ایقاظ الہِمَم

فی

شرح الحِکَم

جلد دوم

مصنف

احمد بن محمد عجیبۃ الحسنی رحمہ اللہ

مترجم

حضرت مولانا محی الدین نظامی رحمہ اللہ

المیزان

خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ

کندیاں ضلع میانوالی

المیزان

عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

سن اشاعت ۲۰۱۰ء
محمد شاہد عادل نے
ندیم یونس پرنٹرز سے چھپوا کر
المیزان اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

ملنے کے پتے

خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ
کندیاں ضلع میانوالی
فون: 0300-6092045

مکتبہ سراجیہ
بالمقابل جامعہ مفتاح العلوم چوک سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا

مدرسہ تعلیم القرآن حسینیہ سرگودھا
0300-9601939

فہرست

اٹھارھواں باب

دعا کے آداب کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

لَا يَكُنْ طَلَبُكَ سَبَبًا اِلَى الْعَطَاءِ مِنْهُ ، فَيَقِلَّ فَهْمُكَ عَنْهُ ، وَ لْيَكُنْ طَلَبُكَ لِإِظْهَارِ الْعُبُوْدِيَّةِ ، وَقِيَامًا بِحُقُوْقِ الرَّبُوْبِيَّةِ

''اللہ تعالیٰ سے تمھاری دعا، اس کے عطا کرنے کا سبب نہیں ہے۔ (لہذا تم اس سے کچھ حاصل کرنے کی نیت سے دعا نہ کرو) اور اگر تم ایسا کرتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی سمجھ تمھارے اندر کم ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے تمھاری دعا، عبودیت (بندگی) کے ظاہر کرنے اور ربوبیت کے حقوق کے ساتھ قائم رہنے کے لئے ہونی چاہئے۔''

میں کہتا ہوں :- اس کتاب کی ابتدا میں یہ بیان گزر چکا ہے۔ کہ عقل و سمجھ والوں (عارفین) کے نزدیک ساری دعائیں معلول (ناقص۔یا۔ثابت) ہیں۔ لہذا اگر دعا مانگو اور دعا مانگنی شرعاً ضروری ہے تو عبودیت کے ظاہر کرنے اور ربوبیت کے حقوق کو ادا کرنے کیلئے دعا مانگنی چاہئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تمھاری دعا، اس کے دینے کا سبب نہیں ہے اور اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے متعلق تمھارے اندر سمجھ کی کمی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی سمجھ کا تقاضا ہے :- اللہ تعالیٰ کے علم کو کافی سمجھنا اور اس کی معرفت کے ساتھ بے نیاز ہونا۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی سمجھ رکھنے والا، نہ کسی شی کا محتاج ہوتا ہے نہ کسی شی میں مشغول ہوتا ہے۔ تو جب کوئی شی اس کو نہیں ملتی ہے تو اس کی نظر صرف اس چیز پر ہوتی ہے، جو قدرت کی اصل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا ہے۔ جو

اس کے لئے اس کے مولا کی مرضی ہے۔

بعض عارفینؒ سے دریافت کیا گیا:- آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:- جو اللہ تعالےٰ چاہتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

دعا سے اور اپنے محبوب کی مناجات سے تمھارا مقصود، اپنی حاجتوں کے پورے ہونے کی خوشی نہ ہونی چاہئے۔ تاکہ تم محبوبین میں شامل ہو جاؤ۔

بعض عارفینؒ نے فرمایا ہے:- دعا کا فائدہ:- اللہ تعالےٰ کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرنی ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے:- حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی:- اے میرے رب! میں بھوکا ہوں۔ مجھ کو کھانا کھلا دے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:- مجھ کو معلوم ہے کہ تم بھوکے ہو۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی:- اے میرے رب! مجھ کو کھلا دے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:- جب میری مرضی ہوگی۔ کھلاؤں گا۔ اور یہ انتہائی درجہ والوں کا مقام ہے۔

لیکن ابتدائی درجہ والے:- تو ان کے لئے حاجتیں طلب کرنے اور کثرت سے دعا مانگنے اور عاجزی کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ ان کے لئے دعا واجب یا مستحب ہے۔ اور انھیں کے بارے میں دعا کرنے کی ترغیب اور اس میں عاجزی کرنے کی ہدایت وارد ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:-

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

"تم لوگ مجھ سے دعا کرو۔ میں تمھاری دعا کو قبول کروں گا۔ اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا:-

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ

"کون ہے۔ جو مجبور کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔"

بعض اخبار میں وارد ہوا ہے:- حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالےٰ نے فرمایا:-

مجھ سے مانگو= یہاں تک کہ اپنے آٹے کا نمک بھی مجھ سے مانگو۔ یہ کمزور لوگوں کے لئے بطور شرعی قانون کے فرمایا گیا۔ کیونکہ انبیاء علیھم السلام کمزور اور طاقتور سب کے لئے معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

اور دعا میں پوری طرح ادب کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ لہذا کسی ایسی چیز کے لئے دعا نہ کرنی چاہئے۔ جو شریعت میں منع کی گئی ہے۔ اور نہ ایسی چیز کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ جو عقل کے نزدیک محال ہے۔ اور دعا، عاجزی وانکساری اور مجبوری ومحتاجی کے ظہور کے ساتھ ہونی چاہئے۔ نہ کہ خوشی و ناز برداری کے ساتھ۔ کیونکہ خوشی اور ناز کے ساتھ دعا، ایسے اللہ والوں کا مقام ہے جو اہل رسوخ و کمال ہیں۔

اور اسی سلسلے میں حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنے حزب کبیر میں فرمایا ہے:- یہ بزرگی نہیں ہے، کہ تم صرف اسی کے ساتھ نیک سلوک کرو، جس نے تمھارے ساتھ نیک سلوک کیا ہے۔

قوتُ القلوب میں بیان کیا گیا ہے:- بنی اسرائیل سات سال تک قحط میں مبتلا رہے۔ پس حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر ہزار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر دعاءِ استسقا (پانی طلب کرنے) کے لئے نکلے۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی کی:- میں ان لوگوں کی دعا کس طرح قبول کروں۔ جبکہ ان کے اوپر ان گناہوں کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ اور ان کے باطن خبیث (ناپاک) ہیں۔ لہذا یہ لوگ یقین کے بغیر دعا کریں گے اور میری حکمت سے بے خوف رہیں گے۔ تم ان کو لے کر واپس جاؤ۔ میرے خاص بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔ اس کا نام برخ ہے۔ تم اس سے کہو، کہ وہ پانی مانگنے کے لئے نکلے۔ تو میں اس کی دعا قبول کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے برخ کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن ان کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک راستے پر جا رہے تھے کہ اچانک ایک حبشی غلام ان کے سامنے آیا۔ اس کے دونوں انکھوں کے درمیان پیشانی پر سجدے کا نشان تھا۔ وہ اپنے کندھے پر ایک چادر رکھے ہوئے تھا۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نور سے پہچانا۔ تو اس کو سلام کیا۔ پھر پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا:- میرا نام برخ ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام

نے ان سے فرمایا:- میں کچھ عرصہ سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ باہر میدان میں چلئے اور ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے پانی طلب کیجئے۔ تو وہ میدان میں تشریف لے گئے۔ اور اپنی دعا و مناجات میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح خطاب کیا:-

''کیا یہ تیرا کام ہے۔ اور کیا یہ تیرا حکم ہے۔ اور کیا تجھ کو یہ معلوم ہے۔ کہ تیرے پانی کے چشمے تیرے لئے خشک ہو گئے ہیں؟ یا ہواؤں نے تیرے حکم کی فرماں برداری سے منہ موڑ لیا ہے۔ یا تیرا خزانہ ختم ہو گیا ہے۔ یا تیرا غضب گنہگاروں پر سخت ہو گیا ہے؟ کیا تو خطا کاروں کی خطا سے پہلے غفار (بخشنے والا) نہیں تھا؟ تو نے رحمت کو پیدا کیا۔ اور بخشش کا حکم دیا۔ تا کہ تو اپنے حکم کی مخالفت کرنے والے کے لئے ہو۔ یا تو ہم کو یہ دکھاتا ہے۔ کہ تو روکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یا تو فوت ہونے سے ڈرتا ہے۔ اس لئے سزا دینے میں جلدی کرتا ہے؟'' وہ برابر یہی فرماتے رہے اور اتنی بارش ہوئی کہ بنی اسرائیل پانی سے تر ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدھے دن میں گھاس اور سبزیاں اگا دیں۔ اور وہ بڑھ کر گھوڑے پر سوار کے برابر ہو گئیں۔ پھر برخ واپس آئے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا استقبال فرمایا اور ان سے کہا:- آپ کا یہ خطاب کیسا ہے جس سے آپ نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی:- ان کو چھوڑ دو۔ کیونکہ ان کی دعا سے مجھ کو ہنسی آجاتی ہے۔

پس تم اس حکایت میں غور کرو:- دعا، کس طرح خوش طبعی (مذاق) کے طور پر واقع ہوئی ہے۔ جس کو اہلِ معرفت اور تمکین کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے اور جو شخص اللہ والوں کے مقامات تک نہیں پہنچا ہے۔ اس کے لئے اللہ رب العالمین کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھنا اور اس سے ڈرنا لازمی ہے۔

پھر حضرت مصنفؒ نے اپنے اس قول کی وجہ بیان کی۔ کہ دعا:- صرف اظہارِ عبودیت کے لئے ہونی چاہئے۔ نہ اس لئے وہ بخشش (کچھ ملنے) کا سبب ہے۔

چنانچہ فرمایا:-

كَيْفَ يَكُوْنُ طَلَبُكَ اللَّاحِقُ سَبَبًا فِي عَطَائِهِ السَّابِقِ، جَلَّ حُكْمُ الْاَزَلِ اَنْ يُّضَافَ اِلَى

الْعِلَلِ

''یہ کیسے ممکن ہے کہ تمھاری اِس وقت ہونے والی دعا اللہ تعالیٰ کے ازلی عطا کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ازلی حکم اس سے بلند و بالاتر ہے۔ کہ اس کی نسبت اسباب کے ساتھ کی جائے۔''

میں کہتا ہوں :- عطاءِ سابق، ازلی حکم :- وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قدیم علم، کائنات کی تجلیوں کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی وابستہ ہو چکا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ازل ہی میں، جو کچھ ہوا اور جو کچھ ابداً آباد تک ہونے والا ہے اس کو مقدر فرما دیا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی روزیوں کو تقسیم فرما دیا ہے۔ اور وقتوں کو مقدر کر دیا ہے۔ -:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ

''بیشک ہم نے ہرشی کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ

''اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک، ہرشی ایک اندازے کے ساتھ ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ

''ہرامت کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ لہذا جب ان کا مقرر وقت آ جاتا ہے۔ تو وہ ایک گھنٹہ بھی نہ آگے کر سکتی ہیں، نہ پیچھے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ

''کسی زندہ شخص کی عمر دراز نہیں کی جاتی ہے اور یہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔ مگر وہ کتاب میں درج ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّوَجَّلًا

''اور کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ مر جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک وقت مقرر ہے۔''

لہٰذا اے انسان ! جب تم کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ قضا و قدر نے تمھاری روزی، اور موت کو پہلے ہی مقدر کر دیا ہے۔ اور یہ کہ تمھاری قسمت (حصہ) اور بخشش پہلے ہی مقرر ہو چکی ہے تو اب تم کیا مانگتے ہو؟

اور اگر تم دعا کرتے ہو تو تمھاری اس وقت پیچھے ہونے والی دعا:- اللہ تعالیٰ کی سابق (پہلے ہی سے مقرر کی ہوئی) عطا کا سبب کیسے بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ تمھاری طرف سے دعا صادر ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا مقرر ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی قدیم حکم اس سے بلند و بالاتر ہے کہ حادث اسباب کے ساتھ اس کو منسوب کیا جائے۔ اس لئے وجود اور حکم دونوں حیثیت سے، قدیم پر حادث کا مقدم ہونا محال ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا ارشاد

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

توحید اس علم کو کہتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اشیاء کے اندر بغیر کسی تدبیر کے جاری ہے۔ اور اس کی صنعت بغیر آمیزش کے ہے۔ اور ہر شی کے وجود کا سبب اس کی صنعت (تخلیق) ہے۔ اور اس کی صنعت کے لئے کوئی سبب نہیں ہے۔ اور بلند آسمانوں اور پست زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی تدبیر کرنے والا نہیں ہے۔ اور ہر وہ شی جو تمھارے عقل و ذہن کے دائرے میں آ جائے، اللہ تعالیٰ اس کے برعکس ہے۔

اور بعض عارفین نے فرمایا:- جو کچھ وجود میں آیا۔ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں ہے۔ یعنی علم اور مشیت کے اعتبار سے نہ کہ قدرت کے اعتبار سے۔

اور ''جو کچھ وجود میں آیا'' اس سے مراد سابق قضا و قدر ہے۔

لہٰذا قدرت نے جس چیز کو پیدا اور ظاہر کیا۔ اس سے بہتر ہونا، قدیم علم کے تعلق کی حیثیت سے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ عقل کے نزدیک یہ جائز

ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر بھی پیدا کردے اور قدرت الٰہی کامل و مکمل ہے۔ لیکن چونکہ جو کچھ ہوا ، یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے آ چکا ہے اور قضائے الٰہی اس پر جاری ہو چکی ہے۔ اس لئے اس سے بہتر نہیں ہوسکتا ہے۔

یا تم اس طرح کہو:- عالم امکان میں جو کچھ ہوا اس سے بہتر نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ عالمِ امکان یعنی عالمِ شہادت میں وہی ظاہر ہوا ہے۔ جو قدیم معانی (حقیقتیں) عالمِ غیب میں تھیں ۔لہٰذا اس سے بہتر نہ ہوا۔ اور نہ ہرگز کبھی ہوگا۔ پس تم اس کو سمجھو۔ یہ کلام درست ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اور اس حقیقت کی طرف ''کہ تمھاری دعا اللہ تعالیٰ کی عطا کا سبب نہیں ہے۔''

جو شئے تمھاری رہنمائی کرتی ہے وہ تمھارے ظاہر ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت کا تمھارے ساتھ موجود ہونا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

عِنَايَتُهُ فِيْكَ لَا لِشَيْءٍ مِنْكَ ، وَ اَيْنَ كُنْتَ حِيْنَ وَاجَهَتْكَ عِنَايَتُهُ ، وَ قَابَلَتْكَ رِعَايَتُهُ؟ لَمْ يَكُنْ فِي اَزَلِهِ اِخْلَاصُ اَعْمَالٍ ، وَ لَا وُجُوْدُ اَحْوَالٍ بَلْ لَّمْ يَكُن هُنَاكَ اِلَّا مَحْضُ الْاَفْضَالِ ، وَ وُجُوْدُ النَّوَالِ

''تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی عنایت تمھاری طرف سے ہونے والی کسی شی کے سبب نہیں ہے۔ اور اس وقت تم کہاں تھے جب ازل میں اللہ تعالیٰ کی عنایت تمھاری طرف متوجہ ہوئی اور اس کی نگرانی اور حفاظت تمھارے سامنے آئی؟ اس کے ازل میں نہ اعمال کا اخلاص تھا، نہ احوال کا وجود تھا۔ بلکہ وہاں صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور بخشش کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں کہتا ہوں:- خبریں اور نقلیں جس شی کے لئے متواتر وارد ہوئی ہیں اور منقول اور معقول جس بات پر متفق ہیں وہ یہ ہے کہ ''جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت قدیم ہے۔ کیونکہ وہ اس کا خاص ارادہ ہے اور اس کا ارادہ اس کے علم کے موافق ہے۔ اور اس کا علم قدیم ہے۔ لہٰذا جو کچھ عالم شہادت میں ظاہر ہوتا ہے وہ صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے عالمِ غیب میں مقدر کر دیا ہے:-

جَفَّتِ الْاَقْلَامُ وَطُوِيَتِ الصُّحُفُ

''قلم خشک ہو گئے اور صحیفے لپیٹ دیئے گئے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا

''زمین میں اور تمھارے اوپر جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ اس کے ظاہر ہونے سے پہلے کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔''

لہٰذا نیک بختی اور بد بختی، دونوں کا فیصلہ قضا و قدر میں پہلے ہی ہو چکا ہے۔ پس نیک بخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں نیک بخت ہوا اور بد بخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں بد بخت ہوا۔

اور مصنف کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:- تمھارے ہر سانس لینے کے برابر وقت میں تمھارے لئے ایک فیصلہ مقدر ہو چکا ہے۔

لہٰذا اے انسان! جب تم کو یہ معلوم ہو گیا تو تم اللہ تعالیٰ کے سابق علم کو کافی سمجھو۔ اور اپنی لاحق (بعد میں ہونے والی) دعا سے باز رہو۔ اور تمھاری دعا صرف عبودیت کے ظاہر کرنے اور ربوبیت کے ادب کو قائم کرنے کے لئے ہو۔ کیونکہ تمھارے وجود سے پہلے تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی عنایت، تمھاری طرف سے صادر ہونے والی کسی طاعت یا عمل کے سبب نہ تھی۔ جس کی بنا پر تم اسکی عنایت اور احسان کے مستحق تھے اور اس وقت تم کہاں تھے۔ جبکہ اس کے ازل میں اس کی عنایت تمھاری طرف متوجہ ہوئی اور تمھاری طرف بڑھی اور تم کو حفاظت اور ہدایت والوں کے زمرے میں لکھ دیا؟ پھر جب اس نے اقرار لینے کے دن تم کو بات کرنے کی طاقت عطا کی تو تم نے اس کے رب ہونے کا اقرار کیا۔

اور اس وقت تم کہاں تھے۔ جبکہ اس کی نگرانی اور حفاظت تمھارے شامل حال تھی۔ حالانکہ تم پیٹ کے اندھیرے میں تھے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنی روزی خون کی رگ سے پہنچائی۔ اور اس عارضی چند روزہ جگہ یعنی ماں کے پیٹ میں تمھاری حفاظت فرمائی۔ یہاں تک کہ تمھارے اعضا سخت اور ہاتھ پاؤں مضبوط ہو گئے؟ پھر تم کو نرمی اور مہربانی سے پیٹ سے نکال کر عالم وجود میں

لایا۔اور اپنی روزی تم کو آسانی سے پہنچائی۔

ازل میں جب اس کی عنایت تمھاری طرف متوجہ ہوئی اور ماں کے شکم میں جب اس کی حفاظت تمھارے ساتھ تھی، اس وقت نہ اعمال کا اخلاص تھا، نہ احوال کا وجود تھا۔جن کی وجہ سے تم عنایت اور حفاظت کے مستحق تھے۔ بلکہ اس وقت صرف اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم تھا۔

حضرت واسطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:- قسمتیں تقسیم کر دی گئیں۔اور صفتیں مقدر کر دی گئیں۔تو حرکات و معاملات سے وہ کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ایک شاعر نے کہا ہے:-

فَلَا عَمَلٌ مِّنِّی اِلَیْهِ اکْتَسَبْتُهُ ۔۔۔ سِوَی مَحْضِ فَضْلٍ لَا بِشَیْءٍ یُعَلَّلُ

''پس میری جانب سے اللہ تعالےٰ کی طرف کوئی عمل نہیں ہے جو میں نے کیا ہو، بلکہ صرف اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم ہے جس کا سبب کوئی شی نہیں ہے۔''

اور دوسرے شاعر نے فرمایا ہے:-

وَ کُنْتُ قَدِیْمًا اَطْلُبُ الْوَصْلَ مِنْهُمْ ۔۔۔ فَلَمَّا اَتَانِی الْعِلْمُ وَارْ تَفَعَ الْجَهْلُ

''میں بہت زمانے سے ان کا وصل طلب کرتا تھا۔لیکن جب مجھ کو علم حاصل ہوا اور جہالت دور ہوئی۔''

عَلِمْتُ بِاَنَّ الْعَبْدَ لَاطَلَبَ لَهٗ ۔۔۔ فَاِنْ قُرِبُوْا فَضْلٌ وَ اِنْ بُعِدُوْا عَدْلٌ

''تو میں نے جان لیا کہ بندے کے لئے کوئی طلب نہیں۔لہذا اگر قریب کر لئے جائیں تو فضل و کرم ہے۔اور اگر دور کر دئے جائیں تو عدل و انصاف ہے۔''

وَ اِنْ اُظْهِرُوْا لَمْ یُظْهِرُوْا غَیْرَ وَصْفِهِمْ ۔۔۔ وَ اِنْ سَتَرُوْا فَالسَّتْرُ مِنْ اَجْلِهِمْ یَحْلُوْ

''اور اگر وہ ظاہر کر دیئے جائیں۔تو اس کے وصف کے ساتھ ظاہر کئے جائیں گے اور اگر چھپائے جائیں۔تو ان کی وجہ سے چھپنا شیریں ہو جاتا ہے۔''

اور دوسرے شاعر نے فرمایا ہے:-

قَدْ کُنْتُ اَحْسِبُ اَنَّ وَصْلَكَ یُشْتَرٰی ۔۔۔ بِنَفَائِسِ الْاَمْوَالِ وَالْاَرْبَاحِ

''میں سمجھتا تھا کہ تمھارا وصل بہترین مالوں اور فائدوں سے خریدا جا سکتا ہے۔

وَ ظَنَنْتُ جَهْلًا اَنَّ حُبَّكَ هَيِّنٌ تُفْنٰى عَلَيْهِ كَرَائِمُ الْاَرْوَاحِ

''اور میں نادانی سے یہ گمان کرتا تھا کہ تمھاری محبت آسان ہے۔مگراس پر قیمتی جانیں قربان کر دی جاتی ہیں۔''

حَتّٰى رَاَيْتُكَ تَجْتَبِىْ وَ تَخُصُّ مَنْ تَخْتَارُهٗ بِلَطَائِفِ الْاَمْنَاحِ

''یہاں تک کہ میں نے تجھ کو دیکھا کہ تو جس کو چاہتا ہےاس کو اپنے لطف وکرم سے چن لیتا ہےاور خاص کر لیتا ہے۔''

فَعَلِمْتُ اَنَّكَ لَا تُنَالُ بِحِيْلَةٍ فَلَوَيْتُ رَاْسِىْ تَحْتَ طَىِّ جَنَاحِىْ

''پس میں نے جان لیا کہ تم کسی تدبیر سے نہ ملو گے۔تو میں نے تدبیر سے ہاتھ سمیٹ لیااور منہ پھیر لیا۔''

وَجَعَلْتُ فِىْ عُشِّ الْغَرَامِ اِقَامَتِىْ فِيْهِ غُدُوِّىْ دَائِمًا وَ رَوَاحِىْ

''اور محبت کے آشیانے میں میں نے اپنے ٹھہرنے کی جگہ بنائی۔اور ہمیشہ صبح وشام اسی میں رہتا ہوں۔''

اسی وجہ سے عارف کا قلب خوف اور امید کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہےاوراس کو اللہ تعالےٰ کے دیدار کے سوا کوئی حاجت باقی نہیں رہتی ہے۔

حاصل یہ ہے :- کہ ولایت ،عنایتِ الٰہی کا راز ہے جو تدبیر اور طلب سے حاصل نہیں ہوتی ،لیکن اللہ تعالےٰ کی عنایت جس کے شامل حال ہوتی ہے اس کے لئے اس کا مقصد آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا:- آپ نے اپنے رب کو کس کے ذریعے پہچانا؟ انھوں نے جواب دیا:- میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعے پہچانا۔اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہ پہچانتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا گیا:- کیا آپ نے اللہ تعالےٰ کو حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے پہچانا ،یا حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالےٰ کے ذریعے سے؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جواب دیا:- اگر میں اللہ تعالیٰ کو حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے پہچانتا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرتا۔ لیکن میرے اندر حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ سے زیادہ مضبوطی سے قائم ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے مجھ کو اپنی ذات کی پہچان کرائی پھر میں نے اللہ تعالیٰ کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کو پہچانا۔

اور یہی مقام، عارفین کی معرفت کی انتہا ہے۔ یعنی جب وہ سابق قضا و قدر کے ساتھ مضبوطی سے قائم ہو جاتے ہیں۔ تو اپنے نفسوں سے جدا ہو کر اپنے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں گم ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ رضا و تسلیم کے سایہ میں آرام و سکون حاصل کرتے ہیں اور معارف کے باغوں سے ان کے اوپر خوش گوار ہوا چلتی ہے۔ لیکن آخری درجے میں ان کے احوال مختلف ہوتے ہیں۔

اَلْمَاءُ وَاحِدٌ وَالزَّهْرُ اَلْوَانٌ

''پانی ایک ہے اور کلیاں اور پھول بہت رنگ کے ہیں۔''

لہذا عارفین میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے اوپر خوف اور شرم کا غلبہ ہوتا ہے۔

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

بعض عارفینؒ نے فرمایا ہے:- جس شخص کو جتنی زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر غالب ہوتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو زیادہ پہچانتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ خوف کرتا ہے۔ اور انھیں لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

''اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی ڈرتے ہیں''

اور عارفین میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اوپر شوق اور اشتیاق غالب ہوتا ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے۔ اس کے اندر بقا کی علامت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق غالب ہوتا ہے۔ اور دنیا، اپنی کشادگی کے باوجود اس کے اوپر تنگ ہوتی ہے۔

شوق ہی عارفین کا مقامِ بلند ہے

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- عارف کا سب سے اونچا اور بزرگ مقام شوق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- میرے کچھ خاص بندے ایسے ہیں کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں ان کا مشتاق رہتا ہوں وہ میرے مشتاق رہتے ہیں۔ میں ان کا ذکر کرتا ہوں اور وہ میرے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں وہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ جو شخص ان کے طریقے پر چلتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور جو ان سے منہ پھیر لیتا ہے میں اس سے ناراض ہوتا ہوں۔ عرض کیا گیا:- اے ہمارے رب! ان کی پہچان کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- وہ دن میں سایوں کا اس طرح خیال رکھتے ہیں۔ جس طرح مہربان چرواہا اپنی بکریوں کا خیال رکھتا ہے۔ اور وہ آفتاب کے غروب ہونے کے اس طرح مشتاق ہوتے ہیں۔ جس طرح چڑیاں غروب آفتاب کے قریب اپنے آشیانوں کے مشتاق ہوتی ہیں۔ پھر جب ان کے اوپر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور بستر بچھا دئے جاتے ہیں۔ اور سب لوگ آرام کرنے لگتے ہیں۔ اور ہر دوست اپنے دوست کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے تو وہ میرے لئے نماز میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی پیشانی میرے سامنے بچھا دیتے ہیں۔ اور میرے کلام سے مناجات (سرگوشی) کرتے ہیں۔ اور میرے سامنے میرے انعام کے لئے خوشامد کرتے ہیں۔ لہذا چیخنے اور رونے اور آہ و فریاد اور قیام و قعود اور رکوع و سجود سے جو تکلیف وہ میرے لئے برداشت کرتے ہیں۔ وہ میری آنکھ کے سامنے ہے۔

اور میری محبت میں جو آہ و فریاد وہ کرتے ہیں۔ اس کو میرے کان سنتے ہیں۔

مشتاقین الٰہی کے تین انعام

تو پہلے میں انکو تین چیزیں عطا کرتا ہوں:-

پہلی چیز:- یہ ہے کہ میں ان کے قلوب میں اپنا نور ڈال دیتا ہوں تو وہ میرے متعلق خبر دیتے ہیں جیسا کہ میں ان کے متعلق خبر دیتا ہوں۔

دوسری چیز:- یہ کہ اگر ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب ان کے میزان میں رکھ دی

جائیں تو ان سب کو ان کے لئے ہلکا کر دوں گا۔

تیسری چیز:- یہ کہ میں اپنی ذات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہو جو یہ جانتا ہو، کہ جس کی طرف میں اپنی ذات کے ساتھ متوجہ ہوتا ہوں میں اس کو کیا عطا کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت ابراھیم بن ادھم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- ایک دن شوق نے مجھ کو گم کر دیا تو میں نے کہا:- اے میرے رب! اگر تو نے محبین میں سے کسی کو کوئی ایسی شی عطا کی ہو جس کے ذریعے ان کے قلوب تیری ملاقات سے پہلے مطمئن اور پر سکون ہوں تو تو مجھے بھی وہ شی عطا فرما۔ کیونکہ بے قراری سے میں تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہوں۔ تو میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں اور وہ مجھ سے فرما رہا ہے:- اے ابراہیم! کیا تم کو مجھ سے یہ درخواست کرنے میں شرم نہیں دامن گیر ہوئی۔ کہ میں تم کو ایسی شی عطا کروں جس کے ذریعے تمھارا قلب میری ملاقات کے بغیر ہی مطمئن اور پر سکون ہو جائے۔

کیا کوئی عاشق معشوق کی ملاقات کے بغیر مطمئن اور پر سکون ہو سکتا ہے؟

پس میں نے کہا:- اے میرے رب! میں مدہوش اور حیران ہوں اس لئے میں نہیں جانتا ہوں کہ میں کیا کہوں۔ لہذا تو مجھ کو بخشدے۔ اور مجھ کو تو ہی بتا دے کہ میں کیا عرض کروں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- تم اس طرح کہو:- اے میرے اللہ! تو مجھ کو اپنی قضاء سے رضامندی اور اپنی بلا پر صبر عطا کر۔ اور مجھ کو اپنی نعمتوں کے شکر کی توفیق عطا فرما۔

اور عارفین میں سے کچھ لوگوں ایسے ہوتے ہیں جن کے اوپر سکون قلب غالب ہوتا ہے، کیونکہ علم و یقین، سکون اور اطمینان کا سبب ہوتے ہیں۔ لہذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی معرفت جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ اس کو سکون اور اطمینان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔تم یہ جان لو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب مطمئن اور پر سکون ہوتے ہیں۔

اور عارفین میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اوپر حیرت (بھوچکا ہونا۔ ہکا بکا ہونا) غالب

ہوتی ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ پہچاننے والا لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حیرت میں ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا ۔ اے میرے اللہ! تو اپنے بارے میں میری حیرت زیادہ کر دے۔

اور عارفین میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اوپر تواضع اور خضوع اور عاجزی وانکساری غالب ہوتی ہے۔

عارف کی مثال

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔ عارف کی مثال: زمین کی طرح ہے جس پر اچھے اور برے سب چلتے ہیں اور بادل کی طرح ہے۔ جو سرخ وسفید سب پر سایہ کرتا ہے اور بارش کے پانی کی طرح ہے جو چلنے والے اور رشوت لینے والے سب کو سیراب کرتی ہے۔

اور عارفین میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی معرفت وسیع ہوتی ہے۔ وہ توحید کے سمندر میں غرق ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو کوئی شے مکدر نہیں کرتی ہے۔ نہ کوئی شے ان پر غالب ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ہر شے سے اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے حصے سے کچھ کم نہیں کیا جا سکتا ہے وہ ہر شے سے مانوس ہوتے ہیں۔ کسی شے سے متنفر نہیں ہوتے ہیں۔

حضرت ابوتراب نے فرمایا ہے:۔ عارف کے وسیلے سے ہر شے کی گندگی دور ہو کر پاک وصاف ہو جاتی ہے۔ اور اس کو کوئی شے گندہ نہیں کرتی ہے۔

حضرت ابوسلیمان دارانی نے فرمایا ہے:۔ اللہ تعالیٰ عارف کیلئے اس کے بستر پر حکمت ومعرفت کا وہ دروازہ کھول دیتا ہے جو اس کیلئے نماز کے قیام میں بھی نہیں کھولتا ہے۔

اور بعض عارفین نے فرمایا ہے:۔ عارف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اس قدر مانوس ہوتا ہے، کہ اس کی مخلوق سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اور وہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ذلیل ورسوا ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مخلوق میں عزیز ومقبول بنا دیتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو وصیت

حضرت داؤد علیہ السلام کے زبور میں ہے:- اے داؤد علیہ السلام! آپ میری رضامندی چاہنے ولوں کو یہ پیغام پہنچا دیجئے:- جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور جو شخص میرے ساتھ بیٹھتا ہے۔ میں اس کا ہمنشین ہوتا ہوں اور جو شخص میرے ذکر میں مانوس ہوتا ہے۔ میں اس کا دوست ہوتا ہوں اور جو شخص میرا ساتھی ہو جاتا ہے میں اس کا ساتھی ہوتا ہوں۔ اور جو شخص مجھ کو اختیار کرتا ہے۔ میں اس کا مختار ہو جاتا ہوں۔ اور جو شخص میری اطاعت کرتا ہے۔ میں اس کی بات سنتا اور قبول کرتا ہوں۔ میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھاتا ہوں:- میرا کوئی بندہ جب مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں یہ جان لیتا ہوں، کہ وہ اپنے قلب کے یقین کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ تو میں اس کو اپنی ذات کے لئے قبول کر لیتا ہوں۔ پھر جتنا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

اور جو شخص مجھ کو چاہتا ہے۔ وہ مجھ کو پالیتا ہے اور جو شخص میرے غیر کو چاہتا ہے۔ وہ مجھ کو نہیں پاتا ہے۔ لہذا اے زمین پر رہنے والو! تم زمین کی فریب دینے والی چیزوں کو چھوڑ دو۔ اور میری کرامت اور مجالست (ہمنشینی) اور مصاحبت کی طرف آؤ۔ اور تم میرے ذکر سے انسیت پیدا کرو۔ تو میں تم کو اپنے ساتھ مانوس کر لوں گا۔ اور تم میری محبت کی طرف بڑھو، میں تمھاری محبت کی طرف بڑھوں گا کیونکہ میں نے اپنے دوستوں کی فطرت کو اپنے خلیل ابراھیم علیہ السلام اور اپنے کلیم موسیٰ علیہ السلام اور اپنی روح عیسیٰ علیہ السلام اور اپنے محبوب محمد ﷺ کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور وہ اپنے عاشقوں کے قلوب کو اپنے نور سے پیدا کیا اور ان کے قلوب کو اپنے جلال اور جمال سے پرورش کیا۔

قضا وقدر پر اعتماد ترک عمل کا بہانہ بن جائیگا

اور چونکہ سابق قضا وقدر پر بھروسہ کرنے کا تقاضا عمل کا ترک کرنا ہے۔ لہذا مصنفؒ نے اس کا راز اپنے اس قول سے بیان فرمایا ہے:-

عَلِمَ اَنَّ الْعِبَادَ يَتَشَوَّ قُوْنَ اِلٰى ظُهُوْرِ سِرِّ الْعِنَايَةِ فَقَالَ! يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ، وَ

عَلِمَ اَنَّهُ لَوْ خَلَّاهُمْ وَ ذَالِكَ لَتَرَكُوا الْعَمَلَ اِعْتِمَادًا عَلَى الْاَزْلِ ، فَقَالَ :- اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

''اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ بندے اس کی عنایت کے راز کے ظاہر ہونے کے مشتاق ہیں۔اس لئے فرمایا :-

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءَ

''وہ جس کو چاہتا ہے۔اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔کہ اگر بندوں کو سابق ازلی مشیت کیساتھ چھوڑ دیا جائے ،تو ازل کے فیصلے پر (قضاوقدر)اعتماد کر کے عمل کو ترک کر دیں گے۔اس لئے فرمایا:-

اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

''بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان والوں کے قریب ہے۔''

میں کہتا ہوں:- چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں اپنے رسولوں علیہم الصلوۃ والسلام کی زبانی یہ خبر دے دی ہے کہ عنایت ،سابق ازل (قضا وقدر) پر منحصر ہے۔لہذا جس کے لئے عنایت مقدر ہو چکی ہے۔اس کو گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔اور کل مخلوق اس عنایت کے راز کے ظاہر ہونے کی مشتاق ہے۔اس وجہ سے ہر شخص یہ گمان کرتا ہے۔کہ وہ اس ازلی عنایت کا اہل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ خبر دی :- یہ عنایت کا راز کچھ لوگوں کے لئے ہے اور کچھ لوگوں کے لئے نہیں ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءَ

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے۔اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے عنایت کے راز کو اپنی مشیت کے ساتھ منسوب کیا۔نہ کہ لوگوں کی مشیت (خواہش) کے ساتھ۔لہذا لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ازلی عنایت بعض لوگوں کے لئے ہے سب لوگوں کے لئے نہیں ہے۔کیونکہ ہر شخص چاہتا ہے، کہ وہ ان بعض لوگوں میں سے ہو۔لیکن اکثر اوقات لوگ سابق ازل (مقدر) پر بھروسہ کر کے عمل کو ترک کر دیتے ہیں۔لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ خبر دی:-

اس عنایت کے راز کی کچھ علامتیں ہیں۔ جو اس شخص کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ جو اس کا اہل ہے اور اس کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی ان علامات سے اس شخص کی پہچان ہوتی ہے۔ جو ازلی عنایت کا اہل ہے۔ اور اس کے ساتھ مخصوص ہے)

کون عنایت ازلی کا مستحق ہے

لہذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

إِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ

''بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان والوں کے قریب ہے۔''

اس آیۂ کریمہ میں رحمت سے مراد:- ازلی عنایت ہے۔ اور وہ ان احسان والوں سے قریب ہے جنھوں نے اپنے رب کی بہتر طریقے پر عبادت کی اور اپنے رب کے بندوں کے ساتھ احسان کیا۔

تو حاصل یہ ہوا:- عنایت کا راز، صرف ان احسان والوں کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ جو اپنے اعمال پر مضبوطی سے قائم اور اپنے رب کی عبودیت (بندگی) میں مخلص ہیں۔ لہذا جو لوگ ازلی حکم (مقدر) پر بھروسہ کر کے عمل کو ترک کر دیتے ہیں وہ حکمت کو باطل کرنے کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا اور مردود ہیں۔ اور جو لوگ قدرت اور ازلی مشیت کو نظر انداز کر کے عمل پر بھروسہ کرتے ہیں وہ جاہل، بارگاہ الہی سے دور، غافل ہیں۔ اور جو شخص دونوں حالتوں کا جامع ہے۔ وہ محقق کامل ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ازلی عنایت الہی کا راز اس پر ظاہر ہوگا۔

حضرت ابوعثمان مغربی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- عارفین کے قلوب، ناگہانی مقدر کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- ایسا نہیں ہے۔ کہ جو شخص طلب کرے، وہ پالے۔ اور جو شخص پا جائے، وہ پہنچ جائے اور نہ ایسا ہے کہ جو شخص پہنچ جائے، وہ ادراک کرے اور جو ادراک کرے، وہ پا جائے۔ اور جو پا جائے، وہ سعادت مند ہو جائے۔ بہت سے ایسے ہیں جو اپنی تمناؤں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور بہت ایسے ہیں جو قربتوں کے بالا خانے پر پہنچ جاتے ہیں۔ جس شخص کو

توفیق کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایک پل میں مقبولیت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک مردِ صالح کی حکایت

جیسا کہ کسی صالح کی حکایت ہے:- انھوں نے ابلیس لعین کو خواب میں دیکھا۔ کہ وہ چیختا، روتا، فریاد کرتا ہے۔ اس کی فوج اس کے پاس جمع ہوگئی۔ اور انھوں نے پوچھا:- تم کو کیا ہو گیا ہے؟ ابلیس نے کہا:- میں کئی سال سے فلاں شخص کو بہکانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اب میں نے یہ دیکھا کہ اس کا ظاہر اور باطن اور پوشیدہ و علانیہ یکساں مضبوط اور درست ہو گیا اور ایسا اچانک ہوا۔ لہذا میں اس کے بہکانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ صدق سے آراستہ ہو کر سچائی کے مقام پر بادشاہ مقتدر اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گیا۔ اور میرے مکر سے محفوظ ہو گیا۔

اللہ کی مشیت کسی شے پر موقوف نہیں

پھر مصنفؒ نے مشیت کے سابق حکم کی حقیقت بیان کی۔ چنانچہ فرمایا:-

اِلَی الْمَشِیْئَۃِ یَسْتَنِدُ کُلُّ شَیْءٍ، وَ لَیْسَتْ تَسْتَنِدُ ھِیَ اِلَی شَیْءٍ

''ہر شی مشیت کا سہارا لیتی ہے۔ اور مشیت کسی شی کا سہارا نہیں لیتی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- مشیت اور ارادہ، دونوں ایک شی ہیں اور کل اشیاء کے وجود کا سبب وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ مَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ ۔ وَ لَو شَاءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ

''اور تم لوگ نہیں چاہتے ہو، مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ لوگ اس کو نہ کرتے۔''

اور اس آیہ کریمہ کے علاوہ بہت سی آیتیں اس کی دلیل ہیں کہ ہر شی کی علت (سبب) سابق ازلی مشیت ہے۔

لیکن مشیت:- نہ کسی شی کا سہارا لیتی ہے۔ نہ کسی شی پر موقوف ہوتی ہے۔ لہذا وہ کسی سوال اور دعا پر موقوف نہیں ہے۔ اس لئے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ وہ بغیر کسی سبب اور سوال کے ہوتا

ہے۔اور جو ہمارا رب نہیں چاہتا ہے۔وہ نہیں ہوتا ہے وہ جس کو چاہتا ہے بغیر کسی عمل کے قریب کر لیتا ہے۔اور جس کو چاہتا ہے۔بغیر کسی سبب کے دور کر دیتا ہے:-

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ

''اللہ تعالےٰ جو کرتا ہے۔اس کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا ہے اور لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

لہذا وہاں تحقیق (پہنچنے اور حاصل ہونے) کا ،ازلی توفیق کے سوا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر واسطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- اللہ تعالےٰ کسی فقیر کو اس کی فقر کی وجہ سے قریب نہیں کرتا ہے اور نہ کسی دولت مند کو اس کی دولتمندی کی بنا پر دور کرتا ہے۔اس کے نزدیک اسباب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔کہ ان کے ذریعے تعلق قائم کرے۔اور ان کی بنا پر جدا کر دے۔اگر تم دنیا و آخرت نثار کر دو تو اس کے سبب تم کو اپنے قریب نہیں کرتا اور اگر تم سب کو لے لو تو اس کے سبب تم کو اپنے سے دور نہیں کرتا۔

جس کو چاہتا ہے بغیر کسی سبب کے قریب کر لیتا ہے۔اور جس کو چاہتا ہے بغیر کسی سبب کے دور کر دیتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:-

وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ

''اور جس کے لئے اللہ تعالےٰ نے نور نہیں بنایا ان کے لئے کوئی نور نہیں ہے۔''

لہذا مشیت پر نظر رکھنا حقیقت ہے اور سبب پر نظر رکھنا شریعت ہے۔یا تم اس طرح کہو:- مشیت کی طرف نظر کرنا قدرت ہے۔اور سبب کی طرف نظر کرنا حکمت ہے اور دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری ہے۔

پس حقیقت مقرر ہے اور شریعت واضح ہے۔شریعت،حکمت ہے اور حقیقت قدرت ہے اور باطن میں حقیقت شریعت پر حاکم ہے اور ظاہر میں شریعت حقیقت پر حاکم ہے۔اور قدرت کا حکم حکمت کے وصف سے اس کے مقام میں افضل نہیں ہے۔اور نہ حکمت کا وصف قدرت کے حکم سے اس کے مقام میں افضل ہے۔

حضرت شطیبی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- تم جان لو کہ آدمیوں کی چار قسمیں ہیں:-

ایک قسم:- وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے ازلی علم یعنی قضا و قدر پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قضا و قدر کا حکم بندے کی کوشش سے بدل نہیں سکتا ہے۔

دوسری قسم:- وہ لوگ ہیں۔ جو انجام پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ اعمال اپنے انجام کے ساتھ وابستہ ہیں۔

تیسری قسم:- وہ لوگ ہیں۔ جو وقت پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ نہ سابق قضا و قدر میں مشغول ہوتے ہیں نہ نتیجے کی فکر کرتے ہیں۔ وہ صرف موجود وقت کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں جس کے کرنے کی ان کو تکلیف دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عارف ابن الوقت (اپنے وقت کا پابند) ہوتا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کی فکر میں نہیں پڑتا اور نہ اس وقت کے سوا جو اس کے سامنے موجود ہے دوسرے وقت کی طرف نظر کرتا ہے۔

چوتھی قسم:- وہ لوگ ہیں۔ جو صرف اللہ تعالیٰ پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ماضی و مستقبل اور حال، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور اس کے حکم سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور کل اوقات تغیر اور تبدیلی کو قبول کرنے والے ہیں اس لئے وہ ہر شی سے منہ پھیر کر صرف اللہ تعالیٰ پر نظر رکھتے ہیں۔

ایک بزرگ نے ایک شیخ کے پاس سے جانے کا ارادہ کیا۔ تو شیخ نے پوچھا:- تم کہاں اور کیوں جانا چاہتے ہو؟

انھوں نے کہا:- یا حضرت میں جا رہا ہوں- تا کہ آپ کو اپنے وقت سے غافل نہ کروں (یعنی میری طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ کا وقت ضائع نہ ہو) شیخ نے فرمایا:- اللہ تعالیٰ کے پاس نہ وقت ہے، نہ مقت (ناراضی)۔ ہم وقت کو نہیں دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم صرف وقت کے رب کو دیکھتے اور جس کے اندر شہود کی حالت مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے وہ موجد اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو کر موجود سے غائب ہو جاتا ہے:-

وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ

''تم ان کو جاگتا ہوا سمجھتے ہو حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔'' ایک شخص نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ سے پوچھا ابو یزید کہاں ہیں؟ تو حضرت نے جواب دیا ابو یزید یہاں نہیں ہیں۔

حکایت:- ایک شخص نے حضرت شبلی رضی اللہ عنہ سے پوچھا:- شبلی کہاں ہیں؟ حضرت شبلی نے جواب دیا:- شبلی مرگیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہ کرے۔ اس سے حضرت شبلی نے یہ مراد لیا:- اللہ تعالیٰ اس کو اپنے رب کے مشاہدہ سے دور کر کے اس کے احساس کی طرف نہ لوٹائے۔

حکایت:- حضرت ابو یزید رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو مسجد میں دیکھا کہ ان کو دریافت کر رہا ہے۔ حضرت ابو یزید نے اس سے فرمایا:- میں بھی ابو یزید کو سالوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ اس شخص نے خیال کیا:- یہ کوئی دیوانہ ہے۔ پھر جب اس کو بتایا گیا کہ یہی ابو یزید ہیں۔ تو اس نے کہا:- یا حضرت میں آپ ہی کو دریافت کر رہا ہوں اور آپ ہی سے ملنا چاہتا ہوں۔ تو ابو یزید نے اس سے فرمایا:- تم جس ابو یزید کو تلاش کر رہے ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ میں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے لئے، جانے والوں میں شامل ہو کر چلا گیا۔ اب اس کو اللہ تعالیٰ نہ لوٹائے۔

یہاں اٹھارھواں باب ختم ہوا۔

خلاصہ

اس باب کا حاصل:- دعا اور طلب کے آداب ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ دعا:- بندگی ظاہر کرنے کیلئے ہونی چاہئے۔ نہ کہ کچھ مانگنے کے لئے۔ اس لئے تمارا حصہ ازل ہی میں تمھارے مانگنے سے پہلے مقدر ہو چکا ہے لہذا اللہ تعالیٰ کی عنایت تمھارے مانگنے سے پہلے ہی تمھارے اوپر ہے۔

یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے۔ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت عمل چاہتی ہے۔ لہذا عمل، مشیت پر موقوف ہونے کے باوجود ازل کی خصوصیت پر حاکم ہے۔ کیونکہ ہر شی مشیت کا سہارا لیتی ہے (یعنی ہر شے کے وجود کا سبب مشیت ہے) اور مشیت کسی شے کی محتاج نہیں ہے۔ لہذا سکون اور ادب لازم ہے۔ یہاں تک کہ طلب کے ترک کرنے میں بھی ادب و سکون لازم ہے۔

مصنف نے انیسویں باب کی ابتدا میں اسی کو بیان فرمایا ہے:-

انیسواں باب

ترک طلب کے ادب کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

رُبَّمَادَلَّهُمُ الْاَدَبُ عَلٰى تَرْكِ الطَّلَبِ

''اکثر اوقات ادب، عارفین کی رہنمائی، دعا اور طلب کے چھوڑ دینے کی طرف کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- ایسا اس لئے ہے۔ کہ عارفین اور اہل فنا پر قضا و قدر کا احکام کے ماتحت خاموشی اور سکون غالب ہوتا ہے، اس وجہ سے دعا اور طلب ان سے کم ہی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ عارف اپنے نفس سے فانی اور اپنی حس سے غائب ہوتا ہے نہ اس کو اپنی ذات کی خبر ہوتی ہے۔ نہ اس کو غیر اللہ کے ساتھ قرار ہوتا ہے۔ لہذا اس کی طرف سے کسی قسم کے سوال کا یا اس کے کسی مقصد کے فوت ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:-

مَنْ شَغَلَهٗ ذِكْرِىْ عَنْ مَسْئَلَتِىْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِى السَّائِلِيْنَ

''جس شخص کو میرے ذکر کی مشغولیت نے مجھ سے سوال کرنے سے غافل کر دیا ہے میں اس کو سوال کرنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں۔''

اشیاء اس کی مشتاق ہوتی ہے۔ اور وہ ان سے بے نیاز ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:-

'' **اِشْتَاقَتِ الْجَنَّةُ اِلٰى عَمَّارٍ وَصُهَيْبٍ وَبِلَالٍ**

''جنت:- حضرت عمار اور حضرت صہیب اور حضرت بلال رضی اللہ عنھم کے لئے مشتاق ہے۔''

حاصل یہ ہے :- کہ بندہ جب تک اپنے نفس سے غائب اور اپنے رب کے مشاہدے میں فانی اور اپنے حس سے جدا ہوتا ہے۔اس سے طلب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے طلب ، دوئی چاہتی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ دریائے وحدت میں ڈوبا ہوا ہے۔لہذا اس وقت اس کا طلب کرنا، اس کے حق میں بے ادبی ہے۔

پھر اگر وہ اپنے نفس کے شعور کی طرف لوٹا دیا جائے ۔اور یہ بقا کا مقام ہے۔تو عبودیت کے طریقے پر، نہ کہ کچھ چاہنے اور طلب کرنے کے طریقے پر، اس کی طرف سے سوال کا تصور کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔

پھر مصنفؒ نے دعا و طلب ترک کرنے میں عارفین کے بھروسہ کی وضاحت فرمائی :-

اِعْتِمَادًا عَلٰی قِسْمَتِہٖ ، وَاشْتِغَالاً بِذِکْرِہٖ عَنْ مَسْئَلَتِہٖ

”اپنے قسمت پر بھروسہ کرنے ، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ دعا اور طلب سے باز رہتا ہے۔“

میں کہتا ہوں :- ازلی قسمت پر بھروسہ کا بیان حکمت کی بحث میں اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

اور ذکر میں مشغول ہونے کی بنا پر سوال سے غافل ہونا۔اس سلسلے میں ابھی یہ حدیث شریف درج کی گئی ہے :-

مَنْ شَغَلَہٗ ذِکْرِیْ عَنْ مَسْئَلَۃِ

حضرت واسطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- ازل میں تمھارے لئے جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ اس وقت کے جھگڑے یعنی فوائد کی طلب سے بہتر ہے۔

حضرت قشیری رضی اللہ عنہ نے فرمایا :-

صوفی جب اپنے قلبؔ میں دعا کے لیے اشارہ پائے تو دعا کرے ۔مثلاً جب دعا کے لئے اپنے قلب میں خوشی اور فراخی پائے تو دعا بہتر ہے اور جب اپنے قلب میں تنگی اور رکاوٹ پائے تو خاموشی بہتر ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- پچاس سال ہوئے میں نے اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگا اور نہ میں دعا کرنا چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ میرے لئے دعا کی جائے۔

اور یہ اس لئے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ غافل نہیں ہے کہ اس کو یاد دہانی کی جائے۔ بلکہ وہ تمھارے پوشیدہ معاملات سے بھی خوب آگاہ ہے۔ لہذا جو کچھ تمھارے لئے مقدر ہو چکا ہے وہ تم کو ضرور ملے گا۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

اِنَّمَا یُذَّکَّرُ مَنْ یَّجُوْزُ عَلَیْہِ الْاِغْفَالُ

''حقیقت یہ ہے کہ یاد اس کو دلایا جاتا ہے جس کے لئے غفلت جائز ہو'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ

مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

''اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔''

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ

'' کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کسی تنبیہ کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے۔ اس کے دینے میں وہ تم کو چھوڑ نہیں دے گا۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

وَ اِنَّمَا یُنَبَّہُ مَنْ یَّجُوْزُ عَلَیْہِ الْاِھْمَالُ

''اور تنبیہ اس کو کی جاتی ہے جس کے لئے چھوڑ دینا جائز ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی قدرت کا کامل ہونے اور اس کے علم کے ہر شی کا احاطہ کرنے کی وجہ سے چھوڑ دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن اس کی حکمت، اسباب و ذرائع کا تعلق اور اشیاء کا مقدم اور مؤخر (آگے، پیچھے) ہونا چاہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ

'' اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہر شی ایک اندازے کے ساتھ ہے۔''

لہذا جس شخص کا ایمان کامل ہوتا ہے۔ وہ اپنی تدبیر سے اللہ تعالےٰ کی تدبیر کو کافی سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے علم کو کافی سمجھ کر اپنی جلد بازی کو ترک کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے افعال کے الٹ پھیر پر راضی رہتا ہے۔ پس وہ خالص ابراہیمی ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جو شخص حضرت ابراھیم علیہ السلام کی ملت پر قائم ہوتا ہے۔ وہ ان کی پیروی ضرور کرتا ہے۔ اور جس وقت وہ آگ میں پھینکے گئے وہ آسمان اور زمین کے درمیان اسی دنیا میں تھے۔ لیکن وہ اللہ تعالےٰ کے علم کو کافی سمجھ کر اپنے سوال سے بے نیاز تھے۔ پس اس وقت حضرت سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی حالت یہ تھی۔ کہ وہ حقیقت میں مستغرق (ڈوبے ہوئے) تھے۔ پھر جب وہ شریعت کی طرف لوٹا دیئے گئے۔ تو انھوں نے یہ دعا کی:-

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ

''اے میرے رب! مجھ کو اور میرے والدین اور مؤمنین کو بخشدے۔''

رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ

''اے میرے رب! مجھ کو حکم عطا فرما اور مجھ کو صالحین کے گروہ میں شامل کر''۔

اسی طرح انبیاء علیھم السلام نے شریعت کی تعلیم دینے اور ان محتاجیوں کے ظاہر کرنیکے لئے جو حج اور عیدوں کی خوشی کی طرح ہے۔ کثرت سے دعائیں فرمائی ہیں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

وُرُوْدُ الْفَاقَاتِ اَعْیَادُ الْمُرِیْدِیْنَ

''فاقوں کا ہونا۔ مریدین کے لئے عید کی خوشی کی طرح ہے۔''

میں کہتا ہوں:- عید:- اس کو کہتے ہیں جو مسرت اور خوشی کے ساتھ بار بار لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ پس عوام کی مسرت اور خوشی، فوائد اور جسمانی عادتوں سے وابستہ ہوتی ہے اور خواص کی خوشی اسمیں ہوتی ہے، کہ اللہ تعالےٰ ان کی طرف متوجہ ہو اور ان کے قلوب زندہ ہوں اور ان کا وقت غیر اللہ کی کثافتوں سے پاک و صاف ہو۔ اور اکثر یہ کیفیتیں صرف فاقہ اور حیرہ اور مجبوری کے وقت پائی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس حالت میں نفس کے فوائد ختم ہو جاتے ہیں۔ اور نفس پر جتنی

زیادہ تنگی واقع ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ عالم ملکوت کی طرف سیر کرتا ہے۔ اور عالمِ ملکوت میں اس کو آرام اور مسرت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

و اما من خاف مقام ربہ و نھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا۔ اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔''

اور وہ دو جنتیں ہیں۔ ایک جنت معجّل، یعنی فوراً حاصل ہونے والی اور دوسری جنت مؤجل، یعنی مقررہ وقت پر آخرت میں ملنے والی۔

اسی وجہ سے حضرات صوفیائے کرام نے فقر کو غنا پر اور تنگدستی کو فراخدستی پر اور ذلت کو عزت پر اور بیماری کو تندرستی پر ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس طریقے پر ان کو رقت قلب اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور جس قدر وہ فاقہ اور محتاجی میں ترقی کرتے ہیں اسی قدر اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب اور دوستی میں ترقی عطا فرماتا ہے۔

ایک صوفی خانہ کعبہ کا طاف کر رہے تھے۔ اور یہ کہہ رہے تھے:-

مُؤْتَزِرٌ بِشَمْلَتِیْ کَمَا تَرٰی وَ صَبِیَّۃٌ بَاکِیَّۃٌ کَمَا تَرٰی

''میری چھوٹی سی چادر یا رومال میں لپٹی ہوئی اور روتی ہوئی لڑکی کو تو دیکھ رہا ہے۔''

وَمْرَأَتِیْ عُرْیَانَۃٌ کَمَا تَرٰی یَامَنْ یَرَی الَّذِیْ بِنَا وَلَا یَرٰی

''اور میری بیوی برہنہ ہے جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے۔ اے وہ ذات مقدس جو ہم کو دیکھ رہی ہے اور خود نظر نہیں آتی ہے۔''

اَمَا تَرٰی مَاحَلَّ اَمَا تَرٰی

کیا تو نہیں دیکھتا ہے۔ جو کچھ میرے اوپر گزر رہا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا ہے۔

ایک شخص نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ تو اس نے کچھ درہم جمع کر کے ان کے سامنے پیش کیے۔ انھوں نے اس سے کہا:- یہ میری طرف سے تم لے لو اگر میرے پاس کچھ ہوگا تو پھر میں اس طرح نہ کہہ سکوں گا۔

انتہائی بلند مقام تک وصول کی شرائط

حضرت ابو اسحٰق ہروی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

جو شخص بزرگی کے انتہائی درجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ سات چیزوں کو ترک کر کے سات چیزوں کو اختیار کرے۔ کیونکہ صالحین ان کو اختیار کر کے اعلیٰ مقام پہنچے ہیں۔

صالحین نے دولتمندی کو ترک کر کے محتاجی کو اور آسودگی کو ترک کر کے فاقہ کو اور بلندی کو ترک کر کے پستی کو اور عزت کو ترک کر کے ذلت کو اور تکبر کو ترک کر کے تواضع کو اور خوشی کو ترک کر کے غم کو اور زندگی کو ترک کر کے موت کو اختیار کیا ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- سچے فقیر کو دولتمندی سے اس خوف سے پوری طرح پرہیز کرنا چاہیے۔ کہ وہ اس کے اندر داخل ہو کر اس کے فقر کو برباد نہ کر دے۔ جیسا کہ دولتمند فقیری سے اس خوف سے بچتا ہے۔ کہ کہیں فقیری اس کی دولتمندی کو برباد نہ کر دے۔ اور عارفین کی عید اور خوشی کے بارے میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:-

قَالُوْا غَدَاالْعِيْدُ مَاذَا اَنْتَ لَابِسُهٗ　　　فَقُلْتُ خِلْعَةُ سَاقٍ حُبُّهٗ جُرْعَا

”لوگوں نے کہا:- کل عید ہے تم کون سا لباس پہنو گے۔ میں نے کہا:- میرا لباس ، جس کی محبت میرے لئے ایک گھونٹ ہے۔“

فَقْرٌ وَ صَبْرٌ هُمَا ثَوْبَایَ تَحْتَهُمَا　　　قَلْبٌ يَّرٰی اِلْفَهٗ الْاَعْيَادَ وَ الْجُمُعَا

فقر اور صبر انھیں دونوں کپڑوں میں میرا قلب ملبوس ہے۔ جو اپنے اس محبوب لباس کو عید اور جمعہ سمجھتا ہے۔“

اَحْرَی الْمَلَابِسِ اَنْ تَلْقَی الْحَبِيْبَ بِهٖ　　　يَوْمَ التَّزَاوُرِ فِی الثَّوْبِ الَّذِیْ خُلِعَا

”وہی بہترین لباس ہے کہ اپنے دوست سے ملاقات کے دن تم اسی کپڑے کو پہن کر ملو جو تم کو پہنا دیا گیا ہے“

اَلدَّهْرُلِیْ مَا تَمَّ اِنْ غِبْتُ يَا اَمَلِیْ　　　وَالْعِيْدُ مَا كُنْتُ مَرْاٰیَ لِیْ وَ مُسْتَمِعَا

”اے میرے مقصود جب میں تم سے دور ہو جاتا ہوں تو زمانہ میرے لئے تاریک ہو جاتا ہے۔ اور

جب تم میرے سامنے ہوتے ہو اور میں تمھاری باتیں سنتا ہوں تو زمانہ میرے لئے عید ہو جاتا ہے''

اور ایک دوسرے شاعر کا کلام ہے:-

قَالَتْ هُنَا الْعِيْدُ بِالْبُشْرٰى فَقُلْتُ لَهَا اَلْعِيْدُ وَالْبُشْرُ عِنْدِىْ يَوْمَ لُقْيَاكَ

''اس نے کہا:- وہاں خوشی کے ساتھ عید ہے۔ تو میں نے اس کہا:- میری عید ہے اور خوشی تمھاری ملاقات کا دن ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّ النَّاسَ قَدْ فَرِحُوْا فِيْهِ وَ مَافَرْحَتِيْ اِلَّا بِرُؤْيَاكَ

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ لوگ عید میں خوشی مناتے ہیں۔ اور میری خوشی صرف تمھارے دیدار میں ہے۔

پھر مصنفؒ نے فاقہ کے عید ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

رُبَّمَا وَجَدْتَّ مِنَ الْمَزِيْدِ فِي الْفَاقَاتِ مَا لَا تَجِدُهٗ فِي الصَّوْمِ وَالصَّلٰوةِ ، اَلْفَاقَاتُ :- بَسْطُ الْمَوَاهِبِ ، اِنْ اَرَدْتَ بَسْطَ الْمَوَاهِبِ عَلَيْكَ ، صَحِّحِ الْفَقْرَ وَ الْفَاقَةَ لَدَيْكَ ، اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ

''اکثر اوقات، فاقوں میں تم کو وہ ترقی حاصل ہوتی ہے۔ جو روزہ اور نماز میں بھی تم کو حاصل نہیں ہوتی ہے۔ فاقے:- عطیات الٰہی کے کشادہ ہونے کا سبب ہیں۔ اگر تم اپنے اوپر عطیات الٰہی کی کشائش چاہتے ہو۔ تو اپنے فقر و فاقہ کو درست کرو۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ صدقات:- صرف فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں۔

میں کہتا ہوں:- یہ حقیقت ہے کہ انسان فاقہ میں اس قدر ترقی حاصل کرتا ہے جس قدر وہ روزہ اور نماز میں نہیں حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ فاقہ (محتاجی) قلوب کے اعمال میں سے ہے۔ اور روزہ ونماز جسمانی اعضا کے اعمال میں سے ہے۔ اور قلبی اعمال کا ایک ذرہ، جسمانی اعمال کے پہاڑ جیسے اعمال سے افضل ہے۔ فاقے:- روح کی غذا ہیں اور روزہ ونماز:- قلب کی غذا ہے۔ روح:- مشاہدہ کا مقام ہے۔ اور قلب:- مراقبہ کا مقام ہے۔ اور دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- وہ مدد جس کا نام فتح ربانی ہے۔ صرف انھیں قلوب میں داخل

ہوتی ہے۔ جو عوائق (روکنے والی اشیاء) اور شواغل (مشغول کر کے غافل کرنے والی اشیاء) سے خالی ہوتے ہیں اور ایسے بندے بھی موجود ہیں۔ جو کثرت سے نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ مگر ان کے قلب کا دروازہ دنیاوی معاملات میں مشغول ہونے کی وجہ سے بند ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور کچھ ایسے بندے بھی موجود ہیں۔ جو نمازیں کم پڑھتے اور روزے کم رکھتے ہیں۔ مگر ان کے قلوب کا دروازہ علوم لدنیہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اور ایسے لوگ کم ہیں۔

اور کل عبادتوں میں ریا داخل ہو جاتی ہے۔ مگر صرف گمنامی میں داخل نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ گمنامی میں نفس کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے:-

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لِعَبْدِهٖ :- سَبَكْتُكَ بِالْفَاقَةِ لِتَكُوْنَ ذَهَباً

''اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرماتا ہے:- میں نے تم کو فاقہ میں اس لئے پگھلایا تاکہ تم سونا بن جاؤ۔''

حضرت مصنفؒ نے اپنی کتاب تنویر میں فرمایا ہے:- تم یہ جان لو کہ بلائیں اور فاقے لطف و کرم کے ان اسرار میں سے ہیں جن کو اہل بصیرت کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اور اگر کچھ نہ بھی ہو پھر بھی نفس کی ذلت اور حقارت اور اس کا اپنے فوائد سے رک جانا کافی ہے اور فاقے کا انتہائی مقصد یہی ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے:- جب ذلت واقع ہوتی ہے تائید الٰہی اس کے ساتھ نازل ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ

''اور اللہ تعالیٰ نے بدر کے میدان میں تمہاری مدد فرمائی۔ جبکہ تم ذلیل اور کمزور تھے۔''

لہٰذا اے مرید! اگر تم عطیاتِ الٰہی کی کشائش اور اپنے اوپر ان کا وارد ہونا، چاہتے ہو۔ تو اپنے فقر و فاقہ کو درست کرو۔ پھر جب تمھارا فقر و فاقہ درست ہو جائے۔ تو عطیاتِ الٰہی کے نزول کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ اب وہ تمھارے اوپر بادلوں کی طرح نازل ہوں گی اور اس کے بارے میں، میں نے ایک قصیدہ کہا ہے۔ اس کا بیان انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔

وَ اِنْ تُرِدْنَ بَسْطَ الْمَوَاهِبِ عَاجِلاً فَفِي الْفَاقَةِ رِيحُ الْمَوَاهِبِ يُنْشَرُ

''اور اگر تم فوراً عطیاتِ الٰہی کی کشائش چاہتے ہو۔ تو سمجھ لو کہ فقر و فاقہ کے اندر عطیات کی خوشبو پھیلتی ہے۔''

اور عطیات :- سے مراد ، معارف اور کشف اور اطمینان اور حکمتیں اور علوم اور اسرار ہیں۔ جو غیوب کے خزانوں سے قلوب پر، اس وقت وارد ہوتے ہیں جب وہ غیر اللہ کی آلائش سے پاک وصاف ہو جاتے ہیں۔ اور قلب سب سے زیادہ صاف اس وقت ہوتا ہے، جبکہ نفس ختم ہو جاتا ہے۔ اور نفس کا خاتمہ :- صرف اس کے فوائد کے ترک ہونے سے ہوتا ہے۔ اور نفس کا خاتمہ :- اکثر اوقات فقر و فاقہ کے سوا کسی دوسرے حال میں نہیں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرات صوفیائے کرام فقر و فاقہ سے خوش ہوتے اور توانگری و خوش حالی سے غمگین ہوتے ہیں۔

ایک صوفی کا فتوحات کو سزا سمجھنا

ایک صوفی پر دنیا کا دروازہ کچھ کھول دیا گیا۔ تو انھوں نے فرمایا:- یہ سزا ہے اور اس سزا کے ملنے کا سبب مجھ کو نہیں معلوم ہے۔

حضرت ہروی نے فرمایا ہے:- فقر و فاقہ چھوڑی ہوئی صفت ہے اور جتنی چیزیں عارف کو حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ لذیذ یہی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داخل کرتا ہے اور اس کے سامنے بٹھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے روکنے والی اشیاء کو ختم کرنے اور تعلقات سے پاک ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلب کے مشغول ہونے کے لئے سب مقامات سے زیادہ مشہور یہی مقام ہے۔

سچا فقیر

بیان کیا گیا ہے :- سچا فقیر :- نہ کسی شی کا خود مالک ہوتا ہے اور نہ کوئی شی اس کا مالک ہوتی ہے۔ یعنی نہ وہ حاکم ہوتا ہے۔ نہ محکوم۔

حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا:-

فقیر کو کب آرام وسکون ملتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:- جب وہ غیر اللہ کو نہیں دیکھتا ہے۔

حضرت شبلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- فقیر، صرف اللہ تعالیٰ سے متعلق ہو کر ہر شی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ سہروردی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب عوارف المعارف میں فرمایا ہے:- فقر و فاقہ:- تصوف کی بنیاد ہے۔ اور فقر ہی سے تصوف قائم رہتا ہے۔ اور تصوف کے لئے فقر کا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ تصوف ایسا جامع نام ہے۔ جس میں فقر اور زہد کے معانی، ان احوال کی ترقی کے ساتھ شامل ہیں جو صوفی کے لئے لازمی ہیں اگر چہ وہ فقیر زاہد ہو۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- فقر کی انتہا، تصوف کی ابتدا ہے۔ کیونکہ تمام اعلیٰ اخلاق کے مجموعے اور پست اخلاق سے پاکیز گی کا نام تصوف ہے۔ بلکہ سارے صوفیائے کرام اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داخل ہونے کا دروازہ صرف فقر ہے اور جو شخص فقر میں ثابت قدمی سے قائم نہیں ہوا اس کو ان فیوض و برکات میں سے کچھ بھی نہیں ملا جس کی طرف صوفیائے کرام نے اشارہ فرمایا ہے۔

اور فقر میں ثابت قدمی سے قائم ہونا:- اس سے مانوس ہونا اور اس کے حاصل ہونے کے لئے رشک کرنا اور اس کے ساتھ مضبوطی سے قائم ہونا ہے۔ یہاں تک کہ فقر و فاقہ اس کے لئے شہد سے زیادہ میٹھا اور مال و دولت اس کے لئے حنظل سے زیادہ کڑوی ہو جائے۔ اور جب اس حال پر قائم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے اوپر عطیات الٰہی کا نزول متواتر ہوتا ہے۔ اور معارف کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ پھر وہ سب سے زیادہ غنی اور خوشحال ہو جاتا ہے۔

ایک زاہد کا قصہ

ایک صالح نے فرمایا ہے:- میرے پاس کچھ مال تھا۔ میں نے حرم شریف میں ایک درویش کو چند روز سے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ نہ کچھ کھاتے ہیں۔ نہ پیتے ہیں۔ اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ مال ان کو دیدوں چنانچہ میں نے وہ مال ان کی گود میں ڈالدیا اور کہا:- اس مال سے اپنی دنیاوی ضرورتیں پوری کیجئے۔ لیکن انھوں نے

اس مال کو پتھریلی زمین پر پھینک دیا اور مجھ سے فرمایا:- میں نے اپنے رب کے ساتھ یہ نشست اپنے کل مال کے معاوضے میں خریدی ہے۔ اور تم اس کو خراب کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہ کر وہ چلے گئے۔ لہذا اللہ کی قسم، میں نے ان سے زیادہ بزرگ اور باعزت نہیں دیکھا کیونکہ انھوں نے مال کو پھینک دیا۔ اور میں نے اپنے سے زیادہ حقیر اور ذلیل نہیں دیکھا کہ میں مال کو حفاظت سے جمع کرتا تھا۔

اور ظاہر و باطن میں فقر و فاقہ کی درستی یہی ہے۔

بعض صوفیائے کرام کی یہ حالت تھی:- جب ان کے پاس کچھ مال ہو جاتا تو وہ رنجیدہ ہو جاتے اور جب ان کے پاس کچھ نہ ہوتا، تو وہ خوش ہوتے تھے۔ ان سے کہا گیا:- دوسرے سب لوگوں کا حال، آپ سے الٹا ہے۔ انھوں نے فرمایا:- جب میرے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے۔ تو میں حضرت رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ہوتا ہوں۔ اور جب میرے پاس کچھ ہوتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ مجھ سے ترک ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- ہمارے شیوخ کرام رضی اللہ عنھم کی یہی حالت تھی اور ہے۔ اور ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ان کے احوال کی پیروی کریں۔

مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے:- ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مولاء عربی رضی اللہ عنہ رات کو چراغ جلا کر گھر میں چاروں طرف دیکھتے تھے اگر گھر میں کچھ پا جاتے تو وہ اس کو فوراً صدقہ کر دیتے تھے۔ اور رات فاقہ کی حالت میں گزارتے تھے۔ تجرید کی حالت میں ان کا یہی حال تھا۔ اسی حال کی شہادت میں مصنف ؒ نے اس آیۃً کریمہ کو پیش کیا ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ

''صدقات صرف فقرا و مساکین کے لئے ہیں۔''

مصنف ؒ نے اس مقام میں یہ آیہ کریمہ پیش کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:-

اللہ تعالیٰ جو عطیات اور معارف عطا فرماتا ہے۔ وہ سب صرف صدقات و احسانات ہیں۔ اعمال و احوال کا بدلہ نہیں ہیں۔ کیونکہ صدقہ کسی عمل کے معاوضے میں نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَ اِنَّ اللّٰهُ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

''بیشک اللہ تعالیٰ کل عالم سے بے نیاز ہے۔''

نیز فقر میں ثابت و قائم ہونا:- عبودیت کے تمام اوصاف میں قائم ہونا ہے اور عبودیت کے اوصاف یہ ہیں -

ذلت اور عاجزی اور کمزوری۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

تَحَقَّقْ بِاَوْصَافِكَ يُمِدُّكَ بِاَوْصَافِهٖ وَ تَحَقَّقْ بِذُلِّكَ يُمِدُّكَ بِعِزِّهٖ ،

وَ تَحَقَّقْ بِعِجْزِكَ يُمِدُّكَ بِقُدْرَتِهٖ ، وَ تَحَقَّقْ بِضُعْفِكَ يُمِدُّكَ بِحَوْلِهٖ وَ قُدْرَتِهٖ

''تم اپنی عبودیت کے اوصاف سے موصوف ہو جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کے اوصاف سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ اور تم اپنی ذلت سے موصوف ہو جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی عزت کے وصف سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ اور تم اپنی عاجزی کے وصف سے موصوف ہو جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے وصف سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ اور تم اپنی کمزوری کے وصف سے موصوف ہو جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے اختیار اور اپنی قوت کے وصف سے تمھاری مدد فرمائے گا۔

(اوصاف سے مدد کرنا:- اوصاف سے موصوف کر دینا ہے۔)

میں کہتا ہوں:- عبودیت کے اوصاف چار ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں ربوبیت کے اوصاف بھی چار ہیں:-

عبودیت کا پہلا وصف:- فقر (محتاجی) ہے۔ اس کے مقابلے میں ربوبیت کا وصف:- غنا (بے نیازی) ہے۔

عبودیت کا دوسرا وصف:- ذلت ہے۔ اس کے مقابلے میں ربوبیت کا وصف:- عزت ہے۔ عبودیت کا تیسرا وصف:- عاجزی ہے۔ اس کے مقابلے میں ربوبیت کا وصف:- قدرت ہے۔ عبودیت کا چوتھا وصف:- کمزوری ہے۔ اس کے مقابلے میں ربوبیت کا وصف:- قوت ہے۔ اور وصف کے ساتھ ثابت و قائم ہونے کا مفہوم:- قلب اور جسم کا وصف سے آراستہ و موصوف ہونا ہے۔

اور یہ اوصاف اس کی مخلوق کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے ذلت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ جبتک وہ اس کے بندوں کے سامنے ظاہر نہ ہو۔

لہذا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ماسوا سے بے نیاز فرمادے۔ اس کو اس کے ماسوا سے محتاج (خالی) ہو جانا چاہئے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے اپنے حزب کبیر میں فرمایا ہے:- اے اللہ! میں تجھ سے ماسوا سے خالی ہونا اور تیرے ساتھ بے نیازی طلب کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ تیرے سوا کچھ نہ دیکھوں۔

تواضع کی کرامات

اور جو شخص یہ چاہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو غیر فانی عزت عطا فرمائے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے ذلت اور تواضع کے ساتھ، اس کی مخلوق کے درمیان موصوف ہونا چاہئے۔ کیونکہ جو شخص اپنے مرتبہ سے گر کر تواضع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مرتبے کو اور زیادہ بلند کرتا ہے۔

اور جو شخص یہ چاہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو خرق عادات (کرامات) کی قدرت عطا فرمائے۔ اس کو اپنی عاجزی سے موصوف ہونا اور اپنے اختیار و قوت کو ترک کر دینا چاہئے۔

اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عبادت اور اس کے نفس اور اس کی خواہش سے مجاہدہ کی طاقت عطا فرمائے۔ اس کو اپنی کمزوری سے موصوف ہونا اور اپنے تمام معاملات کو اپنے آقائے حقیقی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہئے۔ اس لئے کہ تم جتنا دو گے، اتنا ہی پاؤ گے۔ اور جس قدر تم اپنے اندر عبودیت کے اخلاق پیدا کرو گے۔ اسی قدر تم ان اخلاق سے موصوف ہوں گے۔ اور جتنا تم اپنی عبودیت کے اوصاف سے موصوف ہوں گے۔ اتنا ہی اللہ تعالیٰ تم کو اپنے اوصاف سے موصوف فرمائے گا۔

اور اس کے بارے میں میں نے کچھ اشعار کہے تھے۔ وہ درج ذیل ہیں:-

تَحَقَّقْ بِوَصْفِ الْفَقْرِ فِي كُلِّ لَحْظَةٍ ‏ فَمَا اَسْرَعَ الْغِنٰى اِذَا صُحِّحَ الْفَقْرُ

”تم ہر لحظہ محتاجی کے وصف سے موصوف رہو۔ کیونکہ اگر محتاجی درست کر لی جائے۔ تو یہ سب سے

بڑی بے نیازی ہے۔''

وَاِنْ تُرِدْنَ بَسْطَ الْمَوَاهِبِ عَاجِلاً   فَفِي الْفَاقَةِ رِيحَ الْمَوَاهِبِ يُنْشَرُ

''اوراگرتم فوراًعطیات کی کشائش چاہتے ہو۔توسمجھ لو۔کہ فاقہ میں عطیات کی خوشبو۔پھیلتی ہے۔

وَاِنْ تُرِدْنَ عِزًّا مَنِيعًا مُؤَيَّدًا   فَفِي الذُّلِّ يَخْفَى الْعِزُّ بَلْ ثَمَّ يَظْهَرُ

''اوراگرتم مضبوط اورتائیدالٰہی رکھنے والی عزت چاہتے ہو۔تو جان لو! کہ یہ عزت ، ذلت میں پوشیدہ ہے۔بلکہ ذلت ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔

وَاِنْ تُرِدْنَ رَفْعًا لِقَدْرِكَ عَالِيًا فَفِي وَضْعِكَ النَّفْسَ الدَّنِيَّةَ يَحْضُرُ

''اوراگرتم اپنے مرتبہ کو بلند کرنا چاہتے ہو۔توتم یہ جان لو! کہ اپنے نفس کو پست وذلیل کرنے ہی میں مرتبے کی بلندی حاضر ہوتی ہے۔

وَاِنْ تُرِدِ الْعِرْفَانَ فَافْنَ عَنِ الْوَرٰى   وَعَنْ كُلِّ مَطْلُوْبٍ سِوَى الْحَقِّ تَظْفَرُ

''اوراگرتم عرفان چاہت ہو۔تومخلوق سے اوراللہ تعالےٰ کے سوا ہر مطلوب سے فنا ہو جاؤ۔تم کامیاب ہو جاگے۔''

تری الحق فی الاشیا حین تلطفت   ففی کل موجود حبیبی ظاھر

''جب اشیاءلطیف ہوکر غائب ہو جائیں گی۔تو تم ان میں اللہ تعالےٰ کو دیکھو گے۔کیونکہ ہر موجود میں میرا دوست ظاہر ہے۔

بندگی اختیارکرو

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

عبودیت کی درستی:-اللہ تعالےٰ کے لئے محتاجی اورکمزوری اورذلت اختیار کرنے سے ہوتی ہے۔اور اس کی ضد :- ربوبیت کے اوصاف ہیں اورتم کو اس سے کیا نسبت ہے؟ توتم اپنے اوصاف کو اپنے اوپرلازم کرو۔اوراللہ تعالےٰ کےاوصاف سے تعلق پیدا کرو۔

اورحقیقی محتاجی اختیار کر کے کہو:-اے بے نیاز اللہ! تیرے سو امحتاج بندے کا کون ہے۔

اور حقیقی کمزوری اختیار کر کے کہو:- اے طاقتور اللہ تیرے سوا کمزور بندے کا کون ہے اور حقیقی عاجزی اختیار کر کے کہو: اے قادر مطلق اللہ! تیرے سوا عاجز بندے کا کون ہے اور حقیقی ذلت اختیار کر کے کہو:- اے عزیز (رب العزت اللہ) تیرے سوا ذلیل بندے کا کون ہے۔

جب تم ایسا کرو گے۔ تو قبولیت اس طرح تمھارے پاس آئے گی۔ گویا کہ وہ تمھاری فرماں بردار ہے۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ

''اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔'' بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اور عبودیت کے وصف سے موصوف ہونا، اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف سے تعلق نہ پیدا کرے۔ جو اس کی عبودیت کے اوصاف کی ضد ہیں۔ لہٰذا اپنی عاجزی اور محتاجی اور کمزوری میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے التجا نہ کرے۔

بادشاہ کو فقیر کا جواب

منقول ہے:- ایک بادشاہ نے ایک فقیر سے کہا:- آپ کی جو کچھ حاجت ہو۔ میرے سامنے پیش کیجئے۔ فقیر نے اس کو جواب دیا:- میں نے اپنی کل حاجتیں اس مقدس ذات کے سامنے پیش کی ہیں۔ جو آپ سے زیادہ قدرت رکھنے والی ہے۔ تو اس نے ان میں سے میری جس حاجت کو پوری کر دیا۔ میں اس پر راضی ہوں۔ اور جس حاجت نے مجھ کو محروم کر دیا۔ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ پھر بادشاہ نے اس سے کہا:- آپ کو مجھ سے کوئی بھی حاجت نہیں ہے؟ فقیر نے کہا:- ہاں ایک حاجت ہے۔ بادشاہ نے کہا:- وہ کیا ہے؟ فقیر نے کہا:- وہ حاجت یہ ہے کہ آئندہ نہ آپ مجھ کو دیکھیں۔ اور نہ میں آپ کو دیکھوں۔

اسی کے متعلق ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:-

مَلَكْتُ نَفْسِيْ وَ كُنْتُ عَبْدًا فَزَالَ رِقِّيْ وَ طَابَ عَيْشِيْ

''میں اپنے نفس کا مالک ہو گیا۔ حالانکہ پہلے میں اس کا غلام تھا۔لیکن اب میری غلامی دور ہو گئی اور میری زندگی خوشگوار ہو گئی۔

اَصْبَحْتُ اَرْضٰی بِحُکْمِ رَبِّیْ اِنْ لَّمْ اَکُنْ رَاضِیًا فَاَیْشِیْ

''میں اپنے رب کے حکم پر راضی ہوں۔ کیونکہ اس کے حکم پر راضی رہنے کے سوا میرے لئے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔

پس یہی ربوبیت کے وصف سے تعلق پیدا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزت حاصل کرنی ہے۔جس کی عزت فنا نہیں ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ لِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَ لِرَسُوْلِہٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ

اورعزت اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رسول ﷺ کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔''

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزت حاصل کر لیتا ہے۔اس کے سامنے ہر شئی عاجز اور فرماں بردار ہو جاتی ہے۔

تو گردن ز حکم داور مپیچ

منقول ہے:- حضرت شیبان راعی رضی اللہ عنہ ، حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوئے۔دونوں حضرات ایک میدان میں جا رہے تھے۔کہ اچانک ایک شیر ان کے سامنے آ گیا۔حضرت سفیان راستے سے الگ ہٹ گئے۔اور حضرت شیبان راعی شیر کی طرف بڑھے اور اس کا کان پکڑ کر اینٹھنے لگے۔اور شیر اپنی دُم ہلاتا رہا۔پھر دُم ہلاتے ہوئے واپس چلا گیا۔حضرت سفیان ثوری نے کہا:-اے شیبان! یہ کس طرح ہوا؟ حضرت شیبان نے فرمایا:-اگر آپ چاہتے تو میں اس پر سوار ہو کر مکہ معظمہ تک چلا جاتا۔

اے دنیا میرے خادم کی نوکر بن جا

منقول ہے:-ایک بڑھیا عورت روزانہ حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کے گھر آتی تھی اور ان کے گھر میں جھاڑو دیتی تھی اور ان کے لئے بازار سے کچھ کھانے کا سامان خرید لاتی تھی۔ان سے دریافت کیا گیا:-یہ کون ہے؟ حضرت نے جواب دیا:-یہ دنیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کو میرا

فرماں بردار بنا دیا ہے۔ کیونکہ میں نے دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ اور اسی سے متعلق یہ حدیث شریف ہے:-

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى لِلدُّنْيَا :- يَا دُنْيَا اُخْدُمِيْ مَنْ خَدَمَنِيْ ، وَ اَتْعِبِيْ مَنْ خَدَمَكِ

''اللہ تعالیٰ دنیا سے فرماتا ہے:- اے دنیا! جو شخص میری خدمت کرتا ہے تو اس کی خدمت کر اور جو شخص تیری خدمت کرتا ہے۔ تو اس کو رنج اور محنت میں مبتلا کر۔

حضرت ابراہیم ادھم ؒ کا قول

حضرت ابراھیم بن ادھم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

جو شخص فقیری چاہتا ہے اس کے سامنے تو انگری آتی ہے اور جو شخص تو انگری چاہتا ہے۔ اس کے سامنے محتاجی آتی ہے اور تو انگری:- حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ متعلق ہو کر ہر شے سے بے نیاز ہو جانا ہے۔

جب جھکا تو غیر کے آگے؟

حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- جو شخص غیر اللہ کے سامنے جھک گیا۔ اس کو یقین کی خوشبو سونگھنی نصیب نہیں ہوئی۔

حضرت ابوتراب نے فرمایا ہے:- میں نے ایک نوجوان کو ایک جنگل میں بغیر کچھ کھانے کے سامان کے چلتے دیکھا۔ میں نے اس سے کہا:- ایسے جنگل میں آپ سفر کر رہے ہیں۔ اور آپ کے پاس کھانے کا کچھ سامان نہیں ہے۔ اس نے کہا:- میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہوں۔ تب میں نے اس سے کہا:- جب آپ کا یہ حال ہے۔ تو آپ جہاں چاہئے، تشریف لیجائیے۔

ابراہیم خواص ؒ کی حکایت

حضرت ابراھیم خواصؒ نے فرمایا ہے:- ایک جنگل میں ایک درویش سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے کہا:- آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:- میں مکہ معظمہ جا رہا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا:- آپ سواری اور زادِ راہ کے بغیر جا رہے ہیں؟ انھوں نے فرمایا:- جو اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے۔ اور ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کو بغیر کسی وسیلے

اورذریعے کے میری روزی عاجز نہیں کرسکتی ہے۔ میں نے کہا:- آپ نے بالکل سچ فرمایا۔ پھراس کے بعد میں نے ان کو مکہ معظمہ میں دیکھا۔ کہ طواف کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں:-

یَا عَیْنُ سُحِّی اَبَدًا یَا نَفْسُ مُوْتِیْ کَمَدًا

اے آنکھ ہمیشہ روتی رہ۔ اے نفس غم سے مرجا

وَ لَا تُحِبِّیْ اَحَدًا اِلَّا الْاِلٰهَ الصَّمَدَا

''اورتو کسی سے محبت نہ کر۔ مگرصرف اس اللہ تعالیٰ سے جو بے نیاز ہے۔''

جب انھوں نے مجھے دیکھا تو مجھ سے فرمایا:-

کیا ابتک آپ کا یقین کمزور ہے؟

میں نے کہا:- نہیں بلکہ مجھ کو یہ یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ہرشی پر قادر ہے۔

یہاں انیسواں باب ختم ہوا۔

خلاصہ

اس باب کا حاصل:- یہ ہے کہ اکثر اوقات ادب:- عارفین کی رہنمائی اس بات کی طرف کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ مانگیں اور اس کے علم کو کافی سمجھیں۔

اس لئے کہ یاددہانی غافل کو اور تنبیہ بھولنے والے کو کی جاتی ہے۔ اور اللہ سبحانہ تعالے کی شان غفلت اور بھول سے بالکل پاک صاف اور بہت بلند ہے۔ لہذا جب ان کے اوپر فاقہ یا سختی نازل ہوتی ہے۔ تو وہ اس کے دور ہونے کے لئے دعا نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اس کو حج اور عید کی خوشی کی طرح سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ان کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کے قلوب پر توحید اور تفرید کی ہوا چلتی ہے۔ اور وہ عطیات ربانی اور علوم لدنی ہیں۔ پھر وہ اپنی عبودیت کے اوصاف سے موصوف ہوجاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے اوصاف سے آراستہ فرماتا ہے۔ تو وہ ظاہر میں بندے اور باطن میں آزاد۔ ظاہر میں محتاج، کمزور اور ذلیل اور باطن میں تو انگر، طاقتور اور عزت والے ہوجاتے ہیں اور یہی کرامت عظمیٰ (بڑی کرامت) ہے۔ نہ کہ محسوس ظاہری کرامت۔

حضرت مصنفؒ نے کرامت ہی کا بیان بیسویں باب کی ابتدا میں بیان فرمایا ہے:-

بیسواں باب

کرامات، کلام و بیان، سوال، کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

رُبَّمَا رُزِقَ الْكَرَامَةُ مَنْ لَّمْ تَكْمَلْ لَهُ الْاِسْتِقَامَةُ

''اکثر اوقات اس شخص سے بھی کرامت صادر ہو جاتی ہے۔ جس کو مکمل استقامت حاصل نہیں ہوتی ہے۔''

میں کہتا ہوں :- محسوس ظاہری کرامت :- یہ ہے۔ پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، زمین کا فاصلہ ختم ہو جانا، پانی کا چشمہ جاری ہونا، کھانا حاضر کر دینا، پوشیدہ باتوں سے واقف ہو جانا اور ان کے علاوہ دوسرے خرق عادات (عادتوں کے خلاف واقعات) کا صادر ہونا۔

حقیقی باطنی کرامت :- یہ ہے۔ بندے کی اپنے رب کے ساتھ ظاہری و باطنی استقامت، اس کے قلب سے حجاب کا دور ہو جانا، اس طرح کہ اس کو اپنے مولائے حقیقی کی معرفت حاصل ہو جائے، اپنے نفس اور اس کی خواہش پر غالب ہونا، اس کے یقین اور اطمینان کا مضبوط ہونا ہے۔ اور محققین عارفین کے نزدیک یہی کرامت معتبر ہے۔

اور عارفین :- محسوس ظاہری کرامات کو نہ چاہتے ہیں۔ نہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ظاہری کرامت، اس شخص سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کی استقامت مکمل نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے شخص سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کو بالکل استقامت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ جیسے جادوگر اور کاہن اور راہب سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ کرامت نہیں ہے۔ بلکہ یہ درحقیقت استدراج ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- صرف یہی دو کرامتیں جامع اور محیط ہیں۔

اول :- ایمان کی کرامت ، یقین کی ترقی اور عیان شہود کے ساتھ۔

دوم :- عمل کی کرامت ، اطاعت اور اتباع کے ساتھ اور دعووں اور فریب کاری سے کنارہ کشی کے ساتھ۔

تو اگر کسی شخص کو یہ دونوں کرامتیں عطا کر دی جائیں۔ لیکن وہ ان دونوں کے علاوہ دوسری اشیاء کا مشتاق ہو۔ تو وہ دھوکا باز اور جھوٹا ہے۔ یا علم و عمل میں سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ ایسے شخص کی مثال :- اس شخص کی طرح ہے۔ جس کو بادشاہ کی رضامندی اور مشاہدے کا شرف حاصل ہو جائے لیکن وہ بادشاہ کی رضامندی کی پرواہ نہ کر کے جانوروں کا انتظام اور دیکھ بال کا مشتاق ہو جائے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- جس کرامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہ ہو۔ ایسی کرامت والا شخص مستدرج ، دھوکا میں مبتلا ہے۔ یا ناقص ہے۔ یا ہلاک ہونے والا ہے۔ یا ہلاک ہو چکا ہے

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- اس شخص کے اندر کچھ کمال نہیں ہے۔ جس کے لئے زمین کا فاصلہ ختم کر دیا جائے۔ کہ ابھی وہ مکہ معظّمہ میں ہے۔ اور ابھی وہ دوسرے شہر میں ہے۔ بلکہ درحقیقت کمال ، اس کے اندر ہے ، جس کے نفس کی صفات ختم ہو جائیں اور وہ اچانک اپنے رب کے قریب پہنچ جائے۔

میں کہتا ہوں :- حقیقی کرامت :- دین پر مضبوطی سے قائم ہونا اور کامل یقین کا حاصل ہونا ہے۔ اور محسوس ظاہری کرامت کے ساتھ اگر ظاہری و باطنی استقامت بھی حاصل ہو۔ تو ایسے صاحب کرامت بزرگ کی تعظیم واجب ہے۔ کیونکہ استقامت کے ساتھ (۱) کرامت اس کے اندر موجود کمال کی شہادت ہے اور اگر ظاہری کرامت کے ساتھ استقامت (۲) نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

اور اکثر ایسا ہوتا ہے:- اہل باطن کی کرامت باطنی ہوتی ہے۔ مثلاً حجاب کا دور ہونا، ایمان کی زیادتی اور شہود وعیاں کی معرفت۔

اور اسی طرح اہل باطن کے ستانے اور تکلیف پہنچانے والوں کی سزا بھی باطنی ہوتی ہے۔ جس کو وہ ستانے والے سمجھتے بھی نہیں ہیں۔ جیسے کہ دل کا سخت ہو جانا، اس طرح کہ حق باتیں سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہے اور گناہوں میں پوری طرح منہمک ہونا، اللہ تعالیٰ سے غافل اور اس کی بارگاہ سے دور ہونا۔ لیکن وہ اس کو سزا نہیں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہری محسوس سزا سے بہت بڑی سزا ہے۔

حاصل یہ ہے:- ظاہری استقامت والوں کی کرامت، محسوس ظاہری ہوتی ہے اور باطنی استقامت والوں کی کرامت، حقیقی باطنی ہوتی ہے۔

ظاہری استقامت والے کے ستانے والوں کو ظاہری سزا ملتی ہے۔ اور باطنی استقامت والے کے ستانے والوں کو باطنی سزا ملتی ہے۔ اور کبھی ان ستانے والوں کو کچھ بھی سزا نہیں دی جاتی ہے۔ کیونکہ اہل باطن سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جو شخص بھی ان سے قریب ہوتا ہے۔ ان کی رحمت اس کے شامل ہوتی ہے۔ خواہ وہ تسلیم کرتے ہوئے قریب ہو، یا انکار کرتے ہوئے قریب ہو۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حضرت نبی کریم ﷺ کی قدم بہ قدم پیروی کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے انتہائی تکلیف پہنچانے والے کافروں کے حق میں فرمایا:-

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

''اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے۔ کیونکہ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

اور جس ولی کی ذات بابرکات سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فیض پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ حضرت رسول کریم ﷺ کی پیروی کی بنا پر، اپنے ستانے والوں کے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو اختیار دیا۔ کہ پہاڑوں کے فرشتے کو جس طرح چاہیں حکم دیں۔ اور پہاڑوں کے فرشتے نے حاضر ہو کر عرض کیا:- اگر آپ حکم دیں۔ تو میں دونوں پہاڑوں کو اس شہر پر الٹ کر سب کو ہلاک کر دوں۔ لیکن حضرت رسول کریم ﷺ نے برداشت فرمایا

اورستانے والوں کومعاف کردیا۔اورفرمایا:-

لَعَلَّ اللّٰهُ اَنْ يُّخْرِجَ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّقُوْلُ :-لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

''ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے پشتوں سے ایسے لوگوں کو پیدا کرے۔

جولاالہ الا اللہ کااقرارکریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اورسب سے بڑی کرامت:- اللہ تعالیٰ کے متعلق سمجھ پیدا ہونا اوراللہ تعالیٰ کی قضا (فیصلہ) پرراضی رہنا اوراللہ تعالیٰ پربھروسہ کرکے اپنے اختیاراورتدبیرکوترک کردینا،اورجس حال میں اللہ تعالیٰ قائم کردے،اسی میں قائم رہنا ہے۔جیسا کہ مصنف نے اس کواپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

مِنْ عَلَامَاتِ اِقَامَةِ الْحَقِّ لَكَ فِي الشَّيْءِ اِدَامَتُهُ اِيَّاكَ فِيْهِ مَعَ حُصُوْلِ النَّتَائِجِ

''تم کوکسی شی میں اللہ تعالیٰ کے قائم کرنے کی علامات میں سے اس شی کے فوئد حاصل ہونے کے ساتھ،اللہ تعالیٰ کاتم کوہمیشہ اسی میں رکھنا ہے۔'' (یعنی تم کوکسی شی میں اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ ہے:- کہ اس شی میں قائم ہونے کے فائدے تم کوحاصل ہورہے ہیں۔اور اس کے علاوہ کسی دوسری شی میں منتقل ہونے کی صورت بھی سامنےنہیں آتی ہے۔)

میں کہتا ہوں:- جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کوکسی ایسی حالت میں قائم کرے،جس کو شریعت بھی منع نہیں کرتی ہے۔اورعقل سلیم بھی اس کو برانہیں سمجھتی ہے۔تواپنی طبیعت سے اس حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا،بندے کے لئے مناسب نہیں ہے۔جبتک کہ خوداللہ تعالیٰ،جس نے اس کواس حال میں قائم کیا ہے۔اس کے اس حال سے نکلنے کا انتظام نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ

''آپ کہہ دیجئے اے میرے رب تو مجھے سچائی کے ساتھ داخل کراورسچائی کے ساتھ نکال''

''پس مدخل صدق:-یہ ہے کہ تم کسی شی میں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے داخل ہو،نہ کہ اپنے اختیار سے

اور مخرج صدق :- یہ ہے کہ تم اس شی سے اللہ تعالےٰ کی مرضی سے نکلو نہ کہ اپنے اختیار سے۔

لہذا اگر اللہ تعالےٰ نے تم کو اسباب میں قائم کیا ہے تو تم اس میں سے اپنے اختیار سے نہ نکلو۔ کیونکہ اس طرح تم تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لہٰذا تم اسباب ہی میں ٹھیرے رہو۔ اور اس وقت تک انتظار کرو۔ کہ اللہ تعالےٰ تمھارے شیخ کی زبان سے واضح اشارہ کے ذریعہ یا تمھارے رب کی طرف سے غیبی آواز کے ذریعہ، تم کو اسباب سے نکال کر دوسری شی میں منتقل کر دے اور اس کا بیان کتاب کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

اور تم کو اس شی میں جس میں تم ہو۔ اللہ تعالےٰ کے قائم کرنے کی علامت :- اللہ تعالیٰ کا تم کو اس شی میں فوئد کے حاصل ہونے اور دین کی سلامتی کے ساتھ ہمیشہ رکھنا ہے۔

اور فوائد سے مراد :- یہ ہے کہ بندے پر جو واجب اور مستحب حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان کو ادا کرتے رہنا۔ مثلاً زکوٰۃ کا ادا کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا، مظلوموں اور عاجزوں کی فریادرسی کرنی اور ان کے علاوہ دوسری نیکیاں۔

اور اگر اللہ تعالیٰ بندے کو علم ظاہر کی نشر و اشاعت میں قائم کرے۔ تو اس میں اللہ تعالےٰ کے قائم کرنے کی علامت :- یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے تعلیم دیتا ہے، اور اس کے بندوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ کے پاس ہے اسی کی خواہش کرتا ہے اور تواضع اختیار کرتا ہے اور طلباء کی گستاخیوں اور بے ادبیوں پر صبر کرتا ہے۔

اسی طرح ہر ظاہری صنعت و حرفت میں :- جبکہ وہ اس میں شریعت کے طریقے پر قائم ہو۔ تو اپنے اختیار سے نہ منتقل ہو۔

اور اگر اللہ تعالےٰ تم کو تجرید میں قائم کرے۔ تو تم دروازے پر کھڑے رہو اور آداب سے آراستہ رہو، یہاں تک کہ تمھارے لئے دروازہ کھول دیا جائے۔

اور تم کو تجرید میں اللہ تعالےٰ کے قائم کرنے کی علامت :- اس کے فوائد کا حاصل ہونا ہے۔

اور تجرید کے فوائد :- احوال و مقامات میں ترقی کرنا ہے۔ یہانتک کہ تم آخری مقام پر پہنچ جاؤ۔

اور مقامات سے توبہ اور تقویٰ اور استقامت اور زہد و ورع اور خوف و رجا، اور رضا و تسلیم

اوراخلاص وصدق اوراطمینان قلب ومراقبہ اورمشاہدہ ومعرفت ہیں۔

اور ہر مقام کے لئے :- علم اورعمل اور حال ہے۔ پہلا درجہ :- علم ۔ دوسرا درجہ :- عمل اور تیسرا درجہ:- حال ہے۔ پھر اس کے بعد مقام ہے۔

پھر جب معرفت کے مقام پر پہنچ جاتا اور اس میں ثابت و قائم ہو جاتا ہے۔ تو سب مقامات ختم ہو جاتے ہیں۔

ایک عارف نے فرمایا:- توحید کے سمندر میں احوال ڈوب جاتے ہیں اور مقامات نیست ونابود ہو جاتے ہیں۔

وَاِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى

''اور بیشک تمھارے رب کے پاس آخری مقام ہے۔''

اس وقت بندہ ، احسان کے سمندر میں غوطہ لگاتا اور ڈوب جاتا ہے۔ پھر جب وہ اللہ تعالٰے کے احسان کے مقام پر فائز ہو کر بیان کرتا ہے۔ تو اگر اس سے کچھ غلطی یا لغزش بھی ہو جائے تو وہ خاموش نہیں ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے :-

مَنْ عَبَّرَ مِنْ بِسَاطِ اِحْسَانِهٖ اَصْمَتَتْهُ الْاِسَاءَةُ وَ مَنْ عَبَّرَ مِنْ بِسَاطِ اِحْسَانَ اللّٰهِ اِلَيْهِ لَمْ يَصْمُتْ اِذَا اَسَاءَ

''جو شخص اپنے احسان کے مقام سے بیان کرتا ہے۔ غلطی اور خطا اس کو خاموش کر دیتی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالٰے کے احسان کے مقام میں قائم ہو کر بیان کرتا ہے، وہ غلطی اور لغزش ہونے پر بھی خاموش نہیں ہوتا ہے۔''

میں کہتا ہوں :- بیان کرنے والے :- وہ وعظ ونصیحت کرنے والے ہیں۔ جو اللہ تعالٰے کے بندوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں اور ان علوم وعطیات اور فتوحات وکرامات کو بیان کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالٰی نے ان کو عطا فرمایا ہے۔

ان بیان کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں :- ایک قسم :- علمائے کرام ہیں اور دوسری قسم :-

عارفین باللہ ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:- ایک قسم:- اہل حجاب ہیں اور دوسرے قسم:- اہل فتح ہیں۔ پہلی قسم، اہل حجاب علما:- وہ لوگ اپنے نفوس کے احسان کے مقام سے بیان کرتے ہیں۔ لہذا وہ اس طرح کہتے ہیں:- ہم نے ایسا کیا اور ہم نے ایسا دیکھا اور ہمارے اوپر اس چیز کا دروازہ کھول دیا گیا اور اے لوگو! تم اس کو کرو اور اس کو چھوڑ دو۔ تو جب وہ لوگ کسی لغزش یا خطا میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو وہ اللہ تعالےٰ سے شرمندہ ہو کر اور اس خوف سے کہ وہ لوگوں کو ایسے فعل کے کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ جو وہ خود نہیں کرتے ہیں، خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنے نفوس کے ساتھ باقی اور اپنے رب سے محجوب ہیں۔ لہذا جب وہ طاعت کرتے ہیں، تو اس سے خوش ہوتے اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جب ان سے کوئی لغزش یا خطا سرزد ہوتی ہے۔ تو وہ رنج وغم کرتے اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ تو چونکہ وہ اپنے نفوس کے احسان کے مقام سے بیان کرتے ہیں، اس لئے خطا اور لغزش ان کو خاموش کر دیتی ہے۔

اور دوسری قسم، اہل فتح عارفین:- وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احسان کے مقام میں قائم ہو کر بیان کرتے ہیں۔ وہ مخلوق کے دیکھنے سے غائب، اپنے نفوس سے فانی اور اپنے رب کے ساتھ باقی ہیں۔ لہذا وہ لوگ جب ان معارف واسرار اور علوم وانوار اور کرامات وفتوحات اور عطیات کو بیان کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ اور نصیحت کرتے ہیں۔ تو وہ نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے منع کرتے ہیں۔ اور ان کا بیان ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اور ان کی نصیحت لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ پھر اگر ان سے کوئی لغزش اور خطا سرزد ہوتی ہے، تو ان کی لغزش اور خطا ان کو خاموش نہیں کرتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی لغزش اور خطا ان کے نفس کی طرف سے ہوتی ہے لیکن ان کا بیان اللہ تعالےٰ کے احسان کے مقام سے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے احسان کو کوئی شی مکدر نہیں کر سکتی ہے اور ہم نے جو یہ کہا ہے۔ ''ان کی خطا ان کے نفس کی طرف سے ہوتی ہے'' یہ صرف ادب کے لحاظ سے کہا ہے۔ ورنہ چونکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالےٰ کے تصرف کے سوا کچھ نہیں دیکھتے ہیں اس لئے ان کی خطا ان کو خاموش نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ وہ احسان کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں اور وہ کائینات

میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں دیکھتے ہیں۔

نیز جو شخص اپنے نفس کے مقام سے بیان کرتا ہے۔ اس کے عیوب اس کو پکار کر کہتے ہیں :- خاموش رہو!

کیا تم کو اپنا برا فعل اور برا وصف یاد نہیں ہے؟ لہذا وہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو جاتا ہے۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احسان کے مقام سے بیان کرتا ہے۔ اس کے عیوب اس سے غائب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مولائے حقیقی کی خوبیوں میں گم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے۔ لہٰذا جب وہ کچھ بیان کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور، اس کے بندوں کے قلوب کی طرف بڑھتا ہے۔ اس لئے اس کا بیان لوگوں کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور نصیحت ان کے قلوب میں بیٹھ جاتی ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے قول میں بیان فرمایا ہے :-

تَسْبِقُ اَنْوَارَ الْحُكَمَاءِ اَقْوَالَهُمْ ، فَحَيْثُ مَا صَارَ التَّنْوِيْرُ وَصَلَ التَّعْبِيْرُ

"حکیموں کے انوار، ان کے اقوال سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تو جس قدر نور پہنچتا ہے، اسی قدر بیان اثر کرتا ہے۔"

میں کہتا ہوں :- حکما :- عارفین باللہ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔ وہ اپنے نفوس سے غائب ہوتے ہیں۔ اور صرف اسی کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ لہذا جب وہ ان علوم و معارف کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جو ان کو ان کے مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ تو ان کے شہود کا نور سننے والوں کے قلوب کی طرف پہلے ہی بڑھ جاتا ہے اور ان کے صدق و اخلاص کے مطابق ان کے اندر سرایت کرتا ہے۔ (اثر انداز ہوتا ہے)

پھر ان سننے والوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے قلب کی گہرائی میں وہ نور داخل ہو جاتا ہے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے قلب کے ظاہر پر وہ نور ٹھہر جاتا ہے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے قلب کے کنارے پر وہ نور چمکتا ہے۔ لہذا جب عارف مقامات و احوال کو بیان کرتا ہے۔ تو اس کا بیان نور کی تاثیر کے مطابق اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا جس

شخص کے قلب کی گہرائی میں نور داخل ہو جاتا ہے، وہ فوراً اپنے رب کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اور جس شخص کے قلب کے ظاہر پر وہ نور ٹھہرتا ہے، وہ خشوع و خضوع اختیار کرتا ہے اور نیکی و تقویٰ کا پختہ ارادہ کرتا ہے اور جس شخص کے قلب کے کنارے پر وہ نور چمکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا اور تصدیق کرتا ہے۔ لہذا جس حد تک نور پہنچتا ہے، اسی حد تک بیان کا اثر ہوتا ہے۔

اور حکماء کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے :- کہ وہ عارفین ہیں۔ اس کے لئے ہماری سند حضرت نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث شریف ہے :-

راس الحکمة مخافة اللہ

''حکمت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔''

اور لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا پہچاننے والا وہی ہے، جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرنے والا۔ انھیں لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

''اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف اللہ تعالیٰ کا علم رکھنے والے (عارفین) ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔''

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ سے حکمت کے متعلق دریافت کیا گیا :- حضرت امام مالک نے جواب دیا :-

جب کوئی بندہ زہد تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر حکمت کی باتیں جاری کر دیتا ہے۔

پھر حضرت امام نے فرمایا :- جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کی آنکھ کھول دے، تو اس کو پوشیدہ عمل، علانیہ عمل سے زیادہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ پوشیدہ عمل، اخلاص کا سر چشمہ ہے اور اخلاص حکمت کا سر چشمہ ہے۔

پھر جب دوبارہ ان سے حکمت کے بارے میں پوچھا گیا :- تو انھوں نے فرمایا :- حکمت ایک نور ہے، جو اللہ تعالیٰ مومن بندے کے قلب میں عالم ملکوت سے ڈالتا ہے۔ لہذا اہل نور ہی حکما

اور عارف باللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اس شاعر کو جس نے ان کی شان میں یہ اشعار فرمائے ہیں :-

هَيْنُوْنَ لَيْنُوْنَ اَيْسَارٌ بَنُوْ يُسْرٍ سُوَّاسُ مُكْرَمَةٍ اَبْنَاءِ اَيْسَارٍ

''وہ نرم طبیعت، نرم مزاج، خوش حال، بزرگی پر قائم رہنے والے، خوشحال لوگوں کی اولاد ہیں۔''

لَا يَنْطِقُوْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ اَنْ نَطَقُوْا وَ لَا يُمَارُوْنَ اِنْ مَارُوْا بِاِكْثَارٍ

''اگر وہ بات کرتے ہیں، تو حق بات کرتے ہیں۔ اور اگر جنگ کرتے ہیں، تو ظلم و زیادتی نہیں کرتے ہیں۔

مَنْ تَلْقَ مِنْهُمْ تَقُلْ لَاقَيْتُ سَيِّدَهُمْ مِثْلُ النُّجُوْمِ الَّتِيْ يَسْرِيْ بِهِ السَّارِيْ

''ان میں سے جس شخص سے تم ملو گے، تو یہی کہو گے کہ میں ان کے سردار سے ملا ہوں۔ وہ ان ستاروں کے مانند ہیں۔ جن سے اندھیری رات میں چلنے والا رہنمائی حاصل کرتا ہے۔''

اور حکما، یعنی عارفین کے بارے میں جو ہم نے کہا:- وہ صرف اسی کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اپنے نفوس سے غائب ہوتے ہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی تصرف کو اس کے انوار کے مظہروں میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

حضرت شیخ ابو العباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- آدمی، تین قسم کے ہیں۔

پہلی قسم :- وہ لوگ ہیں۔ جو اس کو دیکھتے ہیں، جو ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچتا ہے۔ (یعنی اپنے اعمال)

دوسری قسم :- وہ لوگ ہیں جو اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی طرف پہنچتے ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے احسانات)

تیسری قسم :- وہ لوگ ہیں و اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

پہلی قسم کے لوگ :- غم اور فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ :- خوشی اور شکر

گزاری میں مشغول رہتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ:۔ ان کو نہ دوزخ کا خوف اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے، نہ جنت کی خوشخبری۔

پہلی قسم کے لوگ :۔ محنت اور تکلیف میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ :۔ مہربانی اور تعریف میں مشغول رہتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ :۔ اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں محو ہوتے ہیں۔

پھر حضرت شیخ نے فرمایا:۔ بیان کیا گیا ہے:۔ اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کے ساتھ تھوڑا عمل، اپنے نفس کی کوتاہی دیکھنے کے ساتھ زیادہ عمل سے بہتر ہے۔

پھر مصنفؒ نے اس بیان کی علامت ، جس کے پہلے بیان کرنے ولے کا نور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور اس بیان کی علامت، جس کے پہلے بیان کرنے والے کی کثافت اور ظلمت آگے بڑھ جاتی ہے، بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

كُلُّ كَلَامٍ يَبْرُزُ وَ عَلَيْهِ كِسْوَةُ الْقَلْبِ الَّذِيْ مِنْهُ بَرَزَ

''جو بات نکلتی ہے۔ اس کے اوپر اس قلب کا غلاف ہوتا ہے، جس سے وہ نکلی ہے۔''

میں کہتا ہوں :۔ جس کلام سے پہلے کلام کرنے والے نور، آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی علامت :۔ قلوب میں اس کا اثر کرنا اور روحوں کو ابھارنا اور اسرار الہیٰ کا شوق پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا جب غافل اس کو سنتا ہے، تو ہوشیار ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کو اطاعت کرنے والا سنتا ہے، تو اسکی خوشی بڑھتی اور اس کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ اور جب اس کو نافرمان گنہگار سنتا ہے، تو وہ گناہ اور نافرمانی سے رک جاتا ہے۔ اور جب اس کو سائر سنتا ہے، تو اس کے سیر کی تکان اور تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ اور جب اس کو واصل سنتا ہے، تو اپنے حال میں مضبوطی سے قائم ہو جاتا ہے۔ چونکہ کلام، کلام کرنے والے کی صفت ہے۔ اس لئے جب کلام کرنے والا نورانی اور روشن ضمیر ہوتا ہے، تو اس کا کلام سننے والوں کے قلوب میں اتر جاتا ہے۔ اور اگر کلام کرنے والا سیاہ قلب اور کثافت والا ہوتا ہے، تو اس کے کلام کی حد صرف سننے والوں کا کان ہے۔ (یعنی اس کی بات صرف کانوں تک رہ جاتی ہے) لہٰذا جو کلام نکلتا ہے اس کے اوپر اس قلب کا غلاف ہوتا ہے، جس سے وہ نکلا ہے۔

اس لئے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:- جو شخص بات کرتا ہے، ہم اس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ اور جو شخص بات نہیں کرتا ہے، ہم اس کو اس کے دن سے پہچانتے ہیں۔ (یعنی کن چیزوں میں وہ دن گزارتا ہے)

بزرگوں نے بیان کیا ہے:- آدمی، بند دو کانوں کی طرح ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں، تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے، کہ یہ بیطار (جانوروں کا ڈاکٹر) ہے،

یا عطار (عطر فروش)

اور یہ بھی بزرگوں نے فرمایا ہے:- بات جب دل سے نکلتی ہے، تو دل میں اثر کرتی ہے۔ اور جب زبان سے نکلتی ہے تو وہ صرف کانوں تک رہ جاتی ہے۔ اور حال کا ابھارنا، قال (زبانی باتوں) سے زیادہ ضروری ہے اور اگر کسی شخص میں حال اور قال دونوں جمع ہو جائیں، تو وہ موجیں مارتا ہوا گہرا سمندر اور پوری طرح روشن ستارہ ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- جس شخص کا قلب روحانی ہوتا ہے۔ اس کی باتیں حقیقت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ ایسے قلب سے نکلی ہوتی ہیں جس کا میدان بہت وسیع ہے۔ اور جس شخص کا قلب نفسانی ہوتا ہے۔ اس کی باتیں ظاہری ہوتی ہے۔ اور جس شخص کے قلب کے کان کو دنیا کے حجابات نے بند کر دیا ہے۔ وہ نہ سن سکتا ہے، نہ سنا سکتا ہے۔

اور آدمیوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو زبانی علم کے عالم ہوتے ہیں۔ اور ان کا قلب معرفت سے جاہل ہوتا ہے۔ اور ان کی پہچان:- دنیا کی باتوں کو آخرت کی باتوں پر، یا ظاہر کی باتوں کو باطن کی باتوں پر ترجیح دینا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے پرہیز کرو، اور دور بھاگو۔ کیونکہ ان کے قلوب مردہ ہیں۔ لہٰذا ان کی باتیں مردار کے متعلق ہوتی ہے۔ اور مردار انتہائی بدبودار ہوتا ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

اَلدُّنْيَا جِيْفَةٌ وَ طُلَّابُهَا كِلَابٌ

''دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں'' لہٰذا جو شخص دنیا سے متعلق باتیں کرتا ہے، اس کی مثال کتے کی طرح ہے اور کتے میں کچھ بھلائی نہیں ہے، اگرچہ وہ عالم ہو۔ یہ حضرت امام شطبی نے

فرمایا ہے۔۔

اور کلام پر تاثیر کا جو لباس ہوتا ہے، وہ کلام کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کے اجازت دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام کرنے کی اجازت نہ ہوئی ہو، تو ایسے کلام پر تاثیر کا لباس نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں واضح فرمایا ہے:-

مَنْ اُذِنَ لَهٗ فِي التَّعْبِيْرِ ، حَسُنَتْ فِي مَسَامِعِ الْخَلْقِ عِبَارَتُهٗ ، وَ جَلَبَتْ اِلَيْهِمْ اِشَارَتُهٗ

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کا بیان مخلوق کے کانوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور اس کا اشارہ ان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- بیان کرنے کی اجازت ایسے کامل اور عارف شیخ کے واسطے سے ہوتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے تربیت کرنے کا اہل بنایا۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ سے ملانے اور ترقی دینے کے لئے مقرر کیا ہے۔ لہذا جب وہ اپنے مرید میں بیان کرنے کی اہلیت دیکھتا ہے تو اس کو بیان کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لہذا جب وہ مرید بیان کرتا ہے۔ تو وہ قلوب کی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ اور غیبی علوم کے جو اسرار اس کی زبان سے جاری ہوتے ہیں۔ وہ مخلوق کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اس کا اشارہ ان کے اوپر ظاہر ہوتا ہے، ا ران کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور محققین کے نزدیک کلام کی آواز اور اعراب کا اور پیش اور زبر اور زیر کے غلط اور صحیح ہونے کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور در حقیقت اعتبار حقیقت کا ہے۔ نہ کہ جسم اور ظرف کا۔

حکایت:- ایک نحوی حضرت حسن بن سمعون کی مجلس میں ان کا کلام سننے کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا ، کہ وہ کلام میں غلطی کر رہے ہیں۔ وہ ان کی مذمت کرتے ہوئے لَوٹ گیا۔ یہ بات حسن بن سمعون کو معلوم ہوئی۔ تو انھوں نے اس نحوی کے پاس ایک خط لکھا:-

تم غرور اور خود پسندی کی زیادتی کی وجہ سے، معرفت الٰہی کے دروازے سے باہر ٹھہرنے پر راضی ہو گئے ہو۔ اس وجہ سے تم نے اپنے افعال کے غلط ہونے کے باوجود، اپنے کلام کے درست ہونے پر بھروسہ کر لیا ہے۔ اور تم پیش اور زبر اور زیر اور جزم کی درستی سے مغرور ہو کر مقصور اصلی سے دور ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی تمام حاجتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیوں نہیں پیش کیا اور تمام برائیوں کو

کیوں نہیں دور کیا اور خواہشات کو کیوں نہیں ترک کیا، اور اپنی آنکھوں کے سامنے موت کو کیوں نہیں رکھا؟ اللہ تعالیٰ کی قسم، اے میرے بھائی! قیامت کے دن کسی بندے سے یہ نہیں پوچھا جائے گا، کہ تم نے اعراب کو کیوں درست نہیں کیا؟ بلکہ اس سے یہ پوچھا جائے گا، کہ تم نے گناہ کیوں کیا؟ کلام کی خوبی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ افعال کی خوبی مقصود ہے۔ اگر زبان کی فصاحت میں فضیلت ہوتی، تو حضرت سیدنا ہارون علیہ السلام، سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ رسالت کے لئے موزوں اور مستحق ہوتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول بیان فرمایا ہے:۔

وَ اَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّی لِسَانًا

''اور میرے بھائی ہارون زبان اور بیان کی فصاحت میں مجھ سے زیادہ ہیں۔''

اور ان اشعار میں سے جو علامہ خلیل یا سیبویہ رحمہما اللہ سے منسوب ہیں، چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

لِسَانٌ فَصِیْحٌ مُعْرِبٌ فِی کَلَامِهٖ فَیَا لَیْتَهٗ مِنْ وَقْفَةِ الْعَرْضِ یَسْلَمُ

''فصیح زبان، جو اپنے کلام میں صحیح اعراب لگاتی ہے۔ اے کاش کہ وہ قواعد کے چکر سے محفوظ رہتی۔

وَلَا خَیْرَ فِی عَبْدٍ اِذَا لَمْ یَکُنْ تُقًی وَ مَا ضَرَّ ذَا تَقْوٰی لِسَانٌ مُعْجَمٌ

کسی بندے کے اندر کچھ بھلائی نہیں ہے، اگر وہ متقی نہیں ہے اور تقوی والے کو عجمی زبان کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اور دوسرے شاعر کا کلام ہے:۔

مُنْحَرِفٌ بِالْفِعَالِ وَ ذُوْ زَلَلٍ وَ اِنْ تَکَلَّمَ فِی جِدَالِهٖ وَزَنَهٗ

''وہ اپنے افعال میں راہ راست سے پھرا ہوا اور خطا کار ہے۔ اگر چہ وہ اپنے مباحثہ میں فصیح کلام کرتا ہے۔

قَالَ :- وَ قَدْ کَتَبْتُ لَفْظَتَهٗ تِیهًا وَ عُجْبًا اَخْطَاَ مَا لَحَنَهٗ

اس نے غرور اور خود پسندی سے کہا:- میں نے اس کے لفظ کو لکھا ہے، اس نے کلام میں غلطی کی۔

وَ اِنَّمَا اَخْطَاَ مَنْ قَامَ غَدًا وَ لَا یَرٰی فِی کِتَابِہٖ حَسَنَۃ

اور درحقیقت، غلطی اس نے کی ہے، جو کل قیامت کے دن اٹھے گا اور اپنے اعمالنامہ میں نیکی نہ دیکھے گا

اور ہمارے شیخ الشیوخ رضی اللہ عنہ جب کسی ایسے شخص کو نصیحت فرماتے تھے، جو عربی کا ماہر ہوتا تھا۔ تو اس سے فرماتے تھے :- آپ اپنی عربیت کو چھوڑیئے۔ اور میں اپنی پیدائشی زبان کو چھوڑوں۔ پھر ہم دونوں طریقت کی طرف متوجہ ہوں۔

حاصل یہ ہے :- جس شخص میں حال اور قال دونوں کی خوبیاں جمع ہوں، وہ سراپا کمال ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے :- کہ اس کے کلام سے اس کی موت کے بعد لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت امام غزالی اور حضرت ششتری اور حضرت ابوالحسن شاذلی اور حضرت ابوالعباس مرسی اور حضرت شیخ مصنف کتاب ہذا رضی اللہ عنہم

اور اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ کہ ان حضرات کے کلام سے بہت زیادہ فیض پہنچا اور پہنچ رہا ہے اور انشاء اللہ پہنچتا رہیگا۔ اور ان حضرات میں، حضرت مصنف رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ بلند درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ کلام میں ان کا قلم سب سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ اور ان کی کتابوں نے صوفیائے کرام کی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور ان کے شیخ نے ان کے لئے اس بات کی شہادت پہلے ہی دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا تھا:- اللہ تعالیٰ کی قسم، یہ نوجوان نہیں مرے گا۔ یہاں تک کہ یہ داعی ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے۔ نیز ان کے شیخ نے ان سے فرمایا:-

اللہ تعالیٰ کی قسم تمہاری بڑی شان ہوگی، اللہ تعالیٰ کی قسم، ضرور تمھاری بڑی شان ہوگی۔ اور مصنفؒ نے جب کتاب التہذیب لکھی۔ تو ان کے شیخ نے ان کے بارے میں فرمایا:- اللہ تعالیٰ کی قسم، میں تم کو اللہ تعالیٰ کے چشموں میں سے ایک ایسا ہدایت کا چشمہ بنا دوں گا۔ کہ علم ظاہر و باطن میں تمھاری پیروی کی جائے گی۔ اور ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا:- اللہ تعالیٰ کی قسم، میں ان کے لئے ان کے دادا بزرگوار کی خدمت میں بیٹھنا، صرف اس لئے پسند کرتا ہوں، تا کہ وہ ان سے تصوف زیادہ حاصل کر لیں۔ ان کے دادا بہت بڑے عالم اور فقیہہ تھے۔ ان کا نام عبدالکریم تھا۔ انھوں نے بہت سی

کتابوں کی شرح لکھی تھی۔

اور مصنف رضی اللہ عنہ کا کلام ہی ان کے مرتبہ کے طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور تصوف انھیں کے ہاتھوں سے واضح اور درست ہوا۔ انھوں نے منزلوں کو قریب کر دیا اور مسلکوں کو بہترین طریقے پر اور مختصر لفظ و اشارہ میں بیان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سےبہترین اجر عطا فرمائے۔

پھر حضرت مصنفؒ نے اس کلام کو بیان فرمایا:- جس کے بیان کرنے کی اجازت کلام کرنے والے کو نہ دی گئی ہو۔ چنانچہ فرمایا:-

رُبَّمَا بَرَزَتِ الْحَقَائِقُ مَكْسُوفَةَ الْاَنْوَارِ، اِذَا لَمْ يُؤْذَنْ لَكَ فِيهَا بِالْاِظْهَارِ

''اکثر اوقات حقیقتیں نور سے خالی ہونے کی حالت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کیونکہ تم کو انھیں ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- کبھی انسان حکمتوں اور حقیقتوں کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ بے ساختہ بیان کرتا ہے، لیکن وہ نور اور اسرار سے خالی ہوتی ہیں۔ نہ ان میں کچھ شیرینی ہوتی ہے۔ نہ ان میں کوئی خوبی اور قبولیت ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کو ان کے بیان کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کو ان کے بیان کرنے کی اجازت دی جاتی ، تو نور کا لباس ان کے اوپر ضرور ہوتا اور سننے والوں کے قلوب پر ان کا اثر یقیناً ہوتا۔

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے لطائف المنن میں فرمایا ہے :- اللہ تعالیٰ اپنے اولیائے کرام کو جو نعمتیں اور بخششیں عطا فرماتا ہے۔ ان میں بہت بڑی بخشش شریں بیانی اور عبارت کی فصاحت ہے۔

نیز مصنفؒ نے فرمایا ہے:- میں نے اپنے شیخ حضرت ابوالعباس سے سنا۔ وہ فرماتے تھے:- ولی معارف اور علوم سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور اسکے نزدیک حقیقتیں مشہور ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کو بیان عطا کیا جاتا ہے، تو یہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے کی اجازت کے مثل ہے۔

نیز مصنفؒ نے فرمایا:- میں نے حضرت ابوالعباس کو فرماتے ہوئے سنا:- اجازت پائے ہوئے کا کلام جب نکلتا ہے، تو اس کے اوپر نور اور قبولیت کا غلاف ہوتا ہے۔ اور سننے والوں کے قلوب میں اس کا اثر ہوتا ہے۔ اور جس کو اجازت نہیں دی گئی ہے، اس کا کلام نور سے خالی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کے قلوب میں اس کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دو شخص ایک ہی حقیقت بیان کرتے ہیں، لیکن ایک شخص کا بیان مقبول ہوتا ہے اور دوسرے شخص کا بیان مقبول نہیں ہوتا ہے اور رد کر دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- بیان کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کریں اور ابتدائی درجہ والوں کے سامنے انتہائی درجہ والوں کی طرح بیان نہ کریں۔

حدیث شریف میں وارد ہے:-

خَاطِبُوْا النَّاسَ بِقَدْرِ مَا يَفْهَمُوْنَ

''لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کرو۔''

ہاں اگر وقت تنگ ہو اور ہر ایک کے لئے علیحدہ بیان کرنا ممکن نہ ہو، تو ابتدائی، اور درمیانی، انتہائی درجہ والے، سب کے لئے ایک ساتھ بیان کریں۔ ہر شخص اپنا حصہ لے لیگا۔ اور اپنے چشمے سے پانی پئے گا۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ

''ہر شخص نے اپنے پانی پینے کے گھاٹ کو پہچان لیا ہے۔''

حضرت جنید رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا:- وہ حاضرین کے سامنے علانیہ حقائق بیان فرماتے تھے۔ ان سے اس کے بارے میں کہا گیا:- آپ سب کے سامنے حقائق و معارف کیوں بیان فرماتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:- ہمارا علم اس سے محفوظ ہے کہ نا اہل اس کو سمجھے۔ یا اسی قسم کی بات فرمائی جس کا مفہوم یہی ہے۔

پھر اجازت کے بعد اِن کا کلام صرف حکمت ہوتا ہے۔ جس کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

عِبَارَتُهُمْ اِمَّا لِفَيْضَانِ وَجْدٍ اَوْ لِقَصْدِ هِدَايَةِ مُرِيدٍ

''ان کا بیان، یا تو وجد کے فیضان کی بنا پر ہوتا ہے، یا مرید کی ہدایت کے ارادے سے۔''

میں کہتا ہوں:۔ معارف اور توحید کے اسرار اور پوشیدہ علوم، جو عارفین کے قلوب پر وارد ہوتے ہیں، علم اور سمجھ والے ان کے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ہوتے ہیں۔ اور عارفین ان اسرار پر اللہ تعالیٰ کے امین (امانت دار) ہیں۔ لہذا وہ اُن اسرار کی اطلاع انھیں کو دیتے ہیں، جن کو ان کا اہل سمجھتے ہیں۔ مگر وہ عارف جس پر حال غالب ہوتا ہے۔ وہ ان کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ (وہ بے اختیاری کی حالت میں بیان کر دیتا ہے) اور وہ غلبہ حال کی وجہ سے اسرار الہٰی کی حفاظت میں متمکن (مضبوطی سے قائم) نہیں ہوتا ہے۔

لہذا عارفین کا بیان، یا تو وجد کے فیضان کی بنا پر ہوتا ہے، جو ان پر غالب ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ان اسرار الہیہ کو ضبط کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ یا ان کا بیان کسی مرید کی ہدایت اور ارشاد کے لئے اور اس کو اس مقام تک ترقی دینے کے لئے ہوتا ہے۔ جس مقام پر پہنچنے کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ ورنہ عارفین، ان اسرار میں سے نہ کم ظاہر کرتے ہیں، نہ کم سے بھی زیادہ کم۔ (یعنی کچھ نہیں ظاہر کرتے ہیں) اور اس کے بارے میں بعض عارفین کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:۔

قُلُوْبُ الْاَحْرَارِ قُبُوْرُ الْاَسْرَارِ

''آزاد لوگوں کے قلوب، اسرار الہیہ کی قبریں ہیں۔'' ایک شاعر نے کہا ہے:۔

لَایَکْتُمُ السِّرَّ اِلَّا کُلُّ ذِیْ ثِقَةٍ　　فَالسِّرُّ عِنْدَ خِيَارِ النَّاسِ مَكْتُوْمٌ

''قابل اعتماد لوگ ہی راز کو چھپاتے ہیں۔ لہذا بہترین لوگوں کے پاس ہی راز پوشیدہ رہتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے دونوں گروہ کے لوگوں کا حال اور مقام بیان کرتے

ہوئے فرمایا:۔

اَلْاَوَّلُ حَالُ السَّالِكِيْنَ

''پہلی حالت، (یعنی وجد سے مغلوب ہو جانا) سالکوں کی حالت ہے۔''

اور وہ سائرین میں سے ترقی کرنے والے لوگ ہیں۔ وہ حقیقت تک تو پہنچے ہیں۔ لیکن تمکین کے

مقام تک نہیں پہنچے ہیں۔ وہ لوگ احوال کے قبضے میں غلام کی طرح ہوتے ہیں۔ جب ان کے اوپر وجد غالب ہوتا ہے، تو وہ فیضیاب ہوتے ہیں۔ لیکن سمجھتے نہیں ہیں۔لہذا جب وہ اپنے نفوس کی طرف لوٹتے ہیں، تو شرمندہ ہوتے اور استغفار کرتے ہیں۔

پھر مصنفؒ نے دوسرے گروہ کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وَالثَّانِي حَالُ أَرْبَابِ الْمَكُنَةِ وَالْمُتَحَقِّقِينَ

''اور دوسری حالت، اہل تمکین اور متحققین (حقیقت میں مضبوطی سے قائم ہونے والوں) کی حالت ہے۔''

وہ لوگ اسرار الٰہیہ کو صرف مریدین کی ہدایت اور سالکین کی تربیت اور سائرین کی ترقی کے لئے بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے سوا دوسرے لوگوں کے سامنے وہ کچھ بھی ظاہر نہیں کرتے ہیں۔لہذا اگر کوئی سالک، بغیر وجد کے غلبے کے اسرار الٰہیہ میں سے کچھ بیان کرتا ہے تو یہ ایک قسم کا دعویٰ ہے۔اور اگر کوئی متمکن، ہدایت کے ارادہ کے بغیر کچھ بیان کرتا ہے۔تو یہ ربوبیت کے اسرار کا افشا (ظاہر کرنا) ہے۔

اور وہ اسرار الٰہیہ عارفین متمکنین کے نزدیک کیمیا سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اور کبھی آدمی سالوں سال ان کی خدمت میں رہتا ہے۔لیکن وہ اس کے سامنے ان اسرار میں سے کچھ نہیں ظاہر کرتے ہیں۔ نہ زیادہ نہ کم۔ یہانتک کہ جب وہ اس کو بخوبی دیکھ لیتے ہیں، کہ اس نے اپنے نفس اور مال کو بالکل دے دیا۔ اور اپنی روح کو بالکل خرچ کر دیا۔ تب وہ اس کو پوشیدہ اشارے سے اسرار الٰہیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے شیخ الشیوخ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے کتاب میں بیان فرمایا ہے:- مریدین کی ایک جماعت نے ہمارے شیخ کی خدمت تیس سال کی۔ پھر ان لوگوں نے شیخ سے عرض کیا:- یا حضرت! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہم کو ہمارے رب کے ساتھ پہنچوا دیں۔ (یعنی معرفت الٰہی تک پہنچا دیں) انھوں نے فرمایا:- اچھا، کل تم لوگ میرے پاس میرے گھر پر آؤ۔لہذا جب وہ لوگ ان کے پاس گئے۔تو انھوں نے ان لوگوں کے سامنے ایک چھوٹا سا بچہ لاکر اس کا منہ ان لوگوں کی طرف کر

دیا۔ پھر وہ گھر میں چلے گئے۔ لہذا تم غور کرو:۔

یہ اشارہ کتنا لطیف اور پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ کہ اس نے اس زمانے کے لوگوں پر، ایسے اولیائے کرام پیدا کر کے احسان کیا۔ کہ جو شخص ظاہر و باطن کی سچائی کے ساتھ ان کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ تو وہ اس کو تھوڑے زمانہ میں وہ اسرار الٰہی عطا فرما دیتے ہیں۔ جن کو متقدمین لمبے زمانے میں نہ حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ ﷺ کی طرف سے ان اولیائے کرام کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے سالکین اور واصلین کے حال پر لمبی بحث کی ہے۔ جس کو مصنفؒ نے اپنی کتاب لطائف المنن میں بیان فرمایا ہے:۔ اور حضرت شطیبیؒ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ ان کے افعال کو اپنے افعال میں اور ان کے اوصاف کو اپنے اوصاف میں اور ان کی ذات کو اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ فنا کر دیتا ہے۔ اور ان کو اپنے اوصاف میں سے ایسا وصف عطا فرماتا ہے، جس کو سننے اور سمجھنے کی طاقت عام لوگوں کو نہیں ہوتی ہے۔ لہذا وہ لوگ ذات کے سمندر اور صفات کے دریا میں غرق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افعال سے فانی، پھر اپنی صفات سے فانی، پھر اپنی ذات سے فانی ہو کر اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کے ساتھ باقی ہوتے ہیں۔ پھر ان کے پاس ان کا کچھ نہیں باقی رہتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ میں فنا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اور جس شخص کی فنا درست ہو جاتی ہے، اس کی بقا بھی درست ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا:۔ فنا:۔ ماسوی اللہ سے غائب ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں:۔ یہ سالکون کا مقام ہے۔ اور بقا:۔ ہر شی کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ موجود ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ لہذا، اہل فنا، سے اللہ تعالیٰ قائم ہوتا ہے۔ اور اہل بقا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اللہ تعالیٰ سے قائم ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ولایت کی دو قسمیں ہیں۔

لہذا ایک قسم:۔ ایسے اولیاء اللہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مومنوں کو دوست رکھتے ہیں۔

اور دوسری قسم :- ایسے اولیاء اللہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔"

وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ

"اللہ تعالیٰ صالحین کا دوست اور سرپرست ہوتا ہے۔"

حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے فرمایا ہے :- ولایت کی پہچان :- قضائے الٰہی پر راضی رہنا، بلاپر صبر کرنا اور سختیوں اور مصیبتوں کے وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ لینا اور آفتوں کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ لہذا جس شخص کو اعمال و مجاہدے کے خزانے سے یہ چار صفتیں عطا کی گئیں۔ تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے اس کی ولائت درست ہوگئی۔ اور جس شخص کو یہ چاروں صفتیں احسان اور دوستی کے خزانے سے عطا کی گئیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ولایت اس کے لئے مکمل ہوگئی۔

پہلی ولایت :- ولایت صغریٰ ہے اور دوسری ولایت :- ولایت کبریٰ۔ ان سے دریافت کیا گیا:۔ لوگ کس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مومنین کے ولی (دوست) ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا :- اللہ تعالیٰ کے ولی مجاہدہ کے ذریعہ ہوتے ہیں :-

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

"جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ (یعنی چلنے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی، ان کی اتباع سے ہوتے ہیں :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ ، فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

"آپ فرما دیجئے ! اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔"

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

"جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔"

اور مومنین کے ولی ان کی اقتدا کر کے (ان کے طریقوں پر چل کے) ہوتے ہیں۔

یہ ان لوگوں کی نشانیاں ہیں، جو ولایت کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔ وہ، وہ لوگ ہیں، جو اس کی بارگاہ کے لئے موزوں ہیں۔ اور اس کی مخلوق سے غائب ہیں۔ وہ لوگ صرف اللہ تعالیٰ کو موجود دیکھتے ہیں۔ اور اس کے ماسوئی ہر شی کو عدم سمجھتے ہیں۔

پہلی قسم کی ولایت کا نام:- ایمان کی ولایت ہے اور دوسری قسم کی ولایت کا نام:- یقین کی ولایت ہے۔

پھر ان سے دریافت کیا گیا:- ایمان اور یقین میں کیا فرق ہے؟ انھوں نے جواب دیا:- ہر یقین، ایمان ہے۔ لیکن ہر ایمان، یقین نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان میں اکثر اوقات غفلت داخل ہو جاتی ہے۔ اور یقین میں غفلت داخل نہیں ہوتی ہے۔ مومن کے سامنے اللہ تعالےٰ کی تجلی ہر شی سے علیحدہ ہوتی ہے۔ اور موقن (یقین والے) کے سامنے اللہ تعالےٰ کی تجلی ہر شی میں ہوتی ہے۔ مومن:- ہر شی سے فانی ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شی کو نہیں دیکھتا ہے۔ اور موقن:- ہر شی میں باقی ہوتا ہے۔ لہذا وہ ہر شی میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ حضرت شیخ ابوالحسن کا کلام ختم ہوا۔

پھر مصنف رضی اللہ عنہ نے بیان کا فائدہ اور نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

اَلْعِبَارَۃُ قُوْتٌ لِعَائِلَۃِ قُلُوْبِ الْمُسْتَمِعِیْنَ ، وَ لَیْسَ لَکَ مِنْهَا اِلَّا مَا اَنْتَ لَهٗ اٰکِلٌ

”بیان:- سامعین فقرا کے لئے غذا ہے اور اس غذا میں سے تمھارا حصہ اتنا ہی ہے، جتنا تم کھا سکتے ہو“

میں کہتا ہوں:- عارفین کا بیان:- طالبین فقرا کے قلوب کی غذا ہے۔ کیونکہ عارفین کے بیان سے طالبین کے قلوب کا یقین زیادہ ہوتا ہے۔ اور ان کے محبوب حقیقی کے مشاہدے میں ترقی ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ شیوخ اور ان کے خلفا کی تربیت میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا یقین، کامل ہو جاتا ہے۔ اور ان کے احوال درست ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ بذات خود مستقل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے رشد و ہدایت کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر شی سے اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے حال میں سے کچھ کم نہیں ہوتا ہے۔ وہ ہر شی میں اللہ تعالیٰ کی سمجھ اور معرفت حاصل کرتے ہیں۔ اور ہر شی

سے پیتے ہیں اور جب وہ ایسا ہو جاتے ہیں۔ تو وہ بذات خود مستقل، دوسروں کی ہدایت کے اہل ہو جاتے ہیں۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- جو لوگ دروازے کی آواز اور مچھروں کی بھنبھناہٹ اور کتوں کے بھونکنے کو نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ عقلمندوں میں سے نہیں ہیں۔

لیکن جو شخص اس مقام میں نہیں پہنچا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس شخص کی تربیت اور نگرانی میں آشیانہ بنا کر رہنا، اپنے لئے لازم کرے، جو اس کو روحانی غذا کھلائے اور تربیت کرے۔ کیونکہ بچہ:- اگر اپنے بازوؤں کی درستی اور مضبوطی سے پہلے آشیانے سے اُڑ کر باہر آتا ہے، تو اس کو کتے اور باز شکار کر لیتے ہیں اور عورتیں اور بچے اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

اور جب وہ شیخ کے آشیانۂ تربیت میں ہو اور وہ اس کو دوسرے طالبین کے ساتھ روحانی غذا کھلائے، تو اس کو اسی قدر خوراک کھلائے، جس قدر وہ ہضم کر سکتا ہو۔ ورنہ وہ غذا اس کو مار ڈالے گی۔ کیونکہ چھوٹے بچے کی غذا، جوان آدمی کی غذا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ایسے ہی مریدین کے لئے شیوخ کا کلام بھی ہے۔ ہر شخص اپنے حال کے مطابق فیض حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا شیوخ کرام ابتدا اور انتہا اور اوسط درجے کے احوال سب ایک ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور ہر مرید اپنی صلاحیت ولیاقت کے مطابق فیض حاصل کرتا ہے:-

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ

''ہر شخص نے اپنے پینے کا گھاٹ پہچان لیا ہے۔''

لہٰذا مبتدی (ابتدائی درجے والا) منتہی (انتہائی درجہ والے) کے مذاکرات سے تعلق نہ رکھے۔ ورنہ وہ تباہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ اگر چھوٹا بچہ، جوان آدمی کا کھانا کھائے گا، تو وہ اس کے حلق میں اٹک جائے گا۔ اور اگر جوان آدمی، چھوٹے بچے کا کھانا کھائے گا۔ تو اس کا پیٹ نہ بھریگا۔

حضرت مصنفؒ کے اس قول کا یہی مقصود ہے:- اس میں سے تمھارا حصہ اتنا ہی ہے، جتنا تم کھا سکتے ہو۔'' یعنی بیان کی غذا سے تمھارے لئے اتنا ہی مفید ہے جتنا کھانے کی تم طاقت رکھتے ہو۔ ورنہ تمھارا گلا گھٹ جائے گا۔

مجھ سے میرے بعض احباب نے روحانیت اور بشریت کی غذا کے متعلق دریافت کیا:-
میں نے جواب دیا:- بشریت کی غذا تو معلوم ہے اور روحانیت کی غذا:- بشریت کی غذا کے مطابق ہے۔ جس طرح بچہ جب تک بڑا نہ ہو، سخت غذا نہیں کھا سکتا ہے۔ اسی طرح روح کی تربیت بھی بتدریج کی جاتی ہے۔ ایک شی کے بعد دوسری شی دی جاتی ہے۔
لہذا پہلے اس کو فقط زبانی ذکر کی غذا کھلائی جاتی ہے۔ پھر زبانی ذکر کے ساتھ ساتھ قلبی ذکر ، پھر فقط قلبی ذکر، پھر روح کا ذکر اور وہ فکر ہے۔ پھر سر کا ذکر اور وہ غور ہے۔ پھر وہ ہر شی کھاتی اور پیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ کل کائنات کو نگل جاتی ہے۔ تو اگر تم اس کو فکر وغور جو عارفین واصلین کی غذا ہے ، پہلے ہی مرتبہ کھلاؤ گے، جبکہ وہ بچوں کے مقام میں ہے۔ تو وہ اس کو اگل دے گی۔ پھر جب روح اس درجے کو پہنچ جائے کہ وہ ہر چیز کھانے اور ہر چیز پئے، تو اس کے لئے یہ درست ہے، کہ وہ ملکوت اعلیٰ میں پرواز کرے۔ اور جہاں چاہے جائے۔ اور ایک جماعت کے لئے ایک ہی برتن سے، ان لوگوں کے مقام کے اختلاف کی بنا پر پینے کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔
اس کی مثال:- ان لوگوں کا واقعہ ہے۔ جنھوں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا:- ''یاسعتر بری'' اور یہ واقعہ اس طرح ہے:- مکہ معظمہ میں کوہ صفا پر ایک شخص نے ''یاسعتر ابری'' کہہ کر دوسرے شخص کو پکارا۔ اس کا نام یہی تھا۔ یہ آواز تین آدمیوں نے سنی۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کا مفہوم ان کے حال کے مطابق آیا۔ ایک شخص نے سنا کہ پکارنے والا کہہ رہا ہے:- الساعۃ تری بری'' اور دوسرے شخص نے اس طرح سنا:- اسع تر بری'' اور تیسرے شخص نے یہ سنا:- ما اوسع بری'' تو پہلا شخص، مستشرف (ترقی کرنے والا) تھا اور دوسرا مبتدی اور تیسرا واصل تھا۔
اور ایسا ہی واقعہ حضرت علامہ ابن جوزیؒ کا ہے:- وہ بغداد میں بارہ علوم حاصل کر رہے تھے۔ ایک روز وہ کسی ضرورت سے باہر گئے۔ ایک شخص کو انھوں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا:-

إِذَا الْعِشْرُوْنَ مِنْ شَعْبَانَ وَلَّتْ   فَوَاصِلْ شُرْبَ لَيْلِكَ بِالنَّهَارِ

''جب شعبان کی بیس تاریخ گزر جائے۔ تو تم رات کے پینے کو دن سے ملا دو۔''

وَلَا تَشْرَبْ بِأَقْدَاحٍ صِغَارٍ   فَقَدْ ضَاقَ الزَّمَانُ عَلَى الصِّغَارِ

''اور تم چھوٹے پیالوں سے نہ پیو۔ کیونکہ زمانہ چھوٹوں پر تنگ ہو گیا ہے۔''

یہ اشعار سنتے ہی وہ پریشان و بدحواس ہو کر مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ اور وہاں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

تو انھوں نے شاعر کے ان اشعار سے یہ سمجھا، کہ زندگی ختم ہو گئی اور دنیا کا کل زمانہ تنگ ہو گیا۔

مصنفؒ نے لطائف المنن میں فرمایا:- تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے۔ یہ حقیقی مفہومات جو ظاہری سمجھ سے باہر اور بلند ہیں الفظوں میں بیان نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ وہ عام سمجھ سے زائد سمجھ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اہل قلوب میں عارفین کو عطا فرماتا ہے۔ اور وہ باطنی حکمت ہے۔، جو اس کے ظاہر میں اس طرح پوشیدہ ہے، جس طرح بیج میں درخت پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور یہ اس طرح کہ مدد نورانی اور فتح ربانی کا کچھ حصہ ظاہری کنارے کے کچھ حصے سے ملتا ہے، اس طریقے پر کہ جہاں قوت ختم ہوتی ہے، وہیں ادراک ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا اکثر اوقات جو کچھ باطنی معنی کے ظاہر کے موافق ہوتا ہے، وہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات جو باطنی معنی کے ظاہر کے کسی جہت سے خلاف ہوتا ہے۔ وہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے اور اکثر اوقات سمجھ اس کے ظاہر کے خلاف ہوتی ہے۔

حضرت شیخ مکین الدین بن اسمر رضی اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے، جن کے لئے حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ علیہ، ولایت کبریٰ اور مکاشفہ عظمیٰ کی شہادت دیتے تھے۔ ایک شخص نے انکی مجلس میں یہ اشعار پڑھا:-

لَوْ كَانَ لِیْ مُسْعِدٌ بِالرَّاحِ يُسْعِدُنِیْ

لَمَا انْتَظَرْتُ لِشُرْبِ الرَّاحِ اِفْطَارًا

''اگر میرا کوئی مددگار ہوتا، جو شراب پینے میں میری مدد کرتا، تو میں شراب پینے کے لئے کسی کا انتظار نہ کرتا۔''

اَلرَّاحُ شَیْءٌ شَرِيْفٌ اَنْتَ شَارِبُهٗ فَاشْرَبْ وَلَو حَمَّلَتْكَ الرَّاحُ اَوْزَارًا

''جو شراب تم پیتے ہو، وہ بہترین شی ہے، لہذا تم پیو۔ اگرچہ شراب تم کو گناہوں پر آمادہ کرے۔''

يَا مَنْ يَلُوْمُ عَلٰى صَهْبَاءِ صَافِيَةٍ ۔۔۔ خُذِ الْجِنَانَ وَ دَعْنِيْ اَسْكُنُ النَّارَا

''اے صاف ستھری شراب پینے پر ملامت کرنے والے! تم جنت لے لو۔ اور مجھ کو دوزخ میں رہنے کے لئے چھوڑ دو۔''

کسی عالم نے کہا:- ان اشعار کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ حضرت شیخ مکین الدین نے فرمایا:- اس کو کہدو:- شاعر پر اعتراض نہ کرے۔ وہ عالم محجوب آدمی ہے۔ وہ صرف ظاہری شراب کو سمجھتا ہے۔ وہ باطن کو نہیں سمجھتا ہے اور یہ بے حسی ہے۔ و اللہ تعالیٰ اعلم

پھر تم کو یہ حقیقت معلوم ہونی چاہئے:- بیان:- بیان کرنے والے کی حالت پر دلیل اور رہنما نہیں ہے۔ کبھی بیان کرنے والا، اپنے بیان سے بلند مقام پر ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے نیچے پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

رُبَّمَا عَبَّرَ عَنِ الْمَقَامِ مَنِ اسْتَشْرَفَ عَلَيْهِ ، وَ رُبَّمَا عَبَّرَ عَنْهُ مَنْ وَصَلَ اِلَيْهِ ، وَ ذَالِكَ مُلْتَبِسٌ اِلَّا عَلٰى صَاحِبِ بَصِيْرَةٍ

''اکثر اوقات مقام کو وہ شخص بیان کرتا ہے جو ترقی کرنے کی حالت میں اس کو دور سے دیکھتا ہے اور اکثر اوقات وہ شخص بیان کرتا ہے۔ جو مقام تک پہنچ چکا ہے۔ اور یہ حالت مشتبہ ہوتی ہے۔ مگر اہل بصیرت پہچان لیتے ہیں، کہ وہ مستشرف (ترقی کرنے ولا) ہے۔ یا واصل ہے۔''

میں کہتا ہوں:- بیان:- بیان کرنے والے کی انتہا کی طرف رہنمائی نہیں کرتا ہے اور نہ جس مقام کا بیان وہ کرتا ہے۔ اس مقام تک اس کے پہنچنے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ کبھی مقام کا بیان وہ شخص بھی کرتا ہے، جو مقام تک نہیں پہنچا ہے، لیکن ترقی کرنے کی حالت میں اس کی نظر اس پر پڑتی ہے اور کبھی مقام کا بیان، وہ شخص کرتا ہے، جو مقام تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اکثر اوقات مقام کا بیان وہ شخص کرتا ہے، جس کا قدم اس بیان کردہ مقام سے بھی آگے ہے۔ اور اس کی پہچان مشکل ہے۔ اس لیے کہ مستشرف اور واصل کو صرف تیز بصیرت والا ہی پہچان سکتا ہے۔ یعنی جس کے اوپر معرفت الہٰی کا دروازہ کھل چکا ہے۔

لہذا جس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دروازہ کھل گیا ہے اور اس سے حجاب دور

ہو گیا ہے۔ وہ واصل اور مستشرف کے کلام کو پہچان لیتا ہے۔

کیونکہ جو شخص شہر کے اندر جاتا ہے اور اس کے اوصاف سے واقف ہو کر شہر کے متعلق بیان کرتا ہے، اس شخص کا بیان اس کی طرح نہیں ہوتا ہے، جو شہر کے اندر گئے بغیر اس کے متعلق بیان کرتا ہے۔

ایک عارف نے فرمایا:- مستشرف لمبی تقریر سے اور واصل مختصر تقریر سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مستشرف بیان کو لمبا کرتا ہے۔ اور لفظوں اور جملوں کو دہراتا ہے۔ اور واصل ایک ہی مرتبہ مختصر جملے سے مکمل سمجھا دیتا ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے:- موسیقی کا ماہر:- بے فائدہ زیادہ تال سُر نہیں کرتا ہے اور فضل و کمال والا:- زیادہ فضول گوئی نہیں کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے عارفین واصلین کی عبارت لمبی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ خطاب کی تفصیلات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور بہت سے مستشرفین کی عبارت مختصر ہوتی ہے۔

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اَلْاِسْتِشْرَافُ وَالْوُصُوْلُ لَيْسَ اِلَّا مَرَاتِبُ التَّوَجُّهِ لِلتَّحَقُّقِ بِالْعِجْزِ فَمَنْ وَصَلَ لِمَعْرِفَةِ الْعِجْزِ عَنِ الْوُصُوْلِ فَهُوَ الْوَاصِلُ ، لٰكِنِ الْعِجْزُ لَا يَكُوْنُ اِلَّا بَعْدَ الْاِتِّصَافِ بِهٖ حَقِيْقَةً لَا مَجَازًا ، وَ ذٰلِكَ اَنَّ الْجَاهِلَ عِجْزُهٗ حَالِيٌّ قَهْرِيٌّ ، وَالْعَارِفَ عِجْزُهٗ جَلَالِيٌّ رَحْمَانِيٌّ

”استشراف اور وصول، صرف عاجزی کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے توجہ کرنے کے مرتبے اور درجے ہیں۔ لہذا جو شخص عاجزی کی معرفت تک پہنچ گیا، وہی واصل ہے۔ لیکن عاجزی نہیں پیدا ہوتی ہے، جب تک حقیقتاً عاجزی کی صفت سے موصوف نہ ہو۔ نہ کہ مجازاً اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ جاہل کی عاجزی، حالی قہری ہوتی ہے اور عارف کی عاجزی، جلالی رحمانی ہوتی ہے۔“

میں کہتا ہوں:- اس کے حق میں عاجزی سے مراد یہ ہے کہ پہلے اس کو حیرت اور مدہوشی

لاحق ہو۔ پھر بعد میں احاطہ اور حقیقت سے عاجزی پیدا ہو:-

پھر مصنفؒ نے فرمایا:- اس بات کی شہادت یہ ہے کہ جاہل جب حرکت کرتا ہے تو فوائد نفسانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور عارف حقوق پر قائم رہتا ہے۔ اور جاہل کا حصہ وہم ہے او عارف کا حصہ سمجھ ہے۔ جاہل ، علم کو طلب کرتا ہے۔ اور عارف ، اللہ تعالےٰ کو طلب کرتا ہے۔ جاہل ، کی نظر صرف ظاہری صورتوں کے تابع ہوتی ہے ، یعنی وہ صرف ظاہری صورتوں کو دیکھتا ہے۔ اور عارف اپنے قلب کی بصیرت کے ساتھ ، باطنی ارواح کے ساتھ غوطہ لگاتا ہے۔ اور سب مرتبے اور مقامات ظاہر اور باطن کی درمیانی منزلیں ہیں۔ اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا ہے۔ مثلاً جسمانی شکلوں سے قلبی عالموں کی طرف ، پھر قلبی عالموں سے روحانی حقیقتوں کی طرف ، پھر روحانی حقیقتوں سے ربانی اسرار کی طرف ، پھر ربانی اسرار سے توحیدی معارف کی طرف منتقل ہونا۔

اور سالک کے لئے یہ مناسب نہیں ہے ، کہ سلوک کے راستے میں جب اس کے سامنے یہ اسرار آویں۔ تو وہ ان کو بیان کرے۔ بلکہ انھیں پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں واضح فرمایا ہے:-

لَا يَنْبَغِيْ لِلسَّالِكِ اَنْ يُّعَبِّرَ عَنْ وَارِدَاتِهٖ ، فَاِنَّ ذَالِكَ مِمَّا يُقَلِّلُ عَمَلَهَا فِيْ قَلْبِهٖ وَ يَمْنَعُهٗ وُجُوْدَ الصِّدْقِ فِيْهَا مَعَ رَبِّهٖ

''سالک کو واردات الہیہ بیان نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کو بیان کرنا ، ان چیزوں میں سے ہے جو واردات کے اثر کو اس کے دل سے کم کر دیتی ہیں۔ اور واردات میں اس کے رب کے ساتھ سچائی اور اخلاص سے اس کو روک دیتی ہیں۔''

میں کہتا ہوں:- مرید اپنے سیر کی حالت میں اپنے علم و عمل اور اپنے واردات کے حال کو چھپانے پر مامور ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اپنے عمل کو ظاہر کرنا ، اس کے اخلاص کی کمی کی وجہ سے ہے۔ اور اس کا اپنے احوال کو ظاہر کرنا ، اپنے رب کے ساتھ اس کی سچائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔

نیز یہ کہ احوال:- اللہ قہار کی بارگاہ سے آتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ قلوب کو خوف سے ہلا دیتے ہیں اور شوق میں بے تاب کر دیتے ہیں۔ لیکن جب مرید ان کو ظاہر کر دیتا ہے ، تو وہ احوال ٹھنڈے ہو جاتے

ہیں اور ان کا نور بجھ جاتا ہے۔

اس کی مثال :- اس شخص کی طرح ہے۔ جس کی دیگچی چولہے پر جوش کھا رہی ہو۔ جب وہ اس میں پھر پانی ڈال دیتا ہے، تو وہ دوبارہ ابلنے لگتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی آگ کو کم کر دیتا ہے اور دیگچی کو ہلا دیتا ہے تو اس کا سالن ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح واردات الہیہ کا حال ہے۔ وہ قلوب کو ان کے مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ تو جب مرید ان کو ظاہر کرتا اور لوگوں سے بیان کر دیتا ہے۔ تو اس کے قلب میں ان واردت کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ اس کو ان واردات میں اپنے رب کے ساتھ سچائی کم ہے۔

میں کہتا ہوں :- اسی طرح ان احوال کا استعمال کرنا ہے۔ جن کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا ظاہر کرنا ، قلوب کو مردہ کرتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے بیان کرنے میں نفس کا فائدہ ہے۔ کیونکہ نفس کی فطرت یہی ہے کہ وہ تعریف اور اچھے ذکر کو پسند کرتا ہے۔ اگر چہ وہ دوستوں اور بھائیوں ہی کی طرف سے ہو۔ اکثر تم دیکھتے ہو کہ بعض فقراء احوال کو بیان کرتے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ ہاں ، اگر لوگ اس کی پیروی کرتے ہوں اور وہ پیروی کرنے اور فقرا کو آگے بڑھانے کے لئے بیان کرے ، تو اس اچھی نیت کے ساتھ بیان کرنا بہتر ہے۔ اور اکثر یہ احوال سوال کرنے کی حالت میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے مصنفؒ نے اس کے فوراً ہی بعد سوال کا بیان کیا۔

یا تم اس طرح کہو :- چونکہ واردات الہیہ کا بیان کرنا ، ان امور سے ہے ، جو لوگوں کی توجہ ، اور تعظیم کا سبب بنتے ہیں۔ اور توجہ اور تعظیم اس درجے پر پہنچاتا ہے کہ لوگ نذرانہ پیش کریں۔ لہذا فقیر کو قبض کے آداب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا:

لَا تَـمُـدَّنَّ يَدَكَ اِلَى الْاَخْذِ مِنَ الْخَلَائِقِ اِلَّا اَنْ تَرٰى اَنَّ الْمُعْطِيَ فِيْهِمْ مَوْلَاكَ ، فَاِنْ كُنْتَ كَذَالِكَ فَخُذْ مَاوَافَقَكَ الْعِلْمُ

”تم مخلوق سے لینے کے لئے اپنا ہاتھ ہرگز نہ بڑھاؤ۔ مگر اس وقت جبکہ تم یہ دیکھو کہ ان کے لباس

میں دینے والا تمھارا مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا اگر تم اس مرتبہ پر پہنچ چکے ہو، تو اتنا لو، جتنا تم کو علم اجازت دے۔''

میں کہتا ہوں:- مخلوق سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھانے کی دو قسمیں ہیں:- ایک یہ کہ بغیر سوال کے ہو۔ دوسرا یہ کہ سوال کے بعد ہو اور دونوں قسموں میں سے ہر ایک کے لئے جدا جدا احکام ہیں۔

پہلی قسم، بغیر سوال کے لینا:- اس کے لئے دو شرطیں ہیں:- ایک علمی اور دوسرا صوفی۔ لہذا اگر عالم ہے، تو ان سے نہ لے، جن کی کمائی حرام ہے یا مخلوط ہے۔ یا جن کے مال میں تصرف کرنا منع کر دیا گیا ہے جیسے بچہ، پاگل، غلام،

اور اگر صوفی ہے۔ تو وہ اس وقت تک نہ لے، جب تک کہ علم اور حال سے ان کو پہچان نہ لے، جن سے لینا ہے۔ لہذا اگر صوفی کی معرفت وسیع ہو اور اس کی فنا اس طریقے پر قائم ہو گئی ہو، کہ اس کی نظر واسطے کی طرف نہ ہو۔ تو اکثر اوقات اس کے لئے قبض یعنی لینا بالکل درست ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیتا ہے۔ لیکن حقیقت اور شریعت کے درمیان جمع کرنا ہی کمال ہے۔ اور بہت سے محققین صوفیائے کرامؒ، بادشاہوں کے عطیات کو لے لیتے تھے۔ پھر ان کو اپنے ہاتھوں سے تقسیم کر دیتے تھے۔

دوسری قسم، سوال کے بعد لینا:- اس کے بارے میں دو طریقے پر کلام ہے۔

پہلا طریقہ:- یہ ہے کہ سوال کرنا، جائز ہے یا منع ہے۔ دوسرا طریقہ:- یہ ہے کہ لینے کے بعد وہ اس کو استعمال کرے یا نہ کرے۔

پہلا طریقہ سوال کرنے کا حکم:- اس کی اصلیت یہ ہے کہ سوال کرنا جائز ہے۔

وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ

''اور سائل (مانگنے والے) کو مت جھڑکو۔''

لہذا اگر سوال کرنا جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ سائل کو جھڑکنے سے منع نہ کرتا۔

اور سوال کی پانچ قسمیں ہیں:- واجب، مندوب، مباح، مکروہ، حرام۔

واجب سوال:- وہ، وہ ہے کہ جان بچانے کے لیے سوال کیا جائے۔ اس حال میں اگر سوال نہ کرے گا، تو مر جائے گا۔ لہذا اس حال میں سوال کرنا اس کے اوپر واجب ہے۔ لہذا اگر وہ سوال نہ کرے گا اور مر جائے گا۔ تو گنہگار ہو کر مرے گا۔ کیونکہ شارع علیہ الصلاۃ والسلام نے انسانی ظاہری زندگی کے فوت ہو جانے کے خوف سے سوال کو واجب کر دیا ہے۔ اور صوفیائے کرام نے بھی روحانی زندگی کے فوت ہونے کے خوف سے سوال کو واجب قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ سرداری اس کو اپنی روح کو فائدہ پہنچانے اور نفس کو مارنے سے روک دیتی ہے۔

چنانچہ حضرت قسطلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شرح بخاری شریف میں حضرت ابن العربی معافری سے نقل کیا ہے:- انھوں نے فرمایا ہے:- ابتدا میں مرید کے لئے سوال کرنا واجب ہے۔ تو حاصل یہ ہوا:- جب انسان کی ظاہری زندگی، یا روحانی زندگی کے فوت ہونے خطرہ ہو، تو سوال کرنا واجب ہے۔ اور حضرت ابن بناء نے اپنے ان اشعار میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:-

وَ مَا عَلَى السَّائِلِ مِنْ تَاوِيْلٍ لِاَجْلِ قَهْرِ النَّفْسِ وَالتَّذْلِيْلِ

''سائل کیلئے نفس کو مغلوب اور زلیل کرنے کی وجہ سے کوئی تاویل نہیں ہے۔''

فَمِنْ اَهْلِ الْاَذْوَاقِ الْاَحْوَالِ مَنْ كَانَ رَاضَ النَّفْسَ بِالسُّؤَالِ

''جس شخص نے نفس کو سوال کے ذریعہ فرماں بردار کر لیا ہے، وہ اہل ذوق واحوال سے ہے۔

قَالُوْا وَلَا خَيْرَ اِذًا فِيْ الْعَبْدِ مَا لَمْ يَكُنْ قَدْذَاقَ طَعْمَ الرَّدِّ

''بزرگوں نے کہا ہے:- بندے میں اس وقت تک کوئی کمال نہیں پیدا ہوتا ہے، جب تک وہ سوال کر رد کرنے کا مزہ نہ چکھے۔

حاصل یہ ہے:- کہ نفس کی ریاضت کے لئے سوال کرنا واجب یا مندوب ہے۔

حضرت ابراھیم خواص رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں ہزاروں درہم و دینار پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن وہ انھیں قبول نہیں کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات اپنے پہچاننے والے لوگوں سے ایک درم، دو درم مانگ لیتے تھے لیکن ایک، دو درم سے زیادہ نہیں مانگتے تھے۔

مندوب سوال :- وہ ہے۔ جو دوسروں کے لئے سوال کرے۔ اور یہ نیکی پر مدد'' کے سلسلے میں سے ہے۔ لہذا وہ لوگوں سے کھانا اس لئے مانگے ، تا کہ اس شخص کو کھلائے جو مانگنے سے شرماتا ہے۔ یا کپڑا مانگے۔ یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں مانگے۔ اور حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنے ان اصحاب کرام کے لئے سوال کیا ہے، جو آپ کے پاس ننگے آئے تھے۔ اور جو سوال نفس کی ریاضت کے لئے ہو، وہ مندوب میں داخل ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مکروہ سوال :- وہ ہے۔ جو بشری غذا کے لئے سوال کرے ، باوجودیکہ وہ اسباب میں سے کوئی سبب اختیار کر کے اپنی غذا حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اور یہ سوال اس حالت میں مکروہ ہے، کہ عبادت کے لئے اسباب سے علیحدہ اور ذکر کے لئے مجرد نہ ہوا ہو۔ لیکن جو شخص اللہ تعالےٰ کے لئے اسباب سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے سوال کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اور بہت سے عارفین محققین نے ایسا کیا ہے۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے شیخ حضرت ابوجعفر حداد رضی اللہ عنہ، ایک یا دو یا تین دروازوں پر مغرب وعشا کے درمیان مانگا کرتے تھے۔ پہلے عام لوگ ان کی اس حرکت پر تعجب کرتے تھے۔ پھر جب وہ اس معاملے میں مشہور ہو گئے۔ تو نہ عوام ان کے مانگنے کو معیوب سمجھتے تھے۔، نہ خواص اور وہ باوجود اپنے بزرگ مرتبہ ہونے اور اللہ تعالےٰ کی معرفت میں کامل ہونے کے مانگا کرتے تھے۔

اور حضرت ابوسعید خراز رضی اللہ عنہ :- جب ان کو سخت فاقہ کی نوبت آتی تھی تو دست سوال دراز کرتے تھے اور فرماتے تھے :- کون شخص ہے جو اللہ تعالےٰ کے لئے کچھ عنایت کرے۔

اور حضرت ابراھیم بن ادھم رضی اللہ عنہ :- بصرہ کی جامع مسجد میں معتکف تھے اور تین، تین دن پر افطار کرتے تھے۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد باہر نکلتے تھے اور دروازوں پر اپنے افطار کے لئے مانگ لیا کرتے تھے۔

اور حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ :- اللہ تعالےٰ کے لئے کھانا مانگا کرتے تھے۔ اگر کبھی زیادہ مل جاتا، تو اپنی ضرورت کے مطابق لے لیا کرتے، باقی چھوڑ دیا کرتے تھے۔

اور اکثر اولیاء اللہ نے باقی رہنے والی آخرت کو ترجیح دینے کی بنا پر، دنیائے فانی کو اسی حال میں گزارا ہے۔ اور یہ سب شریعت اور حقیقت میں نقص نہیں پیدا کرتا ہے۔ اور نہ معرفت کے نور کو بجھاتا ہے۔

اور حضرت ابن بناء نے سوال کی ان دونوں قسموں مندوب و مکروہ کی طرف اپنے حسب ذیل اشعار میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وَ كَرِهُوْا سُوَالَهٗ لِنَفْسِهٖ　　　ثُمَّ اَبَاحُوْهُ لِاَجَلِ نَفْسِهٖ

''اور عارفین نے اپنے ذات کے لئے فقیر کے سوال کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لیکن اپنے ہم جنس یعنی دوسرے لوگوں کے لئے اس کے سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔''

وَ لَمْ يَعُدُّوْهُ مِنَ السُّؤَالِ　　　لٰكِنْ مِنَ الْعَوْنِ عَلَى الْاَعْمَالِ

''بلکہ عارفین نے دوسرے لوگوں کے لئے سوال کرنے کو سوال میں نہیں شمار کیا ہے۔ بلکہ اس کو اعمال پر مدد کی قسم میں شمار کیا ہے۔

اِذْ كَانَ خَيْرُ الْخَلْقِ فِي اَتْرَابِهٖ　　　يَسْاَلُ اِحْسَاناً اِلٰى اَصْحَابِهٖ

''اس لئے کہ تمام مخلوق سے افضل حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنے اصحاب کرام کے لئے چندہ طلب فرمایا کرتے تھے۔

مباح سوال:۔ وہ ہے کہ غیر ضروری حاجت کو پورا کرنے کے لئے سوال کرے۔ جیسے کہ اپنا قرض ادا کرنے کے لئے سوال کرے، یا اپنی ستر پوشی اور جان بچانے کے لئے جتنی ضرورت ہو، اس سے زیادہ سوال کرے یا ان کے سوا وہ چیزیں مانگے، جو اس کی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہیں، مگر اس کو اُن چیزوں کی حاجت ہے۔

حرام سوال:۔ وہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مانگے۔ حدیث شریف میں ہے:۔

مَنْ لَهٗ اَرْبَعُوْنَ دِرْهَمًا فَالسُّؤَالُ عَلَيْهِ حَرَامٌ

''جس شخص کے پاس چالیس درم ہوں۔ اس کے لئے سوال کرنا حرام ہے۔'' اور اسی کے متعلق یہ حدیث شریف بھی وارد ہے:۔

إِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ

''جس کے لئے مانگنا حرام ہے۔ ایسا مانگنے والا قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

اور گڑگڑا کر اور ضد کر کے مانگنا بھی حرام ہے اور اِس طرح مانگنا بھی حرام ہے کہ جس سے مانگا ہے۔ اس کو نقصان پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً

''وہ لوگوں سے اصرار اور ضد کے ساتھ نہیں مانگتے ہیں۔''

میں کہتا ہوں:- بعض صوفیائے کرام جو گڑگڑانے اور ضد کرنے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ دینے والوں کی سخت و ناگوار باتیں سن کر اپنے نفس کو مار ڈالیں اور ایسا وہ صرف انھیں لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں، جن کو وہ پہچانتے ہیں کہ وہ دینے سے انکار کریں گے۔ اس لئے وہ اپنے نفس کے امتحان اور درستی کے لئے دینے والوں سے سخت اور ناگوار باتیں نکلواتے ہیں۔ اور کبھی اس طرح کرنے سے ان کا ارادہ، اخلاص کا ثابت کرنا اور اپنے حال کا چھپانا ہوتا ہے۔ لہذا وہ رغبت اور خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کو کافی سمجھنے کی بنا پر تمام لوگوں سے زیادہ زاہد اور تارک الدنیا ہوتے ہیں۔

اور یہ سب، عارفین سے قوت اور جذب کے حال میں ہوتا ہے۔ جبکہ سکر یعنی مدہوشی ان پر غلب ہوتی ہے۔

یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے۔ سب ان حضرات سے تحقیق کر کے بیان کیا ہے۔ اور یہ سب حالتیں اس زمانہ میں ختم ہو چکے ہیں۔ کیونکہ اب صرف اہل صفا اور اہل وفا باقی رہ گئے ہیں۔ اور صوفیائے کرام کے طریقے میں سوال کے شامل ہونے کا سبب یہ ہے:-

ہمارے شیخ الشیوخ سیدی علی الجمل عمرانی رضی اللہ عنہ کو فاس میں مرتبہ اور وزارت، اور ریاست حاصل تھی۔ جب وہ شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور حضرت شیخ نے ان کی سچائی اور ریاضت کو دیکھا۔ تو ان سے فرمایا:-

میں آپ کے اندر ایک ایسا جذبہ اور نشہ دیکھتا ہوں، جو آپ سے پہلے کسی دوسرے شخص میں میں نے نہیں دیکھا۔ اور اگر میں آپ کے اندر صدق و ریاضت نہ پاتا تو طریقت کی طرف آپ کی رہنمائی نہ کرتا۔ حضرت شیخ علی نے دریافت کیا :- یا حضرت ، وہ کیا ہے؟ حضرت شیخ نے فرمایا:- وہ بازار میں مانگنا ہے۔ میں نے ان کے متعلق اسی طرح اپنے بعض برادران طریقت سے سنا ہے۔

لیکن جو میں نے ان کی کتاب میں دیکھا، وہ یہ ہے حضرت شیخ نے ان سے فرمایا:- اے صاحبزادے! میں دیکھتا ہوں کہ تم یہ علم حاصل کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تم جو اس علم تصوف کا ارادہ رکھتے ہو۔

تو یہ بغیر رہنمائی کرنے والے پیر و مرشد کے تم حاصل نہ کر سکو گے۔ لہذا وہ ان کی بیعت میں داخل ہو کر علم تصوف حاصل کرنے لگے۔ اور اپنی موت تک تصوف ہی میں ثابت قدمی سے قائم رہے۔ پھر جب انھوں نے اس کے سر کا مزہ چکھا اور ان اسرار کو پایا جو اس کے اندر ہیں۔ اور ان منزلوں اور مقاموں کو طے کیا جو مرید اپنی سیر میں کرتا ہے۔ تو انھوں نے اپنے مریدین کو اس کی سیر کرائی اور اس پر عمل کرنے کے لئے ان کی رہنمائی کی۔

لہٰذا سوال کے جائز ہونے کی بنیاد:- نفوس کو مارنا ہے۔ نہ کہ روپیہ، پیسہ حاصل کرنا۔ اس لئے جس شخص نے نفوس کے مارنے کے لئے سوال پر عمل کیا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ صرف نفوس کے زندہ رہنے ہی نے ہم کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے محجوب کیا ہے۔

اور جو شخص روپیہ، پیسہ حاصل کرنے کے لئے سوال کرتا ہے۔ وہ بدبختی اور تنگدستی میں مبتلا ہوتا ہے۔

اور مانگنے کی حالت میں سائل کے لئے مناسب یہ ہے:- ہاتھ سے مخلوق کی طرف اشارہ کرے اور اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ مباحث میں فرمایا ہے:-

وَ اٰدَابُ الصُّوْفِیْ عِنْدَ الْمَسْئَلَۃِ ۔ اَنْ یَّدْخُلَ السُّوْقَ اِلَیْہِ یَسْاَلَہٗ

”اور سول کرنے کے وقت صوفی کے آداب یہ ہیں کہ وہ بازار میں داخل ہو کر لوگوں سے سوال کرے۔

لِسَانُهٗ يُشِيْرُ نَحْوَ الْخَلْقِ وَ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْحَقِّ

''اس کی زبان مخلوق کی طرف اشارہ کرے اور اس کا قلب اللہ تعالٰے کی طرف متوجہ ہو۔''

اور حضرت ابن لیون تجیبی نے سوال اور اس کی اصلیت کو بیان فرمایا ہے۔ اور زنبیل کے مسئلے کو بھی بیان فرمایا ہے۔

زنبیل کا طریقہ اس طرح بیان کیا ہے:- پہلے وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر زنبیل یعنی برتن اپنے داہنے ہاتھ میں لے اور بازار میں نکل جائے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی ہو۔ وہ اللہ تعالٰے کا ذکر کرے اور آدمیوں کا ذکر کرے۔ لوگ جو کچھ دیں وہ زنبیل میں رکھتا جائے۔ یہاں تک کہ جو کچھ میسر ہو، وہ سب درویشوں کے سامنے رکھ دے۔ پھر سب مل کر بغیر تکلیف اور زحمت کے یہ حلال کھانا کھائیں۔

سوال کے حکم کے بارے میں جو کچھ ہم کو معلوم ہوا، وہ میں نے بیان کیا ہے۔

اور اب اس زمانہ میں جو حال ہمارے سامنے ظاہر ہے۔ اس حال میں سوال کا ترک کر دینا، سوال کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اب سوال کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ اور دوسرے پیشوں کی طرح مانگنا بھی ایک پیشہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت سے فقیروں کا نفس اس کی طرف بڑھتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس میں نفس کا فائدہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور سوال کرنے میں جو کچھ ملے۔ اگر فقیر اس کا محتاج ہو، تو خود اس کو لے لے اور اگر اسکو اس کی ضرورت نہ ہو، تو وہ اس کو پوشیدہ طور پر رات میں صدقہ کر دے۔

اور ہمارے شیخ الشیوخ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔ سوال کرنے سے ہمارا مقصد ارواح کی غذا ہے۔ تو اگر اس سے اجسام کی غذا بھی نکل آئے، تو ''تبارک اللہ'' یعنی جس شخص کو اس کی حاجت ہو، وہ اس کو اپنے استعمال میں لائے۔ وباللہ التوفیق۔

اور حکمت جس کو حضرت مصنفؒ نے بیان فرمایا ان اہم حکمتوں میں سے ہے، جن کی اہل تجرید کو حاجت ہوتی ہے۔

اور مصنفؒ کا مقصد سوال پر بحث کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد، یقین کی تربیت اور مخلوق

سے بے توجہی کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ لہذا سائل کا قلب مخلوق سے وابستہ نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اگر اس کا قلب مخلوق کی طرف متوجہ ہو، تو اس کو وہ چیز نہ لینی چاہئے۔ جو اس کو دی جا رہی ہے۔ اور جب تک وہ یہ نہ سمجھے کہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس وقت تک مخلوق سے لینے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھائے۔ اور یہ سمجھ ذوق اور حال سے پیدا ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں:- یہ شرط صرف ان چیزوں میں ہے، جن کو وہ بغیر سوال کے لیتا ہے۔ لیکن سوال کی حالت میں یہ معرفت شرط نہیں ہے۔ بلکہ سوال علم اور مجاہدہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ تا کہ وہ ذوق بن جائے۔ لیکن جو چیزیں بغیر سوال کے ملے، اس کے لینے میں یہ معرفت ضروری ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

یہ معرفت شرط نہیں ہے کہ دینے والا فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔ بلکہ صرف اس بات کا علم کافی ہے اور یہی صحیح ہے کہ وہ اسوقت تک لوگوں سے لے سکتا ہے، جب تک اس کے نفس کی توجہ مخلوق کی طرف نہ ہو۔ لیکن اگر اس کا نفس مخلوق کی طرف متوجہ ہو، تو اس کو چاہئے کہ مخلوق سے لینے سے باز رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ضمانت کو کافی سمجھے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا

''اور زمین میں کوئی چلنے والا جاندار نہیں ہے، مگر اس کی روزی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔''

اک عارف سے دریافت کیا گیا:- آپ نے دنیا کو کیسے ترک کیا۔ جبکہ پہلے دنیا آپ کے پاس تھی اور آپ اس میں مشغول تھے؟ انھوں نے جواب دیا:- میں نے اللہ تعالیٰ کی اس آیۂ کریمہ کے مفہوم میں انصاف کے ساتھ غور وفکر کیا:-

وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا

تو میں نے تمام مخلوقات کو، مچھر سے لے کر ہاتھی تک دیکھا، کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی روزی کا ضامن ہے۔ لہذا میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اور اس کی عبادتمیں مشغول ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے:- تم لوگ روزی کی فکر نہ کرو۔ کیونکہ ایک بچے کو چھوٹا ہونے کے باوجود ہر روز روزی ملتی ہے۔ یہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے:- مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو دنیا کے لئے عمل (محنت و مشقت دوڑ دھوپ) کرتا ہے۔ حالانکہ وہ دنیا میں بغیر کسی عمل کے روزی پاتا ہے۔ اور آخرت کے لئے عمل نہیں کرتا ہے۔ حالانکہ آخرت کی روزی (عمل کا ثواب) عمل کے بغیر نہیں ملے گی۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

مَنْ كَانَ هَمُّهُ الْاٰخِرَةُ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ ، وَ اَتَتْهُ الدُّنْيَا وَ هِيَ رَاغِمَةٌ وَ مَنْ كَانَ هَمُّهُ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ ، وَ لَمْ يَاْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَهُ ، وَ اَنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ كَمَا يَطْلُبُهُ

”جو شخص آخرت کے لئے ارادہ، اور فکر و عمل کرتا ہے۔ اس کے قلب میں اللہ تعالیٰ اپنی غنا و بے نیازی پیدا کر دیتا ہے۔ اور دنیا اس کے پاس ذلیل اور عاجز ہو کر آتی ہے۔ اور جو شخص دنیا کے لئے ارادہ اور فکر و عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی محتاجی، اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اس کو دنیا میں سے اتنا ہی ملتا ہے، جتنا اس کیلئے مقدر ہو چکا ہے۔ اور روزی بندے کو اسی طرح تلاش کرتی ہے، جس طرح بندہ روزی کو تلاش کرتا ہے۔“

حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے تھے:- ایسے قلب کو حکمت یعنی معرفت حاصل نہیں ہوتی، جس میں تین خصلتیں ہوں:-

اول:- روزی کی فکر۔ دوم:- مخلوق سے حسد۔ سوم:- مرتبہ کی خواہش۔

حضرت حبیب عجمی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت حبیب عجمیؒ نے اپنے اور حضرت حسن بصریؒ کے افطار کے لئے کھانا تیار کیا۔ ناگاہ ایک سائل ان کے پاس آ گیا۔ حضرت حبیب عجمیؒ نے سب کھانا اس سائل کو دے دیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا:- اے حبیب! تمہارا یقین زیادہ اور علم کم ہے۔ تمہیں سائل کو آدھا کھانا دینا چاہئے تھا۔ باقی آدھا ہم اور تم کھاتے۔ حضرت حبیب عجمیؒ نے عرض کیا:- یا حضرت! اس کا ثواب آپ کے لئے ہے۔ اور میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔ جب رات ہوئی تو دروازہ

کھٹکھانے کی آواز آئی۔ حضرت حبیبؒ باہر نکلے، تو دیکھا کہ ایک غلام بہت سا کھانا لئے ہوئے سخت سردی میں کھڑا رو رہا ہے۔ حضرت حبیبؒ نے دریافت کیا:- یہ کیا ہے؟ غلام نے کہا:- یہ کھانا ہے۔ میرے آقا نے مجھ سے کہا ہے:- اگر یہ کھانا تمھارے ہاتھ سے حضرت حسن بصریؒ نے قبول کر لیا، تو میں تم کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے آزاد کر دوں گا۔ میں بہت دنوں سے اس کی غلامی کر رہا ہوں۔ حضرت حبیب نے فرمایا:- لا الہ الا اللہ، غلام کو آزاد کرنا، اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔ پھر اس غلام کو ساتھ لے کر حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا:- یا حضرت! بیشک آپ کا علم زیادہ اور یقین کم ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا:- اے حبیب! تم ہم سے آگے بڑھ گئے۔

میں کہتا ہوں:- ہمارے شیخ الشیوخ سے بھی اسی قسم کے واقعہ کی حکایت ہے۔ جو مجھ سے ان کی بعض مریدین نے بیان کیا۔ میں نے ان سے مزید تحقیق کے لئے پھر دریافت کیا انھوں نے فرمایا:- یہ واقعہ صحیح ہے۔

اور وہ واقعہ اس طرح ہے:- ان کے گھر والوں نے بہترین کھانا تیار کیا۔ جب کھانا سب کے سامنے رکھا گیا، تو اچانک ایک سائل سامنے آ کر سوال کرنے لگا۔ حضرت شیخ نے سب کھانا اٹھا کر سائل کو دے دے۔ اور ان کے اہل وعیل سب بھوکے رہ گئے۔ نماز عشا کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ حضرت شیخ باہر نکلے تو دیکھا:- ایک شخص ہے، اس کے ساتھ ایک خوانچہ ہے۔ جس میں بہت قسم کے کھانے ہیں۔ حضرت اس کھانے کو لے کر اپنے اہل وعیال کے پاس تشریف لے گئے۔

ایک دولت مند آدمی نے بیان کیا ہے:- میں سو رہا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا:- ایک آدمی میرے پاس کھڑا کہہ رہا ہے:- مظلوم کی فریاد رسی کرو۔ میں خوفزدہ ہو کر بیدار ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ ڈالا:- میں نے ایک تھیلی میں ایک سو دینار لیا۔ اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا لگام چھوڑ دیا۔ وہ گھوڑا مجھے لے کر آبادی سے باہر نکلا اور ایک ویران مسجد کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا۔ میں گھوڑے سے اتر کر مسجد داخل ہوا۔ میں نے

دیکھا کہ ایک مسکین اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کرتے ہوئے اس کا فضل مانگ رہا ہے۔ میں نے اس مسکین سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا :- میں صاحب عیال ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ انھوں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگ رہا ہوں۔ میں نے وہ سو دینار، جو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کو دیا۔ اور اس سے کہا:- جب یہ ختم ہو جائیں، تو مجھ سے پھر مانگنا۔ میں فلاں شخص ہوں۔ تم میرے پاس چلے آنا۔ اس نے کہا:- ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ کی قسم، میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ مانگوں گا۔ پھر میں اللہ تعالیٰ پر اس کے کامل اعتماد سے تعجب کرتا ہوا واپس آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک شخص کی حکایت ہے۔ جو اللہ رب العالمین کے ساتھ یقین کو مضبوط کرتی ہے۔ اور اعتماد کامل کا سبب بنتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بندہ اس بات پر شرم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے۔ تو پھر غیر اللہ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنے میں تو وہ بہت ہی زیادہ شرم کرے گا۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے قول میں بیان فرمایا ہے:-

رُبَّمَا اسْتَحْیَ الْعَارِفُ اَنْ یَّرْفَعَ حَاجَتَہٗ اِلٰی مَوْلَاہُ اِکْتِفَاءً بِمَشِیْئَتِہٖ ، فَکَیْفَ لَا یَسْتَحْیِ اَنْ یَّرْفَعَ اِلٰی خَلِیْقَتِہٖ

”اکثر اوقات عارف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنے سے شرم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی مشیت کو کافی سمجھتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنے میں وہ کیوں نہ شرم کرے گا؟“

میں کہتا ہوں:- عارف:- وہ ہے۔ جو تقریب اور قرب کے اس مقام پر پہنچ گیا ہو، کہ وہ اپنے نفس سے بالکل فنا ہو گیا ہو۔ اور اس سے اینیت اور غیریت اس طرح مٹ گئی ہو، کہ اس کو اپنے وجود کی خبر نہ ہو اور اس کو اپنے مولائے حقیقی کے سوا کسی کے ساتھ قرار نہ ہو۔ لہٰذا جب وہ عبودیت کو طلب کرتا ہے۔ تو وہ اپنے مولائے حقیقی سے اس بات پر شرم کرتا ہے، کہ اس کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرے۔ تو پھر اس کے غیر کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنے میں وہ کیوں شرم نہ کرے گا؟ اور ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل چیز عطا فرماتا ہے، جو وہ مانگنے

والوں کو دیتا ہے۔ اور پھر اس کو صدق کے مقام میں انبیاء علیھم السلام اور صدیقین رضی اللہ عنھم کے ساتھ قائم کرتا ہے۔

اور اس سے پہلے یہ حدیث شریف گزر چکی ہے:-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- جس شخص کو میرے ذکر کی مشغولیت مجھ سے مانگنے سے غافل کر دیتی ہے۔ میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر اور زیادہ عطا کرتا ہوں۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا ہے:- اللہ تعالیٰ ہر وقت اپنے بندوں کے قلوب سے باخبر رہتا ہے۔ تو جب کوئی قلب اپنی حاجت کے لئے اس کے غیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر شیطان کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور اپنے سے اس کو محجوب کر دیتا ہے۔

حضرت واسطی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا:-

آپ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز کیوں مانگتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:- میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ مجھ سے یہ کہا جائے:- اگر تم ہم سے وہ چیز مانگتے ہو، جو ہم نے تمھارے لئے پہلے ہی مقدر کر رکھا ہے۔ تو تم ہمارے اوپر اتہام لگاتے ہو۔ اور اگر تم ہم سے وہ چیز مانگتے ہو، جو ہم نے تمھارے لئے مقدر نہیں کیا ہے، تو تم ہمارے ساتھ بے ادبی کرتے ہو۔ اگر تم اپنا معاملہ ہمارے سپرد کر دیتے اور ہماری نظر پر اعتماد کرتے، تو ہم تمھارے تمام معاملوں کو اپنی منشا کے مطابق بحسن وخوبی انجام دیتے۔ یہاں بیسواں باب ختم ہوا۔

اس باب کا حاصل:-

کرامات اور کرامات سے پیدا ہونے والی عبارت کو بیان کرنا ہے۔ کیونکہ حقیقی کرامات:- عبودیت پر استقامت اور ربوبیت کے انوار کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اور جب استقامت اور مشاہدہ ولی کے اندر ثابت وقائم ہو جاتا ہے۔ تو وہ حکمت یعنی معرفت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اور اس کو بیان کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اس وقت اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ مخلوق نذرانے اور عطیات لے کر اس کے سامنے آتی ہے۔ تو اگر وہ ان نذرانوں کے اندر اپنے مولائے حقیقی کی معرفت حاصل کرے، تو اس کے لئے مخلوق سے ہدیہ و نذرانہ لینا درست ہے اور اگر یہ معرفت اس کو حاصل نہیں ہے، تو اس کا لینا درست

نہیں ہے۔

اور بشریت کی غذا کے لئے مخلوق سے مانگنا، عارفین کے لئے ایسا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس لئے کہ وہ اللہ تعالےٰ سے بھی مانگنے سے شرم کرتے ہیں اور اس کے علم اور مشیت کو کافی سمجھتے ہیں۔اور یہ واصلین کا مقام ہے۔

اور سائرین اپنے نفوس کے مجاہدے اور ریاضت میں مشغول رہتے ہیں۔لہذا اگر ان کے نفوس پر سوال گراں گزرے،تو وہ سوال کی طرف بڑھیں۔اور اگر ان کے نفوس پر فاقہ اور صبر اور مشیت اور علم کو کافی سمجھنا گراں ہو،تو وہ فاقہ اور صبر اور مشیت اور علم الٰہی کو کافی سمجھنے کی طرف بڑھیں۔

جیسا کہ مصنف رضی اللہ عنہ نے اکیسویں باب کی ابتدا میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

اکیسواں باب

درست اور ناقص اعمال اور احوال کے میزان کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اِذَا الْتَبَسَ عَلَیْکَ اَمْرَانِ فَانْظُرْ اَثْقَلَھُمَا عَلَی النَّفْسِ فَاتَّبِعْہُ فَاِنَّہٗ لَا یَثْقُلُ عَلَیْھَا اِلَّا مَا کَانَ حَقًّا

''جب دو چیزیں تمھارے لئے متشابہ ہوجائیں، (یعنی دو چیزوں میں حق پوشیدہ ہوجائے) تو تم یہ دیکھو کہ دونوں چیزوں میں سے تمھارے نفس پر کون زیادہ گراں (ناگوار) ہے۔ جو زیادہ گراں ہو، اسی پر عمل کرو۔ کیونکہ نفس پر وہی چیز گراں ہوتی ہے، جو حق ہوتی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- جو سائرین جہاد اکبر میں مشغول ہیں، ان کے لئے یہ بالکل درست میزان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ

''تم لوگ اللہ کی راہ میں جہاد (جدوجہد) کرو۔ جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا

''جو لوگ ہمارے راستے میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم اپنے راستوں کی طرف ان کی ہدایت و رہنمائی کرتے ہیں (یعنی ہم ان کو اپنے راستوں پر چلاتے ہیں۔''

لہذا ہر وہ شی جو مرید کے نفس پر گراں گزرے اور اس کا نفس اس سے نفرت کرے، وہی حق ہے۔ اور

مرید کے اوپر اس کی پیروی واجب ہے۔یعنی مرید کو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔) اور جو شی مرید کے نفس کو آسان اور ہلکا معلوم ہو، وہ باطل ہے۔اور اس میں نفس کا فائدہ ہے۔لہذا مرید کے لئے اس سے پرہیز کرنا واجب ہے اور اس معاملے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔کیونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے، کہ ایک نفس پر ایک شی گراں ہوتی ہے اور دوسرے نفس پر وہ گراں نہیں ہوتی ہے۔کسی نفس پر خاموشی گراں و ناگوار معلوم ہوتی ہے۔اور کسی نفس پر گفتگو کرنا، گراں گزرتا ہے۔مثلاً اس صورت میں جبکہ انکی تربیت خاموشی میں کی گئی ہو۔

بعض نفس ایسے ہوتے ہیں جن پر گوشہ نشینی گراں گزرتی ہے۔اور بعض لوگوں سے ملنا جلنا ناگوار ہوتا ہے۔کسی نفس کے لئے روزہ رکھنا شاق گزرتا ہے اور کسی نفس کے لئے افطار کرنا۔کسی نفس کے لئے مانگنا، اتنا گراں اور شاق ہوتا ہے۔کہ وہ سوال کرنے کے ساتھ ہی مر جاتا ہے۔اور کسی نفس کے لئے مانگنا آسان ہوتا ہے۔جیسا کہ اس کے لئے جس کو مانگنے کا حکم ملنے سے پہلے ہی مانگنے کی عادت رہی ہو۔اسی پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کرو۔

لہذا بندے کو ہوشیاری کے ساتھ اپنے نفس کی نگرانی کرتے رہنا چاہئے۔اور اس کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف معاملہ کرنا چاہئے۔اسی طرح ہمیشہ ہر معاملے میں اس کے حکم (خواہش) کی مخالفت کرتا رہے۔اور ان تمام معاملات میں اس کو ملامت کرتا رہے، جن کو وہ بہتر شکل میں پیش کرتا ہے۔

پھر جب نفس محسوس ظاہر سے پاک وصاف ہو جائے۔اور اس میں ظاہر کا ایک ذرہ بھی باقی نہ رہے، اس وقت بندے پر اس کی موافقت کرنی واجب ہے۔اس لئے کہ اب اس کے اندر صرف اللہ تعالیٰ کی تجلی جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اب اس آیہ کریمہ کا مصداق ہے :-

جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔"

لہذا عارف کا معاملہ سائر کا برعکس ہوتا ہے۔سائر کو تدبیر واختیار نقصان پہنچاتے ہیں اور عارف کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔سائر کے لئے لوگوں سے ملنا جلنا مضر ہے اور عارف کے لئے مفید ہے۔سائر

کے لے کلام نقصان دہ ہے۔اور عارف کے لئے نفع بخش۔سائر کو دنیا نقصان پہنچاتی ہے۔اس لئے اس سے بھاگتا ہے۔اور عارف دنیا سے غائب ہوتا ہے۔اس لئے دنیا اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔بلکہ اکثر اوقات اس کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

حاصل یہ ہے:-عارف اپنے تمام معاملات میں سائر کے برعکس ہے۔

و باللہ التوفیق

اور جو شخص اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا چاہتا ہے،اس پر واجب ہے کہ اپنے نفس کو تربیت کرنیوالے شیخ کے سپرد کردے۔کیونکہ اس کے نفس کے معاملات اس سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔اور بالفرض اگر اس کو ان چیزوں کا علم بھی ہو،جو نفس کو گراں و ناگوار معلوم ہوتی ہے۔لیکن پھر بھی وہ شیخ کی ہمت کے بغیر اپنے نفس سے جہاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔اللہ تعالےٰ کی یہی سنت اپنے بندوں میں جاری ہے۔کیونکہ نفس اپنی رائے اور خواہش سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتا ہے۔لہذا جو شخص نفس سے جہاد کرنے میں بندے کی مدد کرتا ہے،بندے پر واجب ہے کہ نفس کو اس کا فرماں بردار بنادے۔اور اگر تم شرعی تکلیفات میں غور کرو۔تو تم ان کو نفس کے خلاف پاؤ گے۔اور جو شخص اپنی قیادت شریعت کے حوالے نہیں کرتا ہے۔وہ کافر ہے اور جو شخص بھی کافر ہوا ہے وہ خوہشات کی پیروی سے کافر ہوا ہے۔ واللہ اعلم

اور اس جگہ ایک دوسرا میزان بھی ہے۔جس کے ذریعے تم اس عمل کو جس میں نفس کا فائدہ ہے اور اس عمل کو جس میں نفس کا فائدہ نہیں ہے،پہچان سکتے ہو۔اور وہ میزان یہ ہے:-

کوئی بھی عمل ہو۔تم اس میں مشغول رہتے ہوئے نفس کے سامنے موت کو پیش کرو۔اگر نفس اس عمل میں مشغول رہتے ہوئے موت کے لئے راضی ہوجائے۔تو سمجھو! یہ عمل درست ہے اور اگر نفس اس عمل میں مشغول رہتے ہوئے موت کے لئے راضی نہ ہو۔تو سمجھ لو! یہ عمل باطل ہے یعنی اس میں نفس کی خواہش اور اس کا فائدہ ہے۔

اسی طرح انسان اس میزان پر اپنے نفس کو وزن کرے۔تاکہ وہ یہ معلوم کرسکے کہ وہ اس عالم سے سفر کر چکا ہے۔یا ابھی اسی عالم میں باقی ہے۔لہذا آرام اور بھلائی کی حالت میں وہ اپنے

نفس پر موت کو پیش کرے۔ اگر اس کا نفس موت کو قبول کرے اور اس سے پیچھے نہ ہٹے۔ تو اس کو معلوم کر لینا چاہئے کہ وہ یقیناً اس عالم سے کوچ کر چکا ہے۔ اور اگر اس کا نفس موت کو نہ قبول کرے اور زندگی چاہے تو اس کو سمجھنا چاہئے! اس عالم میں اس کا نفس اتنا ہی باقی ہے، جتنا وہ موت سے بھاگتا ہے۔ وباللہ التوفیق

پھر مصنفؒ نے دوسرا میزان بیان فرمایا:- جس کے ذریعے خواہش کی پیروی میں حق و باطل کو پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

مِنْ عَلَامَةِ اِتِّبَاعِ الْهَوٰى اَلْمُسَارَعَةُ اِلٰى نَوَافِلِ الْخَيْرَاتِ ، وَالتَّكَاسُلُ مِنَ الْقِيَامِ بِالْوَاجِبَاتِ

''خواہش کی پیروی کی علامتوں میں سے نفل عبادتوں کی طرح بڑھنا ہے اور فرائض اور واجبات کے ساتھ قائم ہونے سے سستی اور غفلت کرنی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- حق و باطل کو پرکھنے کے لئے یہ دوسرا میزان ہے۔

اور اگر تم چاہو تو اس طرح کہہ سکتے ہو:- یہ پہلے میزان میں داخل ہے۔ کیونکہ نفس کی شان یہ ہے کہ اس پر واجب گراں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اور چونکہ فرائض اور واجبات کو بہت سے لوگ ادا کرتے ہیں، اس لئے نفس کو اس کے ادا کرنے میں دوسرے لوگوں پر فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ خصوصیت تلاش کرتا ہے:-

بخلاف نوافل کے کہ نفس ان کی طرف دوڑتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ان کو تنہا ادا کرے۔ اور اس کو نوافل کے ادا کرنے میں، یا تو مدح وثنا کی خواہش ہوتی ہے یا حور وقصور کی اجر طلب کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھتا ہے اور یہ سب کا سب محققین عارفین کے نزدیک، نفس کے ظاہری اور پوشیدہ فوائد میں سے ہیں۔ لہذا نفل نیکیوں اور عبادتوں کے فضائل کی طرف بڑھنا فرائض اور واجبات سے غفلت اور کاہلی کرنے کے باوجود، خواہش نفسانی کی علامات میں سے ہے۔ لہذا فرائض اور واجبات کو مقدم رکھنا، انسان پر واجب ہے اور فرائض پر انھیں سنتوں اور نفلوں کو مقدم کرے، جو

فرائض کو کامل کرنے کے لئے ہیں:- جیسا کہ فرض سے پہلے اور اس کے پیچھے جو نفلیں مقرر کی گئی ہیں وہ صرف اس لئے ہیں کہ ان سے فرائض میں حضور قلب حاصل ہونے میں مدد ملے۔ کیونکہ اگر حضور قلب حاصل ہو جائے، تو انسان وسیلے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اور ہمارے نزدیک سب سے بڑی نفل عبادت:- فکر و نظر کے درمیان اپنے مولائے حقیقی کے مشاہدہ میں غرق ہو جانا ہے۔ یا اس مذاکرہ، یا ذکر میں غرق رہنا ہے، جو مشاہدہ کے مقام تک پہنچاتا ہے۔

لہذا جس نے دنیا کو پورے طور پر چھوڑ دیا اور اپنے نفس اور جنس سے غائب ہو گیا۔ اس نے کل فرائض اور نوافل کو جمع کر لیا۔ اگر چہ اس نے رات سو کر، اور دن کھا کر گزارا ہو۔

بعض اخبار میں سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق منقول ہے۔ انھوں نے عرض کیا:- اے میرے رب! میں تجھ کو کہاں تلاش کروں؟ اللہ تعالےٰ نے ان سے فرمایا:- اپنے نفس کو چھوڑ دو۔ اور میرے پاس آ جاؤ۔ یعنی تم اپنے نفس سے گم ہو جاؤ تو مجھ کو اپنے نفس سے بھی زیادہ اپنے قریب پاؤ گے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

تم صرف ایک ورد اپنے اوپر لازم کرو۔ اور وہ ورد:- خواہش نفسانی کو ختم کر کے مولائے حقیقی سے محبت کرنی ہے۔

و باللہ التوفیق

اور چونکہ عبادتوں سے غفلت اور سستی کرنا، نفس امارہ کی شان ہے اس لئے اللہ تعالےٰ نے عباتوں کے لئے وقت مقرر کر دیا۔ جیسا کہ حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

قَيَّدَ الطَّاعَاتِ بِاَعْيَانِ الْاَوْقَاتِ ، لِئَلَّا يَمْنَعَكَ عَنْهَا وُجُوْدُ التَّسْوِيْفِ ، وَوَسَّعَ عَلَيْكَ الْوَقْتَ لِيَبْقٰى لَكَ حِصَّةُ الْاِخْتِيَارِ

''اللہ تعالےٰ نے عبادتوں کو مقررہ اوقات کے ساتھ مقید کر دیا۔ تا کہ ٹال مٹول اور کاہلی تم کو عبادت

سے نہ روک دے۔ اور تمھارے لئے عبادتوں کے ادا کرنے کے وقت کو وسیع کر دیا۔ تا کہ تمھارے لئے اختیار باقی رہے۔''

میں کہتا ہوں:۔ عمل میں سستی اور ٹال مٹول کرنا، اور لمبی امید باندھنا، نفس کی شان ہے۔ تو اگر اس کو اس کے اختیار کے ساتھ چھوڑ دیا جائے، تو وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ اور چونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کو یہ علم ہے، کہ اس کے بندوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کو صرف محبت نہیں ابھارتی ہے اور صرف رغبت ان کو نہیں کھینچتی ہیں۔ بلکہ ان کو صرف دوزخ کا خوف اور امتحان کی زنجیریں اللہ تعالیٰ کی طرف کھینچتی ہیں۔ یا جنت کی نعمت کے حرص کا جال، اللہ تعالیٰ کی طرف کھینچتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طاعت س پھر گیا، اس کے لئے اس نے دردناک عذاب کی وعید فرمائی۔ اور جس شخص نے اس کی اطاعت کی اور اس کا قرب حاصل کیا۔ اس کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتوں کا وعدہ فرمایا۔ پھر وہ احکام اور فرائض ان کے اوپر واجب کئے، جن میں اس کی اطاعت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر ان کے ادا کرنے کے لئے مخصوص وقت مقرر فرمایا۔ کیونکہ اگر وہ ان کو اپنے بندوں کا اختیار پر چھوڑ دیتا، تو فرائض و احکام کے ادا کرنے کے ساتھ بہت ہی کم لوگ یعنی صرف شوق و محبت والے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کہ اس نے عبادتوں کے لئے مخصوص اوقات کو وسیع فرما دیا۔ اس طرح بندوں کے لئے اختیار کا حصہ باقی رہ گیا۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے ظہر کے وقت کو عصر تک اور عصر کے وقت کو سورج کے زرد ہونے تک اور مغرب کے وقت کو عشا تک اور عشا کے وقت کو آدھی رات تک اور فجر کے وقت کو طلوع آفتاب کے قریب تک وسیع کر دیا۔

اے بندو! اللہ تعالیٰ نے ان عبادتوں کو جو تمھارے اوپر واجب کیا ہے، مقررہ اوقات کے ساتھ مقید کر دیا۔ تا کہ کاہلی اور ٹال مٹول تم کو عبادتوں کے ادا کرنے سے روک نہ دے۔ پھر تم کو اس حد تک نہ پہنچا دے کہ تم عبادتوں کو بالکل چھوڑ دو۔ اور عبادتوں کے اوقات کو تمھارے لئے وسیع کر دیا۔ تا کہ تمھارے لئے اختیار کا کچھ حصہ باقی رہے۔

اس لئے اگر اللہ تعالیٰ تمھارے لئے وقت کو تنگ کر دیتا، تو یہ بہت سی پریشانیوں اور

مجبوریوں کا سبب بن جاتی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مِنَّتِہٖ وَوَسْعَۃِ رَحْمَتِہٖ

سب تعریفیں اس کے احسان اور اس کی رحمت کے وسیع ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔''

منقول ہے :۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فرماتا ہے :۔ میں تم کو عدم سے وجود میں لایا۔ پھر میں نے فضل و کرم کی امداد سے تمھاری مدد کی۔ میں نے تمھاری آنکھ میں روشنی پیدا کی تاکہ تم اس سے میری قدرت کی دلیلوں اور عظیم الشان نشانیوں کو دیکھو۔ اور تمھاری بصیرت میں نور عطا فرمایا تاکہ تم اس سے میرے خطاب کو سمجھو۔ اور اطاعت کے ذریعے میرے عذاب سے بچو۔ اور میرے ثواب کی امید رکھو۔ کیونکہ میں نے اطاعت پر تم سے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اور نافرمانی پر تم کو عذاب کی وعید فرمائی ہے= پھر میں نے تم کو ان اعمال کی تکلیف دی، جس کے کرنے کی تم طاقت رکھتے ہو اور میں نے تمھارے لئے اوقات کے سلسلے میں ہر تنگی کو وسیع کیا۔ لہذا اگر تم ان اعمال کو جو میں نے تمھاری ابتدائی عمر میں تمھارے اوپر واجب کیا ہے، آخری عمر میں بھی ادا کرتے تو میں ان کو تمھاری طرف سے قبول فرمالیتا۔ لہذا بتاؤ وہ کون ہے جس نے تم کو ان کے ادا کرنے سے روکا؟ اس کے لئے تمھارے پاس گمراہی اور سرکشی کے سوا کوئی عذر نہیں ہے۔

اور یہ مشہور مثل ہے :۔ جو طلب کرتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے اور جو ڈرجاتا ہے۔ وہ ناکام ہوجاتا ہے۔

اور غور کرو :۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو مجاہدہ کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر وہ شی واجب کر لی جو اس کے اوپر واجب نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا قول سب سے سچا ہے :۔

وَ اِنَّ اللہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ

''اور بیشک اللہ تعالیٰ احسان والوں کے ساتھ ہے۔''

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا

''جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم اپنی راہوں کی طرف ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔''

اور مندرجہ ذیل اشعار میں اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے:۔

لَوْ صَحَّ مِنْكَ الْهَوٰى اُرْشِدْتَ لِلْحِيَلِ

وَالصِّدْقُ سَيْفٌ يُنِيْلُ غَايَةَ الْاَمَلِ

''اگر تمھارا عشق سچا ہوتا، تو پہاڑ کی طرف تمھاری رہنمائی کی جاتی۔ کیونکہ سچائی ایسی تلوار ہے، جو امید کے آخری درجے تک پہنچا دیتی ہے۔

فَكُنْ اَخَاهِمَّةٍ تَسْمُوْ بِصَاحِبِهَا

وَ لَا تَكُنْ بِالتَّوَانِيْ مُحْبِطُ الْعَمَلِ

''لہذا تم ایسی ہمت کے مالک بنو، جو اپنے مالک کو بلند کر دیتی ہے اور تم سستی سے عمل کو ضائع نہ کرو۔

حضرت ربیع بن خیثم رضی اللہ عنہ اس آیہ کریمہ کو بار بار پڑھتے اور روتے تھے:۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

''کیا جن لوگوں نے گناہ کیا ہے، انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ ہم ان لوگوں کو ان لوگوں کی طرح بنا دیں گے، جو ایمان لائے ہیں اور اچھا عمل کیا ہے۔''

اور چیخ کر کہتے تھے:۔ اے کاش، مجھ کو یہ معلوم ہوتا، اے میرے نفس! تو دونوں گروہوں میں سے کس گروہ میں ہے؟

اور اس آیہ کریمہ کا نام:۔'' مُبْكِيَةُ الْعَابِدِيْنَ ''

عابدین کو رلانے والی ہے۔

حضرت سھل رضی اللہ عنہ نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:۔ اہل موافقت، اہل مخالفت کی طرح نہیں ہیں۔ اہل موافقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ

''قدرت والے بادشاہ اللہ تعالیٰ کے پاس صدق کے مقام میں ہوں گے۔''

اور اہل مخالفت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

فِی عَذَابِ السَّعِیْرِ

''عذاب دوزخ میں ہوں گے۔''

اور چونکہ مصنفؒ نے عبادت کے لئے وقت مقرر کرنے کی حکمت بیان کی۔ لہذا عبادت کے واجب کرنے کی حکمت بھی بیان کی۔ چنانچہ فرمایا:-

عَلِمَ قِلَّةَ نُهُوْضِ الْعِبَادِ اِلٰی مُعَامَلَتِهٖ ، فَاَوْجَبَ عَلَیْهِمْ وُجُوْدُ طَاعَتِهٖ فَسَاقَهُمْ اِلَیْهِ بِسَلَاسِلِ الْاِیْجَابِ، اَوْجَبَ عَلَیْكَ وُجُوْدُ طَاعَتِهٖ ، وَ مَا اَوْجَبَ عَلَیْكَ اِلَّا دُخُوْلَ جَنَّتِهٖ

''اللہ تعالےٰ نے معلوم کیا کہ بندے اس کے معاملہ (عبادت) کی طرف بہت ہی کم سبقت کریں گے۔ لہٰذا اس نے اپنی عبادت ان کے اوپر واجب کر دی۔ گویا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو اپنی طرف واجبات کی زنجیروں کے ذریعے کھینچا۔'' اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں سے راضی ہوا، جو جنت کی طرف زنجیروں سے باندھ کر لے جائے جاتے ہیں۔'' اللہ تعالےٰ نے تمھارے اوپر اپنی طاعت کو واجب کیا تو حقیقت یہ ہے کہ اس نے تمھارے اوپر جنت میں داخل ہونے کو واجب کیا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- یہ تشریع کی حکمت ہے۔ لیکن مصنف نے صرف اہل ظاہر کی حکمت کو بیان فرمایا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے:- جب اللہ سبحانہ تعالےٰ نے اپنے علم اور حکمت سے یہ معلوم کیا کہ اس کے بندے اس کی عبادت کی طرف بہت ہی کم سبقت کرینگے۔

جیسا کہ اس نے فرمایا:-

وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ

''اور میرے بندوں میں سے شکرگزار بندے کم ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:-

وَ قَلِیْلٌ مَّا هُمْ ''اور شکرگزار بندے کم ہیں۔''

لہٰذا جب اللہ تعالےٰ نے یہ معلوم کیا تو اس نے ان کے اوپر اپنی عبادت کو واجب کر دیا۔

اور عبادت کے ترک کرنے پر ان کی سزا کی وعید سنائی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی طرف واجبات کی زنجیروں میں باندھ کر چلایا۔

پھر حضرت مصنفؒ نے اس حدیث شریف کو جو قیدیوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ بیان کر کے یہ اشارہ فرمایا ہے:- بندے کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ اور وہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ کے قبضے میں گرفتار ہے۔ اور یہ مشہور حدیث ہے:-

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے:-

عَجِبَ رَبُّكَ مِنْ قَوْمٍ يُّسَاقُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ بِالسَّلَاسِلِ

''ایسے لوگوں سے تمھارا رب راضی ہوا، جو زنجیروں کے ذریعے جنت کی طرف چلائے جاتے ہیں۔'' چونکہ حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام، اللہ تعالیٰ اور اس کی بارگاہ کی طرف چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ لہذا جس نے آپ ﷺ کی موافقت کی وہ نجات پا گیا۔ اور جس نے آپ کی مخالفت کی۔ اس کے گردن میں زنجیر باندھ کر اس کے رب کی بارگاہ کی طرف لے گئے۔

اور اس حدیث شریف:- عجب ربک من قوم یساقون الی الجنۃ بالسلاسل کی تشریح میں بعض علمائے کرام نے فرمایا:- یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب، تعجب، کا مفہوم:- اپنے بندوں کے لئے رضامندی کا اظہار ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عجیب شان کا مالک ہے۔ لیکن اظہار تعجب کی تشریح یہ ہے:- جنت جس میں ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتوں کے موجود ہونے اور اہل جنت کے دائمی عیش و عشرت میں رہنے کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور لازم یہ تھا کہ اہل عقل میں سے جو لوگ اس خبر کو سنتے۔ ان لوگوں کو ایسا ہونا چاہئے تھا کہ فوراً اس کی طرف بڑھتے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے پوری طرح جدوجہد کرتے اور اس کے پالینے کے لئے ہر قسم کی مصیبتیں اور تکلیفیں خوشی اور رضامندی سے برداشت کرتے۔ مگر اس کے برعکس:- ان لوگوں کا یہ حال ہے۔ کہ اسی جنت سے یہ لوگ بھاگتے اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جنت کی طرف زنجیروں کے ذریعے کھینچ کر لے جائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ انسان ان بڑی مصیبتوں کے طرف کھینچ کر لے جایا جاتا ہے۔ جن سے طبیعتیں نفرت کرتی اور بھاگتی ہیں۔ لہذا اظہار تعجب مخلوق کے اعتبار سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے۔

اور بلاشبہ، اللہ سبحانہ تعالیٰ ہر قسم کے منفعتوں (فائدہ پہنچانے والی چیزوں) سے فائدہ اٹھانے سے بے نیاز ہے۔ اور اس نے تم کو عبادت کرنے کا حکم اس لئے دیا اور گناہوں سے اس لئے منع کیا ہے۔ کہ عبادت کرنے میں تم کو فوائد حاصل ہوں گے۔ اور گناہوں سے پرہیز کرنے میں تم نقصانات سے بچو گے گویا اس نے اپنی عبادت کو تمھارے اوپر واجب نہیں کیا ہے، بلکہ تمھاری جنت میں داخل ہونے کو تمھارے اوپر واجب کیا ہے۔

ایک حکیم یعنی عارف نے فرمایا ہے:- تم کو معلوم ہونا چاہئیکہ اطاعت میں مختلف مرتبے اور درجے ہیں اور مخالفت میں مختلف کبیرہ گناہ اور دوزخ کے نیچے کے درجے ہیں۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اَھْلَ الْجَنَّةِ لَیَتَرَاءُ وْنَ الْغُرْفَةَ فَوْقَھُمْ كَمَا یَرٰى اَھْلُ الْاَرْضِ الْكَوَاكِبَ الدُّرِّیَّ فِی اُفُقِ السَّمَاءِ، قِیْلَ :- یَا رَسُوْلَ اللهِ تِلْكَ مَنَازِلُ الْاَنْبِیَاءِ ؟ قَالَ :- وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ رِجَالٌ اٰمَنُوْا بِاللهِ وَ صَدَّقُوا الْمُرْسَلِیْنَ

’’اہل جنت اپنے اوپر کی طرف بالا خانوں کو اس طرح دیکھیں گے۔ جس طرح زمین والے آسمان کے کناروں پر روشن ستارے کو دیکھتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا:- یارسول اللہ! کیا وہ بالا خانے انبیا علیھم السلام کے مقامات ہوں گے؟ آپ نے فرمایا:- اس ذات اقدس کی قسم، جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ وہ بالا خانے ان لوگوں کے لئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اس کے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔‘‘

اور ایک دوسرے عارف نے فرمایا ہے:- آدمی تین قسم کے ہیں۔

ایک قسم:- ایسے لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت، عبودیت اور شکر اور تعمیل حکم اور خدمت کے حقوق کے ساتھ قائم ہونے کے لئے کرتے ہیں۔ لہذا واجب:- ان کے مرتبہ اور درجہ کو زیادہ کر دیتا ہے۔

اور دوسری قسم:- وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت، واجب کی تعظیم کے لئے کرتے ہیں۔ لہذا واجب ان کے حق میں [illegible] کا ظاہر کرنا ہے

اور تیسری قسم :- وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے عذاب کے خوف اور اس کے ثواب کی امید سے کرتے ہیں۔ لیکن اگر عذاب کا خوف اور ثواب کی امید نہ ہوتی تو وہ اس کی عبادت نہ کرتے۔ لہٰذا واجب ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہے اور تینوں میں بھلائی ہے۔ اگر چہ تینوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

میں کہتا ہوں :- تحقیق یہ ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں :-

ایک قسم :- وہ لوگ ہیں جو تکلیف کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ کثافت و حجاب والے ہیں۔

دوسری قسم :- وہ لوگ ہیں۔ جو تعظیم کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ علم اور معرفت والے ہیں۔

اہل حجاب :- خوف اور طمع سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔

اور اہل عیان :- محبت اور شکر ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام اور خواص اولیائے کرام رضی اللہ عنہم کا مقام ہے۔

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا :-

اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْراً

''کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں''

لہٰذا اہل باطن کے نزدیک خدمت کے واجب ہونے میں صرف یہی حکمت ہے کہ ربوبیت کے اس سر کی پوشیدگی کو ظاہر کیا جائے جو عبودیت کے مظاہر میں ہے۔ کیونکہ عبودیت کے بغیر ربوبیت ایسا نقص ہے کہ اس کے اوپر اپنی حکمت کا باطل کرنا لازم آتا ہے۔ اور ربوبیت کے بغیر عبودیت ایسا محال ہے کہ اس کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایک عارف کا شعر ہے :-

مَنْ لَا وُجُوْدَ لِذَاتِہٖ فِی ذَاتِہٖ   فَوُجُوْدُہٗ لَوْلَاہُ عَیْنُ مَحَالٖ

''جس شی کا وجود اپنی ذات سے مستقل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود کے لئے دوسری شی کا محتاج ہے۔

لہٰذا اگر اس کے وجود کی علت نہ ہوتی، تو اس شی کا وجود محال ہوتا۔'' یعنی عبودیت اپنے وجود کے لئے ربوبیت کی محتاج ہے۔ لہٰذا اگر ربوبیت نہ ہوتی تو عبودیت کا وجود نہ ہوتا۔''

اور اسی بنا پر جب عارفین اس راز کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں، کہ عبودیت کے لئے بذات خود مستقل وجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے وجود کی حکمت :- صرف یہ ہے کہ عبودیت کے احکام کے ظاہر کرنے کے ساتھ، ربوبیت کے راز کی صورتیں متعلق ہیں۔ اور عارفین اس کو حال اور ذوق سے پہچانتے ہیں، تو ان کی عبادت شکر ہو جاتی ہے اور وہ عبودیت میں محمول (اٹھائے گئے) ہیں، نہ کہ حامل (اٹھانے والے)۔ ان کا عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی عبادت حقیقت میں بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ محسوس ظاہر میں کم ہو۔ اور ان کی عبادت کبھی کم ہوتی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے کل تصرفات عبادت ہیں۔ ان کا سونا اور ان کا کھانا پینا اور ان کا چلنا، سب عبادت ہے۔

اسی قسم کے لوگوں کی شان میں یہ حدیث شریف وارد ہوئی ہے :-

نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ '' عالم کا سونا عبادت ہے۔''

نیز حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے :-

رِجَالٌ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ عَلَى الْفُرُشِ الْمُمَهَّدَةِ ، قِيْلَ :- مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ ؟ قَالَ :- اَلذَّاكِرُوْنَ اللهَ كَثِيْرًا

'' کچھ لوگ ایسے ہیں جو فرش بچھے ہوئے راستے پر چل کر جنت میں داخل ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا :- یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا :- وہ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے لوگ ہیں۔'' یا حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے جس طرح فرمایا ہو۔ اس حدیث شریف کو منذری نے بیان کیا ہے۔

حضرت ابو سلیمان نے فرمایا ہے :- کبھی عارف اپنے بستر پر وہ مقام پا لیتا ہے، جو وہ نماز میں نہیں پاتا ہے۔ اور بندہ اپنے لئے اس مقام پر پہنچنے کی تعجب خیز نہ سمجھے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل کسی سبب سے نہیں، بلکہ بغیر کسی سبب کے حاصل ہوتا ہے اور

اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر مطلب کو پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا:۔

مَنِ اسْتَغْرَبَ اَنْ یُّنْقِذَهُ اللّٰهُ مِنْ شَهْوَتِهٖ ، وَ اَنْ یُّخْرِجَهُ مِنْ وُجُوْدِ غَفْلَتِهٖ ، فَقَدِ اسْتَعْجَزَ الْقُدْرَةَ الْاِلٰهِیَّةَوَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا

”جو شخص اس بات کو تعجب خیز سمجھتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کی شہوت سے نجات دے اور اس کو اس کی غفلت سے باہر نکالے۔ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر شی پر قادر مقتدر ہے“

میں کہتا ہوں :۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی شی عاجز و مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔ اس کا حکم سب پر غالب ہے۔ اور بندوں کے قلوب اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ جس طرح اور جہاں کہیں چاہتا ہے۔ ان کے قلوب کو پھیرتا، اور بدلتا ہے۔ لہذا جو شخص غفلت میں منہمک اور خواہش کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے وہ اس کو حیرت انگیز نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غفلت سے نکال دے اور اس کو خواہش کے سمندر سے نجات دے۔ کیونکہ ایسا سمجھنا، اس کے ایمان میں نقص کی دلیل ہے۔ اور یہ تعجب خیز اور حیرت انگیز کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْئٍمُّقْتَدِرًا

”بیشک اللہ تعالیٰ ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔“

اور تم بھی انھیں میں سے ایک شی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کے حق میں فرمایا ہے:۔

یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا

”اے میرے گناہگار بندو! تم لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دے گا۔“ اور دوسری جگہ فرمایا:۔

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ

”جس شخص نے گناہ کرنے کے بعد توبہ کیا اور اپنی اصلاح کر لی۔ تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کی توبہ

قبول کرے گا۔‘‘

ان کے علاوہ بہت سی آیات کریمہ ہیں۔ جو گناہوں کی بخشش کی دلیل ہیں۔ اور حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے:-

لَو اَذْ نَبْتُمْ حَتّٰی تَبْلُغَ خَطَا یَا کُمْ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ تُبْتُمْ لَتَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ

’’اگر تم نے اس قدر گناہ کیا ہے۔ کہ تمھارے گناہ آسمان کی بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔ پھر تم نے توبہ کیا۔ تو ضرور اللہ تعالےٰ تمھاری توبہ قبول فرمائے گا۔‘‘

اور ان متقدمین اولائے عظام سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ جو پہلے اہل غفلت وہ عصیان میں سے تھے۔ پھر بعد میں اہل مشاہدہ وعیان میں شامل ہو گئے۔ پہلے چور تھے۔ پھر خواص میں سے ہو گئے۔ مثلاً حضرت ابراھیم بن ادھم اور حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابو یعزیٰ اور بہت سے حضرات جن کی حد اور شمار دشوار ہے۔

حضرت قشیری رضی اللہ عنہ نے اپنے رسالہ کی ابتدا میں ان حضرات میں سے کچھ لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور انھوں نے ان حضرات کا بیان اس لئے پہلے کیا ہے۔ تاکہ گناہگاروں کی امید میں تقویت ہو۔

اور اس شخص کے واقعہ سے نصیحت حاصل کرنی چاہئے، جس نے ننانوے اشخاص کو قتل کیا۔ پھر اس نے ایک راہب سے توبہ کے بارے میں دریافت کیا :- راہب نے اس کو جواب دیا:- تمھارے لئے توبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ سن کر اس نے راہب کو بھی قتل کر کے ایک سو پورا کر دیا۔ پھر اس نے ایک عالم سے دریافت کیا:- عالم نے توبہ کی طرف اس کی رہنمائی کی اور اس کو ایک گاؤں میں جانے کا حکم دیا۔ جس میں اللہ تعالےٰ کی عبادت کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ اس نے وہاں جانے کے لئے سفر کیا۔ لیکن وہ راستے ہی میں وفات پا گیا۔ بعد میں اس کو رحمت کے فرشتے لے گئے۔ یہ واقعہ بخاری شریف میں بہت تفصیل سے ایک لمبی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح اس شخص کا واقعہ ہے جو پہلے چور تھا۔ پھر اس نے ایک عابد سے دریافت کیا :- کیا میرے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ عابد نے اس سے مذاق کیا اور ایک سوکھی ہوئی شاخ اس کو

دے کر کہا:- اس سوکھی سوئی شاخ کو لو۔ جب یہ شاخ تمھارے ہاتھ میں سبز ہو جائے تو سمجھ لینا کہ تمھاری توبہ قبول ہوگئی۔ اس نے اس سوکھی شاخ کو عابد سے خلوص نیت کے ساتھ لیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگا۔ وہ اس شاخ کو برابر دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر ایک روز وہ سوکھی شاخ نرم اور سرسبز ہوگئی۔

میں کہتا ہوں:- میں نے بہت سے لوگوں کو غفلت اور ترک نماز میں ڈوبے ہوئے پایا۔ وہ لوگ دین کی مشہور باتوں میں سے بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ پھر خصوصیت کے طریقے سے ان کے واقف ہونے کا ذکر کیا۔ پھر ان کی حالت میں انقلاب ہوا اور وہ خواص عارفین ہو گئے۔

اور میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا۔ جو گناہوں میں منہمک، نافرمانیوں اور لوگوں پر ظلم کرنے میں غرق تھے۔ لیکن آخر میں وہ بڑے صالحین میں سے ہو گئے۔

اور میں نے سبتہ کی سرحد پر عیسائیوں کو دیکھا۔ وہ ذکر کے حلقہ کے پیچھے حاضر ہوئے، ان کے اندر کشش پیدا ہوئی۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ چلے، یہاں تک کہ ہم اس سرحد سے باہر چلے آئے، جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے۔ اور اگر ان لوگوں کو ہمارے ساتھ رہنے کی آسانی میسر ہو جاتی، تو وہ لوگ جلد مسلمان ہو جاتے۔

اور ہمارے ایک برادر طریقت اپنے نفس کے غفلت سے نکل جانے پر تعجب سے فرمایا کرتے تھے:- یہ بد بخت غلاموں کے بازار کا دفع کرنے والا۔ لہذا جس شخص کے پاس جوشی بھی ہو، اس کو نکالنا چاہئے۔ پھر اس کے بعد میں نے ان کو ننگے سر ننگے پاؤں مجذوبیت کی حالت میں دیکھا اور اب وہ خواص اولیائے کرام میں سے ہیں۔

اور ایسا اتفاق اکثر اس شخص کو ہوتا ہے، جو ایسے عارفین کاملین کی صحبت سے فیض یاب ہو جاتا ہے، جن کے پاس اکسیر (کیمیا) ہے اور ایسے عارفین ہر زمانہ میں موجود ہوتے ہیں اور یہ بات بہت مشہور ہے۔ اس کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ جس شخص کو شک ہو، وہ اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لہذا اس شخص پر بہت ہی تعجب ہے، جو آفتاب کے نکلنے کے بعد اس کی روشنی سے اور چاند کے ظاہر ہونے کے بعد اس کی روشنی سے انکار کرتا ہے۔ لیکن ان کا حال ویسا ہی ہے، جیسا کہ قصیدۂ

بردہ کے مصنف علامہ بوصیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

قَدْ تُنْكِرُ الْعَيْنُ ضَوْءَ الشَّمْسِ مِنْ رَمَدٍ

وَ يُنْكِرُ الْفَمُ طَعْمَ الْمَاءِ مِنْ سَقَمٍ

''آشوب چشم کی وجہ سے، آنکھ سورج کی روشنی کا انکار کرتی ہے۔اور بیماری کی وجہ سے منہ پانی کے مزے کا انکار کرتا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا

''اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیتا ہے۔پھر تم اس کے لئے گمراہی سے نکلنے اور ہدایت پانے کا، کوئی راستہ ہرگز نہ پاؤ گے۔''

اور اس سے زیادہ تعجب اس شخص پر ہے، جو تربیت کرنے والے شیخ کے موجود ہونے سے انکار کرتا ہے۔اور اہل خصوصیت کے ختم ہو جانے کا اقرار کرتا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

''حقیقت یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ قلوب جو سینوں کے اندر ہیں اندھے ہو جاتے ہے۔''

یعنی قلوب اہل خصوصیت کے راستے کو دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں۔وہ صرف عوام کے راستے کو دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ چمگادڑ کا حال ہے:۔وہ صرف رات کی تاریکی میں دیکھتا ہے۔دن کی روشنی میں اس کو کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔لہذا وہ معذور ہے۔کیونکہ اس کے پاس وہ روشنی ہی نہیں ہے، جو تیز نظر رکھنے والوں کے پاس ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے :۔ اللہ تعالیٰ پہلے اپنے بندے پر خواہشات میں مشغولیت کو غالب کر دیتا ہے۔اور غفلتوں کے قید خانے میں اس کو مقید کر دیتا ہے۔پھر بعد میں اس کو توبہ اور غفلت سے ہوشیاری کی توفیق عطا کر کے اس پر احسان فرماتا ہے اور اس کو اپنے احباب کے ساتھ اپنی بارگاہ قدس کے مقامات میں داخل فرماتا ہے۔تاکہ وہ اس احسان کی قدر و منزلت پہچانے جو اللہ تعالیٰ

نے اس پر کیا ہے۔

جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

رُبَّمَا وَرَدَتِ الظُّلَمَ عَلَيْكَ لِيُعَرِّفَكَ قَدْرَ مَامَنَّ بِهِ عَلَيْكَ

''اکثر اوقات تمھارے اوپر تاریکیوں کو وارد کرتا ہے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ اس احسان کی قدر تم کو پہنچوائے، جو اس نے ان تاریکیوں کے ذریعے تمھارے اوپر کیا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کہ جو چیز تلاش اور محنت کے بعد ملتی ہے، وہ اس سے زیادہ مزے دار اور قابل قدر ہوتی ہے۔ جو بغیر محنت کے حاصل ہوتی ہے۔ اور جدائی کے بعد جو محبت پیدا ہوتی ہے، وہ اس محبت سے زیادہ شیریں اور پائدار ہوتی ہے، جو بغیر جدائی کے حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ خلوص اور صفائی جو ظلم اور سختی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس خلوص اور صفائی سے زیادہ خالص اور صاف ہوتی ہے، جو ظلم اور سختی کے بغیر حاصل ہوتی ہے۔ اور نفس کو اس کی مرغوب چیزوں اور عادتوں سے جدا کر کے فرمان بردار کرنا، اس سے زیادہ اہم ہے کہ وہ بغیر محنت اور سختی کے فرماں بردار ہو جائے۔ کیونکہ برداراجرت ہو، یا قدر و منزلت، محنت اور کوشش کے مطابق ہوتی ہے۔

لہذا بندے کے اوپر پہلے غفلت اور شہوت وارد ہونے میں یہی حکمت ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو اس غفلت اور شہوت سے باہر نکالے۔ تو وہ اس نعمت کی قدر و منزلت کو پہچانے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے۔

لہذا اے انسانو! اکثر اوقات اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر ظلمتوں کو مسلط کرتا ہے اور ظلمتوں سے مراد:- غیر اللہ اور کدورت نفسانی اور خواہشات و عادات کی محبت ہے۔ لہذا تم غیروں اور کدورتوں اور خواہشوں اور عادتوں کے سمندر میں ڈوب جاتے ہو۔ اور انکی تاریکیوں کے قید خانے میں مقید ہو جاتے ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ تم کو ایک گھڑی میں ان تاریکیوں سے نکال لیتا ہے۔ اور ایسا اللہ تعالیٰ اس لئے کرتا ہے۔ تا کہ تمھارے اوپر معرفت الٰہی کا دروازہ کھل جانے کے بعد تم اس احسان کی قدر و منزلت کو پہچانو، جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر کیا ہے۔ پھر تم اس پہچان کے بعد اللہ تعالیٰ

سے محبت اور اس کا شکر زیادہ سے زیادہ کرو۔ اور تمھارے نزدیک اس کے اسرار کا مرتبہ اور قدر بڑھ جائے اور تم ان کے حق کو پہچانوں اور غیر مستحق سے ان کی حفاظت کرو۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنت کو مکروہات (سختیوں) سے گھیر دیا ہے۔ تاکہ بندے اس میں داخل ہونے کے بعد اس نعمت کی قدر کو پہچانیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرما کر ان کے اوپر احسان کیا ہے۔

اسی طرح عارفین کی جنت بھی سختیوں سے گھری ہوئی ہے۔ تاکہ عارف اس سر کی قدر و منزلت کو پہچانے، جو اللہ تعالیٰ نے اس پر ظاہر کیا ہے۔ اور اس کامیابی کی قدر کو جانے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشی ہے۔

اور تم کو یہ جاننا چاہئے۔ کہ یہ ظلمتیں، جو قلوب پر وارد ہو کر علام الغیوب اللہ تعالیٰ سے روک دیتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے دنیا اور نفس اور شیطان کی طرف سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا جو شخص دنیا کو ترک کر دیتا ہے۔ اور اپنے نفس سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ کو اس سے آزاد کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اتنا کرتا ہے۔ کہ شیطان جل کر پگھل جاتا ہے۔ تو وہ شخص احباب کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ علم غیوب کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- اللہ سبحانہ تعالیٰ نے جب قلب کو پیدا فرمایا۔ تو اس کو اپنے اسرار کا خزانہ اور اپنے انوار کی کان اور اپنے بندے کے اندر اپنے دیکھنے کا مظہر بنایا اور اللہ تعالیٰ نے بندے کے وجود میں قلب سے افضل کوئی شی نہیں پیدا فرمائی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قلب کے دروازے پر سب سے کمتر اور نجس شی ڈال دی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے:- مختلف متضاد اشیا کا ایک جگہ جمع ہونا۔ جن کے ایک جگہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو قدرت حاصل نہیں ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے قلب کے دروازے پر مردار اور کتے کو ڈال دیا۔ مردار:- دنیا ہے۔ اور کتا:- شیطان ہے۔ کتا، مردار کو نوچ کر کھا رہا ہے۔ لہذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے سر کے خزانے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اس کے لئے مردار دنیا سے آنکھ بند کر لینا اور کتے شیطان سے منہ پھیر لانا لازمی اور ضروری ہے۔

اس لئے کہ جس شخص نے شیطان سے اور اس کی مردار دنیا سے منہ پھیر لیا، اس پر شیطان کے غالب ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

اور جو شخص دنیا اور شیطان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ نور چھن جاتا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ اس کے لئے اس طلسم کی طرح ہے، جو خزانے پر ہوتا ہے۔ اور وہ لامحالہ خزانے میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔

عارفین نے فرمایا ہے:- دنیا، شیطان کی لڑکی ہے اور دنیا دار، ابلیس کا داماد ہے۔ لہذا باپ اپنی بیٹی سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک لڑکی شوہر کی حفاظت میں ہے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:-

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا زَھَّدَہٗ فِی الدُّنْیَا وَرَغَّبَہٗ فِی الْاُخْرٰی وَ بَصَّرَہٗ بِعُیُوْبِ نَفْسِہٖ ، قِیْلَ :- یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! اَیُّ النَّاسِ شَرٌّ ؟ قَالَ :- اَلْاَغْنِیَاءُ یَعْنِی الْبُخَلَاءَ ، ثُمَّ قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ :- وَ مَنْ عَظَّمَ غَنِیًّا لِاَجْلِ غِنَاہٗ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ کَعَابِدِ وَ ثَنٍ وَ مَنْ اَسِفَ عَلٰی دُنْیَا فَاتَتْہُ اِقْتَرَبَ مِنَ النَّارِ مَسِیْرَۃَ سَنَۃٍ

”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کے اندر دنیا سے نفرت اور آخرت کی طرف رغبت پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس کو اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا:- یارسول اللہ ! کون لوگ برے ہیں؟ حضرت ﷺ نے فرمایا:- وہ مالدار جو بخیل ہیں۔ پھر حضرت علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:- جو شخص کسی دولتمند کی عزت و تعظیم اس کی دولت کی وجہ سے کرتا ہے۔ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک بت پرست کی طرح ہے۔ اور جو شخص دنیا کے کھو جانے پر افسوس کرتا ہے۔ وہ دوزخ کی طرف ایک سال کی مسافت (فاصلہ) کے برابر بڑھ کر قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:- جس شخص نے مال سے محبت کی۔ اس نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ اور جس نے دنیا سے محبت کی۔ اس نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ کیونکہ ایک قلب میں میری محبت اور مال و دنیا کی محبت کبھی نہیں سما سکتی ہے۔

اے موسیٰ! جو شخص مخلوق سے ڈرتا ہے، وہ مجھ سے نہیں ڈرتا ہے اور جو شخص روزی کے کھو جانے سے ڈرتا ہے وہ میرے اوپر بھروسہ نہیں کرتا ہے۔ مجھ کو اپنی عزت وجلال کی قسم، جو بندہ میرے اوپر بھروسہ کرتا ہے، میں اس کے لئے کافی ہو جاتا ہوں۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ ملک اور ملکوت کی کنجیاں میرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں اور جو بندہ مجھ کو مضبوط پکڑتا ہے۔ میں اس کو جنت میں داخل کرتا ہوں۔ اور اس کے کل اہم اور ضروری کاموں کے میں کافی ہوں۔ اور جو شخص میرے سوا غیر کو مضبوط پکڑتا ہے۔ تو میں اس کے اوپر کی طرف سے اسباب وذرائع کو منقطع کر دیتا ہوں۔ اور اس کے نیچے کی طرف سے زمین کو سخت کر دیتا ہوں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ اس کو کس طرح ہلاک کر دوں۔

اے موسیٰ! میں نے تمھارے لئے توریت کو پانچ کلموں (باتوں) پر ختم کیا ہے۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے۔ تو کل علوم تمھارے لئے مفید ہوں گے۔ ورنہ کوئی علم بھی تم کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

پہلا کلمہ:- تمھارے لئے جس روزی کی ذمہ داری میں نے لی ہے۔ اس پر پورا یقین اور بھروسہ رکھو۔ جب تک میرا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ اور میرا خزانہ ہمیشہ بھرا رہے گا۔ کبھی خالی نہ ہو گا۔

دوسرا کلمہ:- جب تک میری بادشاہت ہے، تم کسی بادشاہ سے نہ ڈرو۔ اور میری بادشاہت ہمیشہ رہے گی۔ کبھی نہ مٹے گی۔

تیسرا کلمہ:- جب تک تمھارے اندر کوئی عیب موجود ہے، تم دوسرے کے عیب کو نہ دیکھو۔ اور بندہ عیب سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا ہے۔

چوتھا کلمہ:- جب تک تمھارے جسم میں تمھاری روح ہے، اس وقت تک تم شیطان سے جنگ کرنا بند نہ کرو۔ کیونکہ شیطان کبھی تم سے جنگ کرنا بند نہیں کرے گا۔

پانچواں کلمہ:- جب تک تم اپنے کو جنت میں نہ دیکھ لو، مجھ سے بے خوف اور بے فکر نہ رہو۔ اور جنت میں بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ تم کو معلوم ہے۔ لہذا مجھ سے کبھی بے خوف اور بے فکر نہ رہو۔

میں کہتا ہوں:- یہ سب دوسروں کے لئے تشریع (قانون سازی) ہے کیونکہ تمام انبیاء

علیھم السلام معصوم ہیں۔ اور جو تعلیم وتربیت ان کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے مراد، ان کے علاوہ، ان کی امت اور دوسرے لوگ ہیں۔

وباللہ التوفیق

پھر وہ شخص جس پر اللہ تعالیٰ احسان کرتا ہے اور اس کو اس کے نفس کی قید سے نکالتا ہے۔ اور اس کو اس کی غفلت کے قید خانے سے آزاد کرتا ہے۔ اگر وہ اس نعمت کی قدر نہیں کرتا ہے۔ تو اس سے یہ نعمت فوراً سلب کر لی جاتی ہے۔

جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ قَدْرَ النِّعَمِ بِوِجْدَانِهَا عَرَّفَهَا بِوُجُوْدِ فُقْدَانِهَا

"جو شخص نعمتوں کے حاصل ہونے پر ان کی قدر ومنزلت نہیں پہچانتا ہے۔ وہ ان نعمتوں کے کھو جانے کے بعد ان کی قدر پہچانتا ہے۔"

میں کہتا ہوں:- مصنفؒ نے جو بیان کیا، وہ مجرب اور درست ہے اور وہ اس طرح کہ کبھی بندے کو نعمتیں اور راحتیں متواتر عطا کی جاتی ہیں۔ لیکن بندہ ان کی قدر نہیں کرتا ہے اور اس کے نزدیک پوری طرح ان کی عزت وتعظیم نہیں ہوتی ہے۔ پھر جب اس سے وہ نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ اور آفتوں اور دردوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو اب اس کو عافیت اور راحت کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح فقیر کی حالت ہے:- اس کو حضور اور فکر ونظر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ ان کی زیادہ قدر ومنزلت نہیں کرتا ہے۔ پھر جب اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور وہ محسوس ظاہر کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اس کا قلب گم ہو جاتا ہے۔ تب وہ ان چیزوں کی قدر پہچانتا ہے، جو اس کے پاس تھیں۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے التجا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی چھنی ہوئی نعمت اس کو واپس کر دیتا ہے۔

منقول ہے:- اللہ تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرماتا ہے:- اے جبریل! میری محبت کی شیرینی، میرے اس بندے کے قلب سے مٹا دو، جس کو میں آزماتا ہوں۔ لہٰذا حضرت

جبرئیل علیہ السلام اس بندے کے قلب سے محبت کی شیرینی مٹا دیتے ہیں۔ پھر جب وہ بے قرار ہوتا اور عاجزی کے ساتھ التجا کرتا اور روتا ہے تو اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیتا ہے :- تم میری محبت کی شیرینی اس بندے کے قلب میں واپس کر دو۔ کیونکہ میں نے اس کو سچا پایا ہے۔ اور جب بندے کے قلب سے محبت کی شیرینی مٹا دی جاتی ہے۔ لیکن وہ گریہ وزاری اور عاجزی کے ساتھ التجا نہیں کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو کچھ واپس نہیں کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیشہ کے لئے اس شیرینی کو چھین لیتا ہے اور عطا کر دینے کے بعد چھین لینے سے، میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور بندے کو چاہئے۔ کہ نعمتوں کی قدر معلوم کر لینے کے بعد، ان میں غور وفکر کرنے اور نعمتوں کے حاصل ہونے سے پہلے اپنے نفس کی حالت میں غور وفکر کے ساتھ مدد طلب کرے۔ لہذا اگر وہ دولتمند ہے تو اپنی پہلے کی محتاجی کی حالت پر، ظاہری یا باطنی طور پر غور کرے۔ اور اگر وہ تندرست ہے تو اپنے مرض کی حالت پر غور کرے۔ اور اگر وہ مطیع وفرماں بردار ہے، تو اپنی نافرمانی اور گناہ کی حالت پر غور کرے۔ اور اگر وہ ذکر کرنے والا ہے تو اپنی غفلت والی حالت پر غور کرے اور اگر وہ عالم ہے، تو اپنی جہالت کی حالت پر غور کرے اور اگر وہ کسی عارف شیخ کی صحبت میں بیٹھتا ہے تو اپنی گمراہی کی حالت پر غور کرے اور اگر وہ عارف ہے تو وہ اپنی جہالت کی حالت پر غور کرے۔ اسی طرح ہر نعمت کی ضد کے موجود ہونے کی حالت پر غور کرے۔ جو اس کے اندر اس نعمت کے حاصل ہونے سے پہلے موجود تھی۔ اس طرح غور کرنے سے وہ ان عطا کی ہوئی نعمتوں کی قدر پہچان لے گا۔ پھر ان کا شکر ادا کرے گا۔ تو وہ نعمتیں ہمیشہ اس کو حاصل رہیں گی۔

لیکن جو شخص نعمتوں کی حالت میں غور وفکر نہیں کرتا ہے۔ وہ ان کی قدر نہیں پہچان سکتا ہے۔ اس لئے وہ ان کا شکر ادا کرنے سے غافل ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ نعمتیں اس سے اس طرح چھن جاتی ہیں کہ اس کو خبر بھی نہیں ہوتی ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے :- زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا :- عاجزی کے طریقے پر نعمت کا اعتراف کرنا ہے اور ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا خلوص کے ساتھ اس کی خدمت میں مشغول ہونا ہے اور قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا :- احسان کا مشاہدہ کرنا اور حرمت کی حفاظت

کرنی ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- تم اپنے نفس کو نعمت کا اہل نہ سمجھو۔ اور اللہ تعالےٰ کی نافرمانی اس کی نعمت کے ساتھ نہ کرو۔

اگر تمہارا یہ اعتراض ہو:- میں نعمتوں کا شکر کس طرح کر سکتا ہوں جبکہ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے۔

تو میرا جواب یہ ہے:- ان نعمتوں کے ساتھ قائم ہونا ہی، ان کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف ہی شکر ہے۔

حضرت مصنفؒ نے اسی حقیقت کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے۔

لَا تُدْهِشُكَ وَارِدَاتُ النِّعَمِ عَنِ الْقِيَامِ بِحُقُوْقِ شُكْرِكَ ، فَاِنَّ ذَالِكَ مِمَّا يَحُطُّ مِنْ وُجُوْدِ قَدْرِكَ

"نعمتوں کا کثرت سے ملنا، تم کو اپنے شکر کے ساتھ قائم ہونے سے مدہوش اور غافل نہ کر دے۔ کیونکہ یہ مدہوشی اور غفلت ان چیزوں میں سے ہے، جو تم کو تمہارے مرتبہ سے گرا دیتی ہیں۔"

میں کہتا ہوں:- اگر انسان اپنے نفس (ذات) میں اور اپنے نفس کے حاصل شدہ نعمتوں میں غور و فکر کرے۔ تو وہ اپنے کو ظاہری اور باطنی نعمتوں میں ڈوبا ہوا پائے گا۔

لہذا وہ، دیکھنے کی نعمت، سننے کی نعمت، سونگھنے کی نعمت، چکھنے کی نعمت، بات کرنے کی نعمت، عقل کی نعمت، دو ہاتھوں کی نعمت، دو پاؤں کی نعمت، تندرستی اور عافیت کی نعمت، کفائت (ضرورت کے مطابق ملنے) کی نعمت، اہل و عیال کی نعمت، اسلام کی طرف ہدایت کی نعمت میں، پھر ایمان کی نعمت، عبادت کی نعمت علم کی نعمت، پھر برادران طریقت کی نعمت:- جن سے وہ مدد طلب کرتا ہے، پھر سب سے بڑی نعمت شیخ کی نعمت میں۔ پھر ان نعمتوں میں جو موت کے بعد اللہ تعالےٰ نے اس کے لئے تیار کی ہیں۔ اور جن کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ غور و فکر کرے۔ تو جب وہ اپنے کو نعمتوں میں ڈوبا ہوا پائے۔ تو اس سے مدہوش اور غافل نہ ہو۔ اور ان کی شکر گزاری میں قائم ہونے سے اپنے اندر کمزوری نہ پیدا ہونے دے۔ کیونکہ ان نعمتوں کا اس طریقے پر اعتراف اور اقرار کرنا، کہ بغیر کسی

شک وشبہ کے قطعی یقینی طور پر وہ بغیر کسی واسطہ اور ذریعہ کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ یہی ان کا شکر ادا کرنا ہے:-

اللہ تعالیٰ کا کلام:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ جو کل عالموں کا رب ہے۔''

زبان سے شکر ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں ہے

کہ جنت سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور جنت میں اہل جنت کا شکر

(الحمد للہ رب العالمین) ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ اٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

''اور اہل جنت کی آخری پکار یہی ہوگی :- سب تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ جو کل عالموں کا رب ہے۔''

بعض اخبار میں وارد ہوا ہے:- سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا:-

اے میرے رب! میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں۔ جبکہ میں تیرا شکر ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں۔ مگر یہ کہ تیری کل نعمتوں میں سے صرف ایک نعمت کا شکر ادا کروں۔ کیونکہ تیری نعمت مجھ پر شکر کو واجب کرتی ہے۔ اور شکر بھی ایک نعمت ہے، جو شکر کو واجب کرتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ غیر محدود بے انتہا چلتا رہے گا۔ ایک شکر دوسرے شکر کو اور دوسرا شکر، تیسرے شکر کو واجب کرتا رہے گا۔ لہٰذا شکر کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا ہے:-

اسی مفہوم میں ایک عارف شاعر کے یہ اشعار ہیں:-

اِذَا کَانَ شُکْرُ اللّٰہِ لِلْعَبْدِ نِعْمَۃً　　عَلَیْھَا مِنَ اللّٰہِ لَہٗ یَجِبُ الشُّکْرَ

''چونکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بندے کے لئے نعمت ہے۔ لہٰذا اس نعمت کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

فَكَيْفَ لَهُ بِالشُّكْرِ وَالشُّكْرُ نِعْمَةٌ لَو وَالَتِ الْاَحْقَابُ وَاتَّصَلَ الْعُمْرُ

"تو اللہ تعالیٰ کا شکر کیسے ادا ہو سکتا ہے۔ جبکہ شکر ادا کرنا بھی ایک نعمت ہے۔ اگر چہ صدیاں گذر جائیں اور عمر دراز بھی حاصل ہو جائے۔ اور ایک دوسرے عارف کا کلام ہے۔

لَكَ الْحَمْدُ مَوْلَانَا عَلٰى كُلِّ نِعْمَةٍ وَ مِنْ جُمْلَةِ النَّعْمَاءِ قَوْلِي لَكَ الْحَمْدُ

"اے ہمارے مولا! کل نعمتوں پر سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں۔ اور میرا لک الحمد کہنا بھی سب نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

فَلَاحَمْدَ اِلَّا اَنْ تَمُنَّ بِنِعْمَةٍ

فَسُبْحَانَكَ لَا يَقْوٰى عَلٰى حَمْدِكَ الْعَبْدُ

"لہذا حمد کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تو ایک نعمت کا احسان اور کرے۔ پس تیری ذات پاک ہے۔ تیرا حمد بیان کرنا اور تیرا شکر ادا کرنا، بندے کی قوت سے باہر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف پھر وحی بھیجی:- جب تم نے یہ پہچان لیا کہ سب نعمتیں میری ہی طرف سے ہیں۔ اور سب نعمتوں کا مالک صرف میں ہوں۔ تو تم نے میرا شکر ادا کر دیا۔ اور میں تم سے اسی شکر پر راضی ہوں۔

اور ایک دوسری روایت ہے:- حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا:- انسان کے جسم میں ہر بال کے اوپر اور نیچے ایک ایک نعمت ہے۔ تو وہ اتنی نعمتوں کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:-

اے داؤد! میں دیتا ہوں، بہت زیادہ، اور راضی ہو جاتا ہوں، بہت تھوڑے پر، اور اتنی نعمتوں کا شکر :- بس یہی ہے، کہ تم یہ پہچان لو:- جتنی نعمتیں تمھارے پاس ہیں، سب میری طرف سے تم کو ملی ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک گورنر نے ان کے پاس لکھا:- میں ایک ایسے ملک میں ہوں، جہاں نعمتوں کی کثرت ہے اور میں اپنے دل سے یہ ڈرتا ہوں کہ وہ شکر کے ادا کرنے میں کمی نہ کرے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو جواب لکھا:- میں تم کو اب جتنا دیکھتا ہوں اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا عالم سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نعمت عطا فرماتا ہے۔ پھر بندہ اس پر

اللہ تعالیٰ کا حمد وشکر کرتا ہے۔تو یہ حمد وشکر اس کی نعمت سے افضل ہو جاتا ہے۔اور تم کو اس کا علم اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم سے حاصل کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیْمَانَ عِلْماً وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ

اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا فرمایا۔اور ان دونوں نے کہا :۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں۔جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

اور دوسری جگہ فرمایا:۔

وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ زُمَرًا

''وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرے۔جنت کی طرف گروہ درگروہ لیجائے جائیں گے۔''

پھر تیسری جگہ فرمایا:۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ

''اور وہ لوگ کہیں گے :۔سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم سے کئے ہوئے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا۔'' اور جنت میں داخل ہونے سے بڑھ کر کون سی نعمت ہے۔

اور چونکہ سب نعمتوں سے افضل اور اشرف نعمت قلب کی دوا اور اس کا شفا پانا ہے۔اس نفسانی خواہش کے مرض سے،جس نے اس کو غفلت کے قید خانے میں مقید کر دیا ہے۔اور اس کو اس کے مولائے حقیقی کے غضب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔لہذا مصنفؒ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔تا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بندے کو اس مرض سے شفا عطا کی ہو،تو وہ اس نعمت کی قدر کرے۔یا اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا نہ دی ہو،تو وہ اپنے کو اس نعمت سے محروم کرنے پر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔چنانچہ فرمایا:۔

تَمَكُّنُ حَلَاوَةِ الْهَوٰى مِنَ الْقَلْبِ هُوَ الدَّاءُ الْعُضَالُ

''قلب کے اندر خواہش کی شیرینی کا قائم ہو جانا بہت سخت بیماری ہے۔''

میں کہتا ہوں:- خواہش کی شیرینی دو قسم کی ہوتی ہے۔

ایک قسم ،نفس کی خواہش:- دوسری قسم ،قلب کی خواہش:- پہلی قسم ،نفس کی خواہش:- وہ اس کی جسمانی خواہشات ہیں۔ جیسے کہ کھانے اور پینے کی چیزوں اور لباسوں ،اور سواریوں اور نکاحوں اور مکانوں کی شیرینی۔

دوسری قسم ،قلب کی خواہش:- وہ اس کی باطنی خواہشات ہیں۔ جیسے کہ مرتبہ اور سرداری اور عزت اور تعریف اور خصوصیت اور کرامت کی خواہش اور محسوس ظاہری عبادتوں کی شیرینی مثلاً زاہدوں اور عابدوں کا مقام۔ اور حروف کے علم کی شیرینی۔

لیکن نفس کی خواہش کا علاج:- اس کا معاملہ قریب یعنی آسان ہے۔ اور اس کا علاج:- اس کے مقام سے بھاگ کر اور زہد (ترک دنیا) اور اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کر کے ،کرنا ممکن ہے۔

لیکن قلب کی خواہش کا علاج:- جب وہ قلب میں قائم ہو جائے۔ تو بہت مشکل ہے اور وہ ایسی مشکل بیماری ہے ،جس نے طبیبوں کو عاجز کر کے اس کے علاج سے روک دیا ہے۔ لہذا وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اور دوا سے اس کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اور اس مرض یعنی قلب کی خواہش کو صرف واردالہیہ:- سابق عنایت سے ،کسی وسیلے کے ذریعے یا بغیر وسیلے کے دور کر سکتا ہے۔

جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:-

لَا یُخْرِجُ الشَّھْوَۃَ مِنَ الْقَلْبِ ، اِلَّا خَوْفٌ مُزْعِجٌ اَوْ شَوْقٌ مُقْلِقٌ

"ہلا دینے والے خوف ،یا بے قرار کر دینے والے شوق کے سوا کوئی شی قلب سے خواہش کو نہیں نکالتی ہے۔"

میں کہتا ہوں:- جب خواہش قلب میں مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے۔ تو اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے۔

اور عام عادت کے مطابق اس کا نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کسی قہری وارد جلالی ،یا جمالی سے ہی نکلتی ہے۔

اور وارد جلالی :- وہ ہلا دینے والا خوف ہے۔ جو تم کو تھرتھرا کر تمھاری خواہش سے روک دیتا ہے۔ اور تم کو تمھارے مقام اور اہل سے باہر کر دیتا ہے۔

اور وارد جمالی :- وہ بے قرار کرنے والا شوق ہے۔ جو تم کو بے قرار کر کے تمھاری مرادوں اور فوائد سے باز رکھتا ہے۔ پھر وہ تمھارے نفس کو تم سے بھلا دیتا ہے۔ اور تم کو تمھارے رب سے مانوس کر دیتا ہے۔ اور اس مرض کے مشکل اور سخت ہونے کی وجہ سے علمائے کرام اللہ تعالیٰ سے زیادہ حجاب میں ہوتے ہیں۔ پھر عابدین، پھر زاہدین زیادہ محجوب ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ خواہش پوشیدہ ہوتی ہے اور اس خواہش والا اس آیہ کریمہ کا مصداق ہے :-

اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ

''اللہ تعالیٰ نے اس کو علم پر گمراہ کر دیا۔''

وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعاً

اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے عمل کر رہے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصیت کے راستے سے گمراہ کر دیا اور وہ لوگ عمومیت کے راستے میں باقی رہ گئے۔

لیکن ظاہری علمائے کرام :- تو وہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے علم سے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یعنی ان کا یہ ظاہری علم ہی سب سے افضل ہے۔ یہاں تک کہ میں نے بعض علما کو یہ کہتے سنا ہے :- احسان کا مقام ان علما کا یہی مقام ہے، جو وہ کتاب وسنت کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔ اور اس سے اوپر کوئی کوئی مقام نہیں ہے۔ تو اس خیال کا ان کے قلوب سے نکلنا، عنایت سابقہ کے سوا کس طرح ممکن ہے۔

لیکن عابدین اور زاہدین :- وہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ محبت اور عبادت کی انتہا یہی ہے۔ اور وہ ظاہری کرامات، جو وہ دیکھتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دور کر دیتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ سے ان کا حجاب زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے اس حال میں مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔
لیکن عوام، اور غافل لوگ :- تو یہ لوگ، اطاعت اور فرماں برداری اور اپنے رب کی طرف بڑھنے

کے لئے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

حدیث شریف میں حضرت نبی کریم ﷺ سے روایت ہے :-

(اَکْثَرُ اَھْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ) اَیِ الْمُغْفِلُوْنَ

اکثر اہل جنت لا پرواہ یعنی غافل لوگ ہوں گے۔''

اور اس بات پر کہ قلبی خواہش، نفسانی خواہش سے بہت سخت اور زیادہ مشکل ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی خواہش ان کے پیٹ میں تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ اور شیطان کی خواہش اس کے قلب میں تھی:-

قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ

اس نے کہا ''میں آدم سے بہتر ہوں۔''

لہٰذا وہ قیامت تک مردود کر دیا گیا۔

پھر تم یہ معلوم کرو۔ کہ خوف کی دو قسمیں ہیں :- ایک عوام کا خوف۔ دوسری، خواص کا خوف۔

عوام کا خوف :- سزا اور عذاب سے ہے۔ اور خواص کا خوف :- دوری اور حجاب سے ہے۔ اور شوق کی بھی دو قسمیں ہیں :-

ایک عوام کا شوق :- حور و قصور کے لئے۔ دوسری خواص کا شوق :- مشاہدہ اور حضور کے لئے۔ عوام کا شوق :- جسمانی نعمتوں کے لئے۔ اور خواص کا شوق :- روحانی نعمتوں کے لئے ہوتا ہے۔ عوام کا شوق، اللہ تعالیٰ کی اس آیہ کریمہ سے پیدا

ہوتا ہے :-

وَعَدَاللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسَاکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ

''اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ جن کے نیچے

نہریں بہتی ہیں۔ وہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ہمیشہ رہنے والے باغوں میں بہترین مکانوں کا وعدہ فرمایا ہے۔''

اور خواص کا شوق، اللہ تعالیٰ کی اس آیہ کریمہ سے پیدا ہوتا ہے:۔

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ اَكْبَرُ ذَالِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

''اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سب سے بڑی ہے۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے احسان و کرم سے ہم کو بڑے مرتبے والوں اور کامل مقام وفضیلت والوں میں سے بنائے۔ آمین

اور جب خوف یا شوق قلب میں داخل ہوتا ہے، تو اس میں سے کل ماسویٰ کو نکال دیتا ہے۔ اور قلب کو معارف اور انوار سے بھر دیتا ہے۔ تو اب اعمال خالص اور احوال پاکیزہ ہو جاتے ہیں اور اللہ بزرگ و برتر اس کے اوپر توجہ فرماتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرماتا ہے۔

كَمَا لَا يُحِبُّ الْعَمَلَ الْمُشْتَرَكَ لَا يُحِبُّ الْقَلْبَ الْمُشْتَرَكَ ، اَلْعَمَلُ الْمُشْتَرَكُ لَا يَقْبَلُهٗ ، وَالْقَلْبُ الْمُشْتَرَكُ لَا يُقْبِلُ عَلَيْهِ

''اللہ تعالیٰ جس طرح مشترک عمل کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح مشترک قلب کو بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ مشترک عمل کو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا ہے۔ اور مشترک قلب پر اللہ تعالیٰ توجہ نہیں کرتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:۔ مشترک عمل:۔ وہ ہے جس میں نفسانی فوائد دنیوی ہوں، یا اخری شامل ہوں۔

اور مشترک قلب:۔ وہ ہے جس میں ماسویٰ اللہ کی محبت ہو۔

لہٰذا جس عمل میں دنیا یا آخرت کے فوائد شامل ہوں، وہ عمل مشترک اور مدخول ہے۔ اور مدخول عمل غیر مقبول ہے۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهٗ وَ شَرِيْكَهٗ

''میں سب شریکوں سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں۔ جو شخص ایسا عمل کرتا ہے، جس میں وہ میرے ساتھ میرے غیر کو بھی شریک کرتا ہے تو میں اس عمل کو اور اس میں شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

اور جس قلب میں ماسوئ میں سے کسی شی کی محبت ہو، وہ خواہش سے آلودہ ہے۔ وہ مولائے حقیقی کی بارگاہ کے لائق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ

''اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:- اے دؤد میرے لئے گھر کو صاف کرو۔ تاکہ میں اس میں سکونت اختیار کروں۔''

حضرت ششتری رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

لِیْ حَبِیْبٌ اِنَّمَا هُوَ غَیُوْرٌ يَظَلُّ فِي الْقَلْبِ كَطَيْرٍ حَذُوْرٍ

اِذَا رَاٰی شَیْئًا اِمْتَنَعَ اَنْ یَّزُوْرُ

''میرا ایک دوست ہے۔ وہ درحقیقت بہت غیرت مند ہے۔ وہ میرے قلب میں چونکنی چڑیا کی طرح رہتا ہے۔ جب وہ میرے قلب میں اپنے ماسوائ کوئی شی دیکھتا ہے۔ تو وہ مجھ سے ملاقات سے رک جاتا ہے۔''

لہذا جس شخص نے اپنے اعمال کو اخلاص کے ساتھ مضبوط کیا، وہ قبولیت کا مستحق ہو گیا۔ اور وہ خواص میں سے ہو گیا۔ اور جس نے اپنے قلب کو غیروں سے پاک کیا۔ اس کا قلب علوم و انوار سے بھر گیا۔ اور اس سے معارف و اسرار کے چشمے جاری ہو گئے۔

اور تم یہ معلوم کرو:- مشترک عمل:- وہ ہے جس میں تین علتوں میں سے کوئی ایک علت داخل ہو۔

پہلی:- ریا۔ دوسری:- عجب یعنی خود پسندی۔ تیسری:- اجر کی خواہش پہلی علت، ریا:- وہ شرک اصغر ہے اور پہلے اس کے متعلق حدیث شریف گزر چکی ہے:-

مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهٗ وَ شَرِيْكَهٗ

''جو شخص کوئی ایسا عمل کرتا ہے، جس میں وہ میرے ساتھ میرے غیر کو شریک کرتا ہے۔ تو میں اس عمل کو اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

اور مسلم شریف کی حدیث میں ہے:-

ثَلَاثَةٌ ، اَوَّلُ مَنْ تُسْعَرُ بِهِمْ جَهَنَّمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، فَذَكَرَ الْقَارِیَ لِغَيْرِ اللهِ ،وَ الشُّجَاعَ الَّذِیْ يُقَاتِلُ لِغَيْرِ اللهِ ، وَ الْغَنِیُّ الَّذِیْ يَتَصَدَّقُ لِغَيْرِ اللهِ

''قیامت کے دن، تین قسم کے لوگوں سے دوزخ پہلے جلائی جائے گی۔ پھر آپ نے بیان فرمایا:-
پہلی قسم کے لوگ:- وہ قاری ہیں ، جو غیر اللہ کے لئے پڑھتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ:- وہ بہادر ہیں، جو غیر اللہ کے لئے جنگ کرتے ہیں۔
تیسری قسم کے لوگ:- وہ دولتمند ہیں۔ جو غیر اللہ کے لئے صدقہ کرتے ہیں۔''

دوسری علت عجب:- وہ اپنے نفس کو دیکھنا اور عمل کو اس کی طرف منسوب کرنا اور اپنے کو دوسرے لوگوں پر فوقیت دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى

''تم لوگ اپنے آپ کو پاک نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بخوبی جانتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔''

بیان کیا گیا ہے:- اس آیہ کریمہ کے معنی یہ ہیں:- جب تم کوئی عمل کرو، تو یہ نہ کہو، کہ میں نے کیا۔ اور تم اس عمل کو ان لوگوں کے سامنے نہ ظاہر کرو جو اس عمل کے معلوم کرنے کی وجہ سے تمھاری عزت کریں۔ اس لئے کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

ثَلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ :- شُحٌّ مُطَاعٌ ، وَ هَوًى مُتَّبَعٌ ، وَاَعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ

''تین چیزیں مہلک اور تباہ کن ہیں۔ پہلی، وہ بخیلی جس کی اطاعت کی جائے۔ دوسری، وہ خواہش جس کی پیروی کی جائے۔ تیسری، انسان کا اپنے آپ کو بہتر سمجھنا۔''

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

''تم لوگ اپنے آپ کو پاک نہ کہو'' کے معنی ہیں:- تم لوگ یہ عقیدہ نہ رکھو کہ تم نیک ہو۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:-

لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَخَشِيْتُ عَلَيْكُمْ مَا هُوْ اَكْبَرُ مِنَ الذُّنُوْبِ الْعُجْبَ

''اگر تم نے گناہ نہیں کیا۔ تو مجھے تمھارے لئے یہ خوف ہے، کہ تم گناہوں سے زیادہ بڑی برائی خود پسندی میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔''

بعض سلف صالحین نے فرمایا ہے:- اگر میں رات سوتے ہوئے گزاروں اور صبح شرمندہ ہو کر اٹھوں، تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ساری رات قیام اور رکوع و سجود میں گزاروں۔ اور صبح میں اپنے کو نیک سمجھتے ہوئے اٹھوں۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا:- آدمی برا کب ہوتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:- جب وہ یہ خیال کرے کہ وہ نیک ہے۔

بیان کیا گیا:- خود پسندی میں مبتلا شخص اپنے نفس اور عمل کے آفتوں سے اندھا ہوتا ہے۔ اور جو عمل مطلوب نہ ہو، وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اس شخص کا عمل مطلوب ہے، جس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے گناہوں کا خوف غالب ہوتا ہے اور ایسا شخص اپنی مدح و ثنا کا خواہاں نہیں ہوتا ہے۔ اور نہ وہ اپنے کو پاک سمجھتا ہے۔

اور اکثر اوقات انسان اپنی رائے اور عقل کو بہتر سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ دوسروں سے کچھ نہیں پوچھتا ہے اور نہ کسی بھی خواہ کی نصیحت کو سنتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سوا دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس فتنے سے سلامتی اور عافیت مانگتے ہیں۔

تیسری علت، عمل پر ثواب یعنی بدلہ چاہنا:- تو اس سے پہلے اس لئے بار بار منع کیا گیا۔ اور یہ بھی یقینی ہے۔ کہ اگر تم ثواب چاہو گے۔ تو اللہ تعالیٰ تم سے اخلاص کے سر کا مطالبہ کرے گا۔ اور شک و شبہ میں مبتلا شخص کے لئے سلامتی کے ساتھ بچ جانا ہی کافی ہے۔ کیونکہ ہر عمل میں ان علتوں میں سے کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ خواص کے اعمال کی طرح قبول نہیں کرتا ہے۔

اورمشترک قلب:-وہ ہے کہ اس میں بھی تین علتوں میں سے کوئی ایک علت ہوتی ہے۔

پہلی علت:-دنیا کی خواہش۔دوسری علت:-خصوصیت کی خواہش۔

تیسری علت:-آخرت کی نعمتوں کی خواہش اور یہ تینوں علتیں اخلاص کوخراب کر دیتی ہیں۔اور خالص توحید کے درجے سے نکال دیتی ہے۔ و باللہ التوفیق

یہاں اکیسواں باب ختم ہوا۔

اس باب کا حاصل

صحیح اور غلط اعمال اور احوال کے میزان کا بیان ہے۔اوراس میزان کا حاصل:-یہ ہے کہ جوشی نفس پر گران یعنی اس کو ناگوار ہو۔وہ صحیح ہے اور جوشی نفس کو آسان اور اچھی معلوم ہو۔وہ غلط ہے اور ان تمام چیزوں میں سے جن سے نفس کو ناگواری ہوتی ہے۔فرض اور واجب کے ادا کرنے پر قائم رہنا ہے۔نہ کہ نوافل کے ادا کرنے پر:- کیونکہ نوافل کا ادا کرنا،نفس کے لئے آسان اور مرغوب ہے تو جب اللہ تعالیٰ کونفس کی اس عادت کا علم ہوا،تو اس نے فرائض کو مقررہ اوقات کے ساتھ مقید کر دیا۔ تاکہ سستی اور ٹال مٹول فرائض کی ادائیگی کو نہ روک سکے۔

اس لئے کہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف نہیں بڑھتے ہیں۔

اور عبادت کے فرض کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض نہیں ہے۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو امتحان کی زنجیروں کے ذریعے جنت میں لے جانا چاہتا ہے۔

لہذا جس شخص پر اس کا نفس غالب آ کر عبادت کی طرف مائل ہونے سے اور اس کی خواہش سبقت کرنے والوں میں شامل ہونے سے روک دے۔تو اس پر اس کو کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غفلت اور خواہش سے نجات عطا کرے۔کیونکہ بے شک قادر مطلق اللہ تعالیٰ کی قدرت پلک جھپکنے میں یا اس سے بھی کم وقت میں کیا سے کیا کر دیتی ہے۔اور اکثر اوقات یہ خواہش یا غفلت تمھارے حق میں نعمت ثابت ہوتی ہے۔اور یہ اس طرح کہ تم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو پہچانو،کہ اس نے تم غفلت اور خواہش سے نجات عطا فرمائی۔کیونکہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس نعمت کی قدر نہیں کی۔اس لئے وہ

نعمت ان سے چھن لی گئی۔ لہذا جب اللہ تعالیٰ تم کو تمھارے نفس سے رہا کر کے اور تم کو تمھارے ہی جنس کے خواص کے زمرے میں شامل کر کے تمھارے اوپر انعام کرے اور تم نعمتوں میں ڈوب جاؤ۔ تو اس کی شکر گزاری سے غافل اور مدہوش نہ ہو جاؤ۔ اور منعم حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں کے ملنے کا اقرار ہی اس کا شکر بجالانا ہے۔

لہذا جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو، جس کو اس کے نفس نے مقید کر لیا ہے۔ اور خواہش کا مرض اس کے قلب میں پیوست ہو گیا ہے۔ تو تم یہ سمجھ لو، کہ یہی وہ دشوار اور لا علاج مرض ہے۔ تو اب اس کو صرف ہلا دینے والا خوف، یا بیقرار کرنے والا شوق ہی اس کے قلب سے دور کر سکتا ہے۔ اور جب اس کو خوف ہلا دیتا ہے۔ یا شوق بیقرار کر دیتا ہے۔ تو اس کا قلب خواہش سے پاک اور اس کا عمل خالص ہو جاتا ہے اور اب اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اس کو انوار سے معمور کر دیتا ہے تو انمیں بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کے قلب کی گہرائی میں انوار پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ظاہر قلب پر انوار ٹھہر جاتے ہیں۔

جیسا کہ مصنف رضی اللہ عنہ نے بائیسویں باب کی ابتدا میں اسی کو بیان فرمایا ہے:-

بائیسواں باب

کدورتوں سے صاف ہوکرانوار کے حاصل کرنے کی ترغیب، وقت کی حفاظت، اللہ تعالیٰ کے بندے سے محبت کرنے کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اَنْوَارٌ اُذِنَ لَهَا فِي الْوُصُوْلِ ، وَاَنْوَارٌ اُذِنَ لَهَا فِي الدُّخُوْلِ

''بعض انوار کو ظاہر قلب تک پہنچنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور بعض انوار کو قلب میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- وہ انوار جن کو قلوب تک پہنچنے کی اجازت دی جاتی ہے، وہ ایمان کے انوار ہیں۔ اور وہ اہل دلیل و برہان کے لئے ہیں۔ کیونکہ ان کے قلوب اغیار سے خالی نہیں ہوتے ہیں۔ اور ان سے آثار یعنی مخلوق کی صورتیں محو نہیں ہوتی ہے۔ لہذا جب وہ انوار آتے ہیں، تو وہ قلب کے اندرونی حصے کو آثار کی صورتوں سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔ اس لئے وہ ظاہر قلب پر ٹھہر جاتے ہیں۔ اور ایمان کے انوار کو نور واصل بھی کہتے ہیں

اور وہ انوار جن کو قلوب میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ وہ احسان کے انوار ہیں۔ جن کا تعلق شہود و عیان سے ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے چونکہ وہ لوگ اپنے قلوب کو اپنے رب کے ماسوا سے خالی کر لیتے ہیں۔ اس لئے انوار ان کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور قلوب کو کشادہ پا کر ان کی گہرائی میں ٹھہر جاتے ہیں۔ اور ان انوار کو نور داخل کہتے ہیں۔

اور نور واصل اور نور داخل کی پہچان یہ ہے:-

نورواصل والا:- تم کبھی اس کو دنیا کے ساتھ دیکھتے ہواور کبھی آخرت کے ساتھ کبھی اپنے نفس کے فوائد کے ساتھ دیکھتے ہواور کبھی اپنے رب کے حق میں مشغول پاتے ہو۔کبھی وہ غفلت میں مبتلا رہتا ہےاور کبھی ہوشیار ہوتا ہے۔

نورداخل والا:- تم اس کو ہمیشہ اپنے رب اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیکھو گے۔نہ اس کو دنیا کے فوائد اللہ تعالیٰ سے غافل کرتے ہیں، نہ آخرت کے فوائد۔وہ اپنے نفس سے غائب ہوتا ہے۔اور اپنے رب کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- ایمان ، جب قلب کے ظاہر میں ہوتا ہے،تو بندہ اپنی آخرت اور اپنی دنیا کو چاہتا ہے۔لہذا ایسا ایمان والا ،کبھی اپنے رب کے ساتھ اور کبھی اپنے نفس کے ساتھ ہوتا ہے۔اور جس قدر نور قلب میں داخل اور قائم ہوتا ہے۔اسی قدر بندے کو دنیا سے نفرت ہوتی ہے۔اور اپنی خواہش کو ترک کرتا ہے۔

اسی مفہوم میں حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

اَلنُّوْرُ اِذَا دَخَلَ الْقَلْبَ اِنْفَسَحَ وَانْشَرَحَ ، قِيْلَ :- فَهَلْ لَّهٗ مِنْ عَلَامَةٍ يَا رَسُوْلَ اللهِ ؟ قَالَ :- نَعَمْ ، اَلتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ ، وَالْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ ، وَالتَّزَوُّدُ لِسُكْنَى الْقُبُوْرِ ، وَالتَّاَهُّبُ لِيَوْمِ النُّشُوْرِ

”نور جب قلب میں داخل ہوتا ہے،تو قلب کشادہ ہو جاتا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا:-یارسول اللہ ! کیا نور کے داخل ہونے کی کوئی نشانی (پہچان) ہے؟ حضرت علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:-ہاں ہے۔بندے کے قلب میں نور کے داخل ہونے کی نشانی:-دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور آخرت کی طرف مائل ہونا اور قبر میں رہنے کے لئے سامان مہیا کرنا اور قیامت کے دن کے لئے تیاری کرنا ہے۔“

تم یہ جان لو وہ انوار جن کے قلب تک پہنچنے کی اجازت ہے۔وہ تمام مؤمنین کے لئے عام ہیں۔

حضرت ابوالحسن رضی اللہ عنہ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:-اگر گنہگار مومن کا نور ظاہر کر دیا

جائے ،تو وہ آسمان اور زمین کے درمیان کی تمام چیزوں پر چھا جائے۔

اور وہ انوار، جن کے قلب میں داخل ہونے کی اجازت ہے، وہ ایسے خواص کے لئے مخصوص ہیں، جو اغیار سے اور انوار کی آلودگی سے پاک ہوتے ہیں۔

لہذا جن لوگوں کو قلب آثار کی صورتوں سے بھرا ہوا ہے، وہ ان انوار کے اسرار کو پانے کی طمع نہ کرے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

رُبَّمَا وَرَدَتْ عَلَيْكَ الْاَنْوَارُ فَوَجَدَتِ الْقَلْبَ مَحْشُوًّا بِصُوَرِ الْاٰثَارِ ، فَارْتَحَلَتْ مِنْ حَيْثُ جَاءَ تْ

''اکثر اوقات تمھارے اوپر انوار وارد ہوتے ہیں۔لیکن وہ تمھارے قلب کو آثار کی صورتوں سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔لہذا وہ جہاں سے آئے تھے، وہیں واپس چلے جاتے ہیں۔''

میں کہتا ہوں:۔ اکثر تمھارے اوپر عالم غیب کے انوار وارد ہوتے ہیں، تاکہ تم کو عالم شہادت سے بے نیاز کر دیں۔لیکن وہ تمھارے قلب کو عالم شہادت کی صورتوں سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔لہذا وہ تمھارے پاس سے رخصت ہو کر واپس چلے جاتے ہیں اور تم کو انھیں صورتوں کے ہاتھوں میں مقید چھوڑ جاتے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:۔ اکثر تمھارے اوپر حقیقت کے انوار وارد ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ تم کو ظرف یعنی ظاہر کے قید خانے سے آزاد کرے۔لیکن وہ تمھارے قلب کو ان سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔لہذا وہ تم کو انھیں کے درمیان، ان سے محجوب ہونے کی حالت میں چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو۔ اکثر تمھارے اوپر ملکوت کے انوار وارد ہوتے ہیں۔لیکن وہ تمھارے قلب کو ملک کی ظلمت سے بھرا ہوا پاتے ہیں۔لہذا وہ تم کو مخلوق کی ظلمت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:۔کبھی تمہارے اوپر جبروت کے انوار وارد ہوتے ہیں لیکن وہ تمہارے قلب کو ملکوت کے انوار سے بھرا پاتے ہیں اور تم کو اس سے خوش اور اس کی رونق اور خوبصورتی پر قناعت گزین پاتے ہیں لہذا وہ تم کو اسی کیسا تھ ٹھیرا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اور تمھاری قناعت تم کو پکار کر کہتی ہے :- ابھی تک تم کو اللہ تعالےٰ سے محرومی ہے۔ جو شی تم تلاش کرتے ہو، وہ ابھی تم سے آگے ہے۔

اور اگر علم ، کسی محدود حد پر ختم ہو جاتا ہے۔ تو اللہ سبحانہ تعالےٰ تمام عارفین کے سردار حضرت نبی کریم ﷺ سے یہ نہ فرماتا۔

(رب زدنی علما)

"آپ کہیے :- اے میرے رب ! مجھے علم میں ترقی عطا فرما:-

اور حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے :-

كُلُّ يَوْمٍ لَا اَزْدَادُ فِيْهِ عِلْماً لَا بُوْرِكَ لِيْ فِي طُلُوْعِ شَمْسِ ذَالِكَ الْيَوْمِ اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

"جس روز میں علم میں ترقی نہ کرو، اس روز کے آفتاب کا نکلنا، میرے لئے مبارک نہ ہو۔" یا جس طرح حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہو۔"

لہذا انوار کو قلب میں داخل ہونے سے روکنے والا ، اغیار یعنی ماسوائے اللہ کا وجود ہے۔ جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے :-

فَرِّغْ قَلْبَكَ مِنَ الْاَغْيَارِ ، تَمْلَاْهُ بِالْمَعَارِفِ وَالْاَسْرَارِ

"تم اپنے قلب کو اغیار سے خالی یعنی پاک کرو۔ تو یہ پاکیزگی تمھارے قلب کو معارف واسرار سے بھر دے گا۔"

میں کہتا ہوں :- حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- اے فقیر ! تم اپنے قلب کو اغیار یعنی ماسوی اللہ سے اس طرح پاک کرو، کہ تمھارے قلب کا تعلق کائنات کی کسی شی سے باقی نہ رہے۔ خواہ وہ علوی ہو، یا سفلی۔ خواہ وہ دنیوی ہو، یا اخروی خواہ وہ ظاہری ہو، یا باطنی۔ جیسا کہ فوائد میں سے خصوصیت وغیرہ کی خواہش۔

لہذا جب تمھارا قلب اس عالم سے بالکل کوچ کر جائے اور اس میں اس کے مولائے حقیقی کی محبت کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ تو وہ یقیناً معارف سے اس طرح سے بھر جائے گا کہ تمہارے او پر

سے رحم کا حجاب اٹھ جائیگا اور تمھارا اندر سے ظاہر کی تاریکی دور ہو جائے گی۔ اور تم کل اشیا کو ملکوتی انوار مشاہدہ کرو گے۔ اور یہ مشاہدہ ذوق و تمکین کا مشاہدہ ہو گا۔ اور پھر قلب جبروت کے اسرار سے بھی بھر جائے گا۔ لہذا تم جمع کے ساتھ فرق سے اور جبروت کے مشاہدہ کے ساتھ ملکوت کے مشاہدہ سے غائب ہو جاؤ گے۔ اور قدر کے اسرار تمھارے اوپر منکشف ہوں گے۔ پھر تمھارے اوپر رضا و تسلیم کی ہلکی اور ٹھنڈی ہوا چلے گی اور تم بادشاہ کریم اللہ تعالیٰ کے پاس ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتوں میں ہوں گے۔

لہذا اس بیان کے مطابق اسرار :- معارف سے بلند اور کامل ہیں۔ کیونکہ معارف :- ملکوت کے انوار کو کہتے ہیں اور اسرار :- جبروت کے انوار کو کہتے ہیں۔

اور کبھی سائر کے سامنے ملکوت کا نور ظاہر ہوتا ہے۔ تو وہ کل کائنات کو نور ہی نور دیکھتا ہے۔ اور وہ ان انوار کا اس لئے محتاج ہے۔ تا کہ وہ ان کے ذریعے ذات کے مشاہدہ تمکین کی طرف ترقی کرے۔

جیسا کہ پڑھنے والا، لفظوں کے دیکھنے اور پڑھنے کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ معنی کو یاد کر کے مضبوطی سے ذہن نشین کر لیتا ہے۔ تو اس کو لفظوں کی حاجت نہیں رہتی ہے۔ لہذا وہ ان کا خیال بھی نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح، پہلے سالک کے سامنے کائنات کا نور ظاہر ہوتا ہے۔ تو وہ ظاہر کی تاریکی سے نکل کر اس نور میں گم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہمیشہ سیر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حقیقت کے مقام پر قابض ہو کر متمکن یعنی مضبوطی سے قائم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو مشاہدہ کی حاجت باقی نہیں رہتی ہے۔ اور جبروت کے نور کے پالینے کی بناء پر، وہ ملکوت کے نور سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اور اس حقیقت کا بیان، مصنف کے اس قول کے ضمن میں پہلے ہو چکا ہے :-

''سیر کرنے والے، جب معرفت کو پالیتے ہیں تو غیر اللہ ان کے قلوب کی آنکھ سے بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اور وہ احدیت کے مشاہدے میں اپنی ذات اور ظاہر سے بالکل گم ہو جاتے ہیں۔ ایک عارف شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے :-

اِنْ تَلَاشَی الْکَوْنُ عَنْ عَیْنِ قَلْبِیْ شَاھَدَ السِّرُّ غَیْبَہٗ فِیْ بَیَانِ

''اگر میرے قلب کی آنکھ سے مخلوق غائب ہو جائے۔ تو سر اپنے غیب کو عیاں دیکھے۔''

فَاطْرَحِ الْکَوْنَ عَنْ عِیَانِکَ وَامْحُ نُقْطَۃَ الْغَیْنِ اِنْ اَرَدْتَ تَرَانِیْ

''لہٰذا تم اپنی آنکھ سے مخلوق کو گرا دو۔ اور غین کے نقطے (یعنی غیر کے عیب) کو مٹا دو۔ اگر تم مجھ کو دیکھنا چاہتے ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے:- کہ مصنفؒ نے معارف سے علوم عرفان اور اسرار سے، ذوق اور وجدان، مراد لیا ہو۔ کیونکہ معارف:- معرفت کے علوم ہی ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ ہر شی میں معرفت حاصل کرتا ہے۔ اور کسی شی کا انکار نہیں کرتا ہے۔ اور اسرار:- ان علوم کے ذوق کو کہتے ہیں اور معرفت پہلے علم ہوتی ہے۔ اور آخر میں ذوق بن جاتی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے:- کہ واو عطف تفسیر کے لئے ہو۔ اس صورت اسرار ہی معارف ہوں گے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اور جو شخص اس مقام تک سیر کر کے جلدی پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ اپنے قلب کو اغیار سے خالی کر کے پوری طرح پاک وصاف کرے۔ کیونکہ قلب اغیار سے جس قدر خالی اور پاک ہوتا ہے۔ اسی قدر انوار و معارف سے آراستہ ہوتا ہے۔ اور جس قدر صفائی ہوتی ہے۔ اسی قدر ترقی ہوتی ہے۔

اسی لئے عارفین نے سائر کو نکاح کرنے اور اسباب و ذرائع کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے روک دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر تعلق سے پاک نہیں ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تعلق اس کو ہوتا ہی ہے۔ اور جب تک ہر تعلق سے پاک نہ ہو، ترقی نہیں کر سکتا ہے۔

پھر جب وہ حقیقت میں مضبوطی سے قائم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے معروف اللہ تعالیٰ کی مراد کے سوا، اس کی کوئی مراد باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اور وہ ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ جو کچھ اس کے مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوتا ہے۔ وہ اس کو بخوشی قبول کرتا ہے۔

اور اگر مرید کے لئے سفر لمبا ہو جائے۔ یعنی اس کی کامیابی میں تاخیر ہو جائے۔ اور وہ ان

اسرار کو نہ پائے۔ اور اس کے اوپر وہ انوار نہ ظاہر ہوں۔ تو وہ اس کو اپنے رب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش میں تاخیر نہ سمجھے۔ کیونکہ وہ بہت بڑا سخی اور بخشش کرنے والا ہے۔ بلکہ اپنی طرف سے توجہ کرنے اور اس کی طرف سبقت کرنے میں کوتاہی تصور کرے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

لَا تَسْتَبْطِي النَّوَالَ ، وَ لٰكِنِ اسْتَبْطِئ مِنْ نَفْسِكَ وُجُوْدَ الْاِقْبَالِ

''تم اللہ تعالیٰ کی بخشش میں تاخیر اور دوری کا خیال نہ کرو۔ بلکہ تم اپنی طرف سے توجہ میں کوتاہی اور خلوص میں کمی کا تصور کرو۔''

میں کہتا ہوں:- اللہ سبحانہ تعالیٰ، بڑا سخی و فیاض اور برداشت کرنے والا مہربان ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے:-

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيْهِ شِبْرًا تَقَرَّبَ مِنْهُ ذِرَاعًا ، وَ مَنْ تَقَرَّبَ مِنْهُ ذِرَاعًا تَقَرَّبَ مِنْهُ بَاعًا ، وَمَنْ اَتَاهُ يَمْشِيْ اَتَاهُ هَرْوِلَةً

''جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت کے برابر قریب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ایک گز یعنی دو ہاتھ قریب ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس چل کر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے پاس دوڑ کر آتا ہے۔

لہذا اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے قلب کے ساتھ متوجہ ہوئے ہو۔ پھر بھی اس کی طرف سے معرفت کا دروازہ کھلنے میں دیری ہو۔ تو اس کی طرف سے بخشش یعنی حجاب کے ہٹنے میں تاخیر نہ سمجھو۔ بلکہ اپنی طرف سے توجہ میں کوتاہی اور خلوص میں کمی کا تصور کرو۔ کیونکہ شاید تمہاری توجہ اس کی طرف مکمل طریقے پر نہ ہوئی ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ زبان حال سے فرماتا ہے:- وہ شخص میرے وصال کو نہیں پا سکتا ہے۔ جس کے اندر میرے غیر کا کوئی شائبہ کسی طریقے سے بھی باقی ہو۔''

لہذا اگر تم سے اغیار مٹ جائیں، تو تمہارے انوار روشن ہو جائیں گے۔ اور اگر تم غفلت کی نجاست سے پاک ہو جاؤ گے۔ تو تم حضوری کی مسجد میں داخل ہونے کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف تمھاری توجہ تو مکمل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ادب تم سے فوت ہو جاتا ہے۔ اور یہی تمھارے لئے بخشش میں تاخیر کا سبب ہوتا ہے۔ اگر چہ تمھاری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف درست اور خالص ہوتی ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- تم یہ یقین کرلو، کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہر فضل و کرم کا اہل ہے۔

لیکن کیا تم کوئی ایسا غلام بھی دیکھتے ہو۔ جو اپنے آقا کے سامنے بے ادبی کرتا، اور اپنے چہرے سے شرم کا چادر ہٹا دیتا ہے؟ لہذا اگر بندہ ایسا کرتا ہے تو وہ بخشش سے زیادہ سزا کا مستحق ہے۔

اہل معرفت نے فرمایا ہے:- تمھارا اہل استقامت ہونا، تمھارے اہل کو کرامت ہونے سے افضل ہے۔

اور جس شخص نے اپنے کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیا اور اپنے مولائے حقیقی کا خریدا ہوا غلام ہو گیا۔ تو اب وہ کسی شی کا حق اپنے آقا پر کس طرح جتا سکتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ حکایت بیان کی گئی ہے:-

انھوں نے ایک شخص کو دیکھا۔ جس نے ایک گھر خریدا اور اس کی رجسٹری کرانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ذوالنون نے اس سے فرمایا:- تم ایسا گھر نہ خرید جو فنا ہو جائے گا۔ اور اس گھر کو نہ چھوڑو جو باقی رہے گا۔ اس شخص نے کہا:-

کیا میں نے کوئی ایسا گھر خریدا ہے۔ جو باقی رہے گا؟ حضرت نے فرمایا:- کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وہ گھر نہیں خریدا ہے جس کا نام دارالسلام ہے؟ وہ سلامتی اور بزرگوں کی ہم نشینی کا گھر ہے۔ تا کہ تم اس گھر میں امن وچین حاصل کرو۔ اور ایسی نعمتوں کا لطف حاصل کرو۔ جو قیمتوں سے نہیں خریدی جا سکتی ہے۔ وہ ایسا گھر ہے، جس کی چار حدین (چوحدی) یہ ہیں:-

ایک طرف:- خائفین (خوف خدا والوں) کی منزلیں ہیں۔ دوسری طرف:- عارفین کی منزلیں ہیں۔ تیسری طرف:- مشتاقوں کی منزلیں ہیں۔ چوتھی طرف:- محبین (محبت والوں) کی منزلیں ہیں۔ اس گھر کی چھت، اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ اور اس کا دروازہ، رضوان کا دروازہ ہے۔ اس کے

دَارُ تُقًى وَرِضًى عَلَيْهِمَا اُسِّسَتْ وَ نِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ

''یہ تقویٰ اور رضامندی کا گھر ہے۔ انھیں دونوں پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے اور متقیوں کا گھر بہت ہی اچھا ہے۔

ثُمَّ نَادَى الْحَقُّ مِنْ اَرْجَائِهَا اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ

''پھر اللہ تعالیٰ اس کے کناروں سے پکارے گا:۔ اس گھر میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

اور اگر اس گھر کی رجسٹری کرانا چاہتے ہو، تو کہو:۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

''میں شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

''اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض میں کر خرید لیا ہے۔''

یہی وہ ثواب ہے، جو بندے نے بخشش کرنے والے بادشاہ اللہ تعالیٰ سے، نافرمانیوں کی ذلت سے اطاعت کی عزت کی طرف اور حرص وطمع کی مشقت سے زہد وورع کی طرف، نکلنے کی قیمت میں خریدا ہے۔ انصاف کرنے والے قلب اور زبان اس کے گواہ ہیں اور جو کچھ قرآن کریم میں نازل ہوا وہ درست ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے وقت سے، خرید وفروخت کی مضبوطی کا یہ آیہ کریمہ ضامن ہے:۔

وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

''اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے قول وقرار کا پورا کرنے والا کون ہے۔''

یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس شخص نے حضرت ذوالنون سے کہا:۔ ہاں میں تیار ہوں۔ پھر اس نے اپنا کل مال صدقہ کر دیا۔ اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور جس شخص کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اوقات کا کچھ حصہ بھی

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کسی چیز میں ضایع نہیں کرتا ہے۔

جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

حُقُوْقٌ فِي الْاَوْقَاتِ يُمْكِنُ قَضَاءُ هَا ، وَ حُقُوْقُ الْاَوْقَاتِ لَا يُمْكِنُ قَضَاءُ هَا

''وقتوں میں مقرر حقوق کی قضا ممکن ہے۔لیکن وقتوں کے حقوق کی قضا ممکن نہیں ہے۔''

میں کہتا ہوں :- وقتوں میں مقرر حقوق :- وہ عبادت ہے ،جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے محدود وقت مقرر فرمایا ہے۔جیسے کہ پنج وقتی نماز فرائض اور سنتہائے موکدہ اور اسی طرح زکوٰۃ اور روزہ ان دونوں کے لئے سال میں ایک محدود وقت مقرر ہے۔لہذا اگر ان کا وقت نکل گیا ،تو ان کی قضا ممکن ہے۔اگر چہ اس شخص کو حد سے نکل جانے والا کہا جائے گا۔لیکن بعض برائی بعض سے ہلکی اور آسان ہے۔

اور بذات خود وقتوں کے حقوق :-وہ اللہ تعالیٰ کا مراقبہ یا اس کا مشاہدہ ہے۔جو ہر شخص کو اس کی وسعت کے مطابق حاصل ہوتا ہے :-

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا

''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسی قدر تکلیف دیتا ہے ،جس قدر اس نے اس کو طاقت عطا کی ہے۔''

جب ان حقوق کا وقت فوت ہو گیا تو اس کی قضا ممکن نہیں ہے۔کیونکہ دوسرے وقت کے لئے بھی ایک مخصوص حق ہے۔جو اپنے وقت کے علاوہ ،دوسرے وقت میں ادا نہیں ہوسکتا ہے۔لہذا ہر لمحہ (سیکنڈ) میں تمھارے اوپر واجب ہے ،کہ تم اللہ کے لئے عمل کرو۔اور اس لمحہ میں اسی عمل میں مشغول رہو۔جو تم کو اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا مندی میں پہنچا دے۔اور مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے :-

اِذْ مَا مِنْ وَقْتٍ يَرِدُ اِلَّا وَ لِلّٰهِ عَلَيْكَ فِيْهِ حَقٌّ جَدِيْدٌ وَاَمْرٌ اَكِيْدٌ ، فَكَيْفَ تَقْضِىْ فِيْهِ حَقَّ غَيْرِهٖ وَ اَنْتَ لَمْ تَقْضِ حَقَّ اللّٰهِ فِيْهِ

''اس لئے کہ جو وقت بھی آتا ہے، اس میں تمھارے اوپر اللہ تعالےٰ کا ایک نیا حق اور تاکیدی حکم واجب ہوتا ہے۔ تو تم اس وقت میں دوسرے وقت کا حق کیسے ادا کرو گے۔ حالانکہ اس وقت میں اللہ تعالےٰ کے واجب حق کو تم نے ابھی ادا نہیں کیا ہے؟''

میں کہتا ہوں:- اے بندو! تمھارے اوپر جو وقت یا لمحہ آتا ہے۔ اس وقت میں تمھارے اوپر اللہ تعالےٰ کا ایک نیا حق واجب ہوتا ہے۔ خواہ وہ ذکر ہو، یا غور و فکر یا مراقبہ یا مشاہدہ، ظاہری یا باطنی خدمت:-

قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ

''ہر شخص نے اپنے پینے کے گھاٹ کو پہچان لیا ہے۔''

اور عبودیت میں ثابت ہونے اور ربوبیت کے وظیفوں کے ساتھ قائم ہونے میں سے ایک تاکیدی حکم واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت کے نئے حق، یا موکدہ حکم سے تم غافل ہو گئے اور دوسرا وقت آ گیا۔ تو تم سے قضا فوت ہو گئی۔ اور گزرے ہوئے وقت کے لئے تم شرمندہ ہو گئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک وقت کا حق تم دوسرے وقت میں ادا کرو۔ حالانکہ اس دوسرے وقت کا بھی ایک مخصوص حق ہے۔ اور اس کا ادا کرنا اسی وقت میں تمھارے اوپر واجب ہے۔ لہٰذا تمھارے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ تم ایک وقت کے حق کو دوسرے وقت میں ادا کرو۔ حالانکہ اس دوسرے وقت میں اللہ تعالےٰ کا جو حق ہے، تم نے اسی کو ادا نہیں کیا ہے۔

حاصل یہ ہے:- ہر وقت کا ایک حق ہے۔ اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کی کوئی قضا نہیں ہے۔ اسی لئے صوفیائے کرام نے آداب میں بیان کیا ہے:-

تصوف انفاس کو ضبط کرنا اور حواس کی حفاظت کرنی ہے۔

انفاس:- گھنٹوں کے منٹ اور سیکنڈ کو کہتے ہیں اور ان کا ضبط کرنا:- مختلف قسم کی طاعتوں سے ان کو آباد رکھنا ہے۔ لہٰذا جو شخص گھنٹوں کے حقوق کو ضائع کر دیتا ہے، وہ تصوف کے ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔

واللہ تعالےٰ اعلم

حضرت شیخ ابوالعباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

بندے کے اوقات چار ہیں۔ پانچواں وقت نہیں ہے۔ نعمت ہے یا مصیبت ہے، یا اطاعت ہے یا معصیت ہے اور ان اوقات میں سے ہر وقت میں، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر ایک حق ہے۔ لہٰذا نعمت کی حالت میں شکر کرنا، اور مصیبت کی حالت میں صبر کرنا اور اطاعت کی حالت میں احسان کا مشاہدہ کرنا اور معصیت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لینا، اس کی طرف رجوع کرنا اور اس سے معافی طلب کرنا ہے۔

اسی معنی میں حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

مَنْ اُعْطِیَ فَشَکَرَ ، وَابْتُلِیَ فَصَبَرَ ، وَ ظُلِمَ فَغَفَرَ ، وَ اَذْنَبَ فَاسْتَغْفَرَ
ثُمَّ سَکَتَ عَلَیْہِ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ ، فَقَالُوْا:- مَالَہٗ یَا رَسُوْلَ اللہِ ؟
قَالَ :- اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ

''ایسا شخص، جس کو عطا کیا گیا، تو اس نے شکر کیا اور مصیبت میں مبتلا کیا گیا تو اس نے صبر کیا اور اس پر ظلم کیا گیا تو اس نے معاف کر دیا اور اس نے گناہ کیا تو استغفار کیا۔ اتنا فرما کر حضرت نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دریافت کیا:-

یا رسول اللہ! اس کے لئے کیا ہے؟ حضرت ﷺ نے فرمایا:- یہی لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے۔ اور وہ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔''

یعنی قیامت کے دن ان کے لئے امن ہے۔ وہ لوگ دنیا مین ہدایت یافتہ ہیں۔ اور یہ بھی تفسیر کی گئی ہے:- ان کے لئے دنیا و آخرت میں امن ہے۔ اور وہ لوگ دنیا و آخرت دونوں میں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے والے ہیں۔

اور تم یہ جان لو! اوقات کے حقوق کے ساتھ مکمل طریقے پر قائم ہونا، بشر کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ مَا قَدَرُوا اللہَ حَقَّ قَدْرِہٖ

''ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر و منزلت کرنی چاہئے تھی، ویسی نہیں کی۔''

یعنی ان لوگوں نے ، اللہ تعالیٰ کی جیسی عبادت کرنی چاہئے تھی ، ویسی نہیں کی ۔ اور جیسا اس کے پہچاننے کا حق ہے ، ویسا نہیں پہچانا ۔ اسی لئے اوقات کے حقوق کی قضا ناممکن ہے ۔ کیونکہ اس میں سانسوں اور خطرات کی حفاظت لازمی ہے اور جبکہ ان کی حفاظت سے نماز کی حالت میں لوگ عاجز ہو جاتے ہیں ، تو وہ ہر وقت کیوں نہ عاجز ہو جائیں گے ۔ لیکن کبھی :-

يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ

''اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے ۔ خاص کر لیتا ہے ۔''

بعض عارفین نے فرمایا ہے :- بیس سال کا زمانہ گزرا ۔ میرے قلب میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شی کا خیال نہیں پیدا ہوا ۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :-

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے ۔ وہ اپنے جسمانی اعضا کو اس چیز میں استعمال کرتا ہے ، جو اس کے محبوب کو پسند ہوتی ہے ۔ اور اس کے کل اوقات عبادت کے ساتھ محفوظ ہوتے ہیں اور اگر اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان دنیا حائل ہو جائے ۔ تو وہ فوراً دنیا کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتا ہے ۔ اور چونکہ عبادت ایسے لوگوں کے ارواح کی غذا ہوتی ہے ۔ لہذا اگر وہ عبادت کو چھوڑ دیں تو وہ مر جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان سے فیض پہنچائے ۔ آمین

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اوقات کے حقوق ضائع کرنے میں عمر بھی ضائع ہوتی ہے ، جو کیمیا سے بھی زیادہ قیمتی ہے ۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے ۔

مَا فَاتَ مِنۡ عُمۡرِكَ لَا عِوَضَ لَهٗ ، وَ مَا حَصَلَ لَكَ مِنۡهُ لَا قِيۡمَةَ لَهٗ

''تمہاری جو عمر فوت ہو گئی ، اس کا بدل کچھ نہیں ہے ۔ اور تمہاری عمر میں سے جتنا تم کو حاصل ہوا ۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے ۔''

میں کہتا ہوں :- مومن کی زندگی ہی اس کا اصل سرمایہ ہے ۔ اسی میں اس کا نفع اور نقصان ہے ۔ لہذا جس نے اس کو مضبوطی سے پکڑا ۔ (یعنی نیک اعمال میں صرف کیا) وہ کامیاب ہونے والوں میں شامل ہوا ۔ اور جس نے اس کو فضولیات اور برے کاموں میں ضائع کیا ۔ وہ نقصان

اٹھانے والوں میں شامل ہوا۔ لہذا زندگی کا جو حصہ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سوا دوسرے کاموں میں گزرا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ اس کا بدل کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ جو وقت چلا گیا، وہ اب کبھی نہیں لوٹے گا۔ اور زندگی کا جو حصہ تم کو حاصل ہو گیا، اس کے لئے کوئی ایسی قیمت نہیں ہے۔، جو اس کے برابر ہو سکے۔ اس لئے کہ اگر تم اس حاصل شدہ زندگی کے حصے میں سے ایک گھنٹہ کے بدلے میں زمین کے برابر سونا خرید لو۔ تو بھی اس ایک گھنٹہ کے عوض یہ قیمت کم ہو گی۔ کیونکہ زندگی کا وہ ایک گھنٹہ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہو۔ تم اس کے عوض ایک بڑا ملک اور دائمی نعمت پاؤ گے۔ اگر ساری دنیا بیچ دی جائے۔ تو وہ اس دائمی نعمت کے ایک فی صد کے برابر بھی نہیں ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر سلف صالحین، اوقات کی حفاظت بڑی سختی سے کرتے تھے۔ اور وقت کے غنیمت جاننے میں وہ اپنی ساری کوشش خرچ کر دیتے تھے۔ وہ ہر وقت کوشش و تیاری ہی میں لگے رہتے تھے۔ اور وقت کی حفاظت کے لئے کل راحت و آرام ترک کر دیتے تھے۔

حدیث شریف میں حضرت رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے:-

لَا تَاْتِیْ عَلَی الْعَبْدِ سَاعَةٌ لَا یَذْکُرُ اللهَ فِیْهَا اِلَّا کَانَتْ عَلَیْهِ حَسْرَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ

''بندے پر جو گھڑی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گزرتی ہے۔ وہ گھڑی قیامت کے دن اس کے لئے حسرت و افسوس ثابت ہو گی۔''

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:- بندے کی عمر کے باقی حصے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بندہ اسی باقی حصے میں، عمر کا جو حصہ فوت ہو گیا ہے، اس کا تدارک کرتا ہے۔ اور جو عمر مر چکی ہے، اس کو زندہ کرتا ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- جو وقت فوت ہو جاتا ہے، وہ پھر واپس نہیں ملتا ہے اور وقت سے زیادہ قیمتی کوئی شئی نہیں ہے۔

اسی حقیقت کے بارے میں یہ شعر کہا گیا ہے:-

اَلسَّبَّاقَ اَلسَّبَّاقَ قَوْلًا وَ فِعْلًا حَذِّرِ النَّفْسَ حَسْرَةَ الْمَسْبُوْقِ

''قول وفعل میں آگے بڑھو، آگے بڑھو۔ گزرے ہوئے وقت کی حسرت سے
اپنے کو بچاؤ۔''

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

میں کچھ ایسے لوگوں سے ملا۔ جو اپنے انفاس اوقات کی حفاظت اور حرص، اس سے زیادہ کرتے تھے۔ ،جتنی حفاظت اور حرص تم لوگ دینار اور درہم کی کرتے ہو۔ جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے دینار اور درہم کو کسی فائدہ کے بغیر خرچ نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اپنا کوئی سانس عبادت کے بغیر ضائع نہیں کرتے تھے۔

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے تھے:- جب آپ کھانا بنایا کیجئے تو اس کو تھوڑا سا پتلا کر دیا کیجئے۔ کیونکہ پتلے اور خشک کے درمیان پچاس تسبیح کا فرق ہے۔''

حضرت ابوعلی جرجانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

میں نے چالیس سال سے روٹی نہیں کھائی ہے۔ کیونکہ اس کے چبانے میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں صرف ستو پانی میں گھول کر پی لیتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں نے چبانے اور نگلنے کے درمیان ساٹھ تسبیح شمار کیا ہے۔

روایت ہے :- رات اور دن کے چوبیس گھنٹے:- قیامت کے دن چوبیس برابر خزانے کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ لہذا جس شخص نے ان کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے آباد کیا ہے۔ وہ ان کو نعمتوں سے بھرے ہوئے خزانوں کی شکل میں پائے گا۔ اور جس نے ان کو ضائع کیا ہے۔ وہ ان کو خالی خزانوں کی شکل میں دیکھے گا۔ پھر افسوس کرے گا۔ اور شرمندہ ہوگا۔

حدیث شریف میں حضرت نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی ہے :-

اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ بَيْنَمَا هُمْ فِي نَعِيْمِهِمْ اِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ مِّنْ فَوْقُ اَضَاءَ تْ مِنْهُ مَنَازِلُهِمْ كَمَا تُضِيْئُ الشَّمْسُ لِاَهْلِ الدُّنْيَا ، فَيَنْظُرُوْنَ اِلٰى رِجَالٍ مِّنْ فَوْقِهِمْ اَهْلِ عِلِّيِّيْنَ يَرَوْنَهُمْ كَمَا يَرَى الْكَوَاكِبُ الدُّرِّيُّ فِي اُفُقِ السَّمَاءِ وَ قَدْفُضِّلُوْا عَلَيْهِمْ فِي الْاَنْوَارِ

وَالْجَمَالِ وَالنَّعِيمِ كَمَا فُضِّلَ الْقَمَرُ عَلٰى سَائِرِ النُّجُوْمِ فَيَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِمْ يَسِيْرُوْنَ عَلٰى نُجُبٍ تَسْرَحُ بِهِمْ فِي الْهَوَاءِ يَزُوْرُوْنَ ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ، فَيُنَادِيْ هٰؤُلَاءِ يَااِخْوَانَنَا مَا اَنْصَفْتُمُوْنَا ، كُنَّا نُصَلِّي كَمَا تُصَلُّوْنَ وَ نَصُوْمُ كَمَا تَصُوْمُوْنَ ، فَمَا هٰذَا الَّذِيْ فُضِّلْتُمْ بِهٖ عَلَيْنَا، فَاِذَا النِّدَاءُ مِنْ قِبَلِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ :- اِنَّهُمْ كَانُوْا يَجُوْعُوْنَ حِيْنَ تَشْبَعُوْنَ ، وَ يَعْطِشُوْنَ حِيْنَ تَرْوُوْنَ ، وَ يَعْرُوْنَ حِيْنَ تُكْسَوْنَ ، وَيَذْكُرُوْنَ حِيْنَ تَنْسَوْنَ ، وَ يَبْكُوْنَ حِيْنَ تَضْحَكُوْنَ ، وَ يَقُوْمُوْنَ حِيْنَ تَنَامُوْنَ ، وَ يَخَافُوْنَ حِيْنَ تَأْمَنُوْنَ ، بِذَالِكَ فُضِّلُوْا عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ، فَذَالِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى :- (فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ)

''اہل جنت، جب کہ وہ اپنی نعمتوں میں مشغول ہوں گے۔ کہ اچانک ان کے سامنے، ان کے اوپر سے ایک نور چمکے گا۔ اس سے ان کے مکانات اس طرح روشن ہو جائیں گے، جس طرح کہ سورج کے نکلنے سے دنیا والوں کے مکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر کی طرف دیکھیں گے۔ تو ان کو اہل علیین کے کچھ لوگ دکھائی دیں گے۔ وہ ان لوگوں کو ایسا روشن دیکھیں گے۔ جیسا کہ آسمان کے کنارہ پر روشن ستارہ دکھائی دیتا ہے۔ اور ان لوگوں کے انوار اور جمال اور نعمتوں میں اس قدر فضیلت (زیادتی) ہوگی۔ جس قدر چاند کی روشنی کی فضیلت سب ستاروں پر ہے۔

پھر وہ ان لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ لوگ ایسی سواریوں پر سوار ہیں۔ جو ان کو سوار کر کے ہوا میں اڑ رہی ہیں۔ اس حال میں کہ وہ لوگ اللہ بزرگ و برتر کے دیدار سے مشرف ہیں۔ لہذا اہل جنت، اہل علیین سے پکار کر کہیں گے :- اے ہمارے بھائیو! تم لوگوں نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہم تمہاری ہی طرح نمازیں پڑھتے تھے، اور تمہاری ہی طرح روزے رکھتے تھے۔ پھر وہ کیا شی ہے، جس کی بنا پر تم لوگوں کو ہمارے اوپر اس طرح فضیلت عطا کی گئی ہے؟ فوراً اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب دیا جائے گا :- جس وقت تم لوگ آسودہ ہو کر کھاتے تھے، اس وقت یہ لوگ بھوکے رہتے تھے۔ اور جس وقت تم پیٹ بھر پانی پیتے تھے، اس وقت یہ لوگ پیاسے رہتے تھے۔ اور جس وقت تم لوگ کپڑے پہنتے تھے۔ اس وقت یہ لوگ ننگے رہتے تھے۔ اور جس وقت تم لوگ غافل

رہتے تھے، اس وقت یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ اور جس وقت تم لوگ ہنستے تھے، اس وقت یہ لوگ روتے تھے۔ اور جس وقت تم لوگ سوتے تھے، اس وقت یہ لوگ نوافل میں کھڑے رہتے تھے اور جس وقت تم لوگ بے خوف اور پرسکون رہتے تھے، اس وقت یہ لوگ خوف سے بے چین رہتے تھے۔ اسی وجہ سے آج ان لوگوں کو تم لوگوں پر یہ فضیلت عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:-

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

''کسی شخص کو نہیں معلوم ہے۔ جو کچھ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والی چیزوں میں سے، ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ یہ ان کے ان اعمال کا بدلہ ہے، جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔''

اور ان چیزوں میں سے، جو اوقات کی حفاظت اور مسلسل عبادت کرنے پر مدد کرتی ہیں۔ ماسوا اللہ کو ترک کرنا، اور اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی شی سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس کا ذکر اکثر کرتا رہتا ہے۔ اور اس کی خدمت میں لگا رہتا ہے اور اس کے سامنے سرنگوں رہتا ہے۔ اور اس کا حقیقی غلام بن جاتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:-

مَا اَحْبَبْتَ شَيْئًا اِلَّا كُنْتَ لَهٗ عَبْدًا ، وَ هُوَ لَا يُحِبُّ اَنْ تَكُوْنَ لِغَيْرِهٖ عَبْدًا

جب تم کسی شے سے محبت کرتے ہو، تو تم اس کے غلام بن جاتے ہو۔ اور تمھارا محبوب یہ نہیں پسند کرتا ہے، کہ تم اس کے سوا کسی دوسرے کے غلام بنو۔''

میں کہتا ہوں:- قلب جب کسی شی سے محبت کرتا ہے۔ تو اس کی طرف بڑھتا اور اس کے سامنے جھکتا اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کرتا ہے:-

اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ

''محبت کرنے والا اس کا فرماں بردار ہوتا ہے۔ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ (یعنی اپنے محبوب کا) اور عبودیت کی حقیقت یہی ہے:- عاجزی سے جھکنا اور اطاعت کرنا اور قلب کا صرف ایک رخ ہے اور انسان کے پہلو میں صرف ایک قلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ

''اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو قلب نہیں بنایا ہے۔''

اور جبکہ قلب کا صرف ایک ہی رخ ہے۔لہذا جب وہ اس ایک رخ کے ساتھ اپنے مولائے حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو ماسوا اللہ سے اس کا رخ پھر جاتا ہے۔اور وہ اس کا حقیقی بندہ بن جاتا ہے۔اور جب وہ اپنی خواہش کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو وہ یقینی طور پر اپنے مولائے حقیقی سے منہ پھیر لیتا ہے۔اور اس کے ماسوا کا بندہ ہو جاتا ہے۔اور اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے یہ پسند نہیں کرتا ہے، کہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے کا بندہ ہو۔

جو شخص اپنی خواہش کا بندہ ہے۔اس کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوَاہُ وَاَضَلَّهُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَ قَلْبِہٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشَاوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو علم رکھنے کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔اور اس کے کان اور قلب پر مہر کر دیا ہے۔اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کے ایسا کر دینے کے بعد، اس کو کون ہدایت کر سکتا ہے۔''

یہ آیہ کریمہ اس شخص کی مذمت میں نص ہے۔جس نے اپنی خواہش کو پسند کیا۔اور اس کو اپنے مولائے حقیقی کے سوا اپنا رب بنالیا۔

لیکن اہل باطن کی تفسیر:- تو وہ ایک اشارہ ہے۔حقیقتاً تفسیر نہیں ہے اور حدیث شریف میں ہے:-

اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَاھِراً وَ بَاطِناً وَحَدًّا وَ مَطْلَعًا

''بے شک قرآن مجید کے لئے ظاہر اور باطن اور حد اور شان نزول ہے۔''

ہمارے شیخ الشیوخ سیدی حضرت محمد بن عبداللہ سے اس آیہ کریمہ کے اشارہ کے بارے میں منقول ہے:- ممکن ہے کہ یہ آیہ کریمہ تعریف میں ہو۔اور اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے:- کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا۔جس نے اپنے معبود کو جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔اپنی

خواہش بنالیا ہے۔ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے رب کی طرف سے علم اور دلیل پر قائم ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو اپنی محبت میں گم کر دیا ہے۔ اور اس کے کان اور قلب پر اپنی محبت کی مہر لگادی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال کر اس کو اپنے ماسوا کے دیکھنے سے روک دیا ہے۔ تو اس ہدایت عظمٰی کی طرف اللہ تعالےٰ کے سوا کون اسکی رہنمائی کر سکتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے سوا اس کا رہنما کوئی نہیں ہے۔

یہ تفسیر، عبادت کے ظاہر کے اعتبار سے آیہ کریمہ کے ظاہری سیاق سے خارج ہے۔ لیکن یہ اس آیہ کریمہ کی باطنی تفسیر ہے مگر اس آیہ کریمہ کی یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اور تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے کلام اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کے لئے اس گروہ صوفیائے کرام کی تفسیر مقررہ معنی کے خلاف ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ معنی، مقصود معنی نہیں ہے۔ لیکن وہ لوگ آیت اور حدیث کو اس معنی پر مقرر کرتے ہیں۔ جس پر لفظ دلالت کرتا ہے۔ پھر یہ لوگ ان اشاروں اور باریکیوں اور اسرار کو سمجھتے ہیں جو ظاہر کی منشا سے خارج ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے اسرار کی صفائی کی بنا پر ان کو خاص طور پر یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ مصنف ؒ نے لطائف المنن میں اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

اب ہم اس بیان کی طرف لوٹتے ہیں، جو پہلے بیان کر رہے تھے:۔ یعنی یہ کہ بندے کو اللہ تعالےٰ کی عبودیت اور اس کے ماسویٰ سے آزادی طلب کرنی چاہئے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:۔

تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ وَالْقَطِيْفَةِ

''دینار اور درہم اور چادر کا بندہ تباہ ہوا۔

اور ایک روایت میں اتنا زیادہ فرمایا:۔

وَالزَّوْجَةُ تَعِسَ وَانْتَكَسَ ، وَإِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ

اور بیوی کا بندہ تباہ و برباد ہوا اور اگر اس کو کانٹا چبھے تو نہ نکالا جائے۔''

حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا:۔

بندہ کون ہے؟ حضرت نے جواب دیا:- بندہ وہ ہے جس کے دل میں غیر اللہ کا ذرا سا تعلق باقی ہو۔ کیونکہ مکاتب وہ غلام ہے جس کے اوپر ایک درہم باقی ہو۔ پھر ان سے دریافت کیا:- آزاد کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا:- آزاد وہ ہے، جو اپنی طبیعت کی غلامی سے نجات پا گیا ہو۔ اور اس کا قلب اس کے نفس کی خواہشات سے نکل گیا ہو۔

منقول ہے:- حضرت شبلی رضی اللہ عنہ کے ایک مرید تھے۔ ایک روز ایک شخص نے ان کو ایک عبا پہنا دیا۔ حضرت شبلی کے سر پر ٹوپی تھی مرید کے دل میں ٹوپی کی خواہش پیدا ہوئی تا کہ عبا کے ساتھ ٹوپی بھی ہو جائے۔ حضرت شبلی کو اس کے دل کا خیال کشف سے معلوم ہوا گیا۔ لہذا عبا کو اس کے جسم سے اتر والیا۔ اور اس کو ٹوپی کے ساتھ شامل کر کے دونوں کو آگ میں ڈال دیا۔ اور مرید سے فرمایا:- تم اپنے دل میں غیر اللہ کی طرف کوئی توجہ باقی نہ رکھو۔

بعض اہل ظاہر علما نے جو ظاہری شریعت پر منجمد ہیں، اصل مقصد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ان کے اس فعل پر اعتراض کیا ہے۔ اس لئے کہ صوفیائے کرام کے اعمال کی بنیاد قلبی عبادت پر ہے۔ کیونکہ اگر قلب ظاہری اعمال کے موافق نہ ہو، تو وہ اعمال صرف ڈھانچہ ہیں، جن کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

و باللہ التوفیق

اور تم یہ جان تو! جو شخص اپنی طبیعت کی غلامی سے نجات پا گیا اور اپنے نفس کی قید سے رہا ہو گیا۔ وہ اپنے رب کی محبت میں ثابت قدمی سے قائم ہو گیا۔

اور محبت کے لئے ابتدا اور وسط یعنی درمیان اور انتہا ہے۔

محبت کی ابتدا:- حکم کی تعمیل، اور منع سے پرہیز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

”آپ فرما دیجئے:- اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو تم میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے محبت کرے گا۔“

محبت کا وسط:- زبان کا ذکر میں مشغول ہونا اور قلب کا محبوب کے مشاہدہ سے متعلق ہونا ہے۔

محبت کی انتہا:-اس کو نہ عبارت پاسکتی ہے۔ نہ وہ وہاں تک اشارہ پہنچ سکتا ہے۔

مندرجہ اشعار میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:-

فَلَمْ یَبْقَ اِلَّا اللّٰہُ لَا رَبَّ غَیْرُہٗ حَبِیْبٌ لِقَلْبٍ غَابَ عَنْ کُلِّ مَقْصَدٖ

''پس اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ باقی نہیں ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ اس قلب کا دوست ہے، جو ہر مقصد سے گم ہو گیا۔''

ھَنِیْئًا لِمَنْ قَدْ نَالَ حُبَّ حَبِیْبِہٖ وَ خَاضَ بِتَرْکِ الْغَیْرِ اَکْرَمَ مَوْرَدٖ

''مبارک ہے وہ شخص، جس نے اپنے دوست کی محبت کو پالیا اور غیر کو ترک کر کے بہترین چشمے میں غوطہ لگایا۔''

نَعِیْمٌ بِلَا حَدٍّ لَدَیْہِ مُجَدَّدٌ عَلٰی عَدَدِ الْاَنْفَاسِ فِی کُلِّ مَشْھَدٖ

''اس کے پاس غیر محدود نعمت ہے۔ جو سانسوں کی تعداد کے مطابق ہر مظہر میں نئی شکل اختیار کرتی ہے۔''

روایت ہے:- حضرت بایزید رضی اللہ عنہ ممبر کے سامنے تشریف فرما تھے۔ جب خطیب نے یہ آیہ کریمہ تلاوت کی:-

وَ مَا قَدَرُوْا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ

''ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی قدر نہیں کی جیسی کرنی چاہئے تھی۔''

تو انھوں نے اپنے اوپر اتنا ضبط کیا، کہ ان کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔ لہذا ان حقیقتوں تک نہ عوام پہنچ سکتے ہیں، نہ خواص، بلکہ ان کے مزے سے صرف خاص الخاص حضرات ہی آشنا ہوتے ہیں۔

اسی حقیقت میں ایک عارف نے بہت خوب اشعار فرمائے ہیں:-

وَ حَقِّكَ لَوْ اَفْنَیْتَ قَلْبِیْ صَبَابَۃً لَکُنْتُ عَلٰی ھٰذَا حَبِیْبًا اِلٰی قَلْبِیْ

''تیرے حق کی قسم، اگر تو میرے قلب کو محبت میں فنا کر دے۔ تو اس کے باوجود تو میرے قلب کو

محبوب رہے گا۔''

أَزِيْدُ عَلٰى عَذْلِ الْعُذُوْلِ تَشَوُّقًا ۔۔۔ وَوَجْدًا عَلٰى وَجْدٍ وَّ حُبًّا عَلٰى حُبِّ

''میں ملامت کرنے والے کی ملامت کے باوجود شوق میں بڑھتا جاتا ہوں اور وجد پر وجد اور محبت پر محبت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔''

اَبَى الْقَلْبُ اِلَّا اَنْتَ فِي كُلِّ حَالَةٍ ۔۔۔ حَبِيْبًا وَلَوْ دَارَتْ عَلَيْهِ يَدُ الْكَرْبِ

''میرے قلب نے ہر شی کی محبت سے انکار کر دیا ہے۔ مگر تم کو ہر حال میں محبوب بنایا ہے۔ اگر چہ اس پر مصیبت کا ہاتھ پھرے۔''

فَلَا تَبْتَلِيْهِ بِالْبُعَادِ فَاِنَّمَا ۔۔۔ تَلَذُّذُ اَنْفَاسِ الْمُحِبِّيْنَ بِالْقُرْبِ

''لہذا جدائی سے میرے قلب کا امتحان نہ لے۔ کیونکہ عاشقوں کے سانسوں کی لذت محبوب کے قرب میں ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے سے محبت کرنے کا مفہوم، جبکہ وہ اس پر توجہ کرے:۔

اپنی بارگاہ سے اس کو قریب کرنا اور اپنے کسی فائدے کے بغیر اس کو اپنی محبت کی ہدایت کرنی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر کے اطاعت کرتا ہے۔ اس کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور جو شخص اس کی طرف سے منہ پھیر کر نافرمانی کرتا ہے۔ اس کی نافرمانی سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر شی سے بے نیاز ہے۔

جیسا کہ حضرت مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

لَا تَنْفَعُهٗ طَاعَتُكَ ، وَلَا تَضُرُّهٗ مَعْصِيَتُكَ ، وَ اِنَّمَا اَمَرَكَ بِهٰذَا وَ نَهَاكَ عَنْ هٰذَا لِمَا يَعُوْدُ اِلَيْكَ ، لَا يَزِيْدُ فِي عِزِّهٖ اِقْبَالُ مَنْ اَقْبَلَ عَلَيْهِ ، وَ لَا يَنْقُصُ مِنْ قَدْرِهٖ اِدْبَارُ مَنْ اَدْبَرَ عَنْهُ

''تمہاری اطاعت اللہ تعالیٰ کو فائدہ نہیں پہنچاتی ہے۔ اور تمہاری نافرمانی اس کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ اور اس نے تم کو جو اطاعت کا حکم دیا، اور نافرمانی سے منع کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ اطاعت کا نفع

اور نافرمانی کا نقصان تمھاری ہی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی طرف بڑھنے والے کا بڑھنا، اس کی عزت میں کچھ اضافہ نہیں کرتا ہے۔ اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے والے کا پیچھے ہٹنا، اس کے مرتبہ اور شان کو کچھ کم نہیں کرتا ہے۔''

میں کہتا ہوں :- اللہ سبحانہ تعالیٰ ہر شے سے بے نیاز ہے۔ اور ہر شے اس کی محتاج ہے اطاعت کرنے والوں کی اطاعت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اور معصیت کرنے والوں کی معصیت سے اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

اور عنقریب مناجات کے سلسلے میں یہ بیان آئے گا :- اے میرے معبود تیری رضا مندی اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے تیری طرف سے اس کے لئے کوئی سبب ہو۔ تو پھر میری طرف سے اس کے لئے کوئی سبب کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اپنی ذات میں اس سے بے نیاز ہے کہ تجھ کو تیری طرف سے کوئی فائدہ پہنچے۔ پھر میری طرف سے تو کیوں بے نیاز نہ ہو گا۔؟

لہذا اے بندو یا انسانو! تمھاری اطاعت اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی ہے کہ وہ اس کا محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ اور تمھاری معصیت سے اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس سے عاجز ہو :-

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ

''وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس نے تم کو اطاعت کا حکم صرف اس لئے دیا ہے تا کہ وہ تم کو اپنی طرف قریب کرے :-

اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

''بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان والوں سے قریب ہے۔''

اور اس نے معصیتوں سے تم کو اس لئے منع کیا ہے کہ اس نے معصیت کو اپنی بارگاہ سے دوری کی علامت مقرر کی ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے تم کو جس شے کا حکم دیا ہے وہ اس کی قرب اور حضوری کے آداب ہیں اور

جس شی سے تم کو منع کیا ہے۔ اس میں نقصان اور بارگاہ سے دوری ہے۔ کیونکہ اس میں بے ادبی ہے اور تحقیق یہ ہے:- کہ

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ

"وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (یعنی وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے) اور ان لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔ (یعنی سب لوگ اس کے سامنے جواب دہ ہیں۔)

اس کی طرف متوجہ ہو کر بڑھنے والوں کا بڑھنا اس کی عزت اور مرتبہ میں کچھ اضافہ نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عزت اور مرتبہ ازلی قدیم ہے اور اس سے منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے والے کا پیچھے ہٹنا اس کی شان میں کچھ کمی نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کل عالم سے بے نیاز ہے۔ حدیث قدسی میں ہے:-

لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَاٰخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مَازَادَ ذَالِکَ فِی مُلْکِیْ شَیْئًا ، وَ لَو اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مَانَقَصَ ذَالِکَ مِنْ مُلْکِیْ شَیْئًا

"اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور انسان اور جن سب کے سب صرف ایک سب سے زیادہ پرہیز گار شخص کے قلب پر جمع ہو جائیں۔ تو ان کے جمع ہونے سے میرے ملک میں کچھ زیادتی نہیں ہوگی اور اگر تمھارے اگلے اور پچھلے اور انسان اور جن سب کے سب صرف ایک سب سے زیادہ بدکار شخص کے قلب پر جمع ہو جائیں۔ تو اس سے میری ملک میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث کو حضرت امام مسلم نے "مسلم شریف میں بیان کیا ہے۔"

اور اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے ایک نام "قدوس" ہے اس کے معنی ہے:- پاک۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- قدوس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر ایسے کمال سے پاک ہے۔ جو اس کی ذات کے لائق نہیں ہے اور اس طرح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ہر نقائص سے پاک ہے۔ کیونکہ اس کی طرف نقائص کی نسبت درست ہی نہیں ہے۔ پھر اس سے اس کو پاک سمجھنا کیسا۔ اس لئے کہ کسی شی سے نفی اسی کی، کی جاتی ہے۔ جس کا ثابت کرنا اس کے لئے درست ہو۔ لہذا اگر تم اس

شی کی نفی کرو گے۔ جس کا اثبات ہی درست نہیں ہے۔ تو اکثر اوقات یہ نقص ہو جائے گا۔ جیسا کہ کہا جائے کہ بادشاہ قصاب نہیں ہے۔ تو اس طرح کہنے سے اس کی ذات میں نقص پیدا ہو جائے گا۔

اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو نقائص سے پاک سمجھنے کی اجازت دی ہے۔ اس سے ان کی مراد کمال تقدیس و تنزیہ (کامل پاکیزگی) ہے۔

اور بعض عارفین نے فرمایا ہے:- اگر خالق کی پاکیزگی مخلوق اپنی عاجز زبان سے بیان کرنے چاہے تو وہ نہیں کر سکتی ہے۔ اس لئے حضرت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ

"میں تیری ثنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں۔ تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف کی ہے۔"

پھر بعض عارفین نے اس کو اس طرح فرمایا ہے:- اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسمائے حسنیٰ سب کے سب کل ہیں۔ اور مخلوق جزو ہے۔ اور جزو کل کو نہیں گھیر سکتا ہے نہ اس کی حقیقت کو پا سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی تاویلوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مقدس شان کے لائق معنی سے خارج کر دینے والی ہیں۔ یہ تسلیم کرنا چاہئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا ہے۔

اس حقیقت کے متعلق ایک عارف کا شعر ہے:-

لَا یَعْلَمُ اللّٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَاتَّئِدُوْا وَالدِّیْنُ دِیْنَانِ اِیْمَانٌ وَ اِشْرَاكٌ

"اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ لہٰذا تم لوگ اس کے جاننے سے عاجز بن جاؤ۔ اور دین دو ہیں۔ ایمان اور شرک"

وَ لِلْعُقُوْلِ حُدُوْدٌ لَا یُجَاوِزُهٗ وَالْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ

"اور عقلوں کے لئے حدیں مقرر ہیں۔ وہ اپنی حدوں سے آگے نہیں جا سکتی ہیں۔ اور ادراک کے پانے سے عاجز رہنے ہی کا نام ادراک ہے۔" یعنی سمجھنے سے عاجز ہونے کا نام سمجھنا ہے۔

اور یہ معرفت کی ابتدا ہے۔

اور معرفت کا وسط (درمیان):- حقیقت کے سمندر سے چلو بھر پانی پینا اور طریقت کے اسرار سے آگاہ ہونا ہے۔ اور عوام کی کل عقلیں اس کو نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ اس میں صرف خواص ہی غوطہ لگاتے ہیں۔ لہذا جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں نام سے ذات پر دلیل بیان کی گئی ہے اور یہ ایسا مقام ہے، جہاں نام اور ذات اور صفت اور موصوف کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا:- اسی بنا پر صوفیائے کرام نے فرمایا ہے:-

جمع:- فرق کا ختم ہو جانا ہے۔ اس کے بعد صرف جمع الجمع باقی رہتا ہے۔ اور یہی معرفت کی انتہا اور اصل مقصد ہے۔

لہذا معرفت کی ابتدا:- صنعت سے صانع پر دلیل کرنا ہے اور معرفت کا وسط:- صانع سے صنعت پر دلیل کرنا ہے۔ اور معرفت کی انتہا:- اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی کا فنا ہو جانا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

”جو کچھ زمین پر ہے، سب فنا ہو جانے والا ہے۔ اور صرف تمہارے بزرگ و برتر رب اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس باقی رہے گی۔

یہ حضرت ششطیی رضی اللہ عنہ نے مختصر طور پر بیان فرمایا ہے۔

یہاں بائیسواں باب ختم ہوا۔

باب کا حاصل

کدورتوں سے پاک ہو کر انوار کے حاصل کرنے کی رغبت دلانا ہے۔ تو جب تم اپنے قلب کو اغیار کی کدورتوں سے پاک کر لو۔ پھر بھی تمہارے لئے معرفت کا دروازہ نہ کھلے، تو تم اللہ تعالیٰ کی بخشش کو دور نہ سمجھو۔ بلکہ تم اس کی طرف اپنے متوجہ ہونے میں کوتاہی سمجھو۔ اور اپنے رب کی طرف بندے کی توجہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے، جب تک کہ وہ ہمہ اوقات اس کی طلب میں مستغرق نہ رہے۔ لہذا عمر کے ہر وقت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور وقت کی حفاظت بندے کے لئے اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک کہ وہ کائنات کی غلامی سے آزاد نہ ہو جائے۔ اور جب وہ ماسوائی کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مولائے حقیقی کا حقیقی بندہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اللہ

سبحانہ تعالیٰ اپنی بارگاہ کی حضوری کے لئے اس کو منتخب کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی فائدہ ہے، نہ نقصان۔ اور در حقیقت اس کا فائدہ اسی کی طرف اور اس کا نقصان اسی کے اوپر لوٹتا ہے۔ اس لئے کہ توجہ کرنے والے کی توجہ سے اللہ تعالیٰ کی عزت میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی ہے۔ اور منہ پھیر کر پیچھے ہٹنے والے کے پیچھے ہٹنے سے اس کی عزت میں کچھ کمی نہیں ہوتی ہے۔ اور جو شخص بھی اس کے قریب پہنچا ہے، وہ صرف اس کے فضل سے پہنچا ہے۔ اور جو شخص اس سے دور ہوا ہے، وہ اس کے انصاف سے دور ہوا ہے۔

اور بندے کا اپنے مولائے حقیقی تک پہنچنے کا مفہوم:۔ اس کو اپنے رب کی عظمت کے نور اور اس کی بلندی کا علم ہونا ہے۔ مصنف رضی اللہ عنہ نے تیئیسویں باب کی ابتدا میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

تیئسواں باب

قرب ووصال اور اس سے پیدا ہونے والے نزول کے مقامات اور احوال کے نتائج اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیازی کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

وَ صُوْلُكَ اِلَیْهِ وَصُوْلُكَ اِلَى الْعِلْمِ بِهٖ ، وَ اِلَّا فَجَلَّ رَبُّنَا اَنْ يَّتَّصِلَ هُوَ بِشَیْءٍ

''اللہ تعالیٰ تک تمھارا پہنچنا:-اس کے ساتھ علم، یعنی اس کی معرفت تک، تمھارا پہنچنا ہے۔ ورنہ ہمارا رب تعالیٰ اس سے بلند و پاک ہے کہ وہ کسی شی سے متصل ہو۔''

متصوفانہ الفاظ واصطلاحات

میں کہتا ہوں:-اہل فن یعنی صوفیائے کرام نے اس مقام میں کچھ اصطلاحات والفاظ مقرر کئے ہیں۔ جن کو تم لوگ آپس میں معانی سمجھنے کے لئے استعمال کرتے ہو۔

ان اصطلاحات میں سے:-سیر اور رحیل اور منازل اور مناہل اور مقامات کے ذکر ہیں۔

اور انھیں اصطلاحات میں سے رجوع اور وقوف ہیں۔ اور یہ سب الفاظ، نفس کے ساتھ مجاہدہ اور اس کے ساتھ جنگ کرنے اور نفس کے تعلقات اور عادات کے ختم کرنے یا ان میں سے کسی شی کے ساتھ ٹھہرنے سے کنایہ ہیں۔

اور عنقریب اس سلسلے میں مصنفؒ کا یہ بیان آئے گا:-اگر نفوس کے میدان نہ ہوتے تو سائرین کی سیر ثابت نہ ہوتی۔''

اور انھیں اصطلاحات میں سے:-وصول اور تمکین اور سکون اور اطمینان ہیں۔ اور انھیں

میں سے :- مشاہدہ اور مکالمہ اور مجالسہ اور مسادورہ ہیں۔

اور یہ سب، اس سے کنایہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال میں سے ان کی ارواح نے حاصل کیا اور جن کا مزہ ان کے اسرار نے چکھا ہے۔ اور ان میں سے کچھ اصطلاحات کی تشریح انشاء اللہ اپنے مقام میں آئے گی۔

اور وصول کے معنی :- صوفیائے کرام کے نزدیک، اللہ تعالیٰ کے واحد وجود کے علم کا ثابت اور قائم ہو جانا ہے۔

لہٰذا تمہارا اللہ تعالیٰ تک پہنچنا :- یہ ہے کہ تم کو اپنے عدم (نہ ہونے) کا شعور اس حد تک ہو جائے کہ تمہارے نزدیک تمہارا عدم ضروری ہو جائے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق تمہارا علم ہو۔ اور فی الحقیقت یہ امر تم کو حاصل ہے۔ لیکن تم کو اس کا شعور نہیں ہے۔

اور بعض صوفیائے کرام نے اس حقیقت کے بارے میں اشعار کہے ہیں۔ ان میں سے بعض شعر حضرت ششتری رضی اللہ عنہ کا ہے :-

بَیْنَ طُلُوْعٍ وَّ نُزُوْلٍ تَخَبَّلَتِ الْغُزُوْلُ

''طلوع اور نزول کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔''

اَفْنِ مَنْ لَّمْ یَکُنْ یَبْقَ مَنْ لَّمْ یَزُوْلُ

''حقیقت میں جس کا وجود نہیں ہے، اس کو فنا کر دو۔ تا کہ صرف وہ ذات باقی رہ جائے، جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔''

جُوْلْ کَیْ تَزُوْلْ اَوِ امْشِ نَزْعَ الْفُحُوْلِ

''فکر کو دوڑاؤ تا کہ تم فنا ہو جاؤ۔ یا مردوں سے مقابلہ کر لئے چلو۔''

لہٰذا زوال یعنی فنا ہی معرفت ہے۔ اور یہی وصول کے معنی ہیں۔ اور اس کا سبب فکر کو کام میں لانا ہے۔ اسی لئے فکر کرنے کا حکم بندے کو دیا گیا ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ سیدی علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :- مشاہدہ سب لوگ کرتے ہیں۔ مگر ان کو معرفت حاصل نہیں ہوتی ہے۔

اور میں نے اپنے شیخ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:-

انسان سب کے سب وحدت کے سمندر میں ہیں۔ لیکن وہ سمجھتے نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ تک بندے کا پہنچنا، یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے علم میں ثابت اور قائم ہو جائے۔ اور اپنے نفس اور کل ماسویٰ سے گم ہو جائے۔ ورنہ محسوس ظاہری طریقے پر پہنچنے کا اعتقاد رکھنا باطل ہے۔ اور ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہمارا رب تعالیٰ اس سے بلند اور اعلیٰ ہے کہ کوئی شی اس سے قریب ہو۔ کیونکہ ہر شی کے لئے ایک مکان میں محدود ہونا لازم ہے۔ یا وہ کسی شے سے قریب ہو۔ کیونکہ ہر شی کے لئے محتاج اور محدود ہونا لازم ہے۔ اور اللہ اس سے بلند اور پاک ہے۔ کیونکہ وہ غیر محدود اور بے نیاز ہے۔

اور تم یہ معلوم کرو:- اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ علم کسبی ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے نفس اور حس سے گم رہتا ہے۔ سکر کے بعد سکر اور حیرت کے بعد حیرت ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بعد میں ہوشیار ہوتا ہے۔ اور حس کا پردہ اور جہالت کا بادل اور نفس کی ظلمت، اس سے دور ہو جاتی ہے۔ پھر دن کا سورج اس کے اوپر روشن ہوتا ہے۔ اور اغیار کی ظلمت اس سے دور ہو جاتی ہے۔

اسی حقیقت کے بارے میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:-

لَیۡلِیۡ بِوَجۡھِکَ مُشۡرِقٌ وَ ظَلَامُہٗ فِی النَّاسِ سَارِ

''میری رات تمہارے چہرے کے سبب روشن ہے۔ حالانکہ دوسرے لوگوں پر اس کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔''

اَلنَّاسُ فِی سَدَفِ الظَّلَامِ وَ نَحۡنُ فِی ضَوۡءِ النَّھَارِ

''لوگ تاریکی کے پردے میں ہیں۔ اور ہم دن کی روشنی میں ہیں۔''

یعنی میرے وجود کی رات تمہاری ذات کے مشاہدے کے سبب روشن ہے۔ اور دوسرے لوگوں پر جدائی کی رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ لوگ مخلوق کی ظلمت کے پردے میں ہیں اور ہم عرفان کے سورج کی روشنی میں ہیں۔''

پھر وہ ہمیشہ شیخ کی تربیت میں، اس کے زیر سایہ رہ کر اس کی مدد حاصل کر کے اپنے صدق

واخلاص کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ظلمتوں میں ڈوبا ہوا دشمن یعنی نفس اس کا فرماں بردار ہو جاتا ہے۔ اور خالص نورانی رہ جاتا ہے۔ اور وہ اس کو بذات خود بھی محسوس کرتا ہے۔ اس وقت وہ زبان حال سے کہتا ہے :- مقابلہ کرنے والے دشمن نفس نے شکست کا اقرار کرلیا ہے۔ اور جنگ ختم ہوگئی۔

پھر جب نفس خالص نورانی ہو جاتا ہے۔ تو وہ ہرشی سے مدد حاصل کرتا ہے۔ ہرشی سے پیتا ہے۔ اور ہرشی سے حصہ لیتا ہے۔ پھر اس کے بعد واسطہ تک اس کا پہنچنا، شکر و احسان کے طور پر باقی رہتا ہے :-

اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَيْكَ

''تم میرا اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ۔''

اور اس وقت وہ اپنی زبان حال وقال سے یہ اشعار پڑھتا ہے :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا تَفْنٰى مَحَامِدُهٗ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ فِی الْاٰصَالِ وَالْبُكَرِ

''سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جس کی خوبیاں فنا نہیں ہوں گی۔ اور سب تعریفیں صبح و شام اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔''

مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ اَضْحٰى عَالِمًا فَطِنًا بِاللّٰهِ فِیْ كُلِّ مَا يَبْدُوْ مِنَ الصُّوَرِ

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام صورتوں میں بخوبی پہچانتا ہے، جو ظاہر ہیں۔''

يَا طَالِبَ الْوَصْلِ جُدْ بِالنَّفْسِ مُلْتَفِتًا عَنْهَا اِلٰى مَنْزِلِ الْاَشْيَاءِ بِالْقَدَرِ

''اے وصل کے طالب نفس سے منہ پھیر کر قضا و قدر سے موافقت کر کے اشیاء کے منزل کی طرف متوجہ ہو کر نفس کو خرچ کر دو۔''

فَاِنْ ظَفِرْتَ فَاَنْتَ الْفَرْدُ وَالْعَلَمُ اَلْمَنْعُوْتُ بِالْحُسْنِ وَالْحُسْنٰى لِذِیْ نَظَرِ

''لہذا اگر تم اس طرح نفس کے خرچ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو تم وہ فرد اور نشان ہو۔ جس کی تعریف خوبی کے ساتھ کی گئی ہے اور اہل نظر کے سامنے تم بھلائی ہو۔''

اوران اصطلاحات میں سے :- قرب اور استشراف (آگاہی) اور مراقبہ ہیں۔

حضرت مصنفؒ نے قرب کے معنی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:-

قُرْبُكَ مِنْهُ اَنْ تَكُوْنَ مُشَاهِدًا لِقُرْبِهٖ ، وَ اِلَّا فَمِنْ اَيْنَ اَنْتَ وَ وُجُوْدُ قُرْبِهٖ؟

''اللہ تعالیٰ سے تمھارے قرب کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے قرب کا مشاہدہ کررہے ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تم کہاں اور اس کا قرب کہاں؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

میں کہتا ہوں :- جب تم نے اس حقیقت کو معلوم کرلیا، کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کے اثبات کے ساتھ ثابت ہے اور اس کی ذات کی احدیت کے ساتھ فنا ہے۔ تو تم نے علم یقین سے یہ جان لیا کہ کائنات اور مکان و زمان کا وجود نہیں اور یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا وجود تنہا تھا۔ اور اس کے ساتھ زمان و مکان نہیں تھا۔ اسی طرح وہ اب بھی ہے۔ اس کے ساتھ زمان و مکان نہیں ہے۔ اس کی احدیت کے نور نے کائنات کو مٹا دیا ہے۔ لہذا اس کے وجود سے زمان و مکان ختم ہوگئے۔ اور صرف اللہ واحد منان باقی رہ گیا۔

بخاری شریف میں حضرت رسول اللہ ﷺ نے روایت کی ہے :-

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى :- يَسُبُّ ابْنُ اٰدَمَ الدَّهْرَ وَ اَنَا الدَّهْرُ بِيَدِىَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- آدمی زمانہ کو برا کہتا ہے۔ حالانکہ زمانہ میں ہوں۔ میرے ہی قبضے میں رات اور دن ہیں۔''

لہذا حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے ہے۔ اور اس کی صفات کے اثر کے لئے، جو ظاہر ہوا، اور ان اشیاء میں پوشیدہ ہوگیا، جو ظاہر ہوئیں۔

لہذا جب تم کو یہ معلوم ہوگیا۔ تو تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ہر شی سے قریب ہے اور ہر شی کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کے سوا کوئی شی موجود نہیں ہے۔''

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

''اس کے مثل کوئی شی نہیں ہے۔''

لیکن حکیمِ مطلق کی حکمت نے حادث اور قدیم کو قائم کیا اور جس شخص کی بصیرت کی آنکھ

اللہ تعالیٰ نے کھول دی، وہ اس کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو عدم دیکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کو گھیرے ہوئے اور اس کے وجود کو فنا کرنے والا ہے اور جس شخص کی بصیرت کی آنکھ اللہ تعالیٰ نے اندھی کر دی۔ وہ فرق کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے۔ اور دوری کے سوا کچھ نہیں پاتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنے قریب کرنا چاہتا ہے، تو اس کی بصیرت کی شعاع کو کھول دیتا ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب اور اپنے کو گھیرے ہوئے دیکھتا ہے۔

روایت ہے:- حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنے شیخ کے سامنے کہا:-

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ یَوْمَ لِقَائِکَ

''اے اللہ! تو اپنی ملاقات کے دن مجھ کو معاف کر دے۔'' ان کے شیخ نے فرمایا اللہ تمہاری رات اور تمہارے دن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے لیکن ظلم نے ظلمت کو واجب کیا اور قضا و قدر پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے۔ محبت کے درجوں اور وصال کے مقاموں سے دور ہونے کا حکم دیا۔ اور ظالم کے لئے وہ دن مقرر ہے۔ جس دن وہ شک نہ کر سکے گا۔ نہ کوئی تدبیر کر سکے گا۔ اور سابق حال میں آ جائے گا۔

اَسْمِعْ بِھِمْ وَاَبْصِرْ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰکِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِی ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ''جس روز وہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے اس روز وہ اپنے ظلم اور اس کے انجام کو سنیں گے۔ اور دیکھیں گے۔ لیکن آج اس دنیا میں یہ ظالم صریح گمراہی میں ہیں''

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے تمہارے قریب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کو وجود اور احاطہ کے قرب کے حیثیت سے، اپنے قریب مشاہدہ کرتے ہو۔ اور یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ تمہارا عالم لطیف اور تمہارے حس کا دائرہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے تمہارا قرب ثابت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَ اِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ

''اور جب ہم نے تم سے کہا، بیشک تمہارا رب لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَهِیْدٌ

”کیا تم اپنے رب کو کافی نہیں سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ ہر شی کا دیکھنے والا ہے۔

لیکن اگر تمھارا یہ اعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ تم اپنے نفس کے موجود ہونے اور اپنے وہمی حس کے ثابت ہونے کا یقین رکھتے ہو۔ تو تم صرف دوری دیکھو گے۔ کیونکہ کہاں تم اور تمھارا محسوس قرب اور کہاں اللہ تعالیٰ کا لطیف نور۔ کیسے ممکن ہے۔ کہ تم اس کو محسوس آنکھ سے دیکھ سکو؟ لہذا جب تک تم عالمِ اجسام میں ہو۔ عالمِ ارواح سے قریب ہونے کی حالت میں بھی اس سے دور رہو گئے۔

جیسا کہ ایک عارف نے اس حقیقت کو اشعار میں بیان فرمایا ہے:-

وَ مِنْ عَجَبٍ اَنِّی اَحِنُّ اِلَیْهِمْ وَ اَسْاَلُ شَوْقًا عَنْهُمْ وَ هُمْ مَعِیْ

”تعجب ہے کہ میں ان کا مشتاق ہوں اور ان کے بارے میں بڑے شوق سے دریافت کرتا ہوں۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہیں۔“

وَ تَبْکِیْهِمْ عَیْنِیْ وَ هُمْ بِسَوَادِهَا وَ یَشْکُوْ النَّوٰی قَلْبِیْ وَ هُمْ بَیْنَ اَضْلُعِیْ

”میری آنکھ ان کے لئے روتی ہے۔ حالانکہ وہ میری آنکھ کی پتلی ہی میں ہیں اور میرا قلب جدائی کی شکایت کرتا ہے۔ حالانکہ وہ میری پسلیوں کے درمیان ہیں۔“

وہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، جو کچھ لوگوں سے ان کے قریب ہونے کی حالت میں بھی دور ہے۔ اور کچھ لوگوں سے ان کی دوری کے بغیر قریب ہے۔

اور مصنف ؒ کے قول شعاع البصیرت کے بیان میں جو تشریح میں نے پہلے کی ہے۔ تم اس کو پھر غور سے پڑھو۔ تو اس مسئلے کی حقیقت بخوبی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔

اور اس حکمت یعنی قرب کا حق یہ ہے کہ اس کو وصول سے پہلے بیان کیا جائے کیونکہ قرب، وصول سے پہلے ہوتا ہے اور اس وجہ سے بھی قرب کا بیان پہلے ہونا چاہئے۔ کہ وصول کے بیان کے بعد ترتیب کے لحاظ سے واردات کا بیان درست ہوتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

قرب کی اقسام

حضرت شیخ زروق رضی اللہ عنہ نے اس حکمت کی شرح میں فرمایا ہے :- قرب کی تین قسمیں ہیں :-

ایک قسم ،قرب کرامت :- اور وہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو اس طریقے پر قریب کرنا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب مشاہدہ کرے۔ پھر وہ اس کے ماسوا کو ترک کر کے اسی سے محبت کرے۔

دوسری قسم ،قرب احاطہ :- اور وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت اور ارادہ اور عام تصرف کا، ہر شی کو گھیرے ہوئے دیکھنا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے قریب ہونا ہے۔

تیسری قسم ،قرب مناسبت و مسافت :- اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ قرب ممکن اور درست نہیں ہے۔ کیونکہ مسافت اس کے لئے محال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی مناسبت ناممکن ہے۔

لہٰذا مصنفؒ کے مقدر کلام سے مراد یہ ہے :-

قُرْبُكَ مِنْهُ عَلٰى وَجْهِ الْكَرَامَةِ اَنْ تَكُوْنَ مُشَاهِدًا لِقُرْبِهٖ مِنْكَ عَلٰى وَجْهِ الْاِحَاطَةِ وَ اِلَّا فَمِنْ اَيْنَ اَنْتَ وَوُجُوْدِ قُرْبِهٖ عَلٰى وَجْهِ التَّنَاسُبِ وَالْمَسَافَةِ

''اللہ تعالیٰ سے تمہارا قرب، کرامت کے طریقے پر اس طرح ہے کہ تم اپنے سے اللہ تعالیٰ کے قرب کو احاطہ کے طریقے پر مشاہدہ کر رہے ہو۔ ورنہ تناسب اور مسافت کے طریقے پر تم کہاں اور اللہ تعالیٰ کا قرب کہاں؟

میں نے اس مضمون کو اس لئے نقل کیا ہے کہ مجھے معلوم ہے۔ کہ اس کتاب کا مطالعہ وہ لوگ بھی کریں گے جو علوم سے بخوبی واقف ہیں اور وہ لوگ بھی اس کا مطالعہ کریں گے، جو علوم سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ تو جب وہ سمندر میں ڈوبنے سے ڈریں گے، تو وہ ایک جزیرہ پا جائیں گے۔ ،جس میں وہ پناہ لیں گے۔

وباللہ التوفیق

اور جو شخص قرب اور وصول کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔اس کے اوپر عرفانی حقیقتیں اور ربانی اسرار اور لدنی علوم وارد ہوتے ہیں۔کبھی وہ مجمل طریقے پر وارد ہوتے ہیں۔بعد میں ان کی تفصیل ظاہر کی جاتی ہے۔اور کبھی وہ مفصل طریقے پر وارد ہوتے ہیں۔اور مفصل واردات اکثر اہل تمکین پر وارد ہوتے ہیں۔اور اکثر یہ واردات فتح اور وصول کے بعد ہی وارد ہوتے ہیں۔اسی لئے ہم نے کہا ہے:-

اگر مصنفؒ پہلے قرب کے مقام کو بیان کرتے اس کے بعد وصول کے مقام کو بیان کرتے، تو بہتر ہوتا۔تاکہ واردات کا بیان اس کے قریب ہوکر ترتیب درست ہو جاتی۔جیسا کہ مصنف نے فرمایا:

اَلْحَقَائِقُ تَرِدُ فِی حَالِ التَّجَلِّیْ مُجْمَلَةً ، وَ بَعْدَ الْوَعْیِ یَکُوْنُ الْبَیَانُ فَاِذَا ، قَرَاْنَاہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

''حقائق تجلی کی حالت میں مجمل طور پر وارد ہوتے ہیں۔پھر یاد کر لینے کے بعد اس کی تشریح ہوتی ہے:- جب ہم قرآن کو پڑھیں، تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجئے۔یعنی اس کو یاد کیجئے۔پھر اس کو بیان کرنا، یعنی تشریح کرنا ہمارے ذمے ہے۔''

میں کہتا ہوں:- حقائق:- وہ علوم اور حکمتوں اور معرفتوں کی تجلیاں ہیں، جو عارف کے قلب پر وارد ہوتی ہیں۔تو وہ حقائق کبھی علوم ہوتے ہیں اور کبھی وہ حکمتیں اور معارف ہوتے ہیں اور کبھی وہ اس غیب کا کشف ہوتے ہیں، جو گذر چکا یا آئندہ ہوگا۔

اور اس کی حکمت یہ ہے۔کہ روح جب حس کی ظلمت سے نکل کر پاک و صاف ہو جاتی ہے۔تو اکثر اس میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے۔وہ سچ ہوتا ہے۔پھر یہ حقائق کبھی تجلی کی حالت میں مجمل طور پر وارد ہوتے ہیں۔اور انسان ان کو اسی طرح یاد کر لیتا ہے، جس طرح کہ وہ وارد ہوتے ہیں۔پھر ان میں غور و فکر کرتا ہے۔تو ان کے معانی ظاہر ہوتے ہیں لہٰذا بیان یعنی معانی کی تشریح بعد میں ہوتی ہے۔

وحی کی چار اقسام

پھر مصنفؒ نے وحی الٰہی کی آیۂ کریمہ سے استدلال کیا ہے۔کیونکہ وحی کی چار قسمیں

ہیں۔

ایک قسم :- وحی الہام۔ دوسری قسم :- وحی منام۔ تیسری قسم :- وحی اعلام۔ چوتھی قسم :- وحی احکام۔

اور اولیائے کرام رضی اللہ عنھم وحی کی تین قسموں، وحی الہام اور وحی منام اور وحی اعلام میں انبیاء علیھم السلام کے ساتھ شریک ہیں۔ اور وحی اعلام :- اللہ تعالیٰ کے متعلق سمجھ حاصل ہونا ہے۔ اور وحی احکام، صرف انبیا علیھم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہذا اولیائے کرم کیلئے وحی الہام ہے۔ وہ پہلے قلب میں مجمل طور پر وارد ہوتی ہے۔ پھر جب وہ اس کو پڑھتا ہے اور اس کی پیروی کو ظاہر کرتا ہے :- اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

(فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ) كَمَا قَرَأْنَاهُ عَلَيْكَ (ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ)

"جب ہم اس کو پڑھیں، تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کریں۔ یعنی جس طرح ہم نے پڑھا ہے، اس طرح پڑھیں۔ پھر اس کے بعد اس کا بیان یعنی تشریح ہمارے ذمے ہے۔"

یہاں تک کہ وہ اس کو سمجھتا ہے اور لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نازل شدہ آیت کے بھول جانے کے خوف سے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے۔ کہ جب کوئی آیہ کریمہ نازل ہوتی تھی۔ تو پہلے حضرت علیہ السلام حضرت جبریل علیہ السلام سے سنتے تھے۔ پھر اس آیہ کریمہ کو خود اسی طرح پڑھتے تھے۔ جس طرح وہ نازل کی گئی۔ لہذا وحی احکام محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ وہ بھلائی نہیں جاسکتی ہے۔ بخلاف وحی الہام کے۔ لہذا ولی کو چاہئے کہ وہ ان واردات کو جلد یاد کرے۔ کیونکہ حکمت تجلی کی حالت میں پہاڑ کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن جب اس سے غفلت کی جاتی ہے، تو وہ اونٹ کی طرح ہو جاتی ہے۔ پھر اگر اس کے بعد بھی اس سے غفلت کی جاتی ہے۔ تو وہ بیل کی طرح ہو جاتی ہے۔ پھر مینڈھے کی طرح، پھر انڈے کی طرح، پھر غائب ہو جاتی ہے۔

اسی لئے ہمارے شیخ الشیوخ سیدی علی رضی اللہ عنہ دوات اور قلم اور کاغذ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تاکہ واردات الہیہ کو فوراً لکھ لیں۔ اور اسی طرح ہمارے سب شیوخ کرام کرتے تھے۔

اور ایسا ہی کرنے کا حکم دیتے تھے۔

میں کہتا ہوں :- یہ سب تشریحیں میں جو میں لکھ رہا ہوں۔ یہ سب درحقیقت واردات و مواہب ہی ہیں۔ کیونکہ جب میں حکمت کی تشریح لکھتا ہوں۔ اور سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا لکھوں۔ تو میں اس کے انتظار میں ٹھہر جاتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی شی وارد ہوتی ہے۔ تو پہلے میں اسے لکھ لیتا ہوں۔ پھر میں حضرات صوفیائے کرام کی کتابوں میں دیکھتا اور غور کرتا ہوں۔ اگر میں کوئی بہترین نقل اس کے موافق پاتا ہوں، جس سے اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فیضیاب کیا ہے۔ تو میں اس کو حفاظت سے لکھ لیتا ہوں۔ ورنہ اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں عطا فرمایا ہے، اسی کو کافی سمجھتا ہوں۔ اور اکثر و بیشتر جب میں کسی کلام کی شرح لکھتا ہوں، پھر بعد میں اس کا مطالعہ کرتا ہوں، تو مجھ کو تعجب ہوتا ہے، کہ یہ میں نے لکھا ہے۔ یا یہ عبارت مجھ سے صادر ہوئی ہے۔ اور یہ سب ہمارے شیوخ کرام کی برکتوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے۔

اور اکثر میں ریاضت اور مجاہدہ کے حال میں ہوتے ہوئے جب تفسیر یا اس کے علاوہ کسی دوسری شی کے بارے میں کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں بیان کرنا شروع کر دیتا ہوں، پھر میں گم ہو جاتا ہوں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں، کہ بیان مجھ سے بے اختیار صادر ہو رہا ہے۔ گویا کہ وہ برسنے والا بادل ہے۔ اور اس وقت مجھ سے علوم اور حکمتیں صادر ہوتی ہیں۔ پھر جب میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ تو ان میں سے صرف تھوڑا سا باقی رہ جاتا ہے۔

ایک روز ہماری مجلس میں ایک نیک بوڑھا آدمی حاضر ہوا۔ اس نے ہماری گفتگو سنی اور تو اس نے کہا :- اللہ کی قسم، میں علمائے کرام اور صالحین عظام کی مجلسوں میں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ لیکن اللہ کی قسم، اس قسم کے جواہروں اور یاقوتوں کو جو فلاں حضرت کی زبان مبارک سے صادر ہوتے ہیں، میں نے ان کی مجلسوں میں صادر ہوتے نہیں دیکھا۔ میں ایک زمانہ تک اسی طرح رہا۔ نہ میں کچھ یاد کرتا تھا۔ اور نہ کچھ لکھتا تھا۔ پھر میری یہ کیفیت تبدیل ہوئی۔ اور اس کے بعد میرے لئے زبان کی عبارت سے قلم کی عبارت زیادہ فصیح ہوگئی۔ یعنی زبان کے بیان سے تحریر کی اہمیت زیادہ ہوگئی۔

بعض عارفین اپنے مریدین سے فرماتے تھے :- جب میں تم لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہوں، تو جو کچھ اللہ تعالیٰ میری زبان پر جاری کرتا ہے۔ اس سے میں خود بھی اسی طرح فائدہ حاصل کرتا ہوں، جس طرح تم فائدہ حاصل کرتے ہو۔

اسی حقیقت کے بارے میں حضرت ابن فارض رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :-

وَلَا تَكُ مِمَّنْ طَيَّشَتْهُ طُرُوْسُهٗ بِحَيْثُ اسْتَخَفَّتْ عَقْلَهٗ وَاسْتَفَزَّتْ

''اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہوؤ، جن کو ان کی کتابوں نے اس طرح ہلکا کیا۔ کہ انھوں نے اپنی عقل کو ہلکا سمجھ لیا۔

فَثَمَّ وَرَاءَ النَّقْلِ عِلْمٌ يَدِقُّ عَنْ مَدَارِكِ غَايَاتِ الْعُقُوْلِ السَّلِيْمَةِ

''لیکن نقل یعنی کتاب کے علاوہ بھی ایک علم ہے۔ جو صحیح عقلوں کی انتہائی سمجھ سے باریک ہے۔''

تَلَقَّيْتَهٗ مِنِّيْ وَ عَنِّيْ اَخَذْتَهٗ وَ نَفْسِيْ كَانَتْ مِنْ عَطَائِيْ مُمِدَّتِيْ

''تم نے اس علم کو مجھ سے حاصل کیا۔ اور میرا نفس میری بخشش سے میرا مددگار ہے۔''

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ جب بیان میں مستغرق ہو جاتے تھے۔ اور ان کے اوپر علوم کا فیضان ہوتا تھا۔ تو وہ فرماتے تھے :- کیا کوئی شخص ہے، جو ہماری زبان سے نکلے ہوئے ان اسرار کو یاد کرے، یا لکھ لے۔ تم لوگ ایک ایسے شخص کے پاس (یعنی میرے پاس) آؤ۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم کا سمندر بنایا ہے۔ یا اسی قسم کی بات فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کی مجلس میں ان کے زمانے کے اکابر اور مشہور علما و صوفیائے کرام حاضر ہوتے تھے۔ مثلاً حضرت عزالدین بن عبدالسلام اور ابن حاجب، اور ابن عصفور اور ابن دقیق العبد اور عبدالعظیم منذری وغیرھم۔

حضرت عزالدین بن عبدالسلام جب حضرت کا کلام سنتے تھے تو فرماتے تھے :- یہ کلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے اقرار سے قریب ہے۔

اور حضرت شیخ تقی الدین بن دقیق العبد فرماتے تھے :- اللہ کی قسم، میں نے ابوالحسن شاذلی سے زیادہ کوئی عارف باللہ نہیں دیکھا۔

حضرت شیخ ابوالحسن ہر سال قاہرہ تشریف لے جاتے تھے۔ ان کی مجلس میں قاہرہ اور مصر

کے اطراف کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اور وہ لوگوں کو علوم و مواہب ربانی اور اسرار لدنی سے فیضیاب فرماتے تھے۔ جب حضرت شیخ ابوالحسن وفات فرما گئے۔ اور حضرت ابوالعباس مرسی ان کے خلیفہ ہوئے، تو وہ بھی اسی طرح قاہرہ تشریف لے جاتے تھے، جس طرح کہ ان کے شیخ تشریف لے جاتے تھے۔ ان کے پاس مصر کے اکابر اور علمائے کرام کی ایک جماعت جمع ہوئی۔ ان لوگوں نے کہا:- اے شیخ! حضرت شیخ ابوالحسن جب یہاں تشریف لاتے تھے۔ اور ہم ان کی تشریف آوری سے برکت حاصل کرتے تھے۔ تو ہم ان سے اللہ تعالیٰ کی معارف و اسرار سنتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا قائم مقام اور خلیفہ بنایا ہے۔ لہذا ہم لوگوں کی خواہش ہے، کہ آپ کے بیان سے برکت حاصل کریں۔ حضرت ابوالعباس نے ان لوگوں سے فرمایا:- انشاء اللہ، کل صبح کے وقت ہم آپ لوگوں کے یہاں آئیں گے۔ جب صبح ہوئی تو انھوں نے اپنے مریدین کو مصر کی طرف چلنے کا حکم دیا اور حضرت امام قشیری رضی اللہ عنہ کے رسالہ للہ قشیریہ کو ساتھ لے چلنے کا حکم دیا۔ ابن صباغ نے فرمایا ہے:- ہم رسالہ قشیریہ لے کر حضرت عمرو بن العاص کی جامع مسجد میں پہنچے۔ ہم نے جامع مسجد کو اہل مصر کے اکابر اور علمائے کرام سے بھری ہوئی پایا۔ حضرت نے فرمایا:- اس مجلس میں نقد لینے والے بھی ہیں اور معتقد بھی۔ ابن صباغ نے فرمایا ہے:- ہم جامع مسجد کے مشرقی حصہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے فرمایا:- رسالہ قشیریہ نکالو۔ میں نے رسالہ نکالا۔ حضرت نے فرمایا:- پڑھو۔ میں نے کہا:- کیا پڑھوں؟ حضرت نے فرمایا:- جو تمھارے سامنے کھل جائے۔ لہذا ہم نے کتاب کھولی تو فراست کا باب ہمارے سامنے کھلا۔ میں نے باب فراست کے ابتدائی حصے کو پڑھا۔ جب میں حضرت رسول اللہ ﷺ کی حدیث شریف کو پڑھ کر فارغ ہوا۔ تو حضرت نے فرمایا:- کتاب بند کر دو۔ پھر فرمایا:- فراست کی چار قسمیں ہیں:-

پہلی قسم:- مومنین کی فراست۔ دوسری قسم:- موقنین کی فراست۔ تیسری قسم:- اولیاء اللہ کی فراست۔ چوتھی قسم:- صدیقین کی فراست۔

پہلی قسم، مومنین کی فراست:- اس کا حال ایسا ایسا ہے۔ اور اس کی مدد اس اس جگہ سے پہنچتی ہے۔ پھر حضرت نے اس موضوع پر بہت بڑی تقریر فرمائی۔ پھر وہ اس موضوع سے موقنین کی

فراست کی طرف منتقل ہوئے۔اور نہایت اعلیٰ درجے کی تقریر فرمائی۔ پھر حضرت نے اولیائے کرام کی فراست بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔اولیائے کرام کی فراست کو فلاں فلاں مقام سے مدد ملتی ہے اور اس کا حال ایسا ایسا ہے۔اور اس موضوع پر حضرت نے وھبی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی تقریر فرمائی۔ جو قطعاً غیر کسبی تھا۔یعنی کتابوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں تھا۔حاضرین مجلس کی عقل گم ہوگئی۔اور حضرت اس موضوع میں ظہر کی اذان تک مستغرق رہے۔اور لوگ روتے رہے اور میں ان کی پیشانی سے پسینہ بہہ کر ان کی ڈاڑھی پر گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔اور ان کی داڑھی لمبی تھی۔

مصنفؒ نے لطائف المنن میں بیان فرمایا ہے:۔ کہ میں حضرت شیخ ابوالحسن کے معاملے میں انکار کرنے ولوں اور ان کے اوپر اعتراض کرنے والوں میں سے تھا۔اور یہ انکار اور اعتراض:۔ کسی ایسی شی کی بنا پر نہ تھا۔ جو میں نے ان سے سنی ہو۔اور نہ کسی ایسی شی کی بنا پر تھا، جس کی روایت ان کے بارے میں صحیح ہو۔ یہاں تک کہ میرے اور ان کے بعض مریدین کے درمیان بحث کا سلسلہ جاری ہوگیا۔اور یہ واقعہ ان کی صحبت سے میرے فیض یاب ہونے کے پہلے کا ہے۔اور میں نے اس مرید سے کہا:۔ صرف علم ظاہر رکھنے والے علما ہی کامل ہیں۔اور یہ لوگ یعنی صوفیائے کرام بڑی بڑی باتوں کا دعویٰ کرتے ہیں۔حالانکہ ظاہری شریعت ان کا انکار کرتی ہے۔اس مرید نے کہا:۔ جب تم شیخ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔تب تم کو وہ بات معلوم ہوگی۔ جو شیخ نے مجھ سے اس روز فرمایا، جس روز تم نے مجھ سے بحث شروع کی ہے۔پھر اس مریدؒ نے کہا:۔میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضرت شیخ نے پہلے ہی مجھ سے فرمایا:۔ یہ لوگ پتھر کے مثل ہیں جو تم سے خطا کر جائے، وہ اس سے بہتر ہے جو تم کو لگ جائے۔ یہ سن کر میں نے یہ سمجھا، کہ میری بات شیخ کو کشف سے معلوم ہوگئی۔ پھر اس مرید نے کہا:۔میری زندگی کی قسم میں بارہ سال سے حضرت شیخ کی خدمت میں ہوں۔ میں نے ان سے کوئی شی ایسی نہیں سنی، جس کا انکار علم ظاہر کرتا ہو۔ ہاں، ان لوگوں کے علم کے خلاف ہوسکتا ہے۔ ہو ان کی ایذا رسانی کے لئے ان کی طرف سے کچھ فرضی باتیں نقل کرتے ہیں۔

پھر حضرت شیخ ابوالحسن کے ساتھ میری صحبت کا سبب یہ ہوا:۔ میرے اور اس مرید کے

درمیان بحث ہونے کے بعد میں نے اپنے دل میں کہا:- اس بحث کو چھوڑو۔ میں خود جا کر شیخ ابوالحسن کو دیکھوگا۔ کیونکہ اہل حق کی ایک امارت (امیری) ہوتی ہے، جس کی شان پوشیدہ نہیں رہتی ہے۔ لہذا میں شیخ موصوف کی مجلس میں حاضر ہوا، تو میں نے ان کو وہی باتیں کہتے ہوئے پایا، جنکا حکم حضرت شارع علیہ السلام نے دیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے فرمایا:- اول:- اسلام ہے۔ اور دوسرا:- ایمان ہے۔ اور تیسرا:- احسان ہے۔

اور اگر تم چاہو تو اس طرح کہو:- اول:- عبادت ہے۔ اور دوسرا:- عبودیت ہے۔ اور تیسرا:- عبودت ہے۔

اور اگر تم چاہو تو اس طرح کہو:- اول:- شریعت ہے اور دوسرا:- حقیقت ہے۔ اور تیسرا: تحقق ہے، یا اس کے مثل۔

اور وہ برابر یہی کہتے رہے:- اگر تم چاہو تو اس طرح کہو۔ اگر تم چاہو تو اس طرح کہو۔ یہاں تک کہ انھوں نے میری عقل کو مبہوت کر دیا۔ اور میں نے یہ جان لیا کہ درحقیقت یہ شخص بحر الٰہی اور مدد ربانی سے چلو بھر رہا ہے۔ یعنی فیضیاب ہو رہا ہے۔ لہذا میرے دل میں جو کچھ بھی اعتراضات اور شک وشبہات تھے، سب کو اللہ تعالیٰ نے دور کر دیا۔

لہذا حقائق، جو اللہ تعالیٰ اپنے اولیائے کرام کے قلوب پر فیضان کرتا ہے۔ پھر وہ اس کو بیان کرتے ہیں۔ پہلے وہ مجمل ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ یاد دلاتے ہیں تب ان کے معانی واضح ہوتے ہیں، ان حقائق میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو عقلیں سمجھتی ہیں۔ اور وہ منقول کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں، جن کو عقلیں نہیں سمجھتی ہیں۔ لہذا تم ان کو ان کے اہل کے سپرد کر دو اور ان کو سننے کے ساتھ ہی ان پر تنقید نہ کرو۔ اور حضرت ابن فارض رضی اللہ عنہ کے کلام میں غور کرو:-

فَثَمَّ وَرَاءُ النَّقْلِ عِلْمٌ يَدِقُّ عَنْ مَدَارِكِ غَايَاتِ الْعُقُوْلِ السَّلِيْمَةِ

''وہاں کتاب کے علاوہ بھی ایک علم ہے۔ جو صحیح عقلوں کی انتہائی سمجھ سے بھی باریک ہے۔

اس کے باوجود حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:- جب تمھارا صحیح کشف بھی قرآن وسنت کے خلاف ہو تو تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرو اور اپنے کشف کو چھوڑ دو۔ اور تم اپنے نفس سے کہو:- اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت میں میری حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ کشف والہام میں اس نے میری ذمہ داری نہیں لی ہے۔

اسی طرح حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا ہے:- جب میرے قلب میں کشف سے کوئی نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ تو میں اس کو کتاب وسنت کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا ہوں۔ اور اس پر عمل نہ کرنے سے اس کے اہل پر تنقید لازم نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ علم وسیع ہے اور اس کے لئے ظاہر اور باطن ہے۔ لہذا اگر تم ان کو نہ سمجھ سکو۔ تو بھی تم ان کو تسلیم کرو۔ اور جن کو تم سمجھتے ہو، ان کو بھی انھیں میں شامل کر دو، جن کو تم نہیں سمجھتے ہو۔ (یعنی تم اپنے علم وسمجھ کو چھوڑ کر بے علم اور ناسمجھ بن جاؤ)

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:-

صدیقین کے مجلس کے آداب میں سے یہ ہے کہ جو تم جانتے ہو، اس کو بھی چھوڑ دو۔ تاکہ تم پوشیدہ سر کے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرو۔

یعنی صدیقین (عارفین) کے پاس جو پوشیدہ علم ہے۔ اگر تم اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو۔ تو ان کے اقوال وافعال واحوال کو پرکھنا چھوڑ دو۔ کیونکہ جب تک تم اپنے علم کے ترازو سے ان کو تولتے اور پرکھتے رہو گے۔ اس وقت تک تم ان کے پوشیدہ علم کی خوشبو کو نہ سونگھ سکو گے۔

ہمارے شیخ الشیوخ سیدی علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:- ہمارے طریقت میں سے وہی شخص کچھ پاسکتا ہے، جو محال کی بھی تصدیق کرے۔

لہذا اے میرے بھائی! اگر تم چاہتے ہو کہ عارفین کے اسرار وعطیات کی ہلکی اور خوشبودار ہوا تمھارے پاس پہنچے۔ تو تم جو کچھ جانتے ہو، اس کو بھی نہ جانی ہوئی چیزوں کی طرح چھوڑ کر لاعلم بن جاؤ۔ اور اپنے علم وعمل سے ہاتھ دھولو۔ اور صرف ان علوم ومعارف کے محتاج بن جاؤ جو ان کے پاس ہیں۔ جیسا کہ ہمارے شیخ طریقت حضرت ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

مجھ سے ایک ایسے شخص نے بیان کیا، جس پر مجھ کو پورا اعتماد ہے۔ کہ حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ، حضرت شیخ ابن مشیش رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنے علم کا ترازو لے کر گئے۔ تو ان کو ولایت کی خوشبو نہیں ملی۔ پھر وہ واپس چلے آئے۔ پھر اسی طرح وہ دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن جیسے گئے تھے۔ ویسے ہی خالی ہاتھ واپس آئے۔ لیکن جب انھوں نے ترازو کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے علم وعمل سے ہاتھ دھو کر، ان کے پاس محتاج بن کر گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو علوم و معارف سے مالا مال کر دیا۔ حضرت شیخ ابن مشیش نے ان سے فرمایا:- اے ابوالحسن! تم اپنے علم و عمل سے خالی ہو کر اور محتاج بن کر ہمارے پاس آئے۔ تو تم نے ہم سے دنیا و آخرت کی بے نیازی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے ذکر سے فائدہ پہنچائے۔ اور ان علوم و اسرار سے ہم کو فیضیاب فرمائے۔ جن سے ان کو فیضیاب فرمایا۔ یہاں تک کہ ہم ان کے وسیلے سے ایسی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔ جس کے ساتھ کوئی محتاجی نہیں ہوتی ہے۔ آمین۔

اور وہ واردات جو حقائق اور علوم کے ساتھ تجلی کرتے ہیں۔ وہ انتہائی درجہ والوں کے واردات ہیں۔ لیکن ابتدائی درجہ والوں کے واردات :- تو وہ طاقت ور قہاری ہوتے ہیں۔ یا ہلا دینے والے خوف کے ساتھ یا بے قرار کر دینے والے شوق کے ساتھ، تا کہ ان کو ان کی خواہشات اور عادات سے علیحدہ کر دیں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے انھیں واردات کا بیان اپنے اس قول میں فرمایا ہے:-

مَتٰى وَرَدَتِ الْوَارِدَاتُ الْاِلٰهِيَّةُ اِلَيْكَ هَدَمَتِ الْعَوَائِدَ عَلَيْكَ ، اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا

”جب واردات الہیہ تمھاری طرف وارد ہوتے ہیں، تو تمھاری بشری عادتوں کو منہدم کر دیتے ہیں۔ بیشک بادشاہ لوگ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کو ویران کر دیتے ہیں۔“

میں کہتا ہوں:- وارد الہی :- وہ شوق یا اشتیاق یا محبت کی قوت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں پیدا فرماتا ہے۔ اور وہ کبھی خوف یا ہیبت یا جلال کی قوت سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ قوت بندے کو اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ پھر وہ اپنی عادتوں اور

شہوتوں اور خواہشوں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے رب کی معرفت اور اس کی رضامندی کی طرف سیر کرتا ہے اور کبھی اس کے اوپر اس محبت اور شوق کے انوار متواتر آتے رہتے ہیں اور اس کو اس کی حس سے گم کر دیتے ہیں۔ اور یہی جذب ہے اور مصنفؒ نے واردات کو جمع کے لفظ سے اس محبت اور شوق کی زیادتی کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ واردات اس کی عادتوں کو اسی وقت ختم کر سکتے ہیں، جبکہ وہ زیادہ ہوں۔ اور ان واردات کا نام ''نفحات'' بھی ہے۔

حضرت رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے:۔

اِنَّ لِلّٰہِ نَفَحَاتٍ فَتَعَرَّضُوْا لِنَفَحَاتِہٖ

''بے شک اللہ تعالیٰ کے نفحات یعنی واردات ہیں۔ لہٰذا تم اس کے نفحات حاصل کرنے کے لئے سامنے آؤ (آگے بڑھو)

لہٰذا جس شخص پر یہ واردات اختیاری طور پر نہ وارد ہوں۔ اس کو چاہئے کہ ان واردات کے حاصل کرنے کے لئے ایسے عارفین کی صحبت اختیار کرے۔ جو اس اکسیر کے مالک ہیں، جو اشیاء کی ماہیت کو بدل دیتا ہے۔ اور اگر ان کی صحبت اختیار کرنے کے بعد بھی اس کے اوپر واردات الٰہیہ نہ وارد ہوں۔ تو اس کو چاہئے کہ اپنے نفس کی عادت کو ظاہر سے ختم کر دے۔ کیونکہ وہ ظاہر سے باطن میں داخل ہوتی ہیں۔ پھر جب واردات الٰہیہ تمہارے اوپر وارد ہوں گے تو وہ تمہاری عادات کو باطن سے بھی ختم کر دیں گے۔ پھر وہ تمہاری عزت کو ذلت میں اور تمہاری دولتمندی کو محتاجی میں اور تمہارے مرتبہ اور شہرت کو گمنامی میں اور تمہاری سرداری کو تواضع میں اور تمہارے کلام کو خاموشی میں اور تمہارے مزے دار کھانے کو بے مزہ اور تلخ کھانے میں اور تمہاری آسودگی کو بھوک میں اور تمہارے اپنے وطن میں قیام کو سیاحت اور سفر میں تبدیل کر دیں گے۔

واردالٰہی کی شان یہی ہے کہ وہ عادات کو ویران و منہدم کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ طاقتور صاحب فوج، سرکش بادشاہ کی طرح ہے۔ جو کسی بستی میں داخل ہوتا ہے، تو اس کی عمارتوں کو ویران کر دیتا ہے۔ اور اس کے معمولات (طریقوں اور رواجوں) کو بدل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

(اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْ قَرْیَةً اَفْسَدُوْھَا) اَیْ نَزَعُوْھَا وَ خَرَبُوْھَا (وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَھْلِھَا

اَذِلَّۃً) اَیْ رَءُ وْسَاھَا اَتْبَاعًا مَرْءُ وْسِیْنَ (وَکَذَالِکَ یَفْعَلُوْنَ)

”بے شک بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کو ویران اور برباد کر دیتے ہیں۔ اور اس کے معزز اور شریف باشندوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ یعنی اس کے رئیسوں اور سرداروں کو غلام اور کمزور بنا دیتے ہیں۔ اور بادشاہوں کی شان یہی ہے کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں۔“

اور اس آیہ کریمہ سے مصنفؒ کا شہادت حاصل کرنا بہت ہی خوب اور مناسب ہے۔ پھر مصنفؒ نے وارد الٰہی کے انسان کے عادات کو منہدم کرنے کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

اَلْوَارِدُ یَاْتِیْ مِنْ حَضْرَۃِ قَھَّارٍ لِاَجْلِ ذَالِکَ لَا یُصَادِمُہٗ شَیْءٌ اِلَّا دَمَغَہٗ ، بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُہٗ فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ

”وارد قہار کی بارگاہ سے آتا ہے۔ اس وجہ سے جو شی اس کے مقابلہ میں آتی ہے۔ وہ اس کو کچل کر مٹا دیتا ہے:- ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں۔ تو حق، باطل کو کچل دیتا ہے۔ لہذا باطل مٹ جاتا ہے۔“

میں کہتا ہوں:- جو وارد سائرین یا طالبین کے قلوب پر وارد ہوتا ہے۔ وہ بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک ”قہار“ کی بارگاہ سے آتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی قہریت سے، نفس یا قلب میں اغیار میں سے جو کچھ بھی پائے، ان کو مٹا دے۔ اور ہم نے ”وارد اللہ تعالیٰ کے اسم پاک ”قہار“ کی بارگاہ سے آتا ہے“ اس وجہ سے کہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہیں اس کے اسمائے حسنیٰ کی تعداد کے مطابق ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کا اسم پاک ”قہار“ اس کی قہریت کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اور اس کا اسم پاک ”جمیل“ اس کے جمال کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اور اس کا اسم پاک۔ ”جلیل“ اس کے جلال کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اور اس کا اسم پاک ”رحیم“ اس کی رحمت کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اور اس کا اسم پاک ”حلیم“ اسکے حلم کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اور اس کا اسم پاک ”کریم“ اس کے کرم کی بارگاہ سے تجلی کرتا ہے۔ اسی طرح ہر اسم پاک کی تجلی اس کے موافق بارگاہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ)

”ہر شی کے خزانے ہمارے پاس ہیں“

اور اگر وہ وراد جو ابتدائی درجہ والوں کے قلوب پر وارد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک "رحیم" یا "حلیم" یا "جمیل" کی بارگاہ سے ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے سبب، یہ ممکن نہیں ہے کہ جو باطل اس کے سامنے آئے، وہ اس کو مٹا دے۔

اور حضرت مصنفؒ نے باطل یعنی کل ماسوی اللہ کو ایسے جانور سے مشابہت دی ہے، جس کے پاس دماغ ہوتا ہے۔ جب اس کے دماغ پر چوٹ لگتی ہے۔ اور وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ تو وہ جانور مر جاتا ہے۔

یہی حالت باطل کی ہے:۔ جب اس سے حق ٹکراتا ہے اور اس کا دماغ پاش پاش ہو جاتا ہے، تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور وارد الٰہی خالص ہوتا ہے، تو جب وہ باطل سے ٹکراتا ہے، تو اس کو مٹا دیتا ہے۔ اور ہلاک کر دیتا ہے۔

اسی لئے مصنفؒ نے اس آیہ کریمہ سے استدلال کیا ہے، جو کفر کے مقابلے میں قرآن کریم کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ کہ جب قرآن کریم نازل ہوا، تو کفر پاش پاش ہو کر مٹ گیا۔ یہی حال ماسوا کا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نور کی قہریت کے ساتھ تجلی کرتا ہے۔ تو ماسویٰ پاش پاش ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالعباس رضی اللہ عنہ اسی مفہوم میں یہ اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے:۔

فَلَوْ عَايَنَتْ عَيْنَاكَ يَوْمَ تَزَلْزَلَتْ   اَرْضُ النُّفُوْسِ وَدُكَّتِ الْاَجْبَالُ

"اگر تمھاری آنکھیں، نفوس کے زمین کے متزلزل ہونے اور عقلوں کے پہاڑوں کے پاش پاش ہونے کا دن دیکھتیں۔

لَرَاَيْتَ شَمْسَ الْحَقِّ يَسْطَعُ نُوْرُهَا   عِنْدَ التَّزَلْزُلِ وَالرِّجَالُ رِجَالُ

"تو تم حق کے سورج کو نفوس کے زلزلہ کے وقت دیکھتے کہ اس کا نور روشن ہے۔ اور اللہ والے اللہ والے ہی ہیں۔"

یعنی وارد الٰہی جب اللہ تعالیٰ کی قہاریت کی بارگاہ سے قوت کے ساتھ وراد ہوتا ہے۔ تو نفوس کے زمین کو منہدم کر دیتا ہے۔ اور عقول کے پہاڑ اس سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس وقت

اس کے سامنے ایسے اسرار کھلتے ہیں۔ جو عقل کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔ اور نقل کی عبارت اس سے عاجز ہوتی ہے۔ لہذا وہ شخص جس پر یہ وارد نازل ہوتا ہے، سراپا حق ہو جاتا ہے۔ وہ جس شی کے مقابل ہوتا ہے، اس کو ختم کر دیتا ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ قطب ابن مشیش رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول میں اسی مفہوم کو مراد لیا ہے:-

مجھ کو باطل پر مارو۔ میں اس کو مٹا دوں گا۔ اس سے مراد یہ لیا ہے۔ کہ وہ ایسا خالص حق ہو جائے۔ کہ جب اس سے ماسویٰ پر ضرب لگائی جائے، تو وہ اس کو مٹا دے۔

لہذا جب ماسویٰ ختم اور فنا ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ باقی رہ جاتا ہے۔، جو کبھی فنا نہیں ہو گا۔ اور ایسا ظاہر ہے، جو کبھی پوشیدہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے اس کو بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے۔ ان کی نظر کتنی گہری اور باریک بین ہے۔ کہ ہر مقام کے مناسب اور مختصر کلام بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

كَيْفَ يَحْتَجِبُ الْحَقُّ بِشَيْئٍ وَالَّذِيْ يَحْتَجِبُ بِهٖ هُوَ فِيهِ ظَاهِرٌ وَ مَوْجُوْدٌ حَاضِرٌ

''حق سبحانہ تعالےٰ کسی شی سے کس طرح محجوب ہوسکتا ہے! حالانکہ وہ جس شی سے محجوب ہوگا۔ وہ اس میں ظاہر اور موجود حاضر ہے''

میں کہتا ہوں:- مصنف نے اس مفہوم کو اپنی اس کتاب میں جمع پر آمادہ کرنے اور فرق سے محفوظ کرنے کے لئے بار بار بیان کیا ہے۔

جمع:- اس حالت کو کہتے ہیں کہ آدمی کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔ اور وہ ہر شی کو ایک دیکھے۔ اور فرق:- اس حالت کو کہتے ہیں کہ آدمی کا ظاہر اور باطن یکساں نہ ہو۔ اور وہ ہر شی کو جدا جدا دیکھے۔ اور ان میں امتیاز کرے۔

لہذا متواتر بیانات سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالےٰ کسی سے محجوب نہیں ہے۔ اور یہ خیال باطل ہے کہ وہ کسی شی سے محجوب ہے۔ کیونکہ اگر وہ کسی وجودی شی سے محجوب ہوگا۔ تو یہ اس کی قدرت کے اثر سے ہوگا۔ اور اس کی قدرت، اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔ اس لئے

کہ صفت اپنے موصوف سے جدا نہیں ہوتی ہے۔ لہذا جو شی جبروت کے سمندر سے ظاہر ہوئی، وہ اس کے انوار میں سے ایک نور ہے اور اس کی صفات کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ عینیہ کے مصنف نے فرمایا ہے:۔

فَاَوْصَافُهٗ وَالْاِسْمُ وَالْاَثَرُ الَّذِیْ هُوَ الْكَوْنُ عَیْنُ الذَّاتِ وَاللّٰهُ جَامِعُ

"لہذا اس کے اوصاف اور اسم اور اثر جو مخلوق ہیں، عین ذات ہیں اور اللہ سب کو جامع ہے۔"

اسی وجہ سے مصنفؒ نے اللہ تعالیٰ کے محجوب ہونے کے تصور پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ ہر وہ شی جو قدرت کے عنصر سے نکلتی ہے۔ وہ سب کی سب اس کے ملکوت کے انوار میں سے ایک نور ہے۔ جو اس کے جبروت کے سمندر سے پہنچتی اور اچھلتی ہے۔

لہذا وحدت ثابت ہوگئی اور حجاب کی بالکل نفی ہوگئی۔ پس ہر موجود کے اندر اللہ تعالیٰ کا نور موجود حاضر ہے۔

پھر چونکہ واردات احوال ہیں اور احوال اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ اسی لئے مصنفؒ نے عمل کو بیان کیا۔ اور تم کو حکم دیا کہ تم اس وجہ سے عمل کو نہ چھوڑو کہ تم نے اس کی لذت نہیں چکھی۔ اور عمل کرنے والا، عمل سے جو پھل پاتا ہے۔ وہی حال اور لذت ہے اور بعض عمل ایسا ہے، جس کا پھل عمل کرنے والا فوراً نہیں پاتا ہے۔ لہذا اس کو وہ عمل ترک نہ کرنا چاہئے۔ اور اس کا پھل سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ اس کی قبولیت سے ناامید ہونا چاہئے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے۔

لَا تَیْئَسْ مِنْ قُبُوْلِ عَمَلٍ لَا تَجِدُ فِیْهِ وُجُوْدِ الْحُضُوْرِ ، فَرُبَّمَا قُبِلَ مِنَ الْعَمَلِ مَا لَمْ تُدْرِكْ ثَمْرَتَهٗ عَاجِلًا

"تم اس عمل کے قبول ہونے سے مایوس نہ ہو۔ جس میں تم کو حضوری قلب حاصل نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات وہ عمل مقبول ہوتا ہے، جس کا پھل فوراً نہیں ملتا ہے۔"

میں کہتا ہوں:۔ مصنفؒ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ جس شخص کو اس کے عمل کا نتیجہ فوراً مل جاتا ہے۔ تو یہ اس کے عمل کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ کہ اگر کسی عمل

کا پھل عامل کو فوراً نہ ملے، تو وہ عمل غیر مقبول ہے۔ بلکہ وہ عمل مسکوت عنہ ہے۔ یعنی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ لہذا اگر اس عمل میں شریعت کے اعتبار سے قبولیت کے لوازمات زیادہ پائے جائیں۔ اور اگر اس میں اخلاص اور تقویٰ اور شرعی مضبوطی شامل ہو، تو انشاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ خواہ عامل کو فوراً (یعنی اس دنیا میں) اس کا پھل ملے یا نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ

''درحقیقت اللہ تعالیٰ متقین ہی سے قبول کرتا ہے۔''

حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے:-

لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْ مُّسَمِّعٍ وَ لَا مُرَاءٍ

''اللہ تعالیٰ سنانے والے اور دکھانے والے یعنی ریاکار کے عمل کو قبول نہیں کرتا ہے۔''

لہذا اگر تم اپنی طاقت کے مطابق اپنے ظاہر اور باطن میں تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہو۔ اور اپنے اعمال میں تم اللہ تعالیٰ کے لئے مخلص ہو۔ لیکن تم عمل کی لذت اور اپنے قلب کی حضوری نہیں پاتے ہو۔ اور وجد والوں کے احوال اور عارفین کے ذوق میں سے تم کو اپنے عمل کا پھل نہیں حاصل ہوتا ہے۔ تو تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے عمل کے قبول ہونے سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ حال کا موجود ہونا اور لذت کا حاصل ہونا، عمل کے لئے شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک علامت ہے اور علامت، اپنی ضد کو لازم نہیں کرتی ہے۔ لہذا اکثر اوقات وہ عمل مقبول ہوتا ہے۔ جس کا پھل فوراً نہیں ملتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کا ثواب تم کو آخرت میں عطا فرمائے گا۔ یا اسی دنیا میں دیر سے عطا کرے گا۔ لہذا تمہارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ تم اپنے عمل کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دو۔ اس لئے کہ اس میں تم کو حضوری قلب حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ یا اس لئے کہ تم کو اس میں لذت نہیں مل رہی ہے۔ بلکہ تمہارے اوپر یہ واجب ہے۔ کہ تم ہمیشہ عمل کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تم کو اس کا پھل حاصل ہو جائے۔ کیونکہ جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کے لئے دروازہ کھول دیا جائے۔ ایک عارف شاعر کے کلام میں غور کرو:-

اُطْلُبْ وَلَا تَضْجَرَنْ مِنْ مَّطْلَبٍ فَاٰفَةُ الطَّالِبِ اَنْ يَّضْجَرَا

''تم طلب کرو۔ اور کسی مطلب سے تنگ دل اور پریشان نہ ہوؤ۔ کیونکہ تنگ دل ہو جانا ہی طالب کے لئے مصیبت ہے۔''

اَمَا تَرَى الْحَبْلَ بِتَكْرَارِهٖ فِي الصَّخْرَةِ الصَّمَّاءِ قَدْ اَثَّرَا

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو، کہ رسی جب سخت پتھر کی چٹان پر بار بار رگڑ کھاتی ہے تو پتھر میں نشان پیدا کر دیتی ہے۔

تم اس عابد کے قصے کو یاد کرو۔ جو مکہ معظّمہ میں چالیس سال تک مقیم رہ کر عبادت کرتے رہے۔ اور جب وہ کہتے (لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ) ''اے میرے اللہ! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔'' تو ہاتف غیب اس کے جواب میں کہتا:-

لَا لَبَّيْكَ وَ لَا سَعْدَيْكَ وَ حَجُّكَ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكَ

''نہ میں تیرے پاس حاضر ہوں۔ (یعنی تیری حاضری میرے پاس مقبول نہیں ہے) نہ میں تیری مدد کروں گا۔ اور تیرا حج تیرے اوپر لوٹا دیا گیا''۔ لیکن وہ عابد برابر اپنی جگہ پر قائم رہے۔ نہ وہاں سے ہٹے، نہ لبیک کہنے سے باز آئے۔

ایک روز ایک شخص ان کی زیارت کرنے کے لئے ان کے پاس آیا۔ جب عابد نے کہا:- لبیک۔ تو اس کے جواب میں ہاتف نے کہا:- لا لبیک۔ یہ سن کر زیارت کے لئے آنے والا شخص واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے دل میں کہا:- یہ شخص مردود بارگاہ ہے۔ عابد نے اس کو پکار کر پوچھا:- تم کو کیا ہوا۔ تم کیوں واپس جا رہے ہو؟ اس شخص نے کہا:- یا حضرت! آپ نے کہا:- لبیک۔ اس کے جواب میں غیب سے آواز آئی:- لا لبیک۔ اس لئے میں واپس جا رہا ہوں۔ عابد نے اس شخص سے کہا:- چالیس سال سے میں یہ جواب سن رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ کیا یہاں اس دروازہ کے سوا کچھ دوسرے دروازے بھی ہیں۔ کہ میں وہاں جاؤں۔ اس لئے میں اسی کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اگر وہ مجھ کو ہزار مرتبہ بھی بھگائے گا۔ جب بھی میں اس کے دروازے سے نہ ہٹوں گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرما لیا۔ اور جب پھر انھوں نے کہا:- لبیک۔ تو اس کے

جواب میں غیب سے آواز آئی۔ لَبَّیْكَ وَ سَعْدَیْكَ

لہٰذا غور کرو:- جو شخص مضبوطی سے دروازے پر کھڑا رہا۔ وہ کس طرح دوستوں میں شامل ہو گیا۔ اور اس کے لئے دروازہ کھول دیا گیا۔

اسی لئے حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے:-

اَحَبُّ الْعَمَلِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُہٗ وَ اِنْ قَلَّ

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ کم ہو۔''

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا

''جب تک تم نہیں تھکو گے، اللہ تعالیٰ نہیں تھکے گا۔''

اور عمل سے مراد:- عبودیت کے طریقے پر قائم رہنا اور ربوبیت کی تعظیم کرنی ہے۔ اور عمل سے احوال اور مقامات کی خواہش مراد نہیں ہے۔ کیونکہ توحید خاص والوں کے نزدیک، یہ اخلاق میں نقص ہے۔

اور کبھی حال، اس شخص کے لئے حجاب کا سبب ہو جاتا ہے۔ جو حال کے ساتھ ٹھہر جاتا ہے۔ اور اس میں لذت حاصل کرتا ہے۔

اسی لئے بعض عارفین نے فرمایا ہے:- عبادت کی لذت سے بچو۔ کیونکہ بلاشبہ وہ اس شخص کے لئے زہر قاتل ہے۔ جو اس کے ساتھ ٹھہر گیا۔ اور اکثر مجھ کو معبود برحق کا شہود اس کے ساتھ حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا تم حال کے بندے نہ بنو۔ بلکہ حال پیدا کرنے والے کے بندے بنو۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے:-

لَا تُزَكِّیَنَّ وَارِدًا لَا تَعْلَمُ ثَمْرَتَہٗ فَلَیْسَ الْمُرَادُ مِنَ السَّحَابَةِ الْاَمْطَارُ وَ اِنَّمَا الْمُرَادُ مِنْهَا وُجُوْدُ الْاَثْمَارِ

''جس وارد کا پھل تم نہیں جانتے ہو۔ اس وارد کو تم پاک نہ سمجھو۔ کیونکہ بدلی سے مقصد بارش نہیں ہے۔ بلکہ پھلوں کا پیدا ہونا مقصد ہے۔''

میں کہتا ہوں:- وارد کا پھل:- عادات کا ختم ہونا اور فوائد کا حاصل ہونا، اور برے اوصاف سے پاک ہونا اور بہتر اوصاف سے آراستہ ہونا ہے۔

اور اگر تم چاہو تو اس طرح کہو:- سچے وارد کا پھل:- وہ ہے جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً عاجزی وانکساری اور خشوع وسکون قلب اور وقار وحلم اور زہد اور سخاوت وایثار اور جسمانی شہوات اور نفسانی عادات کی غلامی سے نجات اور مخلوقات کی قید سے نکل جانا اور شہود وعیاں کی فضا کی طرف ترقی کرنا اور اغیار کے قبضے سے آزاد ہونا اور معارف واسرار کی تحقیق کی طرف خالص ہو کر بڑھنا اور مصنفؒ ان سب کو علیحدہ علیحدہ پہلے بیان کر چکے ہیں۔

چنانچہ حضرت مصنفؒ نے اس کتاب کی ابتدا میں بیان فرمایا:-

اَوْرَدَ عَلَيْكَ الْوَارِدَ لِتَكُوْنَ بِهٖ عَلَيْهِ وَارِدًا اِلٰى آخِرِهٖ

''اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر وارد کو اس لئے وارد کرتا ہے۔ تا کہ تم اس سے ذریعے اس کی طرف آؤ۔ وہ تمہارے اوپر وارد کو اس لئے وارد کرتا ہے۔ تا کہ وہ تم کو اغیار کے قبضے سے محفوظ کرے۔ اور مخلوق کی غلامی سے آزاد کرے۔ وہ تمہارے اوپر وارد کو اس لئے وارد کرتا ہے۔ تا کہ وہ تم کو تمہارے وجود کی قید سے آزاد کر کے اپنے شہود کی فضا میں پہنچائے۔

اور اس سے کچھ پہلے اسی باب میں مصنفؒ نے فرمایا ہے:- جب تمہارے اوپر واردات الہیہ وارد ہوتے ہیں۔ تو تمہاری عادات کو منہدم کر دیتے ہیں۔

نیز فرمایا وارد:- قہار کی بارگاہ سے آتا ہے۔ اس لئے جو شی اس کے سامنے آتی ہے۔ وہ اس کو مٹا دیتی ہے۔

لہذا جب تمہارے اوپر وارد نازل ہو۔ اور تمہاری انسانی عادتوں کو ختم کر کے تمہارے اندر مذکورہ بالا خصلتوں کو نہ پیدا کرے۔ تو تم اس کو پاک نہ سمجھو۔ اور اپنے نفس کو ملامت کرو۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ وہ وارد شیطانی ہو۔ کیونکہ وارد الہیہ کے بعد ٹھنڈک اور سکون قلب اور زہد واطمینان اور عاجزی وانکساری پید ہوتی ہے۔ اور وارد شیطانی کے بعد:- گرمی اور سخت دلی اور تکبر اور تیز مزاجی اور انانیت یعنی خود پرستی پیدا ہوتی ہے۔

لہذا حال سے مراد :- خوشی اور ہلکا پن اور بے عملی اور غیر شرعی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ درحقیقت حال سے مراد :- وہ پھل ہیں۔ جو اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

پس حال :- بارش کے بادل کے مثل ہے۔ جس طرح بادل سے مقصد بارش نہیں ہے۔ بلکہ وہ پھل ہیں، جو اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا تم حال کے قائم رہنے کی خواہش نہ کرو۔ کیونکہ کبھی اس کا قائم رہنا تمہارے لئے مضر ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ بارش ہونے سے اس کا فائدہ نقصان سے بدل جاتا ہے۔

حضرت مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے :-

لَا تَطْلُبَنَّ بَقَاءَ الْوَارِدَاتِ بَعْدَ اَنْ بَسَطَتْ اَنْوَارَهَا ، وَاَوْدَعَتْ اَسْرَارَهَا ، فَلَكَ فِي اللهِ غِنًى عَنْ كُلِّ شَيْئٍ وَلَيْسَ يُغْنِيْكَ عَنْهُ شَيْءٌ

”جب واردات اپنے انوار کو تمہارے قلب میں پھیلا چکے ہوں اور اپنے اسرار سپرد کر چکے ہوں، تو ان کے باقی رہنے کی خواہش نہ کرو۔ کیونکہ جب تم نے اللہ تعالیٰ کو پالیا، تو تم ہر شی سے بے نیاز ہو گئے۔ اور تم کو کوئی شی اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کر سکتی ہے۔“

میں کہتا ہوں :- کسی شی کو چاہنا، اس کی محبت کی دلیل ہے۔ اور کسی شی کی محبت اس کی عبودیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم اس کے غیر کے بندے بنو۔ لہذا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ کسی حال کی خواہش کرو، نہ کسی مقام کی۔ تو اگر تمہارے اوپر احوال یعنی واردات الہیہ وارد ہوں۔ پھر وہ علیحدہ ہوں اور وہ لوٹ جائیں تو اب اس کے بعد کے وہ تمہارے قلب سے اغیار کی ظلمتوں اور مخلوق کی صورتوں کو مٹا کر اپنے انوار پھیلا چکے ہوں، اور اپنے اسرار یعنی یقین اور عیاں شہود سپرد کر چکے ہوں۔ تو تم ان واردات کے باقی رہنے کی خواہش نہ کرو۔

یا تم اس طرح کہو :- تم واردت کے باقی رہنے کی خواہش نہ کرو۔ جبکہ وہ اپنے انوار تمہارے قلب میں پھیلا چکے ہوں۔ اور تمہارے نفس کی عادات کو ختم کر چکے ہوں۔ اور تم جسمانی خواہشات اور نفسانی عادات کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہو۔ اور برے اوصاف سے پاک ہو کر بہترین اور پاکیزہ اوصاف سے آراستہ ہو چکے ہو۔ کیونکہ یہی واردات الہیہ کے انوار کی علامات

ہیں۔اور جبکہ وہ اپنے اسرار یعنی یقین واطمینان اور معرفت، یا زہداور رضا و تسلیم ، یا خشوع وتواضع اور عاجزی وانکساری، تمھارے قلب کو سپرد کر چکے ہوں۔ کیونکہ وارد الٰہی کی سچائی اور اس کا پھل حاصل ہونے کی علامات یہی ہیں۔لہذا جب پھل حاصل ہو گیا۔تو حضرت مصنفؒ کے نزدیک کسی شی کی حاجت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے پالینے کے بعداب تم ہر شی سے بے نیاز ہو گئے۔ اوراب تم کسی شی کے محتاج نہیں رہ گئے۔لیکن تم کو اللہ تعالےٰ سے کوئی شی بے نیاز نہیں کرسکتی ہے۔

اور عنقریب مصنفؒ کا یہ قول آئے گا:- تمھارے اللہ تعالےٰ کو پانے کے بعد تم سے کیا شی گم ہوئی؟ اور تم سے اللہ تعالےٰ کے کھوجانے کے بعد تم کیا شی ملی؟

ایک عارف شاعر نے فرمایا ہے:-

لِكُلِّ شَيْئٍاِذَا فَارَقْتَهٗ عِوَضٌ وَ لَيْسَ لِلّٰهِ اِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضٍ

”ہر شی کا بدلہ ہے، اگر تم نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔لیکن اگر تم نے اللہ تعالےٰ کو چھوڑ دیا ہے‘ تو اس کا کوئی بدلہ نہیں ہے۔“

اور اشارہ میں ہے:-اللہ تعالےٰ نے فرمایا:- تم ہرگز میرے سوا کسی شی پر بھروسہ نہ کرو۔ کیونکہ یہ تمھارے لئے عذاب اور باعث ہلاکت ہے۔اس لئے کہ اگر تم علم پر بھروسہ کرو گے، تم ہم اس کو تمھارے پیچھے لگادیں گے۔اور اگر تم عمل کی پناہ لو گے۔تو ہم اس کو تمھاری طرف لوٹادیں گے۔ اور اگر تم حال پر اعتماد کرو گے۔توم ہم تم کو اسی کے ساتھ روک دیں گے۔اور اگر تم وجد سے محبت کرو گے۔تو ہم تم کو اسی کے قریب رکھیں گے۔اور اگر تم مخلوق کا لحاظ کرو گے۔تو ہم تم کو انھیں کے سپرد کر دیں گے۔اور اگر تم معرفت سے دھوکا کھاؤ گے۔تو ہم اس کو تمھارے لئے جہالت بنادیں گے۔پھر تمھارے پاس کون سی تدبیر ہے؟ اور تمھارے ساتھ کون سی طاقت ہے؟لہذا تم ہم کو رضامندی کے ساتھ اپنا رب بنالو۔تاکہ ہم تم کو رضامندی کے ساتھ اپنا بندہ بنالیں۔

حضرت ابوسلیمان دارانی سے دریافت کیا گیا:- ان چیزوں میں سب سے افضل کون سی چیز ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:-ان چیزوں میں جن کے ذریعے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے، سب سے افضل اور قریب یہ ہے۔کہ

بندہ اپنے قلب سے خبردار ہو۔ اور وہ دنیا اور آخرت سے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ چاہے۔ اسی کے متعلق ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:۔

مَنْ عَرَفَ اللهَ فَلَمْ تُغْنِهِ مَعْرِفَةُ اللهِ فَذَاكَ الشَّقِيُّ

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت نے اس کو بے نیاز نہیں کیا۔ تو وہ بد بخت ہے۔''

مَا يَصْنَعُ الْعَبْدُ بِعِزِّ الْغِنٰى وَالْعِزُّ كُلُّ الْعِزِّ لِلْمُتَّقِيْ

''بندہ دولت کی عزت لے کر کیا کرے گا۔ اور کل عزت متقی کے لئے ہے۔

لہذا جب تم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنا حاصل ہو جائے گا، تو تم کل ماسویٰ سے بے نیاز جاؤ گے۔

اس لئے تم بادشاہ علام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی حال اور وارد اور مقام کی طرف توجہ نہ کرو۔ کیونکہ حال یا وارد کے باقی رہنے کی طرف تمہارا متوجہ ہونا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر شی سے بے نیاز نہ ہونے کی دلیل ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

تَطَلُّعُكَ اِلَى بَقَاءِ غَيْرِهٖ دَلِيْلٌ عَلٰى عَدَمِ وِجْدَانِكَ لَهٗ

''غیر اللہ کے باقی رہنے کی طرف تمہارا متوجہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں پایا ہے۔''

میں کہتا ہوں:۔ اس لئے کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کو پالیا ہوتا، تو تم کسی شی کو نہ طلب کرتے اور نہ تم کسی شی کے محتاج ہوتے۔ لہذا جو شخص وارد اور حال سے خوش ہوتا ہے، وہ وصال کو نہیں پاتا ہے۔ اور جو شخص غیر اللہ کا محتاج ہے، وہ عارف باللہ نہیں ہے۔ اور جو شخص کسی شی کا محتاج ہوتا ہے۔ یا کسی شی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کسی سی میں ہے۔ نہ کسی شی پر ہے۔ (یعنی اس کو اللہ تعالیٰ سے کچھ تعلق نہیں ہے)

اور اکثر میں فقرا سے کہتا ہوں:۔ جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ وارد کے چھن جانے کے بعد

اپنے شیخ کو چھوڑ کر دوسرے شیخ کے پاس جاتا ہے۔تو تم سمجھ لو کہ وہ اپنی پہلی حالت پر باقی ہے۔اور عوام میں سے ہے۔اور اپنے صدق کی کمی کی بنا پر وہ خصوصیت کے شہروں میں داخل نہیں ہوا ہے اگر وہ خصوصیت کے شہروں میں داخل ہوتا تو اس کی ہمت جمع ہوتی اور اس کا قلب مطمئن ہوتا ہے۔اور وہ غیر اللہ کے پانی سے بے نیاز ہوتا۔لہذا اسکا اپنے شیخ کے علاوہ دوسرے کا پیاسا ہونا، اس بات کی دلیل ہے، کہ اس نے اس کا پانی نہیں پیا ہے۔یعنی اس سے فیضیاب نہیں ہوا ہے۔اور کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے۔ اور بیان کیا جاتا ہے، کہ یہ اشعار حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

كَانَتْ لِقَلْبِىْ اَهْوَاءٌ مُفَرَّقَةٌ　　فَاسْتَجْمَعَتْ مُذْرَاَتْكَ الْعَيْنُ اَهْوَائِىْ

''میرے قلب میں مختلف خواہشیں تھیں۔لیکن میری آنکھ نے تم کو دیکھا تو میری سب خواہش سمٹ کر ایک ہو گئیں۔

فَصَارَ يَحْسُدُنِىْ مَنْ كُنْتُ اَحْسُدُهٗ
وَ صِرْتُ مَوْلَى الْوَرٰى مُذْصِرْتَ مَوْلَائِىْ

''پھر وہ لوگ مجھ سے حسد کرنے لگے، جن سے پہلے میں حسد کرتا تھا۔اور جب تو میرا مولا ہو گیا۔تو میں مخلوق کا مولا ہو گیا۔

تَرَكْتُ لِلنَّاسِ دِيْنَهُمْ وَ دُنْيَاهُمْ
شُغْلاً بِذِكْرِكَ يَا دِيْنِىْ وَ دُنْيَائِىْ

''اے میرے دین اور دنیا! میں نے تیرے ذکر میں مشغول ہو کر لوگوں کے دین اور دنیا کو ان کے لئے چھوڑ دیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر شی سے بے نیاز ہونے کی علامات میں سے :-اللہ تعالیٰ سے مانوس ہونا اور اس کے غیر سے متنفر ہونا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔اور اس سے کوئی شی بے نیاز نہیں کر سکتی ہے۔لہذا جب کوئی شخص اپنے رب کے شہود کے سوا کسی حال یا مقام کو کھو دیتا ہے۔پھر وہ اس کے کھو جانے پر غم کرتا اور پریشان ہوتا ہے۔وہ بارگاہ الہی سے دور

ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

وَاسْتِیْحَاشُكَ بِفُقْدَانِ مَاسِوَاهُ دَلِیْلٌ عَلیٰ عَدَمِ وَ صُلَتِكَ بِهٖ

''ماسوی اللہ کے گم ہونے سے تمھارا رنجیدہ اور پریشان ہونا، اللہ تعالیٰ تک تمھارے نہ پہنچنے کی دلیل ہے۔''

میں کہتا ہوں:۔ احوال اور واردات کے گم ہونے سے تمھاری وحشت و پریشانی یا رنج و غم ، اللہ تعالیٰ تک تمھارے نہ پہنچنے کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر تم اس کے قریب پہنچ گئے ہوتے ، تو کسی شی سے گم ہونے سے تم کو غم یا وحشت نہ ہوتی۔ اور درحقیقت تم نے کوئی شی گم نہیں کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیازی کی علامت یہی ہے:۔ جب بندے کی کوئی ایسی شی گم ہو جائے جس کے گم ہونے سے گھبرانا اور پریشان ہونا یا رنج و غم کرنا ، بندے کی عادت ہوتی ہے۔ مثلاً اولاد یا اس کے قریب کوئی شی یا ظاہری عبادت یا اس کے علاوہ کوئی شی فوت ہو جائے۔ تو وہ معرفت الٰہی کی طرف رجوع کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور بندوں سے یہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

لِكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ

''تا کہ تم لوگ اپنی فوت شدہ چیز پر غم نہ کرو۔ جو تم کو دیا ہے اس پر خوش نہ ہوؤ۔''

حضرت مصنفؒ رضی اللہ عنہ نے تنویر میں بیان فرمایا ہے:۔ تم یہ جان لو۔ کہ اللہ تعالے تم کو حال میں اس لئے داخل کرتا ہے، تا کہ تم اس سے کچھ حاصل کرو۔ نہ اس لئے کہ وہ تم سے کچھ حاصل کرے۔ اور وہ اس لئے آتا ہے۔ کہ تم اس میں تعریف کا ہدیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اٹھا کر اپنی طرف لاؤ۔ پھر تم اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے اسم پاک ''مبدی'' کے ساتھ توجہ کرو۔ کیونکہ اسی نے اس کو ظاہر کیا ہے اور باقی رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں جو حصہ تمھارا ہے، جب وہ تم کو مل جائے۔ اس کے بعد جب امانت واپس ہو جائے۔ تو تم اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے اسم پاک ''معید'' کے ساتھ توجہ کرو۔ کیونکہ اسی نے اس کو لوٹایا اور اس کو فوت کیا ہے۔ لہذا تم ہرگز کسی رسول کے باقی

رہنے کی خواہش نہ کرو، جبکہ اس نے اس کی رسالت پہنچادی ہے۔ اور نہ کسی امانت دار کے باقی رہنے کی خواہش کرو جبکہ اس نے اس امانت پہنچادی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ احوال کے زائل ہونے کے بعد، انزال کے مرتبوں سے معزول ہوتے ہی کم ظرف رسوا اور ذلیل ہو جاتا ہے۔ اسی وقت عیوب ظاہر ہو جاتے اور پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیازی کا دعویٰ کرنے والے کتنے ہیں اور درحقیقت اس کی بے نیازی اس کی عبادت یا اس کے نور یا اس کی معرفت کا دروازہ کھلنے کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزت کا دعویٰ کرنے والے کتنے ہیں۔ اور اس کی عزت مخلوق پر، اس کی معرفت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مرتبہ اور شان کے ظاہر کرنے سے متعلق ہے۔ لہذا تم اللہ تعالیٰ کے بندے بنو۔ نہ کہ اسباب کے بندے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ بغیر سبب کے تمھارا رب ہے۔ اسی طرح تم بھی بغیر کسی سبب کے اس کے بندے بن جاؤ۔ تا کہ تم اسی طرح اس کے ہو جاؤ، جس طرح وہ تمھارا ہے۔

یہاں تیئسواں باب ختم ہوا۔

اس باب کا حاصل :- قرب و وصال اور اس سے پیدا ہونے والے انزال کے مقامات اور احوال کے نتائج اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیازی کا بیان کرنا ہے۔ اور یہی وہ ہمیشہ اور برابر قائم رہنے والی نعمت ہے۔ جس کے بیان سے مصنفؒ نے چوبیسواں باب شروع کیا ہے۔

چوبیسواں باب

دوامی نعمت اور نعمت کو ختم کرنے والی اشیاء کے بیان میں

حضرت مصنفؒ نے فرمایا ہے:-

اَلنَّعِیْمُ وَ اِنْ تَنَوَّعَتْ مُظَاهِرُهٗ اِنَّمَا هُوَ بِشُهُوْدِهٖ وَ اِقْتِرَابِهٖ وَ الْعَذَابُ وَ اِنْ تَنَوَّعَتْ مُظَاهِرُهٗ اِنَّمَا هُوَ بِوُجُوْدِ حِجَابِهٖ ، فَسَبَبُ الْعَذَابِ وُجُوْدُ الْحِجَابِ وَ اِتْمَامُ النَّعِیْمِ بِالنَّظْرِ اِلٰی وَجْهِهِ الْکَرِیْمِ

نعمت، اگر چہ اس کے مظاہر مختلف قسم کے ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے قرب اور شہود کی بنا پر ہے۔ اور عذاب، اگر چہ اس کے مظاہر مختلف قسم کے ہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے حجاب کی بنا پر ہے۔ لہذا عذاب کا سبب:- اللہ تعالیٰ سے حجاب کا ہونا ہے اور نعمت کا کمال:- اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں:- روح کی نعمت اور اس کا عذاب صرف اس کے رب کے شہود اور حجاب سے ہے۔ اور یہ حالت روح کے عالم اجسام سے نکل جانے ار عالم ارواح کی طرف اس کی ترقی کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ لہذا اس وقت اس کی نعمت:- وصال اور جمال کی خوشبو ہے اور اس کا عذاب:- جمال کے مشاہدہ سے اس کا محجوب ہونا اور اللہ بزرگ و برتر سے اس کا دور ہونا ہے۔ اور یہ تمام مخلوقات (جن وانس) کو آخرت میں حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ آخرت میں حق للہ باطل سے جدا ہو جائے گا۔ اور ہر شخص اپنا ٹھکانا پہچان لے گا۔

اہل جنت:- اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی لذت محسوس کریں گے۔ اور اپنے سے اللہ

تعالیٰ کی رضامندی اور اس کا قرب معلوم کریں گے۔ لیکن ان لوگوں کے علم میں ایک دوسرے سے فرق ہوگا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار چادر کے پیچھے سے کر رہے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کو یہ معلوم ہوگا۔ کہ وہ چادر کے اندر داخل ہو کر اس کا دیدار کر رہے ہیں۔

بخاری شریف میں یہ حدیث شریف روایت کی گئی ہے:۔

وَ مَا بَيْنَ النَّاسِ وَ بَيْنَ اَنْ يَّنْظُرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ اِلَّا رِدَاءُ الْكِبْرِيَاءِ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ جَنَّةِ عَدْنٍ

''لوگوں کے اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کے درمیان، جنت عدن میں کبریائی کی چادر حائل ہوگی۔''

اور اس چادر کو صرف اہل ذوق ہی سمجھیں گے۔

اور اہل دوزخ:۔ اللہ تعالیٰ سے دوری محسوس کریں گے۔ اس لئے ان کا عذاب دوگنا ہو جائیگا اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنے جمال کی صفت کے ساتھ تجلی کرتا، تو وہ اس دن عذاب کی تکلیف بھول جاتے اور اگر اہل جنت سے اس دن اللہ تعالیٰ محجوب ہو جاتا، تو جنت کی وسعت ان کے اوپر تنگ ہو جاتی۔ اور ان کی نعمت عذاب بن جاتی۔

لیکن جو لوگ دنیا میں عارف باللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان سے محجوب نہ ہوگا۔ جس طرح یہاں وہ اس کو اس کے انوار کے واسطہ سے دیکھتا ہیں۔ اسی طرح وہاں وہ اس کو اس کے اسرار کے لطائف سے دیکھیں گے۔ بلکہ اس سے بہتر طریقے پر دیکھیں گے۔ کیونکہ باطن ظاہر پر اور قدرت حکمت پر غالب ہوگی۔ اور جو شخص یہاں محجوب ہے، وہ وہاں بھی محجوب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى

''اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔''

اس آیہ کریمہ کی دو تفسیریں ہیں:۔ ایک ظاہری۔ دوسری، باطنی۔ لیکن آخرت میں بدن کی لطافت کی بنا پر حجاب بھی لطیف ہوگا۔ اس لئے ان کی نعمت قرب کے دیکھنے ہی سے مکمل ہوگی۔

لیکن جب وہ قرب ان سے گم ہو جائے گا، تو ان کی نعمت تلخ ہو جائے گی۔ کیونکہ آخرت میں حکم ارواح کے لئے جاری ہوگا۔ اور اس دنیا میں حکم اجسام کے لئے جاری ہے۔ لیکن جو لوگ اس دنیا میں ترقی کر کے عالم ارواح تک پہنچ جاتے ہیں، وہ اہل جنت میں سے ہیں۔ لہذا ان کی نعمت ارواح کی نعمت ہے اور وہ وصال کی خوشبو اور کمال کا شہود ہے۔ لہذا ان کی نعمت :- اللہ تعالیٰ کے قرب اور رضامندی کا دیکھنا ہے۔ اس لئے اگر ان سے قرب کا شہود زائل ہو جائے یا رضامندی کی مدد منقطع ہو جائے، تو جنت کی وسعت ان کے لئے تنگ ہو جائے گی۔

لیکن اجسام کی نعمت اور ان کا عذاب :- یعنی جو لوگ اجسام کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محجوب ہیں۔ ان کی نعمت اور عذاب :- اس چیز کی موافقت یا مخالفت کی بنا پر ہوتی ہے، جو ان کی طبیعت کے مناسب ہے۔ لہذا جب تندرستی اور آرام اور محسوس ظاہری خوبصورتی، جو ان کی طبیعت کے موافق ہوتی ہے، ان کو حاصل ہوتی ہے۔ تو وہ ان کے حق میں نعمت ثابت ہوتی ہے۔ اور جب ان کی طبیعت کے مخالف کسی طرح کا درد یا کچھ گم ہونا یا کچھ رک جانا یا کوئی فتنہ ان کو لاحق ہوتا ہے۔ تو وہ ان کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے نہ قرب کی لذت میں کچھ لطف ہے۔ نہ دوری کی تلخی میں کچھ خرابی ہے۔ لہذا درحقیقت نعمت میں ان کا حصہ جانوروں کے حصے کی طرح ہے۔ ہاں اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان کی عادتیں ختم ہو جائیں۔ اور ان کے محسوس عذاب کی حالت میں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے جمال کی صفت کے ساتھ تجلی کرے۔ تو وہ اس عذاب کو بھول جائیں گے۔

حاصل یہ ہے :- مصنف کا کلام اہل قرب یا اہل شہود کے لئے ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ قرب اور شہود کی لذت کو حاصل کرتے ہیں۔ اور دوری اور حجاب کی تلخی کو محسوس کرتے ہیں۔ خواہ وہ اس دنیا میں ہو، خواہ آخرت میں۔

جو کچھ میرے اوپر منکشف ہوا، وہ میں نے بیان کر دیا ہے۔ اور جو کچھ مصنف نے بیان کیا ہے، اہل عشق اس کو چکھ چکے ہیں۔

چنانچہ بہت سے عاشق ایسے ہوئے ہیں۔ جن کے اوپر ان کے محبوب کے سامنے مار پڑی۔ لیکن انھوں نے ... کو محسوس نہیں کیا لیکن ... محبوب ان کے سامنے سے غائب ہو

گیا، تو وہ رونے اور فریاد کرنے لگے۔ اور جب ان سے اس کیفیت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ تو انھوں نے جواب دیا:- جب وہ حاضر تھا اور دیکھ رہا تھا، جس کے لئے میرے اوپر مار پڑ رہی تھی۔ تو میں مارنے کے درد سے بے حس اور بے خبر تھا۔ لیکن جب وہ میرے سامنے سے غائب ہو گیا۔ تو مارنے کا درد مجھ کو محسوس ہوا۔

میں کہتا ہوں:- اسی حقیقت کی بنا پر عارفین نے فاقوں اور ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کو لذیذ سمجھا۔ کیونکہ ان میں انھوں نے اپنے محبوب کے سامنے ہونے اور اس کے راضی ہونے کا مزہ چکھا۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنھم فرماتے تھے:-

سنو! تین ناپسند اشیاء، سب اشیاء سے زیادہ مجھ کو پسند اور عزیز ہیں۔ فقر اور مرض اور موت۔

حضرت بلالؓ کی زوجہ محترمہ موت کے وقت چیخ کر کہہ رہی تھیں (واکرباہ) ہائے اے تکلیف۔ اور حضرت بلالؓ موت کے وقت فرما رہے تھے:- "واطرباہ" واہ رے خوشی کل میں اپنے دوستوں حضرت محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کرام سے ملاقات کروں گا۔

حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو جب پیٹھ میں نیزہ مارا گیا۔ اور وہ سینہ پار کر کے نکل گیا۔ تو انھوں نے فرمایا:-

فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ

"رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا۔"

اور ایک ولی اللہ کوڑھی تھے۔ وہ بیماروں کے لئے دعا کرتے تھے۔ تو وہ لوگ فوراً شفایاب ہو جاتے تھے۔ ان سے لوگوں نے کہا:- آپ اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے، کہ وہ آپ کو شفا عطا فرمائے۔ انھوں نے فرمایا:- میں نے اللہ رب العزت کو خواب میں دیکھا، کہ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے:- کیا تم اس پر راضی ہو کہ میں تم کو ایک مصیبت میں مبتلا کروں۔ اور اس کے ذریعے میں تم کو اعلیٰ سے بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دوں؟ میں نے کہا:- ہاں، میں راضی ہوں۔ لہذا میں کوڑھی ہو گیا۔

اس لئے تم کو چاہیئے کہ ان بزرگان دین کے حالات میں غور کرو:- جب وہ عالم اجسام

سے ترقی کر کے عالم ارواح تک پہنچ گئے، تو ان کے لئے نہ کوئی جسمانی نعمت باقی تھی، نہ جسمانی عذاب۔ بلکہ ارواح کی نعمت او ارواح کا عذاب باقی تھا۔ جسمانی نعمت اور عذاب سے وہ لوگ غائب تھے۔ لہٰذا ان لوگوں کی نعمت اور ان کی ارواح کی غذا:- ان کے رب تعالیٰ کا ذکر اور اس کے نور، یا قرب کا شہود ہوتی تھی۔ اور وہ ان کے لئے ایسی غذا بن گئی تھی، کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور اس سے وہ بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ دیتے۔ تو ان کی روحیں ان کے جسموں سے جدا ہو جاتیں۔

اسی حقیقت کے بارے میں ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:-

بِالْقُوْتِ اِحْیَاءُ الْجُسُوْمِ وَ ذِکْرُہٗ تَحْیَا بِہٖ الْاَلْبَابُ وَالْاَرْوَاحُ

''جسموں کی زندگی غذا سے ہوتی ہے اور عقلوں اور روحوں کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہوتی ہے۔''

ھُوَ عَیْشُھُمْ وَوُجُوْدُھُمْ وَ حَیَاتُھُمْ حَقًّا وَ رُوْحُ نُفُوْسِھِمْ وَالرَّاحُ

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ان کا عیش اور ان کا وجود اور ان کی زندگی اور ان کے نفوس کی روح اور راحت ہے۔''

اور میں نے اپنے قصیدہ عینیہ میں کہا ہے:-

وَلِی لَوْعَۃٌ بِالرَّاحِ اِذْ فِیْہِ رَاحَتِیْ وَ رَوْحِیْ وَرَیْحَانِیْ وَ خَیْرٌ وَاسِعُ

''مجھ کو وحدت کے شراب سے عشق ہے۔ کیونکہ اسی میں میرے لئے راحت اور خوشبودار ہوائیں اور وسیع بھلائی ہے۔''

سَکِرْنَا فَھِمْنَا فِی بَھَاءِ جَمَالِہٖ فَغِبْنَا عَنِ الْاِحْسَاسِ وَالنُّوْرُ سَاطِعُ

''ہم مست ہو گئے، پھر اس کے جمال کی رونق میں کھو گئے۔ پھر احساس سے گم ہو گئے۔ حالانکہ نور روشن ہے۔''

تَبَدَّتْ لَنَا شَمْسُ النَّھَارِ وَاَشْرَقَتْ
فَلَمْ یَبْقَ ضَوْءُ النَّجْمِ وَالشَّمْسُ طَالِعُ

''ہمارے سامنے دن کا سورج ظاہر ہوا اور روشن ہے۔لہذا ستاروں کی روشنی باقی نہیں رہی۔اور سورج نکلا ہی رہتا ہے۔''

حاصل یہ ہے :-ارواح کی نعمت ،یعنی وہ جو اپنے محبوب کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ان سے جدا نہیں ہوتی ہے۔لہذا عارفین کی نعمت ان سے جدا نہیں ہوتی ہے۔کیونکہ اللہ تعالےٰ کا قرب ختم نہیں ہوتا ہے۔

اور جس شخص کا نفس قرب الٰہی سے دور ہو جاتا ہے، وہ عذاب کو محسوس کرتا ہے اور اس کو غم و فکر اور پریشانیاں اور تکلیفیں لازم ہوتی ہیں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے :-

مَا تَجِدُهُ الْقُلُوْبُ مِنَ الْهُمُوْمِ وَالْاَحْزَانِ ، فَلِاَجْلِ مَامُنِعَتْهُ مِنْ وُجُوْدِ الْعَيَانِ

''قلوب جن پریشانیوں اور غموں کو محسوس کرتے ہیں۔وہ اس وجہ سے ہے، کہ ان کو عیاں شہود سے محروم کر دیا گیا ہے۔''

میں کہتا ہوں :-درحقیقت پریشانیوں اور غموں کا سبب :-شہود کا گم ہونا ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالےٰ ہمیشہ قریب اور نگہبان ہے۔لہذا جو شخص دوست سے قریب ہو۔وہ کسی شی کے جدا ہونے یا اس کے کھو جانے کو کیسے محسوس کر سکتا ہے؟ دوست کا مشاہدہ، ہر دور و نزدیک سے غائب کر دیتا ہے اور جو شی بھی دوست کے پاس سے آتی ہے، وہ محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔اور ہر شی دوست ہی کی طرف سے آتی ہے۔لہذا کوئی ناپسند شی اس کو لاحق نہیں ہوتی ہے۔کہ وہ اس سے پریشان ہو اور اس کے محبوب حقیقی کے سوا کوئی دوسری شی اس کو محبوب ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے کھو جانے پر غم میں مبتلا ہو۔کیونکہ اس کے محبوب حقیقی میں کل خوبیاں جمع ہیں۔

ایک عارف شاعر نے فرمایا ہے :-

تَذَلَّلْ لَهٗ تَحْظٰى بِرُؤْيَا جَمَالِهٖ   فَفِيْ وَجْهِ مَنْ تَهْوٰى الْفَرَائِضُ وَالنَّوَافِلُ

''تم عاجزی اور فرماں برداری کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاؤ۔تو تم اس کے جمال کے دیدار سے لطف حاصل کرو گے۔کیونکہ جس ذات اقدس کو تم چاہتے ہو، اسی کے سامنے فرائض اور نوافل ادا

کرنا ہے۔"

اسی مفہوم میں عینیہ کے مصنف نے فرمایا ہے:-

تَلَذُّ لِیَ الْاٰلَامُ اِذْ کُنْتَ مُسْقِمِیْ وَاِنْ تَخْتَبِرْ فَھُوْا عِنْدِیْ صَنَائِعُ

"جب مجھ کو مصیبت میں مبتلا کرنے والا تو ہے۔ تو مصیبتیں میرے لئے مزے دار ہیں اور جب میری آزمائش تو کرتا ہے، تو وہ میرے نزدیک صنعت ہے۔

ان سب کا حاصل یہ ہے:- جس شخص کی نظر محبوب حقیقی کی طرف ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے نور اور جمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے لئے نہ کوئی فکر باقی رہتی ہے، نہ کوئی غم۔ جیسا کہ حضرت ابن فارض نے شراب کے بارے میں فرمایا ہے:-

فَمَا سَکَنَتْ وَالْھَمُّ یَوْمًا بِمَوْضِعٍ کَذَالِکَ لَمْ یَسْکُنْ مَعَ النَّغَمِ الْغَمُّ

"شراب اور فکر دونوں ایک وقت میں ایک جگہ نہیں ٹھہرتے ہیں۔ اسی طرح گانے کے ساتھ متہ نہیں ٹھہرتا ہے۔"

اور یہ شعر بھی انھیں نے فرمایا ہے:-

وَلَو خَطَرَتْ یَوْماً عَلٰی خَاطِرِ امْرِئٍ اَقَامَتْ بِہِ الْاَفْرَاحُ وَارْ تَحَلَ الْھَمُّ

"اور اگر کسی دن کسی شخص کے دل پر فکر اور غم ہوتا ہے۔ تو اس کے ذریعے خوشیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ اور غم چلا جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:- اے داؤد! تم میرے غیر کی فکر کو اپنے قلب میں جگہ نہ دو۔ کیونکہ اس سے روحانیوں کی لذت کم ہو جاتی ہے۔ اے داؤد! میں روحانیوں کے قلوب کا چراغ ہوں اور جس شخص کے قلب کا چراغ میں ہوں وہ کبھی فکر مند نہیں ہوتا ہے۔ اے داؤد! مخلوق سے میری مراد یہی ہے کہ وہ روحانی ہوں۔

حاصل یہ ہے:- جو شخص اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کے ماسویٰ سے غائب ہوتا ہے۔ اس کے لئے کچھ فکر باقی نہیں رہتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا ساتھی وہ ذات اقدس ہے۔ جو بندے کے ہر ارادہ کے لئے مدد اور فتح کا سبب ہے۔ کیا تم حضرت رسول اللہ ﷺ کے قول میں، جو حضرت ابوبکر

صدیقؓ سے اس وقت فرمایا، جب مشرکین ان کے دیکھ لینے کے قریب ہو گئے تھے۔ غور نہیں کرتے ہو:-

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

''غم نہ کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

چونکہ حضرت رسول کریم ﷺ عیاں وشہود کے مقام میں تھے۔ اس لئے ان کو کچھ فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اور نہ کوئی غم ان کے مقام کے قریب پہنچا۔ اور اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ موقن (یقین کے مقام میں) تھے۔ مشاہدہ کے مقام میں نہ تھے۔ لہذا حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے مقام کمال کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔ کیونکہ شہود کا مقام، یقین کے مقام سے بلند ہے۔

اسی حقیقت کے بیان میں کسی عارف کا یہ شعر ہے:-

كَبُرَ الْعَيَانُ عَلَيَّ حَتّٰى اَنَّهُ   صَارَ الْيَقِيْنُ مِنَ الْعَيَانِ تَوَهُّمَا

''عیاں وشہود میرے اوپر اتنا غالب ہو گیا کہ اس کے سامنے یقین وہم ہو گیا۔''

اور ان تمام اشیاء میں سے جن کا اہتمام اس شخص کے لئے ضروری ہے۔ جس کا یقین کامل نہیں ہوا ہے۔ روزی کا معاملہ اور مخلوق کا خوف ہے۔

یہاں تک کہ حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اگر کوئی شخص مجھ کو ان دونوں چیزوں سے بےفکر ہونے کی ضمانت دے تو میں اس کے لئے ولایت حاصل ہونے کا ضامن ہوں۔

حضرت مصنفؒ نے روزی کے معاملے کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

مِنْ تَمَامِ النِّعْمَةِ عَلَيْكَ اَنْ يَّرْزُقَكَ مَا يَكْفِيْكَ ، وَ يَمْنَعَكَ مَا يُطْغِيْكَ

''اللہ تعالیٰ کی کامل نعمتوں میں سے یہ ہے۔ کہ وہ تم کو اس قدر روزی عطا فرمائے، جو تمہارے لئے کافی ہو۔ اور اس قدر سے تم کو روک دے، جو تم کو سرکش اور گمراہ کر دے۔

میں کہتا ہوں [illegible] اللہ تعالیٰ کی کامل نعمت [illegible] یہ ہے کہ وہ اس کی ہمت کو اپنی

طرف متوجہ کر دے۔ اور اپنے غیر کے ساتھ ہر قسم کے تعلق سے اس کے قلب کو پاک کر دے۔ اور اس کو اتنی روزی دے جو اس کے لئے کافی ہو۔ اور اس کے غیر کے ساتھ تعلق سے اس کو بے نیاز کر دے۔ اور یہی غنا باللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیاز ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے نیاز ہونے اور اس کے ماسوائیٰ سے غائب ہونے سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ اور ہر اس شی سے اس کو محروم اور بے نیاز کر دے جو اس کو اپنے میں مشغول کر کے اس کو اس کے رب سے غافل کر دیتی اور سرکش و گمراہ بنا دیتی ہے۔

تو جب اللہ تعالیٰ، اتنا کھانا اور کپڑا اور مکان، جو تمھاری بشریت کے قائم رہنے کے لئے اور اتنا علم اور عمل اور ذوق اور معرفت، جو تمھاری روحانیت کے قائم رہنے کے لئے کافی ہو، تم کو عطا فرما دے اور جو اشیاء تم کو سرکش اور گمراہ کرتی اور تم کو اپنے میں مشغول کر کے، اپنے رب کے ساتھ تمھارے حضور سے تم کو غافل کرتی ہیں۔ ان سے تم کو محروم کر دے۔ تو یقینی طور پر اس نے اپنی نعمت تمھارے اوپر مکمل کر دی۔ لہذا تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، جو اس نے تم کو عطا فرمائی ہے اور ان اشیاء کے معاملے میں جو تمھارے لئے دشوار کر دی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو۔ اور ان اشیاء کو اپنے سے جدا کر دو، جو تمھارے قلب کو اپنے میں مشغول کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے سے روکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ مومنوں کی طرف سے مدافعت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

''بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس سے ڈرتے ہیں اور جو احسان والے ہیں۔''

اور حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے اس فقر اور غنا (محتاجی اور دولت) سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے۔ جو اپنے میں مشغول کر کے غافل کر دیتی اور اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے والے فقر اور گمراہ کر دینے والی دولت سے پناہ مانگا کرتے

تھے۔اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتاً

''اے میرے اللہ! تو آل محمد کی روزی بقدر ضرورت عطا فرما۔''

اور نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:۔

خَیْرُ الذِّکْرِ الْخَفِیُّ اَیْ فِی الْقَلْبِ وَ ھُوَ الْفِکْرَۃُ وَ خَیْرُ الرِّزْقِ مَا یَکْفِیْ

''بہترین ذکر، ذکر خفی ہے۔ جو قلب میں ہوتا ہے اور وہ فکر ہے اور بہترین روزی وہ ہے جو ضرورت کے لئے کافی ہو۔''

نیز حضرت رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے:۔

مَا طَلَعَتْ شَمْسٌ اِلَّا وَ بِجَنَا حَیْھَامَلَکَانِ یُسْمِعَانِ الْخَلَائِقَ غَیْرَ الثَّقَلَیْنِ :۔ اَیُّھَا النَّاسُ ھَلُمُّوْا اِلٰی رَبِّکُمْ ، مَا قَلَّ وَ کَفٰی خَیْرٌ مِّمَّا کَثُرَ وَ اَلْھٰی

''جب آفتاب طلوع ہوتا ہے۔تو اس کے دونوں طرف دو فرشتے جن اور انسان کے سوا تمام مخلوقات کو یہ پیغام سناتے ہیں:۔اے لوگو! تم سب اپنے رب کی طرف آؤ۔ جو چیز کم ہے، لیکن ضرورت کے لئے کافی ہے۔ وہ اس سے بہتر ہے، جو زیادہ ہو اور اللہ تعالےٰ سے غافل کر دے۔''

اور حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:۔

لَیْسَ الغِنٰی بِکَثْرَۃِ الْعَرَضِ ، اِنَّمَا الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

''دولتمندی اور بے نیازی، مال اور سامان کی زیادتی سے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ بے نیازی درحقیقت نفس کا بے نیاز ہونا ہے۔''

اور اسی مفہوم میں ایک عارف کا یہ شعر ہے:۔

غِنَی النَّفْسِ مَا یَکْفِیْکَ مِنْ سَدِّخَلَّۃٍ   فَاِنْ زِدْتَ شَیْئاً عَادَ ذَاکَ الْغِنٰی فَقْرًا

''نفس کا غنا وہ ہے، جو تمھاری ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔اور غیر کی محتاجی سے تم کو بے نیاز کرے۔ لہذا اگر تم کچھ زیادہ چاہو گے، تو وہ غنا فقر ہو جائے گا۔''

حضرت عبدالواحد بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ میں نے سنا:۔ ایلہ کے ویرانے

میں ایک پاگل لونڈی رہتی ہے۔ جو حکمت کی باتیں کرتی ہے۔ میں اس کو تلاش کرنے لگا۔ آخر میری اس سے ملاقات ہوئی۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ اور وہ ایک اون کا جبہ پہنے ہوئی تھی۔ جب اس نے مجھ کو دیکھا تو کہا:- اے عبدالواحد! تمھارا آنا مبارک ہو۔ مجھ کو اس بات سے تعجب ہوا کہ اس نے مجھ کو کیسے پہچان لیا۔ جبکہ اس نے اس سے پہلے مجھ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کو جواب دیا:- اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے۔ پھر اس نے کہا :- آپ کیوں آئے ہیں؟ میں نے کہا:- آپ مجھ کو کچھ نصیحت فرمایئے۔ اس نے کہا:- ایسے واعظ پر تعجب ہے، جس کو نصیحت کی جائے۔ اے عبدالواحد !تم یہ جان لو، بندہ جب کفایت میں ہوتا ہے یعنی اس کی ضرورت کے مطابق اس کو مل جاتا ہے اور پھر بھی وہ دنیا کی کسی شی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ زہد کی لذت اس سے چھین لیتا ہے۔ اور وہ اس کے لئے حیران و پریشان ہوتا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا کوئی حصہ ہوتا ہے تو وہ اس کو اس کے سر میں بطور وحی کے دے دیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے:-

اے میرے بندے! میں نے چاہا تھا کہ میں اپنے فرشتوں کے نزدیک تیرے مرتبے کو بلند کروں۔ اور تم کو اپنے اولیا کے لئے رہنما اور اپنے عبادت گزار بندوں کے لئے مرشد بناؤں۔

لیکن تم دنیا کے مال اور سامان کی طرف مائل ہو گئے۔ اور مجھ کو چھوڑ دیا۔ لہذا میں نے انسیت کے بعد وحشت اور عزت کے بعد ذلت اور دولتمندی و بے نیازی کے بعد محتاجی کا تم کو مالک بنا دیا۔ اب تم اسی حالت کی طرف لوٹ جاؤ۔ جس حالت پر پہلے تھے۔ تم اپنے نفس کی اسی حالت کی طرف لوٹ جاؤ جس کو تم پہچانتے ہو۔ پھر وہ لونڈی مجھ کو چھوڑ کر چلی گئی اور اس سے مزید بات کرنے کی حسرت میرے دل میں باقی رہ گئی۔

بعض آسمانی کتابوں میں ہے:- سب سے آسان معاملہ جو میں اہل دنیا کے ساتھ کرتا ہوں [illegible] یہ ہے کہ جب وہ دنیا کی طرف مائل [illegible] تو میں اپنے مناجات کی لذت ان سے سلب کر لیتا ہوں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ کفایت (ضرورت کے موافق ملنا) نعمت ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ ملنا وبال ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے۔ کیونکہ نفس فطری (پیدائشی) طور پر عطا اور بخشش

سے محبت کرتا ہے۔ اور محروم کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ لہذا جب اللہ تعالیٰ اس کو دیتا ہے، تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جب اس سے چھین لیتا ہے۔ تو وہ رنج وغم کرتا ہے۔ لہذا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی خوشی ہمیشہ قائم رہے، اس کو چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کوئی ایسی شی نہ لے، جس کے کھو جانے سے اس کو غم ہو۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

لِيَقِلَّ مَا تَفْرَحُ بِهِ يَقِلَّ مَا تَحْزَنُ عَلَيْهِ

''جب وہ شی کم ہوگئی، جس سے تم کو خوشی ہوتی ہے۔ تو وہ شی کم ہوگی، جس کے کھو جانے سے تم کو غم ہوتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری خوشی ہمیشہ قائم رہے، تو تم کسی ایسی شی کے مالک نہ بنو، جس کے کھو جانے پر تم کو غم ہو۔ اس لئے کہ اس کے کھو جانے پر تمھارا غم اس بات کی دلیل ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ لہذا اگر تم مال، یا مرتبہ، یا عزت یا اس کے علاوہ دوسری چیزوں میں سے اپنی ضرورت اور حاجت کم کرو گے، تو تم کھو جانے والی شی نہ پاؤ گے، کہ تم اس کے لئے غم کرو۔

کسی عارف سے دریافت کیا گیا:- آپ غم کیوں نہیں کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:- اس لئے کہ میں ایسی شی اپنے پاس رکھتا ہی نہیں ہوں، جو مجھ کو غم میں مبتلا کرے۔ اسی کے بارے میں کسی عارف کے یہ اشعار ہیں:-

وَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ لَّا يَرٰى مَا يَسُوْءُهُ ۝ فَلَا يَتَّخِذْ شَيْئًا يَخَافُ لَهُ فَقْدًا

''جس شخص کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی شی نہ دیکھے جو اس کو غم میں مبتلا کرے۔ اس کو چاہئے کہ ایسی کوئی شی نہ حاصل کرے، جس کے کھو جانے کا خوف ہو۔''

فَاِنَّ صَلَاحَ الْمَرْءِ يَرْجِعُ كُلُّهُ ۝ فَسَادًا اِذَا الْاِنْسَانُ جَازَبِهِ الْحَدَّا

''کیونکہ انسان کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے، جبکہ وہ اس میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔''

حکایت:- ایک بادشاہ کی خدمت میں جواہرات سے مرصع فیروزہ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا۔ جس کے

مثل دوسرا نہ تھا۔ بادشاہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک درباری حکیم سے پوچھا:۔ آپ کی نگاہ میں یہ پیالہ کیسا معلوم ہوتا ہے؟ حکیم نے جواب دیا:۔ میں اس پیالے کو آپ کے لئے ایک مصیبت اور محتاجی سمجھتا ہوں۔ بادشاہ نے پوچھا:۔ یہ کیسے؟ حکیم نے کہا:۔ اگر یہ ٹوٹ گیا، یا گم ہو گیا، تو یہ ایک ایسی مصیبت ہو گی، جس پر آپ کو صبر نہ ہو گا۔ اور اگر چوری ہو گیا تو آپ اس کے لئے محتاج ہوں گے۔ اور اس کی طرح دوسرا پیالہ آپ پائیں گے نہیں۔ اور آپ کے پاس اس پیالہ کے آنے سے پہلے آپ مصیبت اور محتاجی سے محفوظ تھے۔ پھر اتفاقاً ایک دن وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔ اور اس کا ٹوٹنا بادشاہ کیلئے ایک بڑی مصیبت بن گئی۔ تو بادشاہ نے کہا:۔ حکیم نے سچ کہا تھا۔ کاش، یہ پیالہ ہمارے پاس نہ لایا گیا ہوتا۔

اور یہاں اس سے بہتر ایک دوسرا میزان بھی ہے:۔

اور وہ یہ ہے کہ جب تم اپنے نفس سے آزاد ہو گئے۔ اور اس کو اپنے رب تعالےٰ کے قضا و قدر کے تیروں کے نشانے پر پیش کر دیا، تو اب جو کچھ بھی وہ تمھارے ساتھ کرے گا۔

تم اس سے مخالفت نہ کرو گے۔ اور اس طرح یقینی طور پر تم کو آرام ملے گا۔ اور تم ہمیشہ خوش رہو گے۔ اس لئے کہ اب تم اس کے منتظر رہو گے، جو تمھارے محبوب حقیقی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر تم خوشی سے مرحبا کہتے ہوئے اس سے ملاقات کرو گے۔ اور یہی رضا و تسلیم کی ٹھنڈک کی شیرینی ہے۔ پھر اگر اس شیرینی کے ساتھ فاعل حقیقی و مختار مطلق اللہ تعالےٰ کا شہود بھی شامل ہو۔ تو وہ ہمیشہ قائم رہنے والی نعمت ہے۔ اور یہی ولایت کبریٰ ہے۔ جو شخص اس کی پیروی کرتا ہے وہ کبھی معزول نہیں ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

اِنْ اَرَدْتَ اَنْ لَّا تُعْزِلَ فَلَا تَتَوَلّٰی وِلَايَةً لَا تَدُوْمُ لَكَ

''اگر تم معزول ہونا نہیں چاہتے ہو، تو تم ایسی ولایت کے مالک نہ بنو، جو تمھارے لئے ہمیشہ نہ رہے۔''

میں کہتا ہوں:۔ جو ولایت ہمیشہ قائم نہیں رہتی ہے۔ وہ، وہ ولایت ہے، جو فرق کی طرف

سے آتی ہے اور وہ مخلوق کی ولایت (حکومت) ہے مثلاً سلطنت، اور قضا اور سرداری کا تعلق اور ان کے علاوہ وہ تعلقات، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی گردن میں ڈال دیا۔ اور اسی مخلوق کی ولایت میں، مال کی ولایت بھی شامل ہے، جبکہ اس کی وجہ سے اس کی عزت وعظیم کی جائے۔ یا نسب کی ولایت جبکہ وہ تقویٰ سے خالی ہو۔ یا علم کی ولایت، جبکہ وہ عمل سے خالی ہو اور ان کے علاوہ دنیا کی دوسری ولایتیں۔ کیونکہ بیشک وہ فنا اور ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد ذلت اور محتاجی آتی ہے۔

اور جو ولایت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ وہ، وہ ولایت ہے۔ جو جمع کی طرف سے آتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزت اور اس کے ساتھ غنا اور اس کی معرفت اور اس کے ماسویٰ سے غائب ہونا ہے۔ کیونکہ بلاشبہ یہ ایسی ولایت ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ اور ایسا شرف ہے، جو کبھی زائل نہ ہوگا۔ اور ایسی عزت ہے، جو کبھی فنا نہ ہوگی۔

حکایت:- سیدنا حضرت عبداللہ بن مبارک جو تبع تابعی تھے اور علما عاملین وزاہدین میں سے تھے = خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تشریف لے گئے۔ جب وہ فوج میں داخل ہوئے، تو سب فوجی ان کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ بھیڑ کی وجہ سے بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ جوتے پاؤں سے نکل گئے۔ اور غیرت ختم ہو گئی۔ ہارون الرشید کی ام ولد (لڑکے کی کنیز ماں) نے اپنے لکڑی کے محل سے جھانک کر دیکھا۔ جب اس نے آدمیوں کی بھیڑ دیکھی، تو پوچھا:- یہ بھیڑ کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا:- یہ خراسان کے عالم ہیں۔ اس نے کہا:- اللہ کی قسم، سلطنت اور عزت یہ ہے۔ نہ کہ ہارون کی سلطنت، جو لوگوں کو کوڑے اور ڈنڈے سے جمع کرتا ہے۔

اور جو ولایت ہمیشہ قائم رہتی ہے:- وہ اس ولی پر اور اس کی اولاد پر ہمیشہ جاری رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس ولی کے مرتبہ اور ولایت کی عظمت کے مطابق وہ ولایت ان میں ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ لہذا جس کی ولایت جتنی بڑی ہوتی ہے، اسی کے مطابق اس کی اولاد اور متبعین میں ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

اور بعض تفسیروں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اس آیہ کریمہ کا یہی مفہوم ہے:-

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ

''اوران لوگوں کو ڈرنا چاہئے ، جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جائیں ،تو وہ ان کے لئے خوف کریں۔''

یعنی ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے، جو اپنی اولاد کے لئے ڈرتے ہیں۔تو بیشک اللہ تعالےٰ ان کی حفاظت فرمائے گا۔

اور اللہ تعالےٰ کی اس آیہ کریمہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے:-

وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا

''ان دونوں لڑکوں کا باپ صالح تھا۔''

ان لڑکوں کا سات پشت اوپر کا دادا صالح ولی تھا۔لہذا اللہ تعالےٰ نے یتیموں کے خزانے کی دادا کی صالحیت اور ولایت کی برکت سے حفاظت فرمائی۔

واللہ تعالےٰ اعلم

لیکن اگر تم ایسی ولایت کے مالک ہو، جو ہمیشہ قائم نہیں رہتی ہے۔تو تم اس ولایت میں ڈرتے اور بچتے رہو۔اور اس کی ابتدائی شیرینی سے دھوکا نہ کھاؤ۔کیونکہ اس کی انتہا تلخ ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

اِنْ رَغَّبَتْكَ الْبِدَايَاتُ زَهَّدَتْكَ النِّهَايَاتُ

''اگر فانی ولایت کی ابتدا تم کو رغبت دلاتی ہے۔تو اس کی انتہا تم کو بیزار کر دے گی۔''

میں کہتا ہوں:- وہ ولایت جو فانی ہے۔جیسے مال، یا مرتبہ، یا خاندان، کی عزت، یا اس کے علاوہ دنیا کی کوئی دوسری عزت ،اس کی ابتدا شریں ہوتی ہے۔اس وجہ سے کہ اس میں نفس کا فائدہ اور حصہ ہوتا ہے۔لیکن اس کا آخر کڑوا ہوتا ہے۔اس لئے وہ ختم ہو جانے والی ہے۔اگر چہ وہ موت سے ختم ہو۔یا اس لئے کہ اسکے بعد ذلت ورسوائی آنے والی ہے۔

اسی لئے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

نِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ وَ بِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ

''دودھ پلانے والی اچھی معلوم ہوتی ہے اور دودھ چھڑانے والی بری معلوم ہوتی ہے۔''

لہذا اگر اس فانی ولایت میں اس کی ابتدا کی شیرینی تم کو رغبت دلاتی ہے تو اس کی انتہا کی تلخی تم کو بے زار کر دے گی۔ لہذا اگر وہ تم کو اپنی ظاہری رونق سے دھوکا دیتی ہے۔ تو تم اس کی باطنی حسرت سے عبرت حاصل کرو۔ اس میں تمھاری رغبت اس کے آنے کی شیرینی کی وجہ سے ہے۔ اور اس میں تمھاری پریشانی اور بیزاری اس کے آخر کی تلخی کی وجہ سے ہے۔

حضرت شیخ ابوعلی ثقفی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

دنیا جب سامنے آئے، تو اس میں مشغول ہونے پر افسوس ہے اور جب وہ پیچھے ہٹ جائے، تو اس کے لئے حسرت ہونے پر افسوس ہے۔ اور عقلمند انسان کسی ایسی شی پر بھروسہ نہیں کرتا ہے۔ کہ جب وہ آگے بڑھتی ہے تو فتنہ ہوتی ہے اور جب وہ پیچھے ہٹتی ہے، تو حسرت ہوتی ہے۔

اسی مفہوم میں ایک عارف کے اشعار ہیں:-

وَ مَنْ یَّحْمَدِ الدُّنْیَا لِشَیْءٍ یَسُرُّہٗ فَسَوْفَ لَعُمْرِیْ عَنْ قَرِیْبٍ یَلُوْمُھَا

''جو شخص دنیا کی تعریف کسی ایسی شی کی وجہ سے کرتا ہے، جس سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تو میری عمر کی قسم، وہ عنقریب اس کو برا کہے گا۔''

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَۃً وَ اِنْ اَقْبَلَتْ کَانَتْ کَثِیْرًا ھُمُوْمُھَا

''جب دنیا پیچھے ہٹ جاتی ہے تو انسان پر حسرت ہو جاتی ہے اور اگر سامنے آتی ہے تو اس کے لئے فکریں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے، سیدنا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے پاس یہ خط لکھا:- دنیا کی مثال سانپ کی طرح ہے۔ چھونے میں وہ نرم محسوس ہوتا ہے لیکن اس کا زہر قاتل ہے۔ لہذا دنیا کی ہر اس شی سے آپ پرہیز کیجئے، جو آپ کو اچھی معلوم ہو۔ کیونکہ وہ بہت تھوڑے وقت تک آپ کے ساتھ رہے گی۔ اور دنیا کے لئے اپنی فکروں کو اپنے سے دور کر دیجئے۔ اس لئے کہ آپ کو اس کے جدا ہو جانے کا یقین ہے اور آپ دنیا سے متنفر ہو کر جب تک اس میں زندہ ہیں خوش رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ دنیا دار، دنیا پر جتنا مطمئن ہوتا ہے۔ اتنا ہی وہ اس کی ناگوار اشیاء سے فکر و غم

میں مبتلا ہوتا ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے :- دنیا، خواب ہے۔ اور اس کی خوشی، بادل کا سایہ ہے۔ اور اس کے حادثات، تیر ہیں۔ اور اس کے فتنے، موجیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام، وحشت رکھا ہے۔ اور اس کو مصیبتوں اور غفلتوں سے قریب کر دیا ہے۔ پھر اس کیطرف یہ وحی فرمائی :- اے دنیا! تو میرے دوستوں کے لیے سخت ہو جا اور میرے دشمنوں کے لئے کشادہ ہو جا۔ لہذا جو شخص دنیا کو انصاف کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے لئے اس میں سے گھٹیا درجے کی چیز کافی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں جو قابل تعریف اور بہتر شی ہے۔ اس کے مقابل گھٹیا اور بری شی بھی ہے۔ مثلاً مال کے مقابلے میں مال کا کھو جانا اور جوانی کے مقابلے میں بڑھاپا اور تندرستی کے مقابلے میں بیماری، اور خوشی کے مقابلے میں غم اور عزت کے مقابلے میں ذلت اور زندگی کے مقابلے میں موت۔

میں کہتا ہوں :- قبیلہ بنوسعد کے صالح ولی سیدی حضرت قاسم بن صبیح کے متعلق روایت ہے کہ بعض حکام نے ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا۔ تو وہ ترغہ میں سیدی حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ کے پاس بھاگ کر چلے گئے۔ اور وہ ان کے قبر شریف کے پاس بیٹھ کر زبان حال سے شکایت کر رہے تھے :- تو خوشبودار عود سے لکھا ہوا ایک کاغذ جس کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی، قبر شریف سے ان کیسامنے بڑھا دیا گیا۔ اس میں یہ دو اشعار لکھے ہوئے تھے :-

اِذَا مَا رَمَاكَ الدَّهْرُ يَوْمًا بِنَكْبَةٍ فَهَيِّىءْ لَهٗ صَبْرًا وَ وَسِّعْ لَهٗ صَدْرًا

''جب زمانہ کسی دن تم کو کسی مصیبت میں پھینک دے تو تم اس پر صبر کے لئے آمادہ رہو اور سینہ کشادہ کر لو۔

لِاَنَّ تَصَارِيْفَ الزَّمَانِ كَثِيْرَةٌ فَيَوْمًا تَرٰى عُسْرًا وَ يَوْمًا تَرٰى يُسْرًا

''کیونکہ زمانہ کی گردشیں بہت ہیں۔ کسی دن تم دشواری اور بدحالی دیکھو گے۔ اور کسی دن آسانی اور خوش حالی دیکھو گے۔

لہذا جو شخص دنیا کے ظاہر کے ساتھ ٹھہر جاتا ہے، تو دنیا کے باطنی غیبی فرشتے اس سے پکار کر کہتے ہیں :- حقیقت میں ہم صرف دھوکا ہیں۔ لہذا تم دھوکا نہ کھاؤ۔ اور مصنف ؒ کے اس قول کا

یہی مفہوم ہے:-

اِنْ دَعَاكَ اِلَيْهَا ظَاهِرٌ ، نَهَاكَ عَنْهَا بَاطِنٌ

''اگر تم کو دنیا کا ظاہر اپنی طرف بلاتا ہے۔تو اس کا باطن تم کو اپنی طرف آنے سے منع کرتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- دنیا کا ظاہر تازہ سر سبز اور شیریں ہے اور اس کا باطن گندہ اور تلخ ہے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:-

اَلدُّنْيَا خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ ، وَ اِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ اَوْ يَلِمُ حَبَطًا

''دنیا تروتازہ اور شیریں ہے۔اور بلاشبہ موسم بہار میں جو گھاسیں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے بعض گھاس ایسی بھی ہوتی ہے، جو مار ڈالتی ہے۔یا بیمار و لاغر کر کے مرنے کے قریب پہنچا دیتی ہے۔

اس حدیث شریف میں حضرت نبی کریم ﷺ نے یہ خبر دی ہے:- کہ دنیا کا ظاہر تروتازہ اور شریں ہے۔لیکن اس کا باطن زہر قاتل ہے۔

ایک عارف نے دنیا کو سات چیزوں سے تشبیہ دی ہے:-

پہلی چیز:- دنیا کو کھاری پانی سے مشابہت دی ہے:- وہ غرق کر دیتا ہے، مگر آسودہ نہیں کرتا ہے اور وہ نقصان پہنچاتا ہے، مگر فائدہ نہیں کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- اسی طرح دنیا اپنی محبت میں دنیا دار کو غرق کر دیتی ہے۔اور وہ اس حال میں مرتا ہے کہ دنیا سے اس کی پیاس نہیں بجھتی ہے۔

دوسری چیز:- دنیا کو بادل کے سایہ سے مشابہت دی ہے۔جو دھوکا دیتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- وہ دھوکا یہ ہے کہ وہ بعض جگہوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔پھر جب آفتاب روشن ہوتا ہے، تو وہ بادل کو دور کر دیتا ہے۔

تیسری چیز:- دنیا کو چمکنے والی بجلی سے مشابہت دی ہے۔یعنی جلد چلی جاتی اور پریشان کر دیتی ہے۔

چوتھی چیز:- موسم گرمی کے بادل سے مشابہت دی ہے۔جو نقصان پہنچاتا ہے، مگر فائدہ

نہیں دیتا ہے۔

پانچویں چیز:- موسم بہار کے پھول سے مشابہت دی ہے۔ جو اپنی تازگی اور خوبصورتی سے دھوکا دیتا ہے۔ پھر وہ جلد ہی زرد ہو جاتا اور خشک ہو کر بکھر جاتا ہے۔

چھٹی چیز:- سونے والے کے خواب سے مشابہت دی ہے۔ وہ اپنے خواب میں خوشی کی چیزیں دیکھتا ہے۔ لیکن جب بیدار ہوتا ہے، تو اپنے ہاتھ میں کچھ نہ پا کر حسرت وافسوس کرتا ہے۔

ساتویں چیز:- زہر قاتل ملے ہوئے شہد سے مشابہت دی ہے۔ وہ دھوکا دے کر مار ڈالتا ہے۔

ان عارف کے پوتے نے فرمایا ہے:- میں نے ستر سال ان ساتوں چیزوں میں غور کیا۔ پھر میں نے ان میں ایک چیز کا اضافہ کیا اور وہ یہ ہے کہ میں نے دنیا کو اس غول بیابانی (جنگل میں رہنے والا جن) سے مشابہت دی ہے، جو اس شخص کو مار ڈالتا ہے، جو اس کو جواب دیتا ہے اور اس کو چھوڑ دیتا ہے، جو اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس کو حضرت ابن عباد رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا ہے۔ لہذا تم اس میں غور کرو۔

پھر مصنفؒ نے دنیا کے ان کدورتوں اور غیروں کا مقام ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

اِنَّمَا جَعَلَهَا مَحَلًّا لِلْاَغْيَارِ ، وَ مَعْدَنًا لِوُجُوْدِ الْاَكْدَارِ ، تَزْهِيْدًا لَكَ فِيْهَا

''اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اغیار کا مقام اور کدورتوں کی کان تم کو دنیا میں زاہد بنانے کے لئے بنایا ہے۔

میں کہتا ہوں:- درحقیقت اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ان اوصاف کے ساتھ، یعنی اس کے غیروں اور غموں کا مقام ہونے اور کدورتوں اور فتنوں کی کان ہونے کے ساتھ اس لئے معیوب کیا ہے۔ تاکہ وہ تم کو دنیا سے کنارہ کش کر کے زاہد بنائے۔ لہذا تم پورے طور پر اس کی طرف بڑھو اور اپنی ہمت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یا اس لئے معیوب بنایا ہے، کہ تم دنیا سے منہ پھیر لو۔ اور آخرت کی طرف متوجہ رہو۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- دنیا کی مثال:- گھیرنے والے خوفناک سمندر کی طرح ہے

اور آخرت اس سمندر کے اس پار ہے اور آخرت کی طرف دیکھنے کے لئے قلب کی آنکھ سے حجاب صرف اس صورت میں دور ہوتا ہے۔ کہ صبر و رضا کی کشتی میں سوار ہو کر اس سمندر سے پار ہو جائے۔ کیونکہ وہ:-

بَحْرٌ لُّجِّيٌّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ

''بہت بڑا اور گہرا سمندر ہے۔ جس کو موج ڈھانپے ہوئے ہے۔ اور موج کے اوپر پھر موج ہے۔ پھر اس کے اوپر سیاہ اور اندھیرا بادل ہے ظلمتوں پر ظلمتیں ہیں۔''

اس کو خواہشات کی موج نے ڈھانپ لی ہے۔ پھر اس کے اوپر غفلتوں کی موج ہے۔

پھر اس کے اوپر کائنات کا بادل ہے۔

نیز اس لئے معیوب بنایا ہے کہ اگر دنیا تمھارے لئے وسیع کر دی جاتی ہے تو تم اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند نہ کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ بھی تم سے ملنا پسند نہ کرتا۔ اور اگر تم کو زیادہ آرام اور نعمتیں دی جاتیں۔ تو روح اسی دنیا پر بھروسہ کر لیتی۔ پھر وہ ہمیشہ عالم اجسام ہی میں پھنسی رہتی اور تمھاری ذات سے مقصود عالم ارواح کی طرف سیر کرنا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر اس عالم سفلی یعنی دنیا کو تنگ کر دیا ہے۔ تا کہ تم اپنی ہمت سے اس عالم سفلی سے عالم علوی کی طرف سیر کرو۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان ہے، لیکن امتحان کی شکل میں ہے۔ لہذا اہل بصیرت عارفین کے سوا اس کا مزہ کوئی نہیں چکھتا ہے۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

عَلِمَ اَنَّكَ لَا تَقْبَلُ النُّصْحَ بِمُجَرَّدِ الْقَوْلِ فَذَوَّقَكَ مِنْ ذَوْقِهَا مَا سَهَّلَ عَلَيْكَ فِرَاقَهَا

''اللہ تعالیٰ نے معلوم کیا کہ صرف کہنے سے تم نصیحت کو نہ قبول کرو گے۔ تو اس نے تم کو دنیا کی سختیوں کا مزہ چکھایا تا کہ اس کا چھوڑنا تمھارے لئے آسان ہو۔''

میں کہتا ہوں:- اللہ تعالیٰ نے یہ معلوم کیا کہ اس کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جو صرف کہنے سے نصیحت نہ قبول کریں گے۔ نہ وہ وعظ و نصیحت سن کر دنیا میں زہد اختیار کریں گے۔ اس لئے کہ اکثر علم اور سمجھ والے قرآن کریم سنتے ہیں۔ جو ان کو دنیا کی برائی پر تنبیہ کرتا اور اس کے فریب

سے ڈراتا ہے۔لیکن وہ اس نصیحت سے غافل رہتے ہیں۔اور انھیں چیزوں میں مشغول رہتے ہیں، جن کی وجہ سے ان کے قلوب کے لئے نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔لہذا جب اللہ تعالےٰ نے یہ چاہا کہ اپنی بارگاہ اقدس کے لئے اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھے منتخب کرے۔تو اس نے ان کے لئے دنیا کو خراب اور تلخ بنا دیا۔اور ان کے اوپر سخت بلائیں اور تکلیفیں نازل کیں اور ان کے ظاہری اعضائے جسمانی کو آزمائشوں کی جگہ بنائی اور یہ سب اللہ سبحانہ تعالےٰ کی عنایت اور احسان ہے۔تا کہ وہ دنیا کے باطن کی تلخی کو چکھیں اور وہ اس کی ظاہری خوبصورتی اور لذت سے فریب نہ کھائیں۔

حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام سے دریافت کیا گیا:۔

مَنْ اَوْلِيَاءُ اللهِ الَّذِيْنَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ قَالَ :- اَلَّذِيْنَ نَظَرُوْ اِلٰى بَاطِنِ الدُّنْيَا حِيْنَ نَظَرَ النَّاسُ اِلٰى ظَاهِرِهَا ، وَاهْتَمُّوْا بِاٰجِلِهَاحِيْنَ اهْتَمَّ النَّاسُ بِعَاجِلِهَا۔

''وہ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں، جن کے لئے نہ کوئی خوف ہے، اور نہ غم میں مبتلا ہوں گے۔'' (نہ دنیا میں نہ آخرت میں) حضرت ﷺ نے فرمایا:۔اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے دنیا کے باطن کو دیکھا۔جبکہ لوگوں نے اس کے ظاہر کو دیکھا۔اور انھوں نے دنیاوی اعمال کے مقررہ وقت پر ملنے والے اجر اور نفع کا اہتمام کیا۔جبکہ لوگوں نے اس کے فوراً ملنے والے اجر و نفع کا اہتمام کیا۔''

اور اس سے پہلے حضرت مصنفؒ کے اس موضوع میں:۔''کائنات کا ظاہر دھوکا فریب ہے اور اس کا باطن عبرت اور نصیحت ہے'' یہ بحث گزر چکی ہے۔

لہذا ان تعرفات جلالیہ میں سے جو اس کے نفس کو متغیر اور مغلوب کرتے ہیں، جو کچھ ولی کے اوپر نازل ہوتا ہے۔وہ ولی کے حق میں بہت ہی بہتر ہوتا ہے۔

عارفین نے فرمایا ہے:۔''امتحان، طاقت کے مطابق ہوتا ہے'' اور ''ہر تکلیف مرتبہ کو بڑھاتا ہے'' اور ''باقی رہنے والے اللہ تعالےٰ کا امتحان، بندے کے باقی رہنے کو ختم کر دیتا ہے۔''

لہذا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ولی کے قلب میں اس دنیا کے کسی شی کی محبت کا کچھ حصہ، یا اس دنیا کی کسی شی پر بھروسہ باقی رہ جاتا ہے۔تو اللہ تعالےٰ اس کے اوپر ایسی شی کو مسلط کر دیتا ہے۔جو اس کو

اس محبت اور بھروسہ کی بنا پر پریشان کر دیتا ہے۔ اور اس شی کو اس کے لئے تلخ بنا دیتا ہے۔ یہ سب اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور احسان ہے۔ تا کہ وہ اس عالم سے عالم ملکوت کی طرف سیر کرے۔ پھر جب اس کی سیر ثابت و قائم ہو جاتی ہے، تو اس کے نزدیک شیریں و تلخ، عزت و ذلت، غنا و فقر، برابر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ بھی آتا ہے، سب اس کے ماسوئی ہیں۔ اور سب برابر ہیں۔ اور یہی حقیقی علم ہے۔ اور اسی کو علم نافع کہتے ہیں۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

اَلْعِلْمُ النَّافِعُ هُوَ الَّذِىْ يَنْبَسِطُ فِى الصَّدْرِ شُعَاعُهٗ، وَيَنْكَشِفُ بِهٖ عَنِ الْقَلْبِ قِنَاعُهٗ

''علم نافع وہ نور ہے جس کی شعاع، سینے میں پھیل جاتی ہے اور اس سے قلب کا حجاب دور ہو جاتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- علم نافع وہ قلوب کا علم ہے۔ اور اس کا کام:- قلوب کو برے اوصاف سے پاک کر کے بہترین اوصاف سے آراستہ کرنا ہے۔ یا تم اس طرح کہو:- اس کا کام تخلیہ اور تحلیہ ہے۔

لہٰذا وہ پہلے نفس اور قلب اور روح اور سر کے عیوب کے متعلق تحقیق کرتا ہے۔ پھر ہر ایک کو ان کے عیوب سے پاک کرتا ہے۔

پھر جب نفس اور قلب اور روح اور سر تمام عیوب سے پاک ہو جاتے ہیں۔ تو وہ کمال کی صفات سے مثلاً ایمان وایقان واطمینان و مراقبہ و مشاہدہ، ہو حلم و رافت و کرم و سخاوت و ایثار اور تمام اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔

پس علم نافع کی وہ شعاع جو سینے میں پھیلتی ہے:- وہ یقین کا برف اور رضا و تسلیم کی ٹھنڈک اور ایمان کی شیرینی اور عرفان کا وجد ہے اور ان سے:- اللہ تعالیٰ کا خوف و ہیبت اور حیا و شرم اور سکون و اطمینان قلب اور ان کے علاوہ دوسرے اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں۔

اور وہ حجاب جو علم نافع کے ذریعے قلب سے دور ہوتا ہے:- وہ غفلت ہے اور غفلت کا سبب:- نفس سے راضی ہونا ہے۔ اور نفس سے راضی ہونے کا سبب:- دنیا کی محبت ہے اور دنیا کی

محبت :- تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔ کیونکہ دنیا ہی کی محبت سے حسد و غرور اور کینہ و غضب اور بخل اور سرداری کی محبت اور سخت دلی اور سخت کلامی اور بے صبری اور ان کے علاوہ دیگر عیوب پیدا ہوتے ہیں۔

لہذا جب یہ عیوب قلب سے دور ہو جاتے ہیں تو اس میں اس علم کی شعاع پھیلتی ہے۔ اور وہ یقین کا برف اور رضا کی ٹھنڈک ہے۔ جس کا بیان پہلے کیا گیا۔

اور علم باللہ :- قلب کا نور ہے اور اس سے ایسی شعاع نکلتی ہے، جو سینے میں پھیل جاتی ہے= پھر وہ اس کو تارک الدنیا بنا دیتی ہے۔ اور جب وہ دنیا کو ترک کر دیتا اور اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ تو اس کا سینہ یقین اور رضا و تسلیم اور ان کے علاوہ دوسرے اوصاف حسنہ کے لئے کشادہ ہو جاتا ہے۔ لہذا علم نافع کے شعاع پھیلنے پر قلب کے حجاب کا دور ہونا مقدم ہے۔ اس لئے افضل یہی ہے کہ پہلے قلب کے حجاب کو دور کرے۔ کیونکہ تحلیہ پر تخلیہ مقدم ہے۔

لہذا اگر مصنفؒ اس طرح فرماتے :-

هُوَ الَّذِيْ يَنْكَشِفُ عَنِ الْقَلْبِ قِنَاعُهٗ وَ يَنْبَسِطُ فِي الصَّدْرِ شُعَاعُهٗ

''علم نافع وہ ہے جس کے ذریعے قلب سے اس کا حجاب دور ہوتا ہے اور سینے میں اس کی شعاع پھیلتی ہے۔'' تو زیادہ بہتر ہوتا۔

اور یہ بھی احتمال ہے :- مصنفؒ نے '' سینے میں شعاع کے پھیلنے'' سے اسلام اور ایمان کا نور مراد لیا ہو۔ اور وہ انوار توجہ ہیں۔ اور قلب سے حجاب دور ہونے'' سے حس اور مخلوق کی ظلمت کا دور ہونا مراد لیا ہو۔ کیونکہ اس ظلمت کے دور ہونے کے بعد ہی انوار مواجہت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور انوار مواجہت کا نام :- انوار احسان اور اسرار عرفان ہے اور اسی طریقے پر مصنفؒ کا کلام کی ترتیب درست ہوتی ہے۔

والله تعالیٰ اعلم

حاصل یہ ہے :- جو علم اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرتا ہے۔ وہی علم نافع ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا علم نافع نہیں ہے۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

خَيْرُ عِلْمٍ مَا كَانَتِ الْخُشْيَةُ مَعَهُ

''بہترین علم وہ ہے، جس کے ساتھ خوف الٰہی ہو۔''

لہٰذا اگر علم سے اللہ تعالیٰ کا خوف نہ پیدا ہو تو اس میں کچھ بھلائی نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا علم، اہل علم پر حجت ہے۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

اَلْعِلْمُ اِنْ قَارَنَتْهُ الْخُشْيَةُ فَلَكَ وَ اِلَّا عَلَيْكَ

''علم کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف شامل ہو، تو وہ تمہارے لئے ہے۔ یعنی تمہارے لئے مفید ہے۔ ورنہ وہ تمہارے اوپر ہے۔ یعنی وہ تمہارے اوپر حجت اور تمہارے لئے مواخذہ اور عذاب کا باعث ہے۔''

میں کہتا ہوں:- جس علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خوف شامل ہوتا ہے وہ اہل علم کو غفلت اور اس کے اسباب سے روکتا ہے اور اس کو ہر اس شی سے جدا کر دیتا ہے، جو اس کو اس کے علم پر عمل کرنے سے روکتی ہے اور ہر اس شی میں اس کو رغبت دلاتا ہے، جو اس کو اس کے رب سے قریب کرتی ہے۔ لہٰذا وہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچنے میں اس کا مددگار ہوتا ہے۔ اور رضائے الٰہی کے میدان کے قریب پہنچنے میں اس کا معاون ہوتا ہے۔ لیکن اگر علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خوف شامل نہیں ہے۔ تو وہ علم اس کے اوپر وبال ہے۔ کیونکہ وہ اب اس کے اوپر حجت ہے۔ کیونکہ علم کے ہوتے ہوئے نافرمانی، اس نافرمانی سے بدتر ہے، جو جہالت کے ساتھ ہو۔

حدیث شریف میں حضرت رسول کریم ﷺ سے روایت ہے:-

وَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ مَرَّةً ، وَوَيْلٌ لِلْعَالِمِ اِذَا لَمْ يَعْمَلْ عَشْرَ مَرَّاتٍ

''جاہل کے لئے ایک مرتبہ تباہی ہے اور عالم کے لئے اگر اس نے عمل نہیں کیا۔ دس مرتبہ تباہی ہے۔'' اس حدیث شریف کو حضرت امام غزالیؒ نے بیان فرمایا ہے۔''

اور حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے حزب کبیر میں اسی طرح فرمایا ہے:-

اس شخص کے لئے خرابی ہے جس نے تجھ کو نہیں پہچانا۔ لیکن خرابی پر خرابی اس شخص کے لئے ہے۔ جس نے تیری وحدانیت کا اقرار کیا، لیکن تیرے احکام پر راضی نہیں ہوا۔

اگر تم یہ اعتراض کرو:۔ بعض احادیث شریف میں وارد ہوا ہے:۔ جاہل کا ایک گناہ معاف کرنے سے پہلے، عالم کے چالیس گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ یا معاف کر دے گا۔

اس کا جواب یہ ہے:۔ پہلی حدیث شریف اس عالم اور جاہل کے بارے میں وارد ہوئی ہے، جو اپنے گناہ پر اصرار کرتے ہوئے مر جائیں۔ اس صورت میں بلاشبہ عالم کے لئے عذاب زیادہ ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں وارد ہے:۔

عالم کو ناک کے بل، آگ میں گھسیٹا جائے گا۔ اور جہنم میں وہ چکی میں گردش کرے گا۔ لیکن جاہل کے بارے میں ایسی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی ہے۔

اور دوسری حدیث شریف، ان دو عالم اور جاہل کے بارے میں ہے۔ جن کی توبہ ثابت ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ عالم کے ہاتھ میں علم کا چراغ ہے۔ جب وہ توبہ کر لے گا، تو اپنے فوت شدہ اعمال کو جاہل سے زیادہ حاصل کرے گا۔ لہذا عالم ایک ماہ میں اپنا نقصان اتنا پورا کر لے گا، جتنا جاہل ایک سال یا اس سے زیادہ میں پورا کرے گا۔

حاصل یہ ہے:۔ پہلی حدیث شریف ان دو عالم اور جاہل کے بارے میں ہے، جو اپنے گناہوں پر قائم رہتے ہوئے مر جائیں۔ اور دوسری حدیث شریف ان دو عالم اور جاہل کے بارے میں ہے، جو توبہ کر کے اپنی اصلاح کریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ علم، دیناروں اور درہموں کی طرح ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، تو تم کو ان سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور اگر چاہتا ہے، تو تم کو ان سے نقصان پہنچاتا ہے۔

حضرت مصنفؒ نے لطائف المنن میں فرمایا ہے:۔

اس علم کا گواہ، جو اپنے بندوں سے اللہ تعالیٰ کا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور اللہ تعالیٰ

کے خوف کا گواہ:- اس کے احکام کے موافق عمل کرنا ہے۔

لیکن وہ شخص، جو علم کے ساتھ دنیا کی طرف رغبت رکھتا ہے اور اہل دنیا کی خوشامد کرتا ہے اور دنیا کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ہمت صرف کرتا ہے، اور مال کو جمع کر کے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور فخر و تکبر کرتا ہے اور لمبی لمبی تمنائیں رکھتا ہے اور آخرت کو بھولا ہوا ہے۔ وہ ان صفتوں کی وجہ سے انبیا علیہم السلام کے وارث ہونے سے کتنا دور ہو گیا ہے۔ اور موروث شی (ورثہ کی چیز) وارث کے پاس اس صفت کے ساتھ منتقل ہوتی ہے، جس صفت کے ساتھ وہ مورث کے ساتھ تھی۔

(علامہ اقبال کا ایک شعر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے:-

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو

پھر پسر لائق میراث پدر کیونکر ہو

اور ان علما کی مثال، جو مذکورہ بالا صفات سے موصوف ہوں، اس شمع (موم بتی) کی طرح ہے۔ جو دوسروں کو روشنی پہنچاتی اور اپنے کو جلا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس علم کو ایسے عالم پر جس کے اندر یہ صفات ہوں، حجت بنائی اور اپنے یہاں اس کو زیادہ عذاب دینے کا سبب بنایا ہے۔

حضرت شیخ زروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ غیر متقی عالم، انبیاء علیہم السلام کا وارث نہیں ہے۔ لیکن اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ موروث شی کو خراب کرنا اور اس کو ناحق استعمال کرنا وارث کو وارث ہونے سے خارج نہیں کرتا ہے۔ کیونکہ نافرمانی نسب کی نفی نہیں کرتی ہے۔ (بیٹا، باپ ہی کا رہے گا، خواہ وہ فرماں بردار ہو یا نافرمان) ہاں، اگر وہ نافرمان ہے، تو اس کو بدترین وارث کہا جائے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لئے بھی علم کو ثابت کیا ہے، جو اس سے نہیں ڈرتا ہے اور اس نے اس شخص سے علم کی نفی نہیں کی ہے، جو اس سے نہیں ڈرتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- انبیاء علیہم السلام کی موروث شی (وراثت) جس شی کو کہی جاتی ہے۔ وہ علم کا مقصد اور اس کا پھل اور نتیجہ ہے۔ اور وہ مقصد:- اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی معرفت ہے۔ نہ

کہ صرف لفظی عبارتیں۔ کیونکہ لفظی عبارتیں صرف واسطہ ہیں۔ اور جب مقصد حاصل نہ ہو، تو واسطہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ لہذا لفظی عبارتوں کے عالم کے لئے وراثت نہیں ہے۔ اس لئے کہ عبارت مقصود بالذات نہیں ہے۔

حضرت شیخ ولی کبیر ابن ابو جمرہ اپنے زمانہ کے علماء کے بارے میں فرماتے تھے:۔ یہ لوگ علم کے ہنر کو صرف ایک ہنر کی حیثیت سے سیکھنے والے لوگ ہیں۔ لہذا یہ لوگ صناع (اہل ہنر) ہیں علما نہیں ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت شیخ ابن عبادؒ نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ لہذا جو شخص اپنے آپ کو، اپنے اوپر علم کے حجت ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

و باللہ التوفیق

اور علم نافع کی علامات میں سے:۔ اللہ تعالیٰ کے علم پر قناعت کرنا اور اس کے دیکھنے کو کافی سمجھنا ہے اور قناعت کا نتیجہ:۔ لوگوں کے بدگوئی کرنے اور تعریف کرنے اور عقیدت سے سامنے آنے، نفرت سے پیچھے ہٹنے کی پرواہ نہ کرنا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے دیکھنے کو کافی سمجھنے کا بیان مصنفؒ نے اپنے اس قول میں فرمایا ہے:۔

مَتٰى اٰلَمَكَ عَدَمُ اِقْبَالِ النَّاسِ عَلَيْكَ اَوْ تَوَجُّهُهُمْ بِالذَّمِّ اِلَيْكَ ، فَارْجِعْ اِلٰى عِلْمِ اللّٰهِ فِيْكَ فَاِنْ كَانَ لَا يُقْنِعُكَ عِلْمُهٗ فِيْكَ ، فَمُصِيْبَتُكَ بِعَدَمِ قَنَاعَتِكَ بِعِلْمِهٖ اَشَدُّ مِنْ مُصِيْبَتِكَ بِوُجُوْدِ الْاَذٰى مِنْهُمْ

”لوگوں کا تمہاری طرف متوجہ نہ ہونا، یا ان کا تمہاری بدگوئی کرتے ہوئے تمہاری طرف متوجہ ہونا، جب تم کو تکلیف اور غم پہنچائے۔ تو تم اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف رجوع کرو۔ پھر اگر اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کا علم تم کو قناعت نہیں عطا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے علم پر قناعت نہ کرنے کی وجہ سے تمہاری مصیبت اس مصیبت سے زیادہ سخت ہے، جو لوگوں کی ایذا رسانی سے تم کو

پہنچی ہے۔"

میں کہتا ہوں :- جب اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر اپنی مخلوق کو اس لئے مسلط کرے کہ تم کو آزمائے :- کیا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنی ہو یا اس کی مخلوق کے ساتھ؟ لہذا جب لوگ تمہاری طرف سے منہ پھیر لیں، یا تم کو برا کہنے اور گالی دینے میں مشغول ہو جائیں۔ اور اس سے تم کو تکلیف پہنچے۔ تو تم اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی آگاہی کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ تمھارا کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اگر تمھارے لئے یہ کافی ہو گیا اور تم کو اس پر قناعت ہو گئی اور تم اس کے ذکر یا اس کے شہود سے مانوس ہو گئے۔ تو تمھارے نزدیک ان کی بدگوئی اور مدح خوانی اور ان کا متوجہ ہونا اور منہ پھیر لینا برابر ہو جائے گا۔ بلکہ اکثر اوقات تم ان کے منہ پھیرنے کو ترجیح دو گے۔ اس لئے کہ ان کی روگردانی میں تمھاری راحت اور اپنے قلب کو اپنے رب کے ساتھ فارغ کر لینا ہے۔ (یعنی لوگوں کی ملاقات سے تم فرصت پا کر فراغت اور حضور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو گے) لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کے علم پر قناعت نہیں کرتے ہو اور اس کے دیکھنے کو کافی نہیں سمجھتے ہو اور لوگوں کی روگردانی پر افسوس کرتے ہو اور ان کی ایذا رسانی سے رنجیدہ ہوتے ہو۔ تو تمھاری مصیبت، تمھارے ایمان کی کمزوری اور تمھارے یقین کے ختم ہو جانے کے سبب لوگوں کی بدگوئی اور تمھاری طرف سے روگردانی کی مصیبت سے زیادہ سخت ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا کمزور ہونا، اور یقین کا ختم ہو جانا، اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غضب اور اس کی محبت کی نظر سے تمھارے گر جانے کا سبب ہے۔

لیکن مخلوق کی ایذا رسانی اور ان کی تم سے دوری تو یہ تمھارے لئے رحمت ہے۔ اور نیز یہ کہ جب لوگ تمھاری بدگوئی اور تم کو نقصان پہنچانے میں مشغول ہوں۔ تو تم اپنے رب کے ساتھ اپنا مقام دیکھو۔ اگر تم اپنے رب کے ساتھ مخلص ہو۔ تو نہ کوئی شی تم کو فریب دے سکتی ہے۔ نہ کوئی شی تم کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

جیسا کہ ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مجذوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :-

اَلنَّاسُ قَالُوْا لِی بِدْعِیٌّ   وَ اَنَا طَرِیْقِی مَنْجُوْراً

''لوگ مجھ کو بدعتی کہتے ہیں۔لیکن میں تو میرا طریقہ کنویں کی چرخی کی طرح ہے۔''

اِذَا صَفَيْتُ مَعَ رَبّیْ اَلْعَبْدُ مَا مِنْهُ ضَرُوْرًا

''جب میں اپنے رب کے ساتھ خالص ہوں۔تو بندے سے مجھ کو کیا ضروریات ہے۔''

حضرت ابراھیم تیمی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض مریدین سے دریافت فرمایا:- میرے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے جوب دیا:-لوگ آپ کو ریا کار کہتے ہیں۔انھوں نے فرمایا :-اب زندگی خوشگوار ہوگئی۔

حضرت بشر حافی رضی اللہ عنہ کو حضرت تیمی کی یہ بات معلوم ہوئی۔تو انھوں نے فرمایا:- اللہ تعالیٰ کی قسم، ابراھیم تیمی نے اللہ تعالیٰ کے علم کو کافی سمجھا۔کیونکہ انھوں نے یہ نہیں پسند کیا۔کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ غیر اللہ کا علم شامل ہو جائے۔

اور انھوں نے یہ بھی فرمایا:-اپنی تعریف سے سکون قلب حاصل ہونا:- گناہوں سے بھی زیادہ سخت مصیبت ہے۔

حضرت ابو حواری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- جو شخص چاہتا ہے کہ وہ کسی نیکی کے ساتھ پہچانا جائے۔ یا اس کا ذکر اس نیکی کیساتھ کیا جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتا ہے۔اس لئے کہ جو شخص محبت سے کوئی عمل کرتا ہے۔وہ یہ نہیں چاہتا ہے۔کہ اس کا عمل ،اس کے محبوب کے سوا کوئی دوسرا دیکھے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

تم اپنے علم کی نشر و اشاعت اس لئے نہ کرو، کہ لوگ تمھارے عالم ہونے کی تصدیق کریں۔ بلکہ تم اپنے علم کی اشاعت اسلئے کرو، کہ اللہ تعالےٰ تمھارے علم کی تصدیق کرے اور اگر چہ علت کا لام موجود ہے۔لیکن جو علت تمھارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس حیثیت سے ہے کہ اس نے تم حکم دیا ہے۔ اس علت سے بہتر ہے، جو تمھارے اور انسان کے درمیان اس حیثیت سے ہے۔کہ اس نے تم کو منع کیا اور ایسی علت جو تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف لائے، اس علت سے بہتر ہے، جو تم کو اللہ تعالیٰ سے دور کردے۔اسی لئے اولیائے کرام رضی اللہ عنہ نے ثواب کے لئے عمل نہیں کیا ہے۔اس لئے کہ وہ

اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے سوا نہ کسی شی سے خوف کرتے ہیں، نہ کسی شی کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ صادق و مصدق اور عالم و معلم اور ہادی و نصیر اور ولی کی حیثیت سے کافی ہے۔ وہ ایسا ہادی ہے جو تم کو ہدایت دیتا ہے۔ اور تمھارے ذریعے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور تمھاری طرف لوگوں کی ہدایت یعنی رہنمائی کرتا ہے۔ اور ایسا مددگار ہے، جو تمھاری مدد کرتا ہے۔ اور تمھارے ذریعے دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ اور تمہارے مقابلے میں دوسروں کی مدد نہیں کرتا ہے وہ ایسا ولی یعنی سر پرست ہے جو تمہاری سر پرستی کرتا ہے اور تمھارے ذریعے دوسروں کی سر پرستی کرتا ہے۔ اور تمھارے مقابلے میں دوسروں کی سر پرستی نہیں کرتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے اولیاء اللہ کو مخلوق کی طرف سے تکلیف پہنچنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِنَّمَا اَجْرٰی الْاَذٰی عَلَیْہِمْ کَیْ لَا تَکُوْنَ سَاکِنًا اِلَیْہِمْ اَرَادَ اَنْ یُّزْعِجَكَ عَنْ کُلِّ شَیْءٍ حَتّٰی لَا یَشْغُلَكَ عَنْہُ شَیْءٌ

"اللہ تعالیٰ تم کو مخلوق سے اس لئے تکلیف پہنچاتا ہے۔ تا کہ تم انھیں کی طرف ساکن (سکون حاصل کرنے والے ٹھہرنے والے) نہ ہو جاؤ۔ وہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر شی سے بےزار کر کے نکالے۔ تا کہ کوئی شی تم کو اپنے میں مشغول کر کے اللہ تعالیٰ سے غافل نہ کرے۔

میں کہتا ہوں:۔ روح، جب عالم سفلی یعنی اس دنیا کی طرف آتی ہے اور اس میں سکونت اختیار کرتی ہے۔ اور اس میں موجود چیزوں سے محبت کرتی ہے۔ تو عالم ملکوت کی طرف۔ جس کو عالم روحانی کہتے ہیں، اس کا منتقل ہونا، دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اہل و اولاد اور اصحاب اور خاندان کی محبت سے مانوس ہو جاتی ہے۔ تو اپنے ولی کے اوپر یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مہربانی اور احسان ہے کہ وہ انھی چیزوں کو اس کے اوپر پریشان اور منتشر کر دیتا ہے، جنکی طرف اس کا نفس مائل ہوتا ہے۔ اور جن سے اس کی روح زیادہ محبت کرتی ہے۔ پھر اور زیادہ محبت کرتی ہے۔ لہذا سب سے پہلے اس کی بیوی اور اولاد، اس کا انکار کرتی ہے۔ پھر اس کے پڑوسی اور اس کے دوست اس کا انکار کرتے ہیں۔ پھر سارا عالم اس کا انکار کرتا ہے۔ تو جب روح یہ دیکھتی ہے کہ یہ سارا عالم اس کا منکر

یعنی مخالف ہو گیا۔ اور یہ عالم اس کے لئے تنگ ہو گیا۔ تو وہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف سفر کرتی ہے۔ اور اس عالم کی طرف اس کی توجہ بالکل باقی نہیں رہتی ہے۔ لہٰذا اب اللہ تعالیٰ سے اس کا وصل مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی فنا اور بقا ثابت ہو جاتی ہے اور اگر نفس مرتبہ اور عزت کے سایہ میں پرسکون حالت میں قائم رہتا ہے۔ تو وہ اس عالم سے بالکل سفر نہیں کرتا ہے۔

اور اولیائے کرام کو جس قدر زیادہ اور سخت تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچتی ہیں، اسی قدر ان کا مرتبہ اور مقام اللہ تعالیٰ کے پاس بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ مجری اور منشا اور فاعل حقیقی ہونے کی حیثیت سے، مخلوق کے ہاتھوں سے تمہاری طرف تکلیفیں اور مصیبتیں اس لئے جاری کرتا ہے۔ تاکہ تم اپنے قلب اور روح کے ساتھ پرسکون ہو کر اسی کی طرف مشغول نہ ہو جاؤ۔ پھر تمہارا یہ سکون اور مشغولیت، عالم ملکوت کی طرف ترقی کرنے سے تم کو روک دے۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم کو اس عالم کی ہر شی سے بیزار اور متنفر کر کے نکالے۔ یہاں تک کہ تم کسی شی پر بھروسہ اور توجہ نہ کرو۔ اور نہ کوئی شی تم کو اپنے میں مشغول کر کے اللہ تعالیٰ کے شہود سے غافل کرے۔ کیونکہ یہ محال ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا بھی مشاہدہ کرو اور اس کے ساتھ غیر اللہ کا بھی مشاہدہ کرو۔ یا تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اس کے ساتھ غیر اللہ سے بھی محبت کرو۔ محبت اس سے انکار کرتی ہے کہ تم اپنے محبوب کے سوا کسی دوسرے کو دیکھو۔ پھر جب محبت مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے اور شہود کامل ہو جاتا ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اپنے اولیائے کرام کو اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے ان کا مرشد بنا کر عروج سے نزول میں واپس کر دیتا ہے۔

حضرت مصنفؒ نے لطائف المنن میں فرمایا ہے:- ابتدا میں اولیاء اللہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر مخلوق کو مسلط کر دیتا ہے تاکہ وہ اغیار کے باقی ماندہ ذروں سے پاک ہو جائے اور ان کے اندر فضائل مکمل ہو جائیں اور مخلوق پر اعتماد کر کے ان میں سکونت نہ اختیار کریں اور ان کے اوپر بھروسہ کر کے ان کی طرف مائل نہ ہوں۔ کیونکہ جس شخص نے تم کو تکلیف پہنچائی، اس نے اپنے احسان کی غلامی سے تم کو آزاد کر دیا۔ اور جس نے تمہارے ساتھ احسان کیا، اس نے اپنے احسان سے تم کو غلام بنا لیا۔

اسی لئے حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

مَنْ اَسْدٰی اِلَیْکُمْ مَعْرُوْفًا فَکَافِئُوْہُ ، فَاِنْ لَّمْ تَقْدِرُوْا فَادْعُوْا لَہٗ

''جس شخص نے تمھارے ساتھ کوئی احسان کیا، تم اس کا بدلہ چکا دو۔ اور اگر تم بدلہ پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہو، تو اس کے لئے دعا کرو۔''

لہٰذا یہ سب تکلیفیں اس لئے پہنچتی ہیں، تا کہ قلب مخلوق کے احسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اور بادشاہ حقیقی اللہ تعالیٰ سے متعلق ہو جائے۔

پھر مصنفؒ نے فرمایا:- حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے فرمایا ہے:- جتنا تم برے لوگوں سے بھاگتے ہو، اس سے زیادہ تم اچھے لوگوں سے بھاگو۔ اس لئے کہ نیک لوگوں کی نیکی تمھارے قلب میں مصیبت پیدا کرتی ہے۔ اور برے لوگوں کی برائی کا اثر صرف تمھارے جسم پر ہوتا ہے۔ اور جو مصیبت تمھارے جسم پر پہنچے وہ اس مصیبت سے بہتر ہے جو تمھارے قلب پر پہنچے اور وہ دشمن جس کے ذریعے تم اللہ تعالیٰ تک پہنچو، اس دوست سے بہتر ہے، جو تم کو اللہ تعالیٰ سے جدا کر دے۔ اور مخلوق کے اپنی طرف متوجہ ہونے کو رات سمجھو۔ اور اپنے سے ان کی روگردانی کو دن تصور کرو۔

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ لوگ جب تمھاری طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تمھارے لئے فتنہ کا سبب ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے فرمایا ہے:- ابتدائے طریقت میں اولیاء اللہ پر مخلوق کو مسلط کرنا، اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

''اور وہ ہلا دئے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان والے پکار اٹھے:- اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی۔''

اور اس آیہ کریمہ کے سوا دوسری آیات بھی ہیں۔ جو اس مفہوم پر دلیل ہیں۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- نفوس کی شان یہ ہے کہ وہ عزت اور شان و شوکت کے مقام پر رہنے میں لذت حاصل کرتے ہیں۔ تو اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دے، تو وہ

ہلاک ہو جائیں۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر موذیوں کی ایذا رسانی اور مخالفین کے اعتراضات کو مسلط کر کے اس مقام سے بیزار اور متنفر کر کے نکالا اور اسی مفہوم میں ایک عارف کے یہ اشعار ہیں :-

عِدَاتِیْ لَھُمْ فَضْلٌ عَلَیَّ وَ مِنَّۃٌ فَلَا اَبْعَدَالرَّحْمٰنُ عَنِّیْ الْاَعَادِیَا

''میرے دشمنوں کا میرے اوپر فضل و احسان ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ میرے دشمنوں کو مجھ سے دور نہ کرے۔''

فَھُمْ بَحَثُوْا عَنْ زَلَّتِیْ فَاجْتَنَبْتُھَا وَ ھُمْ نَافَسُوْنِیْ فَارْتَکَبْتُ الْمَعَالِیَا

''انھوں نے میری غلطیوں پر بحث کیا۔تو میں نے غلطیوں سے پرہیز کیا۔اور انھوں نے میرا مقابلہ کر کے مرتبے میں مجھ سے بڑھ جانے کی حرص کی تو میں بلند مرتبوں پر پہنچ گیا۔''

ایک عارف نے فرمایا:- دشمن کی نصیحت اللہ تعالیٰ کا کوڑا ہے۔جس کے ذریعے قلوب لوٹائے جاتے ہیں۔جب وہ غیر اللہ کی طرف ٹھہر جاتے ہیں۔ورنہ قلب عزت اور مرتبہ کے سایہ میں ٹھہر جائے گا۔اور وہ اللہ تعالیٰ سے بہت بڑا حجاب ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

ایک مرتبہ مجھ کو ایک شخص نے تکلیف پہنچائی۔میں نے اس پر صبر کیا۔جب میں سو گیا۔تو میں نے خواب میں دیکھا، کہ مجھ سے کہا جا رہا ہے:- دشمنوں کی زیادتی:-

صدیقیت کی ایک علامت ہے۔جبکہ وہ ان کی پرواہ نہ کرے۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو تم نے یہ معلوم کر لیا کہ ولی اللہ کے لئے ایذا رسانی، اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کی سنت ماضیہ ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً

پس تم اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے۔''

اور ہمارے نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کے حالات میں غور کرو۔آپ ﷺ نے قریش اور بنی وائل کے ہاتھوں کتنی مصیبتیں جھیلیں۔اعلان نبوت کے بعد جو مخلوق سے تکلیف پہنچنے کا مقام

تھا۔آپ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ تیرہ سال رہے۔ ہر سال آپ پر مار دھاڑ اور سختی و مصیبت کے ساتھ گزرا۔اور جب حضور اقدس ﷺ مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے۔تب بھی آپ ﷺ کو آرام نصیب نہ ہوا۔آپ ہمیشہ جہاد کرتے اور تعلیم دیتے رہے۔اور علمائے یہود کی دشمنی وایذا رسانی اور شر انگیزی برداشت فرماتے رہے۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تشریف لے گئے۔اور شرف وکرم اور بزرگی وعظمت کے کمال پر جا پہنچے۔ﷺ

اور آپ ﷺ کے ساتھ اور آپ ﷺ یہی حالت آپ ﷺ کے اصحاب عظام رضی اللہ عنھم کی تھی۔ ان کو کچھ آرام کبھی نہ ملا۔اور ان میں سے اکثر حضرات نے شہید ہو کر وفات پائی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ زہر سے شہید ہوئے۔اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قتل ہو کر شہید ہوئے۔اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ذبح ہو کر شہید ہوئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ زہر میں بجھائی ہوئی تلوار سے شہید ہوئے۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر پلا کر شہید کیا گیا۔اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے شہید کیا گیا۔

یہاں تک کہ ان کے سر مبارک کے ساتھ ملک شام میں کھیل کر کے بے حرمتی کی گئی۔ پھر سر مبارک مصر میں دفن کیا گیا۔ایک بادشاہ نے فدیہ دے کر مصر میں دفن کیا اور مصر والوں کے نزدیک وہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک ہے۔

پھر بے شمار اولیاء اللہ گزرے ہیں۔جن کے ساتھ اہل دنیا نے یہی سلوک کیا۔

اور حضرت جنید رضی اللہ عنہ اور ان کے مریدین کی شکایت بادشاہ سے کی گئی۔اور وہ سب تلوار کے سامنے لائے گئے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بچایا اور ایک جگہ جمع کر دیا۔

حضرت جنیدؒ اور ان کے مریدین کا واقعہ یہ ہے:-بغداد کے علما نے خلیفہ متوکل سے کہا:- جنید اور ان کے مریدین زندیق یعنی بے دین ہو گئے ہیں۔خلیفہ نے ، جو حضرت جنیدؒ سے حسن عقیدت رکھتا تھا،ان علما سے کہا:-اے اللہ تعالیٰ کے دشمنو! تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اولیاء اللہ کو ایک ایک کر کے زمین سے ختم کر دو۔تم لوگوں نے حضرت منصور حلاج کو قتل کر دیا۔حالانکہ تم ہر روز ان کا ایک بیان سنتے تھے،لیکن ان کو روکتے نہیں تھے۔لہذا جب تک تم لوگ دلیل میں حضرت جنید پر

غالب نہ آ جاؤ۔ اور ان کو شکست نہ دیدو۔ تم کو ان کے قتل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ لہذا تم لوگ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے علما کو جمع کرو۔ اور ان سے بحث کرنے کے لئے ایک مجلس منعقد کرو۔ اگر تو لوگ ان کے اوپر غالب ہو گئے۔ اور لوگوں نے یہ گواہی دی، کہ تم لوگ ان پر غالب ہو گئے ہو۔ اور ان کو شکست ہو گئی ہے۔ تو میں ان کو قتل کر دوں گا۔ اور اگر حضرت جنید تم لوگوں پر غالب ہو گئے۔ اور تم لوگوں کو بحث میں شکست ہو گئی۔ تو اللہ تعالیٰ کی قسم، میں تم لوگوں پر تلوار لے آؤں گا۔ اور اتنا قتل کروں گا، کہ تم لوگوں میں کسی ایک عالم کو زمین پر باقی نہ چھوڑوں گا۔ علما نے کہا:- ہاں، ہم تیار ہیں۔ پھر ان علما نے حضرت جنیدؒ سے مقابلہ کرنے کے لئے شام اور یمن اور عراق اور دوسرے علاقوں کے علما کو جمع کیا۔ تو جب اس مقصد کے لئے سب علما جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہر چہار جانب سے جو شخص دین کا ایک مسئلہ بھی جانتا تھا وہ بھی حاضر ہوا۔ جب علما مقررہ مجلس میں جمع ہو گئے۔ تو خلیفہ نے حضرت جنید کو بلانے کے لئے ایک قاصد روانہ کیا۔ حضرت جنید اپنے مریدین کے ساتھ شاہی محل کے دروازے پر آئے۔ پھر وہ خود تو خلیفہ کے دربار میں تشریف لے گئے اور اپنے مریدین کو باہر چھوڑ دیا۔ اور خلیفہ کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ایک عالم کسی مسئلے میں حضرت جنید سے سوال کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ قاضی علی بن ابی ثور نے اس عالم کی بات سنی۔ تو قاضی نے علما سے دریافت کیا:- کیا آپ لوگ حضرت جنید سے سوال کریں گے۔ علما نے جواب دیا:- ہاں پھر قاضی نے دریافت کیا :- کیا آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے، جو جنید سے زیادہ عالم ہو؟ علما نے جواب دیا:- نہیں۔ ہم میں جنید سے زیادہ علم جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ قاضی نے کہا:- بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنید آپ سے زیادہ عالم ہیں۔ تو ان کو ایک ایسا علم حاصل ہے جس سے آپ لوگ ناواقف ہیں اور آپ لوگ ایک ایسے علم میں ان کے اوپر اعتراض کر رہے ہیں۔ جس کو آپ لوگ نہیں جانتے ہیں۔ لہذا آپ لوگ ایسے شخص سے کیسے سوال کر سکتے ہیں، جس کی بات آپ نہیں سمجھتے ہیں۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ سارے علماء مبہوت (ہکا بکا) ہو گئے اور کچھ دیر تک خاموش رہے پھر علما نے کہا اے مسلمانوں کے قاضی اب کیا کرنا چاہئے آپ جو مناسب مشورہ دیں گے، ہم لوگ اس پر عمل کریں گے۔ کیونکہ آپ کا حکم قابل اطاعت ہے۔ راوی نے بیان کیا ہے:- پھر قاضی علی

نے اپنا منہ خلیفہ متوکل کی طرف کیا اور خلیفہ سے کہا:- آپ حضرت جنید کو چھوڑ دیجئے ۔ اور ان کے مریدین کے پاس چلئے ۔ آپ کا جلاد ولید بن ربیعہ ان کے سامنے یہ اعلان کرے:- تم میں کون شخص تلوار کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے تیار ہے۔ یہ اعلان سننے کے بعد جو شخص سب سے پہلے سامنے آئے گا۔ ہم اس سے سوال کریں گے۔ خلیفہ نے کہا:- اللہ تعالیٰ آپ کے اوپر رحم فرمائے ۔ ایسا کیوں کیا جائے ۔ کیا آپ ان کے مریدین کو دھمکانا اور مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے سامنے ان کے خلاف کوئی دلیل ظاہر نہیں ہوئی ہے؟ ایسا کرنا ہمارے لئے جائز نہیں ہے۔ قاضی نے کہا:- اے امیر المومنین ! صوفیائے کرام اپنے اوپر ایثار کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ لہذا آپ ولید بن ربیعہ کو حکم دیجئے کہ وہ یہ اعلان کرے:- تم میں سے کون شخص تلوار کے سامنے کھڑا ہونا چاہتا ہے؟ پھر جو شخص جلدی سے آ کر تلوار کے سامنے کھڑا ہو گا۔ وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ جاہل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ سچا ہو گا۔ تو وہ اپنے بعد زندہ رہنے کے لئے اپنے ساتھیوں کو اپنے اوپر ترجیح دے گا۔ اور خود تلوار کے سامنے کھڑا ہو جائے گا۔ تو جب ان میں سب سے جاہل شخص ہمارے سامنے آئے گا۔ تو علما جس مسئلے میں چاہیں گے، اس سے مناظرہ کریں گے۔ تو یہ یقینی بات ہے کہ نہ علما اس پر غالب ہوں گے۔ نہ وہ علما پر غالب ہو گا۔ لہذا ہمارے اور ان کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ واقعہ بڑی مصیبت بن گیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے، کہ کس کو اس مصیبت سے نجات ملے گی۔ اور کون اس کا شکار ہو گا؟ کیونکہ اگر حضرت جنید قتل کر دیئے جائیں، تو یہ اسلام میں بہت بڑا حادثہ ہو گا۔ کیونکہ بلا شبہ وہ ہمارے زمانے میں ایمان کے قطب ہیں۔ اور اگر علما و فقہا قتل کر دیئے جائیں تو یہ بھی بہت بڑی مصیبت ہو گی۔ خلیفہ نے قاضی سے فرمایا:- اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے درست سوچا ہے۔

پھر خلیفہ نے ولید کی طرف متوجہ ہو کر اس سے کہا:- قاضی صاحب تم کو جو حکم دیں۔ اس پر عمل کرو۔ لہذا ولید تلوار لٹکائے ہوئے نکلا اور مریدین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کل مریدین دو سو ستر تھے۔ سب اپنے سروں کو جھکائے بیٹھے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے۔

ولید نے ان لوگوں کے سامنے پکار کر کہا:- کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو تلوار کے سامنے

آئے؟

یہ آواز سن کر اس کے سامنے ایک صاحب آ کر کھڑے ہو گئے۔ جن کا نام حضرت ابوالحسن نوری رضی اللہ عنہ تھا۔

ولید کا بیان ہے:- میں نے کسی پرندے کو بھی ان سے زیادہ تیز رفتار نہیں دیکھا۔ وہ اتنی جلدی دوڑ کر میرے سامنے کھڑے ہوئے۔ ان کے اتنی جلدی آ کر کھڑے ہونے سے مجھ کو تعجب ہوا۔

میں نے کہا:- کیا تم کو معلوم ہے کہ تم کیوں میرے سامنے کھڑے ہوئے ہو؟

انھوں نے جواب دیا:- ہاں، کیا تم نے یہ نہیں کہا ہے:- کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے، جو تلوار کے سامنے کھڑا ہو؟

میں نے ان سے کہا:- ہاں، میں نے کہا ہے۔

پھر ولید نے ان سے کہا:- تم کیوں کھڑے ہوئے؟

حضرت نوریؒ نے جواب دیا:- مجھ کو معلوم ہوا ہے، کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس سے نکل کر کامیابی کے گھر آخرت کی طرف چلا جاؤں۔ اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی زندگی کو اپنی زندگی پر ترجیح دوں، اگرچہ وہ میرے بعد ایک گھڑی زندہ رہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرے قتل ہو جانے کے ساتھ فتنہ ختم ہو جائے۔ اور سب لوگ بچ جائیں۔ اور میرے سوا کوئی قتل نہ ہو۔

ولید کہتا ہے:- مجھ کو ان کے اس فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے پر بہت تعجب ہوا۔ پھر میں نے اس سے کہا:- تم قاضی صاحب کے سوال کا جواب دو۔

یہ سن کر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ان کے رخسار پر آنسو جاری ہو گئے۔ پھر انھوں نے دریافت کیا:- کیا مجھ کو قاضی صاحب نے بلایا ہے؟

میں نے کہا:- ہاں، تم کو قاضی صاحب نے بلایا ہے۔

انھوں نے کہا:- تب مجھ کو واقعی ان کے سوال کا جواب دینا ہو گا۔

پھر میں ان کو ساتھ لے کر دربار میں گیا۔ اور بادشاہ اور قاضی کو ان کا سارا قصہ بتایا۔ دونوں کو بہت تعجب ہوا۔

پھر قاضی علی نے ان سے پیچیدہ سوالات کئے چنانچہ قاضی نے ان سے سوال کیا:- تم کون ہو؟ اور تم کس لئے پیدا کئے گئے ہو؟ اور تم کو پیدا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے؟ اور تمھارا رب تم سے کہاں ہے۔

حضرت نوریؒ نے فرمایا:- پہلے آپ یہ بتائیے، کہ آپ کون ہیں، جو مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟

قاضی نے جواب دیا:- میں قاضی القضاۃ ہوں۔

حضرت نوریؒ نے قاضی صاحب کو جواب دیا:- تب تو آپ کے سوا کوئی رب نہیں ہے اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ قاضی القضاۃ ہیں اور آج فیصلہ اور انصاف کا دن ہے اور لوگ دوپہر کے وقت جمع کئے گئے ہیں۔ تو پھر صور کی وہ آواز کہاں ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے؟:-

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہُ

اور صور پھونکا جائے گا۔ تو جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب بیہوش ہو جائیں گے مگر جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔"

کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بے ہوش ہو جائیں گے۔ یا کیا میں ان میں سے ہوں۔ جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ کیونکہ میں نے صور کا پھونکنا نہیں دیکھا اور اس کی آواز نہیں سنی۔

قاضی صاحب تھوڑی دیر مبہوت رہے۔ پھر کہا:-

اے شخص، کیا آپ نے مجھ کو معبود بنا دیا؟

حضرت نوری نے جواب دیا:- معاذ اللہ۔ اللہ کی پناہ:- میں نے آپ کو معبود نہیں بنایا ہے۔ بلکہ آپ نے اپنا نام قاضی القضاۃ رکھ کر اپنے آپ کو معبود بنایا ہے اور اس قاضی کے سوا کوئی قاضی القضاۃ نہیں ہے۔ جو فیصلہ کرتا ہے اور اس کے اوپر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیا سب نام آپ

کے لئے تنگ ہو گئے۔ تھے۔ آپ کو کوئی دوسرا نام نہیں ملا تھا؟ کیا آپ کے لئے قاضی المسلمین یا ایک عالم یا ایک اللہ کا بندہ وغیرہ کافی نہیں ہوا۔ جو آپ نے اپنا نام قاضی القضاۃ رکھا؟ آپ نے یہ نہ کہہ کر کہ میں علی بن ثور ہوں، تکبر کیا۔ پھر وہ برابر قاضی صاحب پر اعتراض کرتے رہے۔ یہاں تک کہ قاضی علی رونے لگے۔ اور ان کو خیال ہوا، ان ان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اور قاضی علی کے رونے کے ساتھ بادشاہ اور حضرت جنید بھی رونے لگے۔

حضرت جنیدؒ نے اپنے مرید حضرت ابوالحسن نوریؒ سے فرمایا:- تم قاضی کے لئے اپنی ملامت بند کرو۔ تم نے ان کو مار ڈالا۔ اب ان کو چھوڑ دو۔

پھر جب قاضی علی کو افاقہ ہوا اور ان کے ہوش وحواس درست ہوئے۔ تو انھوں نے کہا:- اے ابوالحسن! آپ میرے سوالوں کا جواب دیجئے۔ میں آپ کے سامنے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جاؤں گا۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا:- آپ اپنے سوالوں کو پھر بیان کیجئے۔ کیونکہ میں انھیں بھول گیا۔ قاضی علی نے ان کے سامنے اپنے سوالوں کو دہرایا۔

حضرت نوریؒ نے اپنی دائیں طرف دیکھ کر فرمایا:- کیا آپ اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟ پھر انھوں نے کہا:- " حَسْبِیَ اللّٰہُ " اللہ تعالیٰ میرے لئے کافی ہے۔ پھر انھوں نے بائیں طرف دیکھ کر اسی طرح فرمایا:- پھر انھوں نے اپنے سامنے سینے کی طرف دیکھ کر اسی طرح فرمایا:- پھر فرمایا:- " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ " سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔" پھر انھوں نے اپنا سر اٹھا کر قاضی علی کی طرف دیکھا اور ان سے فرمایا:- اللہ تعالیٰ آپ کے اوپر رحمت نازل فرمائے۔

آپ کا پہلا سوال:- یہ ہے۔ تم کون ہو؟

اس کا جواب یہ ہے:- میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا ہے:-

-اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا

" جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سب رحم کرنے والے اللہ تعالیٰ کے پاس بندہ کی حیثیت

سے آئیں گے۔

اور آپ کا دوسرا سوال یہ ہے:- تم کس لئے پیدا کئے گئے ہو؟

اس کا جواب یہ ہے:- اللہ تعالیٰ ایک ایسا خزانہ تھا۔ جو پہچانا نہیں جاتا تھا۔ لہذا اس نے مجھ کو اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

(وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ) اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ

''میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ یعنی مجھ کو پہچانیں۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں اسی طرح فرمایا ہے:-

اور آپ کا تیسرا سوال یہ ہے:- میرے پیدا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے:- میرے پیدا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد، مجھ کو بزرگی عطا فرمانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی۔''

اور آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:- مجھ سے میرا رب کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے:- میرا رب مجھ سے وہیں ہے، جہاں میں اس سے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ

''تم لوگ جہاں بھی رہو، اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے۔''

قاضی علی نے اس پر یہ سوال کیا:- آپ مجھے یہ بتایئے :- اس آیہ کریمہ کے مطابق، اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ اور ہمارے ساتھ کس طرح ہے؟

حضرت نوریؒ نے جواب دیا:- اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ اسی طرح ہے، جس طرح ہم اس کے ساتھ ہیں۔

لہٰذا اگر ہم اس کے ساتھ، اطاعت اور عبادت کے ساتھ ہیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ اطاعت اور عبادت کی طرف مدد اور ہدایت کے ساتھ ہے۔ اور اگر ہم اس کے ساتھ غفلت کے ساتھ ہیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ مشیت کے ساتھ ہے۔ اور اگر ہم اس کے ساتھ معصیت اور نافرمانی کے ساتھ ہیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ مہلت یعنی ڈھیل دینے کے ساتھ ہے اور اگر ہم اس کے ساتھ توبہ کے ساتھ ہیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ توبہ قبول کرنے کے ساتھ ہے۔ اور اگر ہم اس کے ساتھ اس کو چھوڑ دینے کے ساتھ ہیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ سزا دینے کے ساتھ ہیں۔

قاضی علی نے کہا :- آپ نے سچ فرمایا۔ لیکن آپ مجھے یہ بتایئے :- اللہ تعالیٰ مجھ سے کہاں ہے؟

حضرت نوریؒ نے جواب دیا:- آپ مجھے یہ بتایئے :- آپ اللہ تعالیٰ سے کہاں ہیں؟ تب میں بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کہاں ہے؟

قاضی علی نے کہا:- آپ نے جو کچھ فرمایا۔ وہ سچ فرمایا۔ لیکن آپ میرے ایک دوسرے سوال کا جواب دیجئے۔

حضرت نوری نے فرمایا:- وہ کون سا سوال ہے؟

قاضی علی نے کہا:- جب میں نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ اپنی دائیں طرف کیوں مڑے؟

حضرت نوری نے جواب دیا:- اللہ تعالیٰ آپ کو عزت عطا فرمائے۔ آپ نے جو سوالات مجھ سے دریافت کئے۔ ان کے متعلق مجھے کچھ بھی علم نہیں تھا۔ کیونکہ میں نے ان کے بارے میں نہ کبھی کسی سے دریافت کیا تھا، نہ کسی سے سنا تھا۔ لہذا جب آپ نے ان مسئلوں کے بارے میں سوال کیا۔ تو میرے پاس ان کا جواب نہیں تھا۔ جو میں آپ کو بتاتا۔ تو میں نے اس بزرگ فرشتے سے جو میری دائیں طرف اعمال لکھتا ہے، سوال کیا اور ان سے کہا:- کیا آپ اس سوال کا جوب دے سکتے ہیں؟ انھوں نے مجھ سے فرمایا:-

مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ تب میں نے کہا:-

"حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ

"میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔اور میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا۔"

پھر قاضی نے سوال کیا:۔اور آپ بائیں طرف کیوں مڑے؟

حضرت نوریؒ نے جواب دیا:۔جس طرح میں نے دائیں طرف کے فرشتے سے سوال کیا۔اسی طرح بائیں طرف کے فرشتے سے سوال کیا۔انھوں نے بھی وہی جواب دیا، جو دائیں طرف کے فرشتے نے جواب دیا تھا۔

پھر قاضی علی نے سوال کیا:۔آپ اپنے آگے کیوں جھکے؟

حضرت نوریؒ نے جواب دیا:۔میں اپنے قلب سے دریافت کیا:۔تو قلب نے اپنے سر سے اور سر نے اپنے رب سے دریافت کر کے مجھ کو وہ جواب بتایا، جو میں نے آپ کو دیا۔لہذا میں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر شکر ادا کرنے اور انتہا کو پانے اور سمجھنے سے عاجزی کا اقرار کرنے کے لئے " الحمد للہ " کہا۔

قاضی علی نے کہا:۔اے شخص! کیا فرشتے آپ سے بات کرتے ہیں؟

حضرت نوریؒ نے قاضی صاحب سے فرمایا:۔اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔کیا آپ کے سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔کہ فرشتوں کے رب نے مجھ سے بات کی۔جبکہ اس نے جواب کی طرف میری رہنمائی فرمائی۔حالانکہ میں جواب سے ناواقف تھا۔

قاضی علی نے کہا:۔اے ابوالحسن! اب میرے اوپر آپ کی بے وقوفی ظاہر ہوگئی اور آپ کی کفر اور آپ کی بے دینی ثابت ہوگئی۔اب آپ ہی بتائیے کہ میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کروں۔اور کس طریقے سے آپ کو قتل کروں۔

حضرت نوریؒ نے قاضی علی سے کہا:۔آپ ہی بتائیے کہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں اور آپ تو قاضی القضاۃ ہیں۔اگر آپ فیصلہ صادر کرتے ہیں اور آپ کے اوپر فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا ہے۔تو جو آپ کے جی میں آئے فیصلہ کیجئے۔آپ کے ہاتھ کیا اختیار ہے؟

قاضی علی نے حضرت نوری سے کہا:- میں ایسا قاضی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔

حضرت نوریؒ نے قاضی علی سے کہا:- کیا آپ نے اس کو سمجھا۔ جو میں نے آپ کو ایسے قاضی کا خطاب دیا ہے۔ جو فیصلہ کرتا ہے اور اس پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے؟ قاضی نے دریافت کیا:- اس کا مفہوم کیا ہے؟

حضرت نوریؒ نے فرمایا:- اس کا مفہوم وہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّ لَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

''آج کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور تم لوگوں کو صرف انہیں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جو تم دنیا میں کرتے تھے۔

پھر حضرت نوری نے قاضی علی سے کہا:- آپ کا کیا ارادہ ہے؟ اب آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ اپنے رب سے ملنے کے لئے میں بھی راضی ہوں۔ اور میرا نفس بھی راضی ہے۔

اتنی گفتگو کے بعد قاضی علی نے اپنا منہ خلیفہ متوکل کی طرف کر کے کہا:-

اے امیر المومنین! آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ زندیق اور بے دین ہیں تو پھر روئے زمین پر کوئی مسلمان نہیں ہے۔

یہ حضرات دین کے چراغ اور اسلام کے ستون ہیں۔ اور یہی لوگ سچے مومن، اور اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہیں۔

تب خلیفہ نے حضرت جنید رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کہا:- اے ابوالقاسم! ان علما و فقہا نے آپ سے مقابلہ کرنے کے لئے یہ عظیم الشان مجلس اس لئے منعقد کی تھی۔ اور آپ سے مناظرہ کرنے کی تیاری اس مقصد سے کی تھی کہ اگر وہ لوگ آپ کو شکست دے دیں اور آپ پر غالب آ جائیں۔ تو آپ کو قتل کر دیں۔ لیکن اب آپ ان سب پر غالب ہیں۔ اور وہ سب شکست کھا چکے ہیں۔ اور میں نے اپنے اوپر یہ قسم کھائی تھی۔ کہ اگر آپ ان کے اوپر غالب آ جائیں گے اور یہ

لوگ آپ کے مقابلے میں شکست کھا جائیں گے۔ تو میں ان سب کو قتل کر دوں گا۔ لہذا اب اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو معاف فرما دیں۔ اور اگر آپ چاہیں تو یہ لوگ قتل کر دیئے جائیں۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:- اے امیر المومنین! میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میرے سبب سے ان میں سے کوئی شخص بھی قتل ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ان لوگوں کو معاف فرمائے۔ اور ہمارے اوپر ان لوگوں کے اعتراض اور انکار کرنے میں ان کے اوپر کوئی گرفت نہیں ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو میرے قتل پر جہالت اور علم کی کمی نے آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ان سب کو معاف فرمائے۔ لہذا مجلس عافیت اور سلامتی کے ساتھ برخاست ہوگئی۔ اور ان میں سے کوئی شخص بھی قتل نہیں کیا گیا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

پھر قاضی علی، حضرت ابوالحسن نوریؒ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان سے کہا :- اے ابوالحسن مجھ کو آپ کے حال سے خوشی ہوئی۔ اور اللہ تعالے گواہ ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ سے ایک ہدایت چاہنے والے شخص کی طرح کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اوپر رحمت نازل فرمائے۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا:- آپ کے دل میں جو بات پیدا ہوئی ہے آپ سوال کیجئے اگر مجھ کو اس کا جواب معلوم ہوگا تو ضرور آپ کو بتاؤں گا۔ ورنہ میں آپ سے کہدوں گا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اور اپنی بے علمی ظاہر کرنا، میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ پھر قاضی علی نے ان سے متعدد مسائل دریافت کئے۔ ان میں سے بعض مسائل مصنفؒ کے اس قول کی تشریح میں پہلے بیان کئے جا چکے ہیں:-

یَا عَجَبًا کَیْفَ یَظْھَرُ الْوُجُوْدُ فِی الْعَدَمِ

''تعجب ہے کہ وجود عدم میں کیسے ظاہر ہوتا ہے؟

اگر تم چاہتے ہو، تو اس قول کی تشریح کو پھر پڑھو۔ اور باقی مسائل کو میں نے اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ ان کا بیان میری تصنیف کردہ کتابوں میں کثرت سے موجود ہے۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

یہ صوفیائے کرام کی وہ تکلیف اور مصیبت ہے، جو حضرت جنید رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔

اور اپنے انبیا علیہم السلام اور اولیا رضی اللہ عنھم کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہی سنت جاریہ ہے۔ ان حضرات پر تمام انسانوں سے زیادہ بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔

اور تم ہمارے شیخ الشیوخ حضرت شیخ ابن مشیش رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر غور کرو جو اپنے زمانہ کے مشہور قطب تھے۔ لیکن وہ قتل کئے گئے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔

اور اسی طرح ان کے مرید کا واقعہ، جو قاضی ابن براء کے ساتھ پیش آیا۔ اور وہ واقعہ اس طرح ہے:۔ قاضی ابن براء نے ان کو تیونس سے نکال دیا۔ اور ان کے بارے میں مصر کے گورنر کے پاس خط لکھا اور ان کے اوپر یہ بہتان قائم کیا کہ وہ ہنگامہ برپا کرنا چاہتے ہیں اور وہ بادشاہت کے طلبگار ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کو ظالموں کے پنجے سے نجات عطا کی جس طرح اپنے اولیائے کرام کی مدد کرنا، اللہ سبحانہ تعالیٰ کی شان ہے۔

اور اسی طرح حضرت غزوانی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے:۔ جب ان کی تربیت مکمل ہوگئی، اور ان کی ہدایت ظاہر ہوگئی۔ یعنی انکو معرفت میں استقامت حاصل ہوگئی۔ تو ان کے شیخ حضرت شیم التباع نے ان کو ان کے شہر میں رہنے کے لئے بھیج دیا اور وہ حضرت شیخ ابن مشیش کے مزار مبارک کے قریب قبیلہ بنوزکار میں مقیم ہوئے۔ جب انھوں نے وہاں کے بازار کو آباد کیا۔ اور مخلوقات ان کی طرف سر کے بل دوڑی۔ تو سلطان مرینی کے پاس ان کی شکایت کی گئی۔ سلطان نے ان کے پاس سپاہیوں کو بھیجا۔ سپاہی ان کو گرفتار کر کے عرائش لے گئے۔

کیونکہ سلطان وہیں مقیم تھا۔ پھر ان کو فاس روانہ کر دیا۔ وہاں وہ چار مہینہ یا چھ مہینہ جیل میں رہے۔ یہاں تک کہ جب سلطان فاس میں آیا تو ان کو رہا کیا۔ لیکن ان کے اوپر اپنے ساتھ فاس میں رہنے کی پابندی لگا دی۔ لہذا وہ بادشاہ کے ساتھ رہنے لگے۔ پھر جب مرینیوں کا زمانہ ختم ہونے کے قریب آیا۔ تو وہ وہاں سے مراکش تشریف لے گئے۔ اور فرمایا:۔ بنی مرین کی حکومت ختم ہوگئی۔ پھر وہ مراکش میں مقیم رہے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔

اور تجیبی نے بیان کیا ہے :- حضرت شبلی رضی اللہ عنہ کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور حضرت ابویزید رضی اللہ عنہ کو متعدد مرتبہ بسطام سے نکالا گیا۔ یہ بہت مشہور واقعہ ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے :- جب اللہ تعالیٰ حق کے ظاہر ہونے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اپنے مخلوق میں سے کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اس کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ پھر یہ اس کے ظاہر اور وسیع ہونے کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر مجرمین میں سے ایک دشمن مسلط کیا اور اولیائے کرام پر بھی دشمنوں کو مسلط کیا۔

اسی مفہوم میں عارفین کے یہ اشعار ہیں :-

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ نَشْرَ فَضِیْلَۃٍ طُوِیَتْ اَتَاحَ لَھَا لِسَانَ حَسُوْدٍ

''جب اللہ تعالیٰ کسی فضیلت کو مشہور کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کے لئے حاسد کی زبان تیار کر دیتا ہے۔''

لَو لَا اِشْتِعَالُ النَّارِ فِی مَاجَاوَرَتْ مَا کَانَ یُعْرَفُ طِیْبُ عَرْفِ الْعُوْدِ

''اگر بتی میں اگر آگ نہ لگتی تو اس کی خوشبو نہ ظاہر ہوتی۔''

اور ہم نے اس موضوع پر اس لئے لمبی تشریح کی ہے، کہ اس موضوع کا تقاضا یہی تھا۔ کیونکہ تصنیف کا وقت جلال کے سامنے آ گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہمارے احباب و متعلقین کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل کے طفیل اپنی تائید عطا فرمائے۔

اور تائید کی علامت :- سختیوں اور مصیبتوں کے وقتوں میں اس طرح توحید کی حفاظت کرنی ہے کہ وہ ابراہیمی ہو جائے۔ تاکہ جب وہ جلال کی آگ میں پھینک دیا جائے اور اس کے سامنے مخلوق آ کر اس سے کہے :- کیا تمھاری کچھ حاجت ہے؟ تو عارف مخلوق کو جواب دے :- تم سے میری کوئی حاجت نہیں ہے۔ میری حاجت صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اور وہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ جلال کی آگ کو حکم دے :-

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰی وَلِیِّیْ

''اے آگ! تو میرے ولی پر ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا۔''

لہذا آگ کی گرمی، ٹھنڈک اور سلامتی میں تبدیل ہو جائے۔

سیدنا حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا ہے:-

مَا رَاَیْتُ نَعِیْمًا قَطُّ مِثْلَ تِلْكَ الْاَیَّامِ الَّتِیْ كُنْتُ فِیْهَا فِی النَّارِ

'جتنے دن میں آگ میں رہا، اس کی طرح کوئی نعمت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔''

میں کہتا ہوں :- اسی طرح جلال کی آگ کی طرح کوئی نعمت نہیں ہے۔، جبکہ وہ ٹھنڈک اور سلامتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی جب وہ رضا کی ٹھنڈک اور تسلیم کی سلامتی میں تبدیل ہو جاتی ہے، تو نعمت مکمل ہو جاتی ہے۔

اور تم یہ جان لو:- مخلوق کی ایذا رسانی بھی، ولایت سے روکنے والی اشیا میں سے ایک روکنے والی شی ہے اور اس پر صبر، صرف صدیقین ہی کرتے ہیں۔ اسی لئے مصنفؒ نے اس کی حکمت اور اس کا راز بیان فرمایا:-

اور ولایت کو روکنے والی اشیاء میں سے :- شیطان اور نفس ہے۔

لہذا مصنفؒ نے شیطان کی ایذا رسانی کو دور کرنے کی کیفیت کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

اِذَا عَلِمْتَ اَنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَغْفُلُ عَنْكَ فَلَا تَغْفُلْ عَمَّنْ نَاصِیَتُكَ بِیَدِهٖ

''جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ شیطان تم کو گمراہ کرنے سے کبھی غافل نہیں ہوتا ہے۔ تو تم اس ذات پاک سے کبھی غافل نہ رہو، جس کے قبضہ قدرت میں تمھاری پیشانی ہے۔''

میں کہتا ہوں :- اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے شیطان اور نفس اور آدمیوں کو اپنی بارگاہ کا محافظ (پہرے دار) مقرر کیا ہے۔ تا کہ کوئی شخص اس وقت تک بارگاہ میں داخل نہ ہو سکے۔ جب تک ان سے جنگ نہ کرے اور ان کو شکست دے کر ان سے آگے نہ بڑھے۔ کیونکہ وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی بارگاہ کے دروازے پر مقرر فرما دیا ہے اور ان کو یہ حکم دیا ہے:- تم کسی شخص کو بارگاہ میں داخل نہ ہونے دو۔ مگر صرف اس شخص کو جو تم سے جنگ کر کے

تمھارے اوپر غالب ہو جائے۔ لہذا وہ تینوں، دروازے پر کھڑے ہیں اور جب کوئی ایسا شخص آتا ہے، جو بارگاہ الٰہی میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ تو پہلے مخلوق اس کے سامنے آتی ہے۔ پھر وہ لوگ بارگاہ الٰہی تک پہنچنے کا راستہ اس کے لئے خراب کرتے ہیں اور بارگاہ الٰہی کو پہچاننے والے شیخ کا بھی وہ لوگ انکار کرتے ہیں۔

لیکن جب وہ شخص لوگوں پر غالب آ جاتا ہے۔ تب اس کے پاس شیطان آتا ہے۔ اور اس کو دروازہ کھلنے کی مدت دراز ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ اور اس کو محتاجی سے خوف دلاتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے:۔ معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر دروازہ کھولے گا، یا نہیں کھولے گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دروازہ کھلتا ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں کھلتا ہے۔

لیکن جب وہ شیطان پر بھی غالب آ کر آگے بڑھتا ہے۔ تو اس کے مقابلے میں اس کا نفس آتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے:۔ ایک ایسی شی کے لئے جس کے ہونے اور نہ ہونے میں شک ہے۔ تم اپنی دنیا اور اپنی شان وشوکت اور اپنی عزت کیوں چھوڑ دو گے؟

لیکن جب وہ نفس پر بھی غالب آ جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے:۔

مرحباً بك اهلاً

''شاباش، تمھارے لئے کشادہ جگہ ہے۔ تم اپنے گھر میں آئے ہو۔

لیکن تینوں جدا کرنے والے یعنی مخلوق اور شیطان اور نفس ان کی حرص اس کو بارگاہ الٰہی سے دور کرنے کی ختم نہیں ہوتی جب تک وہ بارگاہِ الٰہی میں مضبوطی سے سکونت نہ اختیار کرے۔

اسی لئے عارفین نے فرمایا ہے:۔ اللہ تعالیٰ کی قسم، جو شخص بھی لوٹا ہے وہ راستے ہی سے لوٹا ہے۔ لیکن جو شخص بارگاہ الٰہی میں پہنچ گیا، وہ پھر کبھی نہیں لوٹا۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ، اپنے مقام سے نکالا ہوا شخص قابل شکر نہیں ہے۔ خواہ وہ مدہوش ہو، یا ہوش میں ہو۔ یہاں تک کہ وہ گروہ میں شامل ہو کر راستہ طے کرے اور چکی پھرنے کی طرح چکر لگائے۔ اگر ثابت قدم ہو جائے گا۔ تو پہنچ جائے گا۔

لہذا اے فقیر یا اے انسان! جب تم نے یہ معلوم کر لیا کہ شیطان ایک لمحہ کے لئے تمھاری

طرف سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ تمھارے سینے میں بائیں طرف اس کا گھر ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوتے ہوتو وہ تمھارے قلب میں وسوسہ پیدا کرتا ہے اور جب تم اس کا ذکر تے ہو، تو وہ تم سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لہذا تم اس سے غافل نہ رہو، جس کے قبضہ قدرت میں تمھاری اور شیطان کی پیشانی ہے۔ اور وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ جب تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہو گے۔ تو وہ شیطان کو تم سے لوٹا دے گا اور اس کا حکم تمھارے لئے کافی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

(اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

''بے شک شیطان کا مکروفریب کمزور ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قران مجید میں شیطان سے ڈرایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:-

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا

''بے شک شیطان تم لوگوں کا دشمن ہے۔ لہذا تم لوگ بھی اس کو دشمن سمجھو۔''

لہذا کچھ لوگوں نے سمجھا کہ شیطان ان کا دشمن ہے۔ تو وہ اس کے ساتھ جنگ کرنے میں مشغول ہو گئے اور حقیقی دوست کی محبت ان سے فوت ہوگئی۔

اور کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شیطان ان کا دشمن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کا دوست ہے۔ لہذا وہ دوست کی محبت میں مشغول ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ شیطان کی دشمنی سے ان کی حفاظت کے لئے کافی ہوگیا۔ جیسا کہ حضرت شیخ ابوالعباس نے فرمایا ہے۔

دوست سے سچی محبت میں مشغولی دشمن کی سچی محبت ہے

اور ہمارے شیخ الشیوخ سیدی علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- دشمن کی سچی دشمنی یہ ہے کہ تم دوست کی سچی محبت میں مشغول ہو جاؤ کیونکہ اگر تم دشمن کی دشمنی میں مشغول ہو جاو گے تو محبوب حقیقی کی محبت تم سے فوت ہو جائے گی اور تمھارا دشمن تم سے اپنا مقصد حاصل کرے گا۔

مخلوق سے ایذارسانی کی شکایت اور شیخ کا جواب

حضرت شعرانی رضی اللہ عنہ نے اپنے شیخ کے پاس جو مغرب میں رہتے تھے، خط لکھا اور

ان سے مخلوق کی ایذا رسانی کی شکایت کی۔ان کے شیخ نے ان کو جواب لکھا:- تم ہرگز ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کرو، جو تم کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ بلکہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہو۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان لوگوں کو تم سے دور کر دے گا۔

اور اس معاملے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونے کے بجائے ان کے ساتھ مشغول ہو جاتے ہیں، جو ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔اور اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تو وہ تکلیف پہنچانے والوں کے معاملے میں ان کے لئے کافی ہوتا اور ان سے تکلیف پہنچانے والوں کو بخیر وخوبی دور کر دیتا۔

شیطان صرف ایمان وتوکل سے دور ہوتا ہے

حضرت شیخ زروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- شیطان صرف توکل اور ایمان سے دور ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

’’بیشک شیطان کو ان لوگوں پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ جو ایمان لائے اور اپنے رب تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں۔‘‘

بیان کیا گیا ہے:- شیطان کتا ہے۔اگر تم اس سے مقابلہ کرنے میں مشغول ہو جاؤ گے، تو وہ چمڑے کو پھاڑ دے گا۔اور کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

اور اگر تم اپنے رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو گے۔تو وہ اس کو آسانی کے ساتھ تم سے ہٹا دے گا۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اگر شیطان ہم کو اس طرح دیکھتا ہے کہ ہم اس کو نہیں دیکھتے تو اللہ تعالیٰ شیطان کو اس طرح دیکھتا ہے کہ شیطان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھتا ہے۔لہذا تم شیطان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔

میں کہتا ہوں:- جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔اس کے نور سے شیطان پگھل جاتا ہے۔پھر اللہ تعالیٰ کے سوا پہچاننے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔

اسی لئے بعض عارفین نے فرمایا ہے :- ہم ایسے لوگ ہیں، کہ شیطان کو ہم لوگ نہیں جانتے ہیں۔ ان سے دریافت کیا گیا:- کیا اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں شیطان کا ذکر نہیں کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا:- ہاں کیا ہے۔ لیکن ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ لہذا شیطان کے معاملے میں اللہ تعالےٰ ہمارے لئے کافی ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہم اس کو بھول گئے۔ وباللہ التوفیق۔

وجود شیطان کی حکمت

پھر مصنف نے شیطان کے وجود کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

جَعَلَهُ لَكَ عَدُوًّا لِيُحَوِّشَكَ بِهِ اِلَيْهِ

''اللہ تعالےٰ نے شیطان کو تمھارا دشمن اس لئے بنایا ہے، تاکہ تم کو اس کے ذریعے اپنی طرف رجوع ہونے کے لئے آمادہ کرے۔''

میں کہتا ہوں:- اللہ تعالےٰ نے کوئی شی بے کار نہیں پیدا کی ہے۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ

''اے ہمارے رب! تو نے یہ سب بے کار نہیں پیدا کیا۔ تو اس سے پاک ہے، کہ کوئی شی بے کار پیدا کرے۔''

تخلیق شیطان کی حکمتیں

شیطان کے پیدا کرنے میں اللہ تعالےٰ کی چند حکمتیں ہیں۔

پہلی حکمت:- اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ کیونکہ کمزور بندہ جب دشمن کو دیکھتا ہے، تو اپنے حقیقی آقا کی طرف بھاگتا ہے۔ اور اس کے قلعہ میں پناہ لیتا ہے تو وہ اس دشمن کے معاملے میں اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

دوسری حکمت:- اپنے بندوں پر حجت قائم کرنی ہے۔ تاکہ جب وہ اس کے حکم کی مخالفت کریں، تو وہ ان سے کہے:- تم لوگوں نے میرے دشمن کی پیروی کی، اور میرے حکم کی نافرمانی کی

ہے۔اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:-

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

''آپ فرما دیجئے !اللہ تعالےٰ کی حجت مکمل ہے۔''

تیسری حجت:- عیوب کے لئے رومال ہونا ہے۔تا کہ اس میں گناہوں کے مَیل پونچھے جائیں۔اوراسی طرح نفس اور دنیا بھی رومال ہیں۔

چوتھی حکمت:- اس کے ساتھ مجاہدہ اور جنگ کرنے میں مومن کی فضیلت اور ترقی ظاہر ہوتی ہے۔انسان کے اوپر شیطان کے مسلط کرنے میں یہی حکمتیں ہیں۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهٖ

''اللہ تعالےٰ اپنے حکم پر غالب ہے۔''

وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ

''اور وہ علم اور حکمت والا ہے۔''

حضرت سہیل تستریؒ سے شیطان کا مکالمہ

حکایت:- روایت ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کے سامنے شیطان ہنستا ہوا آیا۔ حضرت سہل نے اس سے کہا:- اے مردود! تو کیوں ہنس رہا ہے۔جبکہ تو اللہ تعالےٰ کی رحمت سے ناامید ہو چکا ہے؟ شیطان نے جواب دیا:- اے سہل میں بھی ایک شی ہوں۔اور اللہ تعالےٰ فرمایا ہے:-

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

''اور میری رحمت ہر شی کے لے وسیع ہے۔''

حضرت سہل نے فرمایا:-اللہ تعالےٰ نے یہ بھی فرمایا ہے :-

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ

''میں عنقریب اپنی رحمت ان لوگوں کے لئے لکھوں گا،جوتقوے والے ہیں۔''

تو اے مردود! تیرے اندر تقویٰ کہاں ہے؟ شیطان نے کہا:- تقویٰ بندے کی صفت ہے اور رحمت، رب تعالیٰ کی صفت ہے اور بندہ فانی ہے اور رب تعالیٰ باقی ہے۔ تو فانی کو باقی سے کیا نسبت؟ پھر حضرت سہل سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔

میں کہتا ہوں:- اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ فرق کی طرف نظر کرنے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے لیکن اگر جمع پر نظر کیا جائے۔ تو رحمت اس کا وصف ہے۔ اور تقویٰ اس کا فعل ہے اور اس کا فعل، اس کے وصف کو مقید کرتا ہے اور سب اسی کی طرف سے ہے۔ اور اسی کی طرف ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ

''اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کیا جا سکتا ہے جو وہ کرتا ہے اور لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔''

نفس کے ظاہر ہونے کی حکمت

پھر مصنفؒ نے نفس کے ظاہر ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وَ حَرَّكَ عَلَيْكَ النَّفْسَ لِيُدِيْمَ اِقْبَالُكَ عَلَيْهِ

''اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر نفس کو حرکت دی (مسلط کیا) تاکہ تمھاری توجہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہے۔''

میں کہتا ہوں:- اللہ تعالیٰ نے تمھارے اوپر نفس کو اس لئے حرکت دی ہے، تاکہ تمھاری توجہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہے۔ کیونکہ نفس پر جب بشریت غالب آتی ہے۔ تو وہ اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ تم کو خواہشات کی زمین کی طرف گراتی ہے۔ اور تم ہمیشہ حقوق اور واجبات کے آسمان کی طرف چڑھنا چاہتے ہو۔ وہ تم کو اپنی اصل صلصال اور طین (کھنکھناتی) ہوئی مٹی اور گیلی مٹی) کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اور تم نفس کو اس کی روح کی اصل کی طرف اعلیٰ علیین میں لوٹانا چاہتے ہو۔ نفس عالم اجسام میں رہنا چاہتا ہے۔ اور تم اس کو عالم ارواح کی طرف ترقی دینا چاہتے ہو۔ لہٰذا وہ ہمیشہ نیچے کی طرف گرنا چاہتا ہے اور تم ہمیشہ اوپر کی طرف چڑھنا چاہتے ہو۔ تمھاری توجہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہونے کے یہی معنی ہیں۔

اور عنقریب مصنفؒ کے اس قول کی تشریح آئے گی:- اگر نفوس کے میدان نہ ہوتے، تو سائرین کی سیر نہ ہوتی۔

لہذا نفس اور شیطان، باطن میں دو نعمتیں ہیں۔ کیونکہ اگر وہ دونوں نہ ہوتے تو اللہ تعالےٰ کی طرف تمھاری حرکت نہ ہوتی۔ نہ اس کی طرف تمہاری سیر ہوتی۔

اسی وجہ سے ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مولای عربی رضی اللہ عنہ سے جب کوئی شخص نفس کی شکایت کرتا تھا۔ تو وہ فرمایا کرتے تھے:- اللہ تعالےٰ مجھ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میرے اوپر اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم اور نفس کا احسان ہے۔ اللہ تعالےٰ کی قسم، میں نفس کی بھلائیوں کو فراموش نہیں کر سکتا ہوں۔

حضرت مولائے عربی کا یہ قول، اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔

اور نفس و شیطان، اس شخص کے لئے عذاب ہیں، جو ان کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے وہ اللہ تعالےٰ سے حجاب میں ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے:- نفس اور شیطان اور دنیا اور انسان، اس شخص کے لئے قاطعات (روکنے والے) ہیں۔ جو ان کی وجہ سے راستہ سے جدا ہو گیا۔ اور اس شخص کے لئے موصلات ہیں (پہنچانے والے) جو حقیقت میں ٹھہرا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالےٰ کی توفیق سبقت کر چکی ہے۔ یعنی مقدر ہو چکی ہے۔

اور نفس، شیطان سے زیادہ سخت دشمن ہے۔ کیونکہ وہ تمھارا قریبی اور تمھارے ساتھ رہنے والا دشمن ہے۔ اور تم اس کے اوپر مہربان ہو۔ لہذا وہ راستے سے علیحدہ کر کے گمراہ کرنے میں ستر شیطانوں سے زیادہ برا ہے۔

چار دشمن اور چار ہی ہتھیار دور چار قید خانے

حضرت ابن قسطلانی نے احمد بن سہل رحمہ اللہ تعالےٰ سے روایت کی ہے۔ کہ انھوں نے فرمایا ہے:- تمھارے دشمن چار ہیں۔

پہلا دشمن:- دنیا ہے اور اس کا ہتھیار:- مخلوق کی ملاقات ہے اور اس کا قید خانہ:- گوشہ تنہائی ہے۔

دوسرا دشمن :- خواہش ہے اور اس کا ہتھیار:- بات کرنا ہے اور اس کا قید خانہ:- خاموشی ہے۔

تیسرا دشمن:- شیطان ہے اور اس کا ہتھیار:- پیٹ بھر کر کھانا ہے اور اس کا قید خانہ:- بھوکا رہنا ہے۔

چوتھا دشمن:- نفس ہے اور اس کا ہتھیار:- زیادہ سونا ہے اور اس کا قید خانہ :- جاگنا ہے۔

ایک عارف نے ان قاطعات کو نظم میں بیان فرمایا ہے:-

اِنِّی بَلَیْتُ بِاَرْبَعٍ یَرْمِیْنَنِی بِاالنَّبْلِ عَنْ قَوْسٍ لَهٗ تَوْتِیْرٌ

''میں چار چیزوں میں مبتلا کیا گیا ہوں۔ جو مجھے تانت والی کمان سے تیر پھینکنے کی طرح پھینکتی ہیں۔

اِبْلِیْسُ ، وَالدُّنْیَا وَ نَفْسِیْ وَالْهَوٰی یَا رَبِّ اَنْتَ عَلَی الْخَلَاصِ قَدِیْرٌ

''وہ ابلیس اور دنیا اور میرا نفس اور خواہش ہیں۔ اے میرے رب! تو ان چاروں سے رہائی دینے پر قدرت رکھتا ہے۔''

مصنفؒ نے ان قاطعات کا بیان اس ترتیب سے بیان فرمایا ہے۔ کہ انھوں نے پہلے دنیا، پھر آدمی، پھر شیطان، پھر نفس کو بیان کیا ہے۔ تو انھوں نے ان کا بیان توحیدی طریقے پر کیا ہے۔ انھوں نے ان کا بیان اس طریقے پر نہیں کیا ہے، کہ یہ ماسوی ہیں، یا قاطعات ہیں۔ انھوں نے درحقیقت ان کے اسرار اور ان کے وجود کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ کہ توحید اور تفرید کے اسرار کی معرفت ان کو کتنی زیادہ حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے ذکر خیر سے فائدہ پہنچائے۔ اور ہم کو ان کے زمرے میں شامل فرمائے۔ آمین

یہاں چوبیسواں باب ختم ہوا

باب کا خلاصہ

اس باب کا حاصل :- اللہ تعالیٰ کی انتہائی نعمتوں کا بیان کرنا ہے۔ اور وہ اس کے چہرہ

انور کے نور کا مشاہدہ کرنا ہے۔ کیونکہ جو شخص مشاہدہ کے مقام میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کو نہ کوئی فکر ہوتی ہے، نہ کوئی غم ہوتا ہے۔

اور ان قاطعات کا بیان کرنا ہے۔ جو مشاہدہ کے مقام میں پہنچنے سے روکتی ہے۔ اور وہ دنیا ہے۔ اور جو چیزیں دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً علم غیر نافع ہیں۔ اور جاہ و مرتبہ کی سرداری۔
اور مخلوق ہے اور مخلوق کی ایذا رسانی سے جن چیزوں کا تعلق ہے۔ اور شیطان اور نفس ہے۔

لیکن مصنفؒ نے ان کا بیان حقیقت کے طریقے پر کیا ہے۔ نہ کہ شریعت کے طریقے پر

لہذا جب انسان ان قاطعات سے نجات پا جاتا ہے۔ تو وہ اپنے رب کی عظمت کے نور کی تجلیوں کے مشاہدہ تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ تمام اشیاء کے ساتھ تواضع اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ان میں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

مصنف رضی اللہ عنہ نے پچیسویں باب کی ابتدا میں اسی کو بیان

فرمایا ہے:-

پچیسواں باب

تواضع، فناوبقا ، محبت، مجاہدہ نفس ، انسان کی حقیقت ، جذب وسلوک ، عروج ونزول کے بیان میں

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

مَنْ اَثْبَتَ لِنَفْسِهٖ تَوَاضُعًا فَهُوَ الْمُتَكَبِّرُ حَقًّا ، اِذْ لَيْسَ التَّوَاضُعِ اِلَّا عَنْ رِفْعَةٍ فَمَتٰى اَثْبَتَ لِنَفْسِكَ تَوَاضُعًا فَاَنْتَ الْمُتَكَبِّرُ

تواضع ظاہر کرنے والا متکبر ہی ہے

''جو شخص اپنے نفس کے لئے تواضع ثابت کرتا ہے۔ وہ درحقیقت متکبر ہے۔ اس لئے کہ تواضع اونچی جگہ سے نیچے اترنے کا نام ہے۔ لہذا جب تم نے اپنے نفس کے لئے تواضع ثابت کی۔ تو تم متکبر ہو۔ (کیونکہ تم اپنی ذات کو اونچا سمجھتے ہو)۔''

میں کہتا ہوں:- تواضع:- نفس کا اس کی وضع (رکھ رکھاؤ، شان) قائم رکھنے اور گرانے میں مجاہدہ ہے۔ کیونکہ نفس بلندی چاہتا ہے۔ اور تم اس کو گرانا چاہتے ہو۔

اگر تم حقیقت میں غور کرو گے۔ اور فکر کی نظر سے دیکھو گے۔ تو تم کو یہ نظر آئے گا۔ کہ کل اشیا چیونٹی سے ہاتھی تک پیدائش اور تجلی میں تمھارے ساتھ برابر ہیں۔ کیونکہ جس ذات اقدس کی تجلی چیونٹی میں ہے، اسی کی تجلی ہاتھی میں ہے۔ لہذا تم اور کتا، پیدائش کی حقیقت میں برابر ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اہل فرق کے نزدیک تشریع اور حکمت میں فضیلت واقع ہوئی ہے (یعنی ایک مخلوق کو دوسری پر فضیلت اہل فرق کے نزدیک تشریح اور حکمت کے اعتبار سے ہے) لہذا

اہل فرق اپنے سوا دوسری مخلوق سے اپنی ذات کو افضل سمجھتے ہیں۔ لہذا جب وہ دوسری اشیاء کے ساتھ اپنا موازنہ (دو چیزوں کا وزن کرنا) کرتے ہیں۔ تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تواضع کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تکبر کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی ذات کے لئے فضیلت ثابت کی اور اپنے کو بلند اور افضل سمجھا۔ پھر انھوں نے اپنی ذات کے لئے تواضع ثابت کی۔ لہذا درحقیقت وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر تکبر کرنے والے ہیں۔۔

اور عارفین باللہ، اپنی ذات کے لئے کبھی فضیلت نہیں ثابت کرتے ہیں۔ وہ کل اشیا کو ایک مخلوق اور ایک نور کی حیثیت سے برابر سمجھتے ہیں اور وہ اپنی ذات کے لئے کوئی بلندی اور افضلیت نہیں ثابت کرتے ہیں۔ تو وہ ابتدا ہی سے تواضع کرنے والے ہیں۔ لہذا ان کی تواضع حقیقی اصلی ہے۔

اور جس شخص نے اپنے نفس کے لئے تواضع ثابت کی اور یہ دیکھا کہ اس نے اپنے مرتبے سے گر کر تواضع کی ہے۔ وہ اس حیثیت سے متکبر ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اپنے لئے زیادہ مرتبہ ثابت کیا۔ کیونکہ نفس کے لئے تواضع ثابت کرنا، اس بلندی اور فضیلت کے لحاظ سے ہے جو اس کو پہلے سے حاصل ہے۔

لہذا اے فقیر یا انسان! جب تم نے اپنے نفس کے لئے تواضع ثابت کی، تو تم حقیقتاً متکبر ہو۔ اور تم اس وقت تک تواضع کرنے والے نہیں ہو جب تک تم کل اشیا کو اپنی طرح، یا اپنے سے بہتر نہ سمجھو۔ اگر تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے۔

حضرت ابو یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- بندہ جب تک مخلوق میں کسی کو اپنے سے برا سمجھتا ہے، اس وقت تک وہ متکبر ہے۔ اور وہ اس وقت تک تواضع کرنے والا نہیں ہے، جب تک وہ اپنے لئے کوئی حال یا مقام ثابت کرتا ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- جو شخص اپنے نفس کو کتے سے افضل سمجھتا ہے، وہ متکبر اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے۔ اور بندہ جس قدر اپنے آقائے حقیقی اللہ تعالیٰ کے مرتبے کی بلندی کی حقیقت تک پہنچتا ہے، اسی قدر تواضع اختیار کرتا ہے۔ اور نفس جب تک حقیقتاً ذلت اور رسوائی سے موصوف

نہیں ہوتا ہے، اس وقت تک وہ اللہ تعالےٰ کی عظمت کا مشاہدہ نہیں کرتا ہے۔ اور چونکہ نفس کی پیدائش کی اصل، کمزوری اور ذلت اور رسوائی ہے، اس لئے اپنے اصلیت کی طرف لوٹنے ہی میں نفس کی بھلائی ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ عزت اور مرتبہ کے دیکھنے سے نجات پا جاتا ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ جس شخص نے دیکھا کہ اس کے نفس نے تواضع کیا ہے وہ تواضع کا محتاج ہے۔ اگرچہ وہ نفس سے آزاد ہو چکا ہو اور جو شخص نفس کو اس کے مرتبے سے گرا دیتا ہے، وہ تواضع کرنے والا ہو جاتا ہے۔

بسلسلہ تواضع حضور ﷺ کا ارشاد

حدیث شریف میں حضرت رسول کریم ﷺ سے روایت ہے:۔

اِنَّمَا الْكَرَمُ التَّقْوٰى ، وَ اِنَّمَا الشَّرْفُ التَّوَاضُعُ ، وَ اِنَّمَا الْغِنَى الْيَقِيْنُ ، وَ الْمُتَوَاضِعُوْنَ فِي الدُّنْيَا هُمْ اَصْحَابُ الْمَنَابِرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، اِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدِ رَفَعَهُ اللهُ اِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ ، وَ لَا يَزِيْدُ التَّوَاضُعُ لِلْعَبْدِ اِلَّا رَفْعَةً ، فَتَوَاضَعُوْا لِيَرْفَعَكُمُ اللهُ ، وَاِذَا رَاَيْتُمُ الْمُتَوَاضِعِيْنَ مِنْ اُمَّتِيْ فَتَوَاضَعُوْا لَهُمْ ، وَاِذَا رَاَيْتُمُ الْمُتَكَبِّرِيْنَ مِنْ اُمَّتِيْ فَتَكَبَّرُوْا عَلَيْهِمْ فَاِنَّ ذَالِكَ مَذَلَّةٌ لَهُمْ وَصَغَارٌ بِهِمْ

''درحقیقت کرم، تقویٰ ہے۔ اور شرف، تواضع ہے۔ اور غنا یقین ہے اور دنیا میں تواضع کرنے والے، قیامت کے دن ممبروں پر رونق افروز ہوں گے۔ جب بندہ تواضع اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالےٰ اس کو ساتویں آسمان تک بلند کرتا ہے۔ اور تواضع بندے کے مرتبے کو بلند کرتا ہے۔ لہذا تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ تا کہ اللہ تعالےٰ تمھارے مرتبہ کو بلند فرمائے۔ اور جب تم میری امت کے تواضع کرنے والوں کو دیکھو، تو تم ان کے سامنے تواضع اختیار کرو۔ اور جب تم میری امت کے تکبر کرنے والوں کو دیکھو، تو تم ان کے سامنے تکبر ظاہر کرو۔ کیونکہ ایسا کرنے میں ان کی ذلت اور توہین ہے۔''

اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:۔ میں اس شخص کے عمل کو قبول کرتا ہوں، جو میری عظمت کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اور میری مخلوق پر تکبر نہیں کرتا ہے۔

اور اپنے قلب میں میرے خوف کو لازم کر لیتا ہے اور میرے ذکر میں دن گزارتا ہے۔ اور میرے لئے اپنے نفس کو خواہشات سے روک لیتا ہے۔

کامل درجہ کی تواضع

پھر حضرت مصنفؒ نے کامل تواضع کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:-

لَیْسَ الْمُتَوَاضِعُ الَّذِیْ اِذَا تَوَاضَعَ رَایٰ اَنَّہٗ فَوْقَ مَا صَنَعَ وَلٰکِنِ الْمُتَوَاضِعُ الَّذِیْ اِذَا تَوَاضَعَ رَایٰ اَنَّہٗ دُوْنَ مَا صَنَعَ

''وہ شخص تواضع کرنے والا نہیں ہے کہ جب وہ تواضع اختیار کرے تو وہ یہ سمجھے کہ میرا مرتبہ تواضع سے بلند ہے۔ بلکہ تواضع کرنے والا وہ شخص ہے، کہ جب وہ تواضع کرے تو سمجھے کہ میرا مرتبہ تواضع سے کمتر ہے۔'' (یعنی جیسی تواضع مجھ کو کرنی چاہئے تھی ویسے میں نے نہیں کی۔)

میں کہتا ہوں:- حقیقی تواضع:- وہ ہے۔ جو اس شخص سے ظاہر ہوتی ہے، جو کل اشیاء کو اپنے سے بہتر دیکھتا ہے۔ تو جب وہ ان کے ساتھ تواضع کرتا ہے، تو وہ یہ سمجھتا ہے، کہ وہ اس سے زیادہ تعظیم کی مستحق ہیں، جتنی میں نے کی ہے۔ اور یہ کہ میرا نفس اس سے زیادہ پست اور ذلیل ہے۔ جتنی میں نے تواضع کی ہے۔

اور تواضع کرنے والا:- وہ شخص نہیں ہے، جو اپنے نفس کو دوسری اشیاء سے بہتر سمجھتا ہے کیونکہ ایسا شخص جب ان کے ساتھ تواضع کرتا ہے، تو وہ سمجھتا ہے۔ کہ میرا نفس اس تواضع سے بہتر ہے جو میں نے کی ہے۔ لہذا وہ شخص متکبر ہے۔ کیونکہ وہ اپنے نفس کے لئے ایسی تواضع ثابت کرتا ہے۔ جس کا وہ مستحق ہے۔

اور یہ حکمت، گویا کہ اپنے سے پہلے بیان کی ہوئی حکمت کی تشریح اور تکمیل ہے۔

حضرت جنیدؒ کے استاذ کی حکایت

حکایت:- حضرت جنید رضی اللہ عنہ کے استاد، حضرت شیخ ابوالحسن کرینی رضی اللہ عنہ کو ایک شخص نے کھانے کے لئے تین مرتبہ دعوت دی۔ جب وہ اس کے یہاں تشریف لے جاتے، تو وہ ان

کو واپس کر دیتا ہے۔وہ پھر لوٹ کر اس کے یہاں تشریف لاتے۔ جب وہ چوتھی مرتبہ اس کے یہاں تشریف لائے۔تو وہ ان کو اپنے گھر میں لے گیا۔اور اس کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ میں نے بار بار آپ کو واپس کیا۔لیکن آپ پھر تشریف لائے۔اس کی کیا وجہ ہے؟انھوں نے جواب دیا:۔ میرا نفس بیس سال سے ذلت و رسوائی کیلئے راضی ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کتے کی طرح ہو گیا ہے۔اس لئے جب وہ بھگا دیا جاتا ہے۔تو بھاگ جاتا ہے۔اور جب پھر بلایا جاتا ہے تو واپس آ جاتا ہے۔اور اس کے سامنے ہڈی پھینکی جاتی ہے۔تو وہ اس کو قبول کر لیتا ہے۔لہٰذا اگر تم مجھ کو پچاس مرتبہ واپس کرتے اور پھر بلاتے،تو میں ضرور آتا۔

حضرت ابوطالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ایک صوفی کے بارے میں بیان کیا گیا :۔ وہ ایک شخص کے پاس جو کھانا کھا رہا تھا،کھڑے ہو گئے۔اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا کر کہا:۔اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ عطا کرو۔اس شخص نے کہا:۔ تشریف رکھیے اور میرے ساتھ کھائیے۔اور میرے ساتھ کھائیے۔انھوں نے کہا:۔ آپ مجھ کو میرے ہاتھ میں دے دیجئے۔ اس شخص نے کھانا ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔وہ اسی جگہ کھاتے ہوئے بیٹھ گئے۔اس شخص نے ان سے اپنے ساتھ نہ بیٹھنے کا سبب دریافت کیا:۔انھوں نے جواب دیا:۔ میرا حال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذلت اور عاجزی کا ہے۔اور مجھ کو یہ پسند نہیں ہے،کہ میں اپنے اس حال کو چھوڑ دوں۔

حضرت سہروردی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ میں نے اپنے شیخ حضرت ضیاء الدین ابونجیب سہروردی رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔جبکہ وہ ملک شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔اور میں ان کے ساتھ تھا۔ایک اہل دنیا نے فرنگی قیدیوں کے سامنے ان کے لئے کھانا بھیجا۔وہ سب اپنی بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے۔جب دسترخوان بچھایا گیا۔

تو حضرت نے خادم سے فرمایا:۔ فقرا کے ساتھ قیدیوں کو بھی کھانا کھلاؤ۔لہٰذا خادم نے اُن لوگوں کو لا کر ایک صف میں دسترخوان پر بٹھا دیا۔پھر حضرت شیخ اپنے مصلّے سے اُٹھے،اور اُن کے پاس آ کر اُن لوگوں کے ساتھ اس طرح بیٹھ گئے گویا کہ وہ بھی اُنھیں لوگوں میں سے ایک شخص ہیں۔ اور اُنھوں نے اور سب قیدیوں نے کھانا کھایا۔اللہ تعالیٰ کے لئے اُن کی تواضع،اور اُن کے نفس کی

انکساری، اور فقرا اور قیدیوں کے ساتھ تکبر سے علیحدگی کی جو کیفیت اُن کے باطن میں پیدا ہوئی، وہ ہمارے سامنے اُن کے چہرۂ مبارک پر نمایاں و منکشف ہوئی۔

ایک عجیب حکایت

حضرت شیخ فقیہ عبدالرحمٰن بن سعیدؒ باعمل فقہا و علماء میں سے تھے۔ ایک دن وہ موسم سرما کی بارش میں چل رہے تھے۔ کیچڑ بہت تھی۔ اسی درمیان اُن کے سامنے اُسی راستے پر چلتا ہوا ایک کتا آیا، جس راستے پر وہ چل رہے تھے۔ جس شخص نے اُن کو اِس حال میں دیکھا ہے۔ اُس نے بیان کیا :- میں نے حضرت شیخ کو دیکھا، کہ وہ دیوار سے چمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کتے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اور اُس کے گذرنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب کُتا اُن کے قریب پہنچا۔ تو جس جگہ وہ کھڑے تھے، اُس کو چھوڑ کر اُس سے نیچے اُتر گئے۔ اور کتے کے چلنے کے لئے اوپر کا راستہ چھوڑ دیا۔ دیکھنے والے شخص کا بیان ہے :- جب کتا اُن کے سامنے سے آگے بڑھ گیا۔ تو میں حضرت شیخ کے پاس آیا۔ میں نے اُن کو اس حال میں دیکھا، کہ اُن کے جسم مبارک پر کیچڑ لگی ہوئی ہے۔ میں نے شیخ سے کہا :- یا حضرت! آپ نے اس وقت جو حرکت کی ہے اس پر مجھ کو سخت حیرت اور تعجب ہے آپ نے اپنے کو کیچڑ میں کیسے ڈالدیا۔ اور کتے کے لئے راستہ چھوڑ دیا، کہ وہ صاف ستھری جگہ میں چلے؟ حضرت شیخ نے مجھکو جواب دیا :- جب میں کتے کے لئے راستہ چھوڑ کر دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہوا۔ تو میں نے اپنے دل میں سوچا :- میں نے اپنے آپ کو کتے سے بہتر سمجھا۔ اور اُس کے اوپر اپنی فوقیت ظاہر کی ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی قسم، کتا مجھ سے بہتر، اور بزرگی کا زیادہ مستحق ہے۔ کیونکہ میں نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی ہے۔ اور میں بہت بڑا گنہگار ہوں۔ اور کتے کے پاس کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے میں کتے کیلئے اپنی جگہ نیچے اتر گیا اور اُس کے چلنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اور اب میں اللہ تعالےٰ سے اس بات کے لئے ڈرتا ہوں، کہ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھکو معاف نہ کرے۔ کیونکہ میں نے اپنے کو اُس سے بہتر سمجھا، جو مجھ سے بہتر ہے۔

اس واقعہ کو حضرت شیخ ابن عباد رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا ہے۔

بعض تواضع ،مجاہدہ اور تصنّع ہوتا ہے۔اور وہ سائرین میں سے اہل یمین کا مجاہدہ ہے۔

اور بعض تواضع ،اختیاری حقیقی ہوتا ہے۔اور وہ عارفین کی تواضع ہے۔چونکہ وہ معبود حقیقی اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے،اس لئے اُس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی ہے مگر غفلت کے وقت۔اور ایسا کم ہوتا ہے۔

اور یہی تواضع ہے جس کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

اَلتَّوَاضُعُ الْحَقِیْقِیُّ:- هُوَ مَا كَانَ نَاشِئًا عَنْ شُهُوْدِ عَظْمَتِهٖ وَ تَجَلِّيْ صِفَتِهٖ

حقیقی تواضع

”حقیقی تواضع:- وہ ہے۔جو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مشاہدے،اور اُس کی صفت کی تجلی سے پیدا ہوتی ہے۔“

میں کہتا ہوں:- حقیقی تواضع:-وہ عارفین کی تواضع ہے۔کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مشاہدے،اور اُس کی ذات وصفات کی تجلی سے پیدا ہوتی ہے۔اور واو عطف تفسیر کے لئے ہے۔ اس لئے کہ صفات کی تجلّی ہی ذات کی عین عظمت ہے۔

اور یہ اس طرح کہ:- اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اپنے قدیم ازل میں اپنی صفات کے ساتھ موصوف اور اپنے اسمائے حُسنیٰ کے ساتھ موسوم،ایسی پوشیدگی اور لطافت میں تھا کہ اُس کو کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ پھر جب اُس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ پہچانا جائے۔تو اُس نے اپنی قدرت اور ارادے سے اپنی ذات اقدس کی عظمت اپنی ازلی صفات سے موصوف حال میں ظاہر کی۔پس ذات کی عظمت کے لئے قدرت ظاہر ہوئی۔لہٰذا ذات اقدس کی عظمت کا شہود،صفات کی تجلّی کا شہود ہی ہے۔

اور اسی کی طرف عینیہ کے مصنف نے اشارہ کیا ہے:-

فَاَوْصَافُهٗ وَ الْاِسْمُ وَ الْاٰثَرُ الَّذِیْ هُوَالْكَوْنُ عَیْنُ الذَّاتِ وَ اللّٰهُ جَامِعُ

”پس اُس کے اوصاف اور اسماء اور آثار یعنی کائنات،عین ذات ہیں۔اور اللہ تعالیٰ سب کا جامع ہے۔“

لہٰذا حقیقی تواضع:-وہی ہے،جو ذات کی عظمت یعنی صفات کے نور کے مشاہدہ سے پیدا ہوتی

ہے۔اسی لئے تم عارفین کو دیکھتے ہو کہ وہ پتھر اور مٹی کے ڈھیلے اور ہر شَی کے ساتھ تواضع کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر شَی میں معرفت حاصل کرتے ہیں۔

تواضع کس طرح آتی ہے

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- جو شخص تواضع اختیار کرنا چاہتا ہے اُس کو چاہیے کہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت سے نفس پگھل کر ذلیل وحقیر ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت اور غلبہ کی طرف نظر کرتا ہے۔ اُس کے نفس کی قدرت اور غلبہ اُس سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ کل نفوس اللہ تعالیٰ کی ہیبت کے سامنے حقیر و ذلیل ہیں۔ لہذا بہترین تواضع یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے نفس کی طرف نہ دیکھے۔

حاصل یہ ہے:- حقیقی تواضع:- صرف عارفین کے لئے ہے۔ اس لئے کہ وہ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اُن سے ان کے نفوس کے اوصاف زائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وصف کے شہود کے سوا کوئی شَی نفس کے وصف سے نہیں نکال سکتی ہے۔

صفات خداوندی کا استحضار ہی نفس کی پستی سے نکال سکتا ہے

جیسا کہ مصنفؒ نے اِس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

[لَا يُخْرِجُكَ مِنَ الْوَصْفِ اِلَّا شُهُوْدُ الْوَصْفِ]

”تم کو وصف سے وصف کے شہود کے سوا کوئی شَی نہیں نکالتی ہے۔“

لہذا تم کو تمھارے نفس کے برے اوصاف سے اللہ تعالیٰ کے عظیم اوصاف کا شہود ہی نکال سکتا ہے۔ اور تم کو تمھارے نفس کی پستی سے صرف تمھارے رب تعالیٰ کے کرم کا شہود ہی نکال سکتا ہے۔ اور تم کو تمھارے حادث اوصاف کے شہود سے تمھارے رب تعالیٰ کے قدیم اوصاف کا شہود ہی نکال سکتا ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ تم کو تمھارے فعل کے شہود سے اپنے فعل کے شہود کے ذریعے، اور تمھاری

صفات کے شہود سے اپنی صفات کے شہود کے ذریعے، اور تمھاری ذات کے شہود سے اپنی ذات کے شہود کے ذریعے نکالتا ہے۔

محبت کی حقیقت کیا ہے؟

ہمارے شیخ الشیوخ حضرت قطب ابن مشیش رضی اللہ عنہ سے محبت کی حقیقت دریافت کی گئی اُن سے اُن کے مرید حضرت ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا۔ تو اُنھوں نے فرمایا:- محبت، جمال کا نور، اور جلال کا قدس ظاہر ہونے کے وقت قلب کا اُنھیں حاصل کرنا، اور چمک جانا ہے۔ اور شرب:- اوصاف کا اوصاف کے ساتھ، اور اخلاق کا اخلاق کے ساتھ، اور انوار کا انوار کیساتھ اور اسماء کا اسماء کیساتھ اور افعال کا افعال کے ساتھ مل جانا ہے۔

لہٰذا بندہ جب تک اپنے رب تعالےٰ کے اوصاف عظیم کا مشاہدہ نہیں کرتا ہے۔ اُس وقت تک اُس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اپنے نفس کے برے اوصاف سے بالکل نکل جائے۔

اور یہ کبھی اُس کے مجاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور کبھی اُس کو اُس کے اوپر عروج ونزول کے درمیان حاصل ہوتا ہے۔

بخلاف اس حال کے کہ جب وہ اپنے رب کے اوصاف کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو وہ اپنے نفس سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور اُس کا محبوب حقیقی اُس کا متولّی ہو جاتا ہے اور وہ اُس کا کان، اور اُس کی آنکھ، اور اُس کا ہاتھ، اور اُس کا پاؤں، اور اُس کا مددگار بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہ صرف اللہ تعالےٰ کے ساتھ تصرف کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:-

(وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ o)

''جو شخص اللہ تعالےٰ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے، تو اُس کی رہنمائی سیدھے راستے کی طرف کی جاتی ہے۔''

اور اسی مفہوم میں عارفین کے حسب ذیل اشعار ہیں:-

اِذَا حُزْتَ الْفَخَارَ فَلَا تُبَالِ X بِنَقْصٍ فِي الْجِبِلَّةِ اَوْ كَمَال

''جب تم نے قابل فخر شئی حاصل کر لی تو تم پیدائش میں نقص یا کمال کی پرواہ نہ کرو۔''

فَمَاالتَّانِیْثُ فِی اسْمِ الشَّمْسِ نَقْصٌ X وَ لَا التَّذْکِیْرُ فَخْرٌ فِیْ ھِلَالِ

''سورج کا نام مونث استعمال کرنا، اُس کے لئے کوئی عیب نہیں۔ اور چاند کے مذکر کہنے میں اُس کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔''

عارف شاعر اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں:- جب فنا فی الذات اور بقا باللہ ثابت ہوگئی تو نفس کے لئے نہ کوئی نقص باقی رہتا ہے، نہ کمال۔ بلکہ سب کمال صرف اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول میں فرمایا ہے:-

[اَلْمُؤْمِنُ یَشْغُلُهُ الثَّنَاءُ عَلَی اللّٰهِ عَنْ اَنْ یَّکُوْنَ لِنَفْسِهٖ شَاكِرًا ، وَ تَشْغُلُهُ حُقُوْقُ اللّٰهِ عَنْ اَنْ یَّکُوْنَ لِحُظُوْظِهٖ ذَاكِرًا ۔]

''مومن وہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی مشغولیت اِس سے غافل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے نفس کے لئے شکر گذار ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں مشغولیت اُس کو اِس سے غافل کر دیتی ہے کہ وہ نفس کے فوائد کو یاد کرے۔''

میں کہتا ہوں:- فنا کے ثابت ہو جانے کے بعد نفس کا وجود ہی نہیں رہتا ہے کہ اُس کو یاد کیا جائے۔ نہ اُس کا کوئی فعل باقی رہتا ہے کہ اُس کا شکر ادا کیا جائے۔ لہٰذا عارف کو اپنے نفس کی کچھ خبر نہیں رہتی ہے، کہ اُس کے کچھ کرنے کی خبر ہو۔ تو اُس کے کسی وصف پر اُس کے شکر ادا کرنے کا کیا ذکر۔

اُس کو اللہ تعالیٰ کے فعل کے شہود نے اپنے فعل کے شہود سے، اور اُس کے وصف کے شہود نے اپنے وصف کے شہود سے، اور اُس کی ذات کے نور کے شہود نے اپنی ذات کے شہود سے، مستغرق کر کے بے خبر کر دیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اُس کو ماسوی اللہ کی طرف توجہ کرنے سے غافل کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ کائنات میں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اس کو اُس کے نفس کے فوائد کی طرف توجہ کرنے سے غافل کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ فنا کے ساتھ نفس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ہے۔ لہٰذا فوائد اُس کے حق میں حقوق بن جاتے ہیں۔ کیونکہ عارفین جب بارگاہ الٰہی

کے آشیانے سے فوائد کی زمین کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت، اور یقین میں تمکین اور رسوخ کے ساتھ نزول فرماتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف نزول فرماتے ہیں لہذا اُن کی نظر اُس کے ماسویٰ کی طرف نہیں ہوتی ہے۔ اُن کی ارواح دنیوی، یا اُخروی، نفسانی، یا روحانی فوائد کی طلب سے نجات پا جاتی ہیں۔ اگر اُن سے کوئی عمل صادر ہوتا ہے، تو وہ اُس کو اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ اس عمل پر اللہ تعالیٰ سے کوئی معاوضہ یا کوئی غرض چاہنے میں شرم کرتے ہیں۔

بدلے کا آرزومند عاشق نہیں

جیسا کہ مصنفؒ نے اِس کو اپنے اِس قول میں بیان فرمایا ہے:-

[لَيْسَ الْمُحِبُّ الَّذِيْ يَرْجُوْا مِنْ مَحْبُوْبِه عِوَضًا وَ يَطْلُبُ مِنْهُ غَرَضًا]

''وہ شخص عاشق نہیں ہے، جو اپنے محبوب سے بدلہ پانے کی امید رکھتا ہے۔ اور اُس سے کوئی غرض حاصل ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- بلا شبہ وہ محبت جو مقاصد اور فوائد پر مبنی ہو، وہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف حاجت پوری کرنے لے لئے ہتھکنڈہ ہے۔ لہٰذا جو شخص کسی سے اس لئے محبت کرتا ہے، کہ وہ اُس کو کچھ دے، یا اُس سے کچھ دور کرے تو وہ در حقیقت صرف اپنے نفس سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اُس میں اُس کے نفس کی غرض نہ ہوتی، تو وہ اُس سے محبت نہ کرتا۔

حضرت ابو محمد رویم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- جو شخص بدلہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ تو اُس کی یہ خواہش، اُس کے محبوب کو ناراض کر دیتی ہے۔

نیز انھوں نے فرمایا:- بدلہ چاہنے والا، ایسا سوداگر ہے جو چاہتا ہے کہ اُس کو دیا جائے تا کہ وہ کچھ پائے۔ اور محبت کرنے والا تو اپنے محبوب کی محبت میں مقتول ہوتا ہے۔ وہ اُس کے سوا کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے۔

اور اسی مفہوم میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:-

بُنِیَ الْحُبُّ عَلَی الْجَوْرِ فَلَوْ----- اُنْصِفَ الْمَحْبُوْبُ فِیْهِ لَسَمَحَ

''محبت کی بنیاد ظلم پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اگر محبت میں محبوب سے انصاف طلب کیا جائے تو یہ گستاخی ہے۔''

لَیْسَ یُسْتَحْسَنُ فِیْ حُکْمِ الْهَوٰی---- عَاشِقٌ یَطْلُبُ تَالِیْفَ الْجَمِحُ

''محبت میں یہ بہتر نہیں سمجھا جاتا ہے کہ عاشق محبت کرنے والے کی دلجوئی کا مطالبہ کرے۔''

اور اُن چیزوں میں سے جو محبت اور عشق میں بہتر نہیں سمجھی جاتی ہیں، محبوب کے ظلم وستم سے رنج وغم ظاہر کرنا، یا اُس کی شکایت اور گلہ کرنا ہے۔ بلکہ محبوب کے ظلم وستم پر صبر اور برداشت کرنا واجب ہے۔ تاکہ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے۔

اور اسی کے بارے میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:-

اِنْ شَکَوْتَ الْهَوٰی فَمَا اَنْتَ مِنَّا ----اِحْمِلِ الصَّدَّ وَ الْجَفَا یَا مُعَنّٰی ۔

''اگر تم محبت میں شکایت کرتے ہو تو ہم میں سے نہیں ہو۔ اے مظلوم عاشق تم محبوب کے ظلم اور اُس کی بےتوجہی کو برداشت کرو۔''

تَدَّعِیْ مَذْهَبَ الْهَوٰی ثُمَّ تَشْکُوْا---- اَیُّ دَعْوَاكَ فِی الْهَوٰی قُلْ لِیْ اَیْنَا ؟

''تم محبت کے راستے پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہو، پھر تم شکایت کرتے ہو۔ تم مجھکو بتاؤ کہ تمھارا محبت کا دعویٰ کتنا صحیح ہے۔''

لَوْ وَجَدْنَاكَ صَابِرًا لِهَوَانَا لَاَعْطَیْنَاكَ کُلَّ مَا تَتَمَنّٰی

''اگر ہم تم کو اپنی محبت میں صابر پاتے، تو ہم تم کو وہ سب کچھ عطا فرماتے، جن کی تم آرزو کرتے ہو۔

اور ایک دوسرے عارف شاعر نے کہا ہے:-

اَلْحُبُّ دِیْنِیْ فَلَا اَبْغِیْ بِهٖ بَدْلًا وَ الْحُسْنُ مَلِكٌ مُطَاعٌ جَارَ اَوْ عَدَلَا

''محبت میرا مذہب ہے۔ میں اُس کا کوئی بدلہ نہیں چاہتا ھوں اور حسن قابل اطاعت بادشاہ ہے خواہ وہ ظلم کرے یا انصاف کرے۔

وَ النَّفْسُ عَزَّتْ وَ لٰکِنْ فِیْكَ اَبْذَلُهَا وَ الذُّلُ مُرٌّ وَ لٰکِنْ فِیْ رِضَاكَ حَلَا

''اور نفس اگر چہ پیارا ہے لیکن میں اُس کو تیری محبت میں قربان کر دوں گا۔ اور ذلت اگر چہ کڑوی ہے لیکن تیری رضامندی میں میٹھی ہو گئی ہے۔''

يَامَنْ عَذَابِىْ عَذُبٌ فِىْ مَحَبَّتِهٖ لَا اَشْتَكِىْ مِنْكَ لَا صَدًّا وَ لَا مَلَلَا۔

''اے وہ ذات جس کی محبت میں میری سختی شیریں ہو گئی ہے۔ نہ میں تجھ سے تیری بے توجہی کی شکایت کرتا ہوں، نہ رنج و غم کی۔''

محبت کی تعبیرات

اور اگر تم چاہو تو اس طرح کہو:۔ محبت:۔ بندے کے قلب میں اللہ تعالیٰ کا اس طرح قائم ہونا ہے کہ وہ اُس کے غیر کی طرف توجہ نہ کرے۔

یا محبوب کے جمال کا قلب کی محبت میں اس طرح قائم ہونا ہے کہ وہ محبوب کے سوا دوسری شئی کی طرف توجہ کرنے کی گنجائش اپنے اندر نہ پائے۔ لہذا جب کسی دوسری شئی کی طرف توجہ واقع ہوتی ہے۔ تو اُسی کے مطابق محبت میں کمی ہوتی ہے۔

چل جھوٹے

کسی شخص نے ایک عورت سے کہا:۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اُس عورت نے جواب دیا:۔ تم مجھ سے کس طرح محبت کرتے ہو۔ جبکہ تمھارے پیچھے ایک ایسی عورت موجود ہے جو مجھ سے زیادہ حسین و جمیل ہے۔ وہ شخص پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ تو عورت نے کہا:۔ اللہ تعالیٰ تم جیسے محبت کرنے والوں کو برباد کرے۔ تم میری محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے ہو۔

اسی طرح بندہ جب اپنے آقائے حقیقی کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے پھر کسی دوسری شئی کو چاہتا ہے، یا اُس کے ماسوا کسی شئی کو بہتر سمجھتا ہے، یا کچھ شکایت کرتا ہے، یا اپنے محبوب کے سوا کسی شئی سے ڈرتا ہے تو وہ محبت میں ناقص ہے۔ یا محبت کا صرف دعویٰ کرتا ہے۔ اور جو شخص ایسی شئی کا دعویٰ کرتا ہے جو اُس کے اندر نہیں ہے تو امتحان کے گواہان اُس کو ذلیل و رسوا کر دیتے ہیں۔

پھر مصنفؒ نے بدلہ کی محبت کے مدخول ہونے کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

[فَإِنَّ الْمُحِبَّ مَنْ يَّبْذُلُ لَكَ، لَيْسَ الْمُحِبُّ مَنْ تَبْذُلُ لَهٗ]

''بیشک محبت کرنے والا وہ ہے جو تمھارے لئے جان و مال کو خرچ کر دے۔ محبت کرنے والا وہ نہیں ہے، جس کے لیے تم خرچ کرو۔ یعنی جو تم سے کچھ طلب کرے۔''

محبت جان وصال کی قربانی چاہتی ہے

میں کہتا ہوں:- کسی شئی سے محبت کرنے والا وہ شخص ہے، جو اُس شئی کے لئے اپنی جان اور مال قربان کر دے۔ اور اس کی وجہ سے اس کی ہم جنس دوسری اشیاء سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اور ایسی محبت مکمل طریقے پر اُسی ذات اقدس کی شان میں درست ہے، جس نے تمھارے اوپر وسیع اور بے شمار انعامات کئے ہیں۔

پہلے اُس نے تم کو پیدا کر کے، پھر تمھاری امداد کر کے تمھارے اوپر انعام کیا۔ پھر تم کو ہر وہ شئی عطا فرمائی جو تم نے چاہی۔ اور تم کو کل عالم کا مالک بنایا۔ تم ان میں جس طرح چاہتے ہو تصرف کرتے ہو۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:-

(وَ اٰتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ)

''اور اللہ تعالےٰ نے تم لوگوں کو وہ کل چیزیں عطا فرمائی، جو تم نے اُس سے مانگی۔'' اور دوسری جگہ فرمایا:-

(خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا)

''اللہ تعالےٰ نے زمین کی کل چیزیں تم لوگوں کے لئے پیدا کی ہیں۔''

پس یہ عوام کی محبت کا سبب ہے۔

لیکن خواص کی محبت:- تو وہ اللہ تعالےٰ کے جمال اور تجلّی کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا وہ اس کے جمال کے مشاہدے میں گم ہے اور اس کی تجلی کی بارگاہ میں سرگرداں ہیں۔

اور اسی مفہوم میں ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:-

يَاسَاقِيَ الْقَوْمِ مِنْ شَذَاهُ الْكُلُّ لَمَّا سَقَيْتَ تَاهُوْا

''اے قوم کے ساقی جب تو نے محبت کی شراب پلائی تو سب مست ہو گئے۔''

غَابُوْا وَ بِالسُّکْرِ فِیْكَ طَابُوْا وَ صَرَّحُوْا بِالْهَوٰی وَ فَاهُوْا

'' وہ گم ہو گئے اور تمھارے نشے میں خوش ہوئے۔ اور محبت کی تشریح کی۔ اور محبت کی باتیں کیں۔''

تو یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی روحوں کو اپنے مولائے حقیقی کی طلب میں بیچ دیا ہے۔ پھر اُنھوں نے جو کچھ بیچا، اُس کو کم سمجھا۔ اور جو کچھ اُنھوں نے خرچ کیا، اُس پر اُنھوں نے شرم کی اس لئے اُنھوں نے اُس کے مقابلے میں کم دیا جو اُنھوں نے طلب کی۔

اسی کے بارے میں سلطان العاشقین حضرت ابن فارض رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ رُوْحِيْ فِيْ يَدِيْ وَ وَهَبْتُهَا X لِمُبَشِّرِيْ بِقُدُوْمِكُمْ لَمْ اُنْصِفِ

''اگر میری روح میرے قبضے میں ہوتی، اور میں اُسے تمھاری آمد کی خوشخبری دینے والے کو نذر کر دیتا، تو بھی میں انصاف نہ کرتا۔''

مَالِيْ سِوٰی رَوْحِيْ وَ بَاذِلُ رُوْحِهٖ X فِيْ حُبِّ مَنْ يَهْوَاهُ لَيْسَ بِمُسْرِفِ

''میرے پاس میری روح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور جس ذات اقدس سے محبت کرتا ہے، اُس کی محبت میں اپنی روح کو خرچ کرنے والا فضول خرچ نہیں ہے۔

فَلَئِنْ رَضِيْتَ بِهَا فَقَدْ اَسْعَفْتَنِيْ يَا خَيْبَةَ الْمَسْعٰی اِذَا لَمْ تُسْعِفِ

''تو اگر تم اس سے راضی ہو گئے، تو تم نے میری حاجت پوری کر دی۔

حضرت شیخ ابوعبداللہ قرشی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- محبت کی حقیقت یہ ہے۔ کہ تم اپنے کو مکمل طریقے پر اُس کو سپرد کر دو، جس کو تم محبت کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اُس میں سے تمھارے لئے کچھ باقی نہ رہے۔ بندو! تم عافیت، اور جنت، اور اعمال وغیرہ طلب کرو۔ پھر اگر بندہ کہتا ہے کہ، نہیں، میں صرف تجھ کو چاہتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- جو شخص مجھ سے یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ فوائد کے ختم کرنے، اور حدوث کے دور کرنے، اور قدم کے ثابت کرنے کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ اُس کے فنا ہونے کو واجب کرتا ہے۔

اسی مفہوم میں ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:-

مَنْ لَّمْ یَکُنْ بِكَ فَانِیًا عَنْ حَظِّهٖ وَ عَنِ الْغِنیٰ وں الْاُنْسِ بِالْاَحْبَابِ

''جو شخص تمھارے ساتھ اپنے فائدے، اور غنا، اور دوستوں کے ساتھ محبت سے فنا نہیں ہوا۔

فَلِاَنَّهٗ بَیْنَ الْمَنَازِلِ وَاقِفٌ لِمَنَالِ حَظٍّ اَوْلِحُسْنِ مَاٰبٍ

''تو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ منزلوں کے درمیان فائدہ حاصل کرنے، یا بہترین انجام کے لئے ٹھہر گیا ہے۔''

حاصل یہ ہے :- محبت کا معاملہ، بہت دشوار اور اہم ہے۔ اور اُس کا سمندر بہت خطرناک ہے۔

اسی کے بارے میں عارفین نے فرمایا ہے :- وہ لوگ ہواؤں اور طوفانوں کے سمندر میں اُس وقت تک نہیں گھسے۔ جب تک وہ خسارہ کے سمندر میں نہیں گھسے۔

محبت نفوس کے ذبح کرنے، اور مال کے ترک کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ششتری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :-

اِنْ تُرِدْ وَصْلَنَا فَمَوْتُكَ شَرْطٌ لَا یَنَالُ الْوِصَالَ مَنْ فِیْهِ فَضْلُهٗ

''اگر تم ہمارا وصال چاہتے ہو، تو اُس کے لئے تمھاری موت شرط ہے۔ وہ شخص میرے وصال کو نہیں پا سکتا جس کے اندر اُس کی کوئی فضیلت باقی ہے۔''

لہذا سائرین کی سیر، اور محبوب حقیقی کی طرف اُن کا سفر، نفوس کے ساتھ جنگ، اور اُن کے مجاہدے اور قتل ہی کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے :-

[لَوْلَا مَیَادِیْنُ النُّفُوْسِ مَا تَحَقَّقَ سَیْرُ السَّائِرِیْنَ]

''اگر نفوس کے میدان نہ ہوتے، تو سائرین کے سیر نہ واقع ہوتی۔''

میں کہتا ہوں :- میدان :- گھوڑا دوڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں نفوس کے ساتھ جنگ اور مجاہدہ کے لئے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا کبھی نفس سائر پر حملہ کرتا ہے، تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور کبھی سائر نفس پر حملہ کرتا ہے، تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی مفہوم میں ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مجذوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

سَایِسْ مِنَ النَّفْسِ جُهْدَكْ X وَ صَبِّحْ وَ مَسِّ عَلَيْهَا

لَعَلَّهَا تَدْخُلْ بِيَدِكْ X فَتَعُوْدُ تَصْطَادْ بِهَا

نفس کو رام کرنے کا طریقہ

حضرت شیخ الشیوخ رضی اللہ عنہ نے ان اشعار میں نفس کے مجاہدے کی کیفیت بیان فرمائی ہے ۔اور تم کو اُس پر غالب ہونیکی تدبیر بتائی ہے۔اور یہ اس طرح کہ تم اُس پر آہستہ آہستہ جاؤ۔لہذا تم پہلے اُس کو صرف خاموشی کی تعلیم دو۔پھر اس کے بعد اُس کو گوشہ نشینی سکھاؤ۔پھر اُس کے بعد تھوڑی تھوڑی خرابی اُس کے سامنے پیش کرو۔یعنی اس کے سامنے پہلے تھوڑا پیش کرو۔پھر جب وہ اُس سے مانوس ہو جائے، تو کچھ اور زیادہ کرو۔اسی طرح بڑھاتے رہو۔

حضرت رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

((اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللهِ اَدْوَمُهَا وَ اِنْ قَلَّ))

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام اعمال سے زیادہ پسندیدہ وہ عمل ہے، جو ہمیشہ قائم رہے، اگرچہ کم ہو لہٰذا تھوڑے عمل کو بے کار نہ سمجھے اور اس عمل کا ورد ترک نہ کردے۔جس سے نفس مرجاتا ہے۔

اور میں مجاہدہ کر رہا تھا۔کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنا ورد ترک کردوں۔تو مجھکو کائنات کے ہاتف نے آواز دی۔یہاںتک کہ بعض وقت بچوں نے مجھکو مخاطب کر کے کہا:- اے یہودی! جبکہ میں نے اپنا ورد ترک کرنے کا ارادہ کیا۔اور میں نے کئی مرتبہ جبکہ میں خراب کا استعمال کر رہا تھا۔سُنا:-اپنے آگے بڑھو۔اور کبھی یہ کہتے ہوئے سنا:-اے پہرے دار ہوشیار۔جبکہ حس ظاہر کی کوئی شئی مجھکو چرا رہی تھی۔اسی طرح برابر میں اپنے نفس کے ساتھ کرتا رہا۔اپنے نفس کے ساتھ میرا مجاہدہ سیاست اور حکمت کے ساتھ تھا۔

نفس سے کس طرح کام لیا جائے

میں نے پہلی مرتبہ نفس کو اتنا ہی بوجھ اُٹھانے کی زحمت دی، جتنا وہ برداشت کرسکتا تھا۔

پھر جب وہ اُس سے مانوس ہوگیا، تو میں اُس کو بڑھاتا گیا۔یہانتک کہ اب میں اُس کے

ساتھ جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:- نفوس پر جب فتح حاصل ہو جاتی ہے، تو سائرین کی سیر ختم ہو جاتی ہے۔لہٰذا اگر وہ نفوس پر فتح حاصل کر لیتے ہیں، تو وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔اور نفس کی اصلاح کے لئے جو سیاست اور تدبیر میں نے بیان کی ہے، وہ بالکل درست ہے۔

مباحث میں فرمایا ہے:-

وَ احْتَلْ عَلَى النَّفْسِ فَرُبَّ حِيلَةٌ X أَنْفَعُ فِي النَّصْرِ مِنْ قَبِيلَةٌ

''اور نفس کی اصلاح کے لئے تدبیر اختیار کرو۔کیونکہ اکثر اوقات تدبیر، مدد کرنے میں خاندان سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔''

لیکن اگر پہلے ہی مرتبہ اُس پر اتنا بوجھ ڈالدیا جائے جس کے اُٹھانے کی وہ طاقت نہیں رکھتا ہے۔تو وہ گر جاتا، اور پست ہمت ہو جاتا ہے۔اور اکثر اوقات وہ بالکل منحرف ہو جاتا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔

اُكْلُفُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيْقُوْنَ ، فَإِنَّ اللهَ لَا يَمِلُّ حَتّٰى تَمِلُّوْا

''تم لوگ اسی قدر عمل کی تکلیف اٹھاؤ، جس قدر برداشت کرنے کی تم طاقت رکھتے ہو۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں تھکے گا۔لیکن تم تھک جاؤ گے۔''

اور یہ بھی حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

((لَا يَكُنْ اَحَدُكُمْ كَالْمُنْبَتِّ لَا اَرْضًا قَطَعَ ، وَ لَا ظَهْرًا اَبْقٰى))

''تم میں سے کوئی شخص اس سوار کی طرح نہ ہو جس نے نہ کچھ زمین طے کی، نہ سواری کی پشت کو چھوڑا۔(یعنی تیلی کے بیل کی طرح چکر لگاتا رہا مگر اپنی ہی جگہ پر رہا)

اس حکمت کا خلاصہ

مصنفؒ نے اس حکمت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے۔اس کا حاصل یہ ہے:-

آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں:-

ایک قسم:- وہ لوگ ہیں، جن کے لئے کوئی سیر نہیں ہے۔اس لئے کہ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی

طرف نہیں ہوتی ہے۔ وہ لوگ شریعت کے ظاہر کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جتنی چیزوں کو شریعت مباح اور جائز قرار دیتی ہے۔ وہ انھیں کو اختیار کرتے ہیں۔ خواہ وہ نفس پر بھاری ہوں یا ہلکی ہوں ۔ بلکہ وہ ہلکی اور آسان چیزوں ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ انھیں چیزوں کا ارادہ کرتے ہیں، جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور ان کو آسان کر دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اپنی عادات اور خواہشات میں کچھ تبدیلی نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی عزت زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ اور ان کا مرتبہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور ان کی دنیا ترقی کرتی رہتی ہے۔ اور یہ لوگ عام مسلمان ہیں۔

دوسری قسم:- وہ لوگ ہیں، جن کے نفوس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اور ان کے اوپر شوق غالب ہوتا ہے۔ لہذا وہ بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے نفوس کے مجاہدے اور محاسبے میں مشغول رہتے ہیں۔ اس لئے ہر وہ چیز جو ان کے نفوس پر بھاری ہوتی ہے، وہ ان کو اسی میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ وہ مرتے ہیں۔ اور ہر وہ شے جو ان کے اوپر ہلکی ہوتی ہے، وہ ان کو اس سے دور رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ روتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہمیشہ اپنے نفوس کے ساتھ مجاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہانتک کہ وہ فرماں بردار اور نرم ہو جاتے ہیں۔ اب نفوس ان کے ہر ارادے میں ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

مرید چار مجاہدے اختیار کرے

لہذا مرید کے لئے

پہلا مجاہدہ:- دنیا کو ترک کرنا، یا کم کرنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ چیز باقی نہ رہے۔ جو اس کو اس کے رب سے غافل کر دے۔

دوسرا مجاہدہ:- لوگوں کو ترک کرنا، اور ان سے بھاگنا ہے۔ اس طرح کہ جن لوگوں کو پہچانتا ہے، ان سے اجنبی بن جائے اور جن لوگوں کو نہیں پہچانتا ہے، ان سے اپنا تعارف نہ کرائے۔

تیسرا مجاہدہ:- اپنی قدر و منزلت اور مرتبے کو گرا دینا ہے۔ یہانتک کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے۔ اور لوگ اس کی نگاہوں سے گر جائیں۔

چوتھا مجاہدہ:- قلب اور جسم دونوں کے اعتبار سے ذلت و انکساری اختیار کرنا ہے۔ مثلاً ننگے پاوں چلنا، اور ننگے سر رہنا۔ وغیرہ

اور نفس جب ذلت اور تواضع اور گمنامی اور فقر کے ساتھ ثابت قدمی سے قائم ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سکون حاصل کرتا، اور ان میں شیرینی محسوس کرتا ہے۔ تو مرید نفس پر غالب ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ بلکہ کل کائنات کا مالک ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:-

وَ نَفْسِكَ تَحْوِىْ بِالْحَقِيْقَةِ كُلَّهَا X اَشَرْتُ بِحَدِّ الْقَوْلِ مَا اَنَا خَادِعُ

''اور تم اپنے نفس کے ساتھ کل حقیقتوں پر حاوی ہو جاتے ہو۔ میں نے گفتگو کے پیرائے میں اشارہ کر دیا ہے۔ اور میں مکار نہیں ہوں۔''

لہذا جو شخص اپنے نفس کا مالک ہو جاتا ہے، وہ کل موجود کا مالک ہو جاتا ہے۔

لہذا اگر ان میدانوں میں نفوس کا مجاہدہ، اور ان کے ساتھ جنگ نہ ہوتی، تو سائرین کی سیر واقع نہ ہوتی۔ اس لئے کہ سائر (سیر کرنے والا) قاعد (بیٹھنے والے) سے صرف خواہش کی مخالفت اور عادات کے ختم کرنے ہی سے ممتاز ہوتا ہے۔

لہذا جس شخص نے اپنے نفس کی عادات کو ختم کر دیا۔ یہانتک کہ اس کے نزدیک عزت و ذلت، اور فقر و غنا، اور ان کے علاوہ وہ سب اشیاء برابر ہو گئیں، جو نفوس کو ناگوار اور ناپسند ہوتی ہیں۔ تو اس کی سیر ثابت ہو گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ گیا۔

اور جو شخص اپنے نفس کو ایک بال کے برابر بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے وہ نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کر سکتا ہے۔ نہ اس تک پہنچ سکتا ہے۔

منع وعطا، عزت وذلت جس کے دل میں برابر نہ ہو وہ کامل نہیں

حضرت ابوعثمان حیری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:- آدمی اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب چار چیزوں منع، اور عطا، اور عزت، اور ذلت میں برابر نہ ہو جائے۔ یعنی اس کا حال یہ ہو کہ اس کے نزدیک ذلت، عزت کی طرح؛ اور محروم کرنا، عطا کرنے کی طرح ہو جائے۔ وہ ذلت اور محرومی سے کوئی کمی نہ محسوس کرے۔

حضرت محمد بن خفیفؒ نے فرمایا ہے:- ہمارے پاس ہمارے ساتھیوں میں سے ایک صاحب آئے۔ اور کہا:- میں بیمار ہو گیا ہوں۔ اور ان کو پیٹ کی بیماری کی شکایت تھی۔ میں ان کی خدمت کر رہا تھا۔ اور ساری رات لگن لے کر ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور جب وہ پاخانہ کرتے، تو میں اسے لے جا کر پھینکتا تھا۔ حضرت محمد بن خفیف نے بیان فرمایا:- ایک مرتبہ مجھے نیند کی جھپکی آ گئی۔ (یعنی میں اونگھ گیا) تو انھوں نے مجھ سے فرمایا: تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ تم سو رہے ہو۔ حضرت محمد بن خفیف سے دریافت کیا گیا:- جب اس نے کہا:- ''تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو'' اس وقت آپ نے اپنے نفس کو کیسا پایا۔ انھوں نے جواب دیا:- مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہے ہیں:- اللہ تعالیٰ تمھارے اوپر رحمت نازل کرے۔

حکایت ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا ہے:- میں مسلمان ہونے کی حالت میں صرف تین مرتبہ خوش ہوا۔

ایک مرتبہ:- میں دریائی جہاز میں سوار ہو کر سفر کر رہا تھا۔ اس میں ایک شخص قصہ بیان کرتا تھا اور لوگ ہنس رہے تھے، وہ بیان کر رہا تھا:- میں نے ایک مرتبہ ترکوں کی جنگ میں ایک گدھا دیکھا۔ پھر کہتا تھا:- اس طرح۔ اور یہ کہہ کر میری داڑھی پکڑتا تھا۔ اور اپنا ہاتھ میرے حلق کی طرف بڑھاتا تھا۔ لوگ یہ دیکھ کر ہنستے تھے۔ اور اس جہاز میں اس کے خیال میں مجھ سے زیادہ چھوٹا اور حقیر کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت سے میں بہت خوش ہوا۔

دوسری مرتبہ:- میں بیٹھا ہوا تھا، کہ ایک شخص آیا، اور مجھکو طمانچہ مارا۔

تیسری مرتبہ:- میں بیٹھا ہوا تھا، کہ ایک شخص آیا، اور میرے اوپر پیشاب کر دیا۔

دل سے خواہش دور ہونے کی حقیقت؟

ایک عارف نے فرمایا ہے:- قلب سے خواہش کے دور ہونے کی حقیقت:- اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خواہش ہر وقت اور ہر حالت میں غیر اختیاری طور پر ہونا ہے۔

لہٰذا مرید جب اپنے اندر یہ علامات پائے، تو وہ سمجھ لے کہ وہ اپنے جنس کے عالم سے نکل گیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں پہنچ گیا ہے۔ اور اب وہ شاعر کے اس قول کی طرح ہو گیا ہے:-

لَكَ الدَّهْرُ طَوْعًا وَ الْاَنَامُ عَبِيْدُ X فَعِشْ كُلُّ يَوْمٍ مِنْ اَيَّامِكَ عِيْدُ

''زمانہ تمھارے موافق، اور مخلوق غلام ہے۔ لہذا تم اس طرح زندگی گذارو کہ تمھاری زندگی کا ہر دن عید کا دن ہے۔

اور جیسا کہ سیدی حضرت ابوالعباس بن عریفؒ نے اسی مفہوم میں فرمایا ہے:۔

بَدَا لَكَ سِرٌّ طَالَ عَنْكَ اكْتِتَامُهٗ X وَ لَاحَ صَبَاحٌ كُنْتَ اَنْتَ ظَلَامُهٗ

''تمھارے اوپر وہ راز ظاہر ہوا، جو مدت دراز تک تم سے پوشیدہ تھا۔ اور وہ صبح نمودار ہوئی، جس کی تاریکی تم تھے۔''

فَاَنْتَ حِجَابُ الْقَلْبِ عَنْ سِرِّ غَيْبِهٖ X وَ لَو لَاكَ لَمْ يُطْبَعْ عَلَيْهِ خِتَامُهٗ

''قلب کا حجاب اس کے غیب کے راز سے تم ہو۔ اور اگر تم نہ ہوتے، تو غیب کے راز پر اس کی مہر نہ لگتی ''

فَاِنْ غِبْتَ عَنْهُ حَلَّ فِيْهِ وَ طَنَّبَتْ عَلٰى مَرْكَبِ الْكَشْفِ الْمَصُوْنِ خِيَامُهٗ

''لہذا اگر قلب سے تم غائب ہو جاؤ۔ تو اس میں کشف کی سواری پر مضبوط محملوں میں محفوظ حالت میں راز جلوہ گر ہوگا۔''

وَ جَاءَ حَدِيْثٌ لَا يُمَلُّ سَمَاعُهٗ X شَهِيٌّ اِلَيْنَا نَثْرُهٗ وَ نِظَامُهٗ

''اور ایسی بات آئے گی، جس کے سننے سے آدمی اکتاتا نہیں ہے اور اس کی نثر اور نظم دونوں ہمیں پسند ہیں۔''

اِذَا سَمِعَتْهُ النَّفْسُ طَابَ نَعِيْمُهَا X وَ زَالَ عَنِ الْقَلْبِ الْمُعَنّٰى غِرَامُهٗ

''نفس جب اس کو سنتا ہے، تو اس کی نعمت مزے دار ہو جاتی ہے۔ اور پریشان قلب سے اس کی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔''

اور اگر مرید اپنے اندر یہ مذکورہ بالا علامات نہ پائے، تو اس کو چاہیے کہ برابر اپنی سیر میں مشغول رہے۔ اور گھبراہٹ اور غفلت و کاہلی میں نہ مبتلا ہو۔ کیونکہ جو شخص اپنے مقصد کو پہچان لیتا ہے۔ اس کے لئے دوسری اشیاء کا چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔

اور یہ کلام صرف ان لوگوں کے لئے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ خوش نصیبی سے شیخ تربیت تک پہنچا دیتا ہے لیکن جو شخص شیخ تربیت تک نہیں پہنچا، وہ کبھی سیر کی خواہش نہ کرے۔ اگرچہ اس نے کل علوم حاصل کر لئے ہوں اور تمام گروہوں کی صحبت اختیار کی ہو۔ اور سیر ذوق کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کسی کو غرق نہیں کرسکتا۔

میں نے بہت نمازیں پڑھیں، بہت روزے رکھے، گوشہ نشینی بھی زیادہ اختیار کی، اور ذکر بھی بکثرت کیا۔ اور قرآن مجید کی تلاوت بھی کثرت سے کی۔ لیکن اللہ کی قسم، ہم کو اپنے قلوب کی معرفت نہیں حاصل ہوئی۔ نہ ہم حقیقت کی شیرینی چکھ سکے۔ یہاں تک کہ ہم نے اہلِ حقیقت، اللہ والوں کی صحبت اختیار کی تو انھوں نے ہم کو تکلیف سے نکال کر آرام میں، اور آمیزش سے نکال کر صفائی میں، اور انکار سے نکال کر معرفت میں پہنچایا۔

اس پر اگر تم یہ اعتراض کرو:- حضرت حضرمی نے فرمایا ہے:-اس زمانہ میں شیخ کامل کی تربیت ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ شیخ کامل کا وجود باقی نہیں ہے۔ اور ہمت اور حال کے سوا کچھ باقی نہیں ہے لہذا تم صرف کتاب وسنت پر عمل کرنا، اپنے اوپر لازم کرو۔

تو میرا جواب یہ ہے:- حضرت حضرمی نے جو فرمایا ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ شیخ تربیت کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ حاشا للہ، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ حضرت حضرمی اللہ تعالیٰ پر حکم قائم کریں۔ اور اس کی قدرت کو عاجز سمجھیں۔ بلکہ ان کے اس طرح کہنے کا مقصد یہ ہے:- ان کے زمانے میں بہت سے جھوٹا دعویٰ کرنے والے پیدا ہو گئے تھے۔ لہذا انھوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو ان جھوٹے مدعیوں سے بچانے کے لئے ایسا فرمایا ہے۔ ورنہ حضرت حضرمی اور حضرت زروق رضی اللہ عنہما کی معرفت ہی اس مقصد کی نفی کرتی ہے۔

اور بالفرض، اگر ان دونوں حضرات کے قول کا یہی مقصد ہو۔ تو وہ دونوں حضرات معصوم نہیں ہیں۔ ہر شخص کا کلام رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور قبول بھی کیا جا سکتا ہے۔ صرف صاحب رسالت ﷺ کا کلام ایسا ہے، جس کا قبول کرنا ہر حال میں لازمی ہے۔ اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

اور حضرت حضرمی کے بعد بہت سے اہل اللہ ہوئے ہیں جو حال اور کلام اور ہمت کے اعتبار

سے تربیت نبویہ کے اہل میں سے تھے۔ لہذا ان کا نہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور ہمارے اس زمانے میں بھی ایسے حضرات موجود ہیں، جو تربیت کے اہل ہیں۔ اور وہ اس طرح مشہور ہیں جیسے پہاڑ کی چوٹی پر آگ بہت دور تک دکھائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے وسیلے سے بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ اور ان کی تربیت سے اتنے لوگ اولیاء اللہ ہوئے، جن کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کی معرفت عطا کر کے احسان فرمایا ہے۔

مصنف ؒ نے لطائف المنن میں فرمایا ہے :- پیروی اس ولی کی ہوتی ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی فرمائے۔ اور تم کو اس کی اس خصوصیت سے آگاہ فرمائے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سپرد فرمائی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی بشریت کا مشاہدہ تم سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔ اور اس کی خصوصیت کے وجود سے تم کو آگاہ کر دیتا ہے۔ لہذا تم اس کو اپنا رہنما بنا لیتے ہو۔ پھر وہ تم کو رشد و ہدایت کی راہ پر چلاتا ہے۔ اور تم کو تمہارے نفس کی رعونتوں، اور دفینوں، اور پوشیدگیوں، اور باریکیوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر جمع کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہے۔ اور تم کو ماسوی اللہ سے بھاگنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وہ تمہارے راستے میں تمہارے ساتھ چلتا ہے۔ یہاںتک کہ تم اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاؤ۔

وہ تم کو تمہارے نفس کی برائی سے آگاہ کراتا ہے۔ اور تم کو اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی پہچان کراتا ہے، جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ لہذا نفس کی برائی سے تمہاری آگاہی، تم کو نفس سے بھاگنے، اور اس کی طرف توجہ نہ کرنے کا فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسان کی معرفت، تم کو اس کی طرف سبقت کرنے، اور اس کے شکر کے ساتھ قائم ہونے، اور ہمیشہ اس کے سامنے اوقات گذارنے کا فائدہ پہنچاتی ہے۔

مذکورہ اوصاف کے مشائخ کہاں ہیں؟

پھر اگر تم یہ کہو:- وہ حضرات کہاں ہیں جن کے اوصاف یہ ہیں جو آپ نے بیان فرمائے ہیں؟ آپ نے مغرب کے عنقا سے بھی زیادہ کمیاب شے کی طرف میری رہنمائی کی ہے۔

تو تم یہ معلوم کرو کہ تم کو رہنمائی کرنے والوں کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تم کو ان کی

طلب میں سچائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تم سچی طلب پیدا کرو، تو تم کو مرشد مل جائے گا۔ اور تم اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

(أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ)

''کون ہے جو پریشان محتاج کی دعا قبول کرتا ہے، جب وہ اس سے دعا کرتا ہے''

اور دوسری جگہ فرمایا:-

(فَلَو صَدَقُوْا اللهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ)

''پس اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے سچائی اختیار کرتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔''

لہذا اگر تم اس شیخ کی تلاش میں جو تم کو اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے، اس طرح پریشان اور حاجتمند ہوتے، جس طرح پیاسا پانی کے لئے، اور خوف زدہ امن کے لئے پریشان اور حاجتمند ہوتا ہے تو تم اس کو اپنی طلب سے زیادہ اپنے قریب پاتے۔ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کو پانے کے لئے اسی طرح حاجتمند اور پریشان ہوتے، جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پانے کے لئے حاجتمند اور پریشان ہوتی ہے تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سے قریب، اور اپنے لئے جواب دینے والا پاتے۔ اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اپنے لئے آسان پاتے، اور اس کے آسان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر توجہ کرتا۔

حضرت شیخ ابن عبادؒ نے فرمایا ہے:- مصنفؒ کے کلام میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ شیخ تربیت کا حاصل ہونا مرید کے لئے اللہ تعالیٰ کی بخششوں اور ہدیوں میں سے ہے جبکہ وہ اپنی ارادت میں سچا ہو اور اپنے مولائے حقیقی کی طلب میں اپنی کوشش صرف کر رہا ہو۔

نہ کہ اس شخص کے گمان کے مطابق جس کو یہ علم ہی نہیں ہے، کہ مولائے حقیقی کی طلب میں سچائی اور کوشش شرط ہے۔

پھر حضرت ابن عبادؒ نے فرمایا:- اور اس وقت اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ ادب استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جب وہ اس کو اس کے اعلیٰ مرتبے اور بلند درجے کا مشاہدہ کرائے

تمہارا شیخ کون ہے؟

نیز حضرت مصنفؒ نے لطائف المنن میں فرمایا ہے:-

تمہارا شیخ وہ نہیں ہے جس سے تم نے سنا۔ بلکہ تمہارا شیخ وہ ہے جس سے تم نے حاصل کیا۔

تمہارا شیخ وہ نہیں ہے جس کا کلام تم کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ بلکہ تمہارا شیخ وہ ہے جس کا اشارہ تمہارے اندر سرایت کر جائے۔

تمہارا شیخ وہ نہیں ہے جو تم کو دروازے کی طرف بلائے۔ بلکہ تمہارا شیخ وہ ہے جو تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب دور کر دے۔

تمہارا شیخ وہ نہیں ہے جس کا قول تم کو متوجہ کر دے۔ بلکہ تمہارا شیخ وہ ہے جس کا حال تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرا دے۔

تمہارا شیخ وہی ہے، جو تم کو خواہش کے قید خانے سے نکال کر مولائے حقیقی کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ تمہارا شیخ وہی ہے، جو ہمیشہ تمہارے قلب کے آئینے کو صاف کر کے چمکاتا رہے یہانتک کہ اس میں تمہارے رب تعالیٰ کے انوار جلوہ گر ہو جائیں۔ وہ تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف کوچ کرائے، تو تم اس کی طرف کوچ کر جاؤ۔ وہ تم کو سیر کرائے، یہانتک کہ تم اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ ہمیشہ تمہارے سامنے رہے، یہانتک کہ وہ تم کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دے پھر وہ تم کو بارگاہ کے نور میں پہنچا کر فرمائے:- ''لو اب تم ہو، اور تمہارا رب ہے''

اور یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سیر مجازی ہے۔ یعنی تعلقات اور قاطعات کے ختم کرنے کا نام سیر ہے۔ ورنہ حقیقت ویسی ہی ہے، جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے:-

[لَا مَسَافَةَ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ حَتَّى تَطْوِيهَا ، وَ لَا قِطْعَةَ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ حَتَّى تَمْحُوهَا وَصْلَتُكَ]

''تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، جس کو تم طے کرو۔ اور تمہارے اور اس کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جس کو تمہارا پہنچنا دور کر دے۔''

میں کہتا ہوں:- یہاں یہ سوال بحث سے مقدر ہے:- گویا کہ کسی شخص نے مصنفؒ سے سوال کیا:- کیا ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی فاصلہ ہے۔ جس کے طے کرنے کے لئے اس کی طرف سائرین کی سیر واقع ہوتی ہے؟ مصنفؒ نے جواب دیا:- تمھارے اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ مگر کثیف نفس کا حجاب، اور قلب کے دنیاوی تعلقات۔ لہذا نفس کی عادات کے خلاف کرنا، اور اس کی خواہشات کو ختم کرنا، اور تعلقات اور قاطعات کو منقطع کرنا:- یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سیر ہے۔ لہذا جس شخص نے نفس کی عادات کے خلاف کیا، اس کے اوپر سے ظلمانی حجابات دور ہو گئے۔ اور جس نے قلب کے تعلقات کو ختم کیا اس کے اوپر علوم ربانی کا فیضان ہوا۔ اور اس کے اوپر عرفان کے سورج روشن ہو گئے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے۔ لہذا تمھارے اور اس کے درمیان کوئی محسوس فاصلہ نہیں ہے۔ جس کی تمھاری سیر طے کرے۔ اور تمھارے اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ جس کو تمھارا پہنچنا دور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

(وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدُ O)

''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ اور اس کا نفس اس کے اندر جو وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ ہم اس کو جانتے ہیں۔ اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

لہذا ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان صرف ہمارے نفس کے وجود کا وہم حائل ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی دوسری شَی حائل نہیں ہے۔ لہذا اگر ہم نفس سے گم ہو جائیں۔ تو ہم اپنے کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پائیں گے۔ اور نفس سے گم ہونا، اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک وہ مردہ نہ ہو جائے۔ اور اس کی موت، اس کی عادات کی مخالفت میں ہے۔

حضرت شیخ ابو مدینؒ نے فرمایا ہے:- جو شخص مرتا نہیں ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھتا ہے۔

اور حضرت شیخ ابو العباس صدسیؒ نے فرمایا ہے :- اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داخل ہونے کے لئے صرف دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ فنائے اکبر ہے۔ یعنی طبعی موت۔ دوسرا دروازہ فنائے اصغر ہے۔ جس کو حضرات صوفیائے کرامؒ مراد لیتے ہیں۔

اور ایک عارف نے فرمایا ہے:- انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس وقت تک نہیں داخل ہوتا ہے جب تک وہ چار موتوں سے نہ مر جائے۔

پہلی، سرخ موت:- اور وہ نفس کی مخالفت ہے۔

دوسری، سیاہ موت:- اور وہ مخلوق کی ایذا رسانی کو برداشت کرنا ہے۔

تیسری، سفید موت:- اور وہ فاقہ کرنا ہے۔

چوتھی، نیلی موت:- اور وہ گدڑیوں کا پہننا ہے۔

حضرت ششطیؒ نے فرمایا ہے:- تم یہ جان لو۔ کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ایسا نہیں ہے، جس میں کوئی جنگل اور میدان ہو، یا کوئی بھلا دینے والا مقام ہو۔ بلکہ وہ منزلیں اور احوال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر منزل اور ہر حال کے لئے معین و مددگار بنا دئے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ اور اپنے بندے کی مدد کرتا ہے۔ اور تنہا مخالف جماعتوں کو شکست دیدیتا ہے۔

اور میدان اور فاصلے:- صرف مرغوب اشیاء کی طرف مائل ہونے، اور عادتوں کی پیروی کرنے، اور نفس کے ساتھ صلح کرنے، اور حس اور عقل اور وہم کے ساتھ ٹھہر جانے میں ہے۔ اور حجاب اٹھ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا راستہ واضح ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ مباحث اصلیہ میں مصنف نے فرمایا ہے:-

وَ اِنَّمَا الْقَوْمُ مُسَافِرُوْنَ X لِحَضْرَةِ الْحَقِّ وَ ظَاعِنُوْنَ

''اور درحقیقت صوفیائے کرام مسافر ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف سفر کر رہے ہیں۔''

فَافْتَقَرُوْا فِيْهَا اِلٰى دَلِيْلٍ X ذِىْ بَصَرٍ بِا لسَّيْرِ وَ الْمَقِيْلِ

''لہذا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے کے لئے ایسے صاحب بصیرت رہنما کے محتاج ہیں جو سیر اور سکون کی حالت سے آگاہ ہو۔''

قَدْ سَلَكَ الطَّرِيْقَ ثُمَّ عَادَ X لِيُخْبِرَ الْقَوْمَ بِمَا اسْتَفَادَ

''جس نے راستہ طے کیا ہو۔ پھر لوٹ آیا ہو۔ تا کہ جو فوائد اس نے حاصل کئے ہیں، ان سے صوفیائے کرام اور طالبین کو آگاہ کرے۔''

نیز حضرت شطیبی نے فرمایا ہے:- آدمیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو مجاہدہ مشاہدے سے روک دیتا ہے۔ تو ان کے اوپر احوال غالب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے اور آخری منزل کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔

اور مخلوق کے راستے جدا جدا ہیں۔ ہر شخص ایک ہی راستے پر نہیں چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

(لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور راستہ بنا دیا ہے۔''

(وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ)

''اور ہر شخص کے لئے ایک طرف اور قبلہ ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا ہے۔ لہذا تم لوگ نیکیوں میں سبقت کرو۔''

اور ہر شخص اسی طرف سے گذرتا ہے، جس طرف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو مخصوص کیا ہے۔

اور اسی وجہ سے کتابیں دیکھنے سے بہت سے مسلک نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمتیں مختلف ہونے کی وجہ سے مسلکوں کی زیادتی ہوگئی ہے۔

خاص کردہ لوگ جن کی طبیعت ظاہری علم پر پیدا کی گئی ہے۔ وہ لوگ سب لوگوں سے زیادہ سیدھے راستے سے دور ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ دروازہ کھول کر ان کی دستگیری نہ فرمائے۔

کیونکہ شریعت سراپا حکمت ہے۔ اور اس کے ماتحت بہت سی حکمتیں ہیں۔ لہذا جو شخص ان کو نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے باغیچے میں پھول تو آتے ہیں، مگر پھل نہیں لگتے ہیں۔

اور اسی بنا پر انکار (اعتراض و اختلاف) واقع ہوا ہے۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے علمائے ظاہر کے ہاتھوں بہت سے صوفیائے کرام رضی اللہ عنہم کا امتحان لیا۔ جبکہ علمائے ظاہر نے کفر و بے دینی، اور بدعت و گمراہی کے ساتھ صوفیائے کرام کو منسوب کیا۔ اور خصوصیت کے سر کا لازمی تقاضا یہی ہے:-

(سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً ○)

''یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے، جو پہلے بھی گذر چکی ہے۔اور تم اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے۔''

(وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلاً وَ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَايَلْبِسُوْنَ)

''اور اگر ہم کسی فرشتے کو رسول بناتے ،تو اس کو بھی آدمی ہی بنا کر بھیجتے ۔اور ہم ان لوگوں پر وہ شے مشتبہ کر دیتے ،جس کو وہ مشتبہ کر رہے ہیں۔''

اور پہلی امتیں اسی قول کے باعث ہلاک ہوئیں:-

(اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَ نَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○)

'' ہم نے اپنے آباواجداد کو ایک راستے پر پایا۔اور ہم انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔''

لہذا حاصل یہ ہوا:- انسان جب نفس کے ساتھ اس کے میدان میں چکر لگا تا ہے۔ پھر وہ اس کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ یہاںتک کہ وہ اس کو درست کر لیتا ہے۔اور اس کو ان اوصاف سے جو اس کو رد کرنے والی ہیں، پاک کر لیتا ہے۔تو اس وقت اس کا نفس اپنی اصل کی طرف رجوع کرتا ہے۔اور اس کا اصلی مقام بارگاہ الٰہی ہے۔جس میں وہ مقیم تھا۔اس لئے کہ نفس اور بارگاہ الٰہی کے درمیان ظلمانی حجابوں کے سوا کوئی شے حائل نہیں ہے۔لہذا جب وہ ظلمانی حجابات سے نکل جاتا ہے تو وہ ظلمانی جسم میں روشن نور بن کر اپنی اصل کی طرف لوٹتا ہے۔لہذا وہ اس کے نزدیک ایسا پوشیدہ یاقوت بن جاتا ہے۔جس کو مخلوق کی سیپیاں ڈھانپے ہوتی ہیں۔

جیسا کہ مصنف نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

[جَعَلَكَ فِي الْعَالَمِ الْمُتَوَسِّطِ بَيْنَ مُلْكِهٖ وَ مَلَكُوْتِهٖ ، لِيُعَلِّمَكَ جَلَالَةَ قَدْرِكَ بَيْنَ مَخْلُوْقَاتِهٖ ، وَ اَنَّكَ جَوْهَرَةٌ تَطْوِيْ عَلَيْهَا اَصْدَافُ مُكَوَّنَاتِهٖ]

''اللہ تعالیٰ نے تم کو عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان عالم متوسط میں بنایا ہے۔تا کہ وہ اپنی مخلوقات کے درمیان تمھارے مرتبے کی بزرگی تمھارے اوپر واضح کرے۔اور تم کو یہ معلوم کرائے، کہ تم ایک ایسا جوہر یعنی موتی ہو جس کو مخلوقات کی سیپیاں ڈھانپے ہوئے رہتی ہیں۔''

انسان کائنات کا خلاصہ ہے

میں کہتا ہوں:- اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کو بڑی عظمت و بزرگی عطا فرمائی ہے۔ اور اس کو کائنات کا منتخب خلاصہ بنایا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ جمع ہے جو اس کے علاوہ کسی مخلوق میں جمع نہیں ہے۔ اس میں عالم ملک و عالم ملکوت، اور نور و ظلمت، اور غیب و شہادت، اور عالم علوی و عالم سفلی، اور قدرت و حکمت، اور ظاہر و باطن سب موجود ہیں۔

لہذا اے انسان! اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے عالم ملک یعنی تمھاری بشریت، اور اپنے عالم ملکوت یعنی تمھاری روحانیت کے درمیان عالم متوسط میں پیدا کیا ہے۔

یا تم اس طرح کہو:- اپنے ملک یعنی عالم اجسام، اور اپنے ملکوت یعنی عالم ارواح کے درمیان پیدا فرمایا ہے۔ لہذا اے انسان! تم صرف ملک نہیں ہو۔ کہ تم جانوروں اور پتھروں کی طرح ہو جاؤ اور نہ تم صرف ملکوتی ہو۔ کہ فرشتوں کی طرح ہو جاؤ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ملک اور ملکوت سے مرکب بنایا ہے تاکہ مجاہدہ اور مشاہدہ کے ذریعے تمھاری بزرگی اور افضلیت ظاہر ہو۔ اور اسی وجہ سے تم خلافتِ الھیہ کے ساتھ مخصوص کئے گئے۔ اور امانت ربانی اٹھانے کے لئے آگے بڑھے۔ پھر تم نعیم جنت اور دیدار الٰہی کی بخششوں سے سرفراز کئے جاؤ گے۔

پھر انسانوں کی دو قسمیں ہیں:-

ایک قسم:- وہ لوگ ہیں، جن کی بشریت ان کی روحانیت پر، اور ان کا ملک ان کے ملکوت پر، اور ان کی ظلمت ان کے نور پر غالب ہے۔ لہذا وہ لوگ مخلوق کی ظلمت میں باقی ہیں، اور شہود و عیاں سے روک دئے گئے ہیں۔ اور وہ لوگ عام مسلمان ہیں۔

دوسری قسم:- وہ لوگ ہیں، جن کی روحانیت ان کی بشریت پر، اور ان کا نور ان کی ظلمت پر، اور ان کا ملکوت ان کے ملک پر غالب ہے۔ اور وہ خواص عارفین سائرین ہیں۔ جو میدان جنگ میں اپنے نفوس کے ساتھ مجاہدہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کر رہے ہیں۔

اور ان سائرین میں سے سابقین (سبقت کرنے والے) مقربین ہیں۔ اور ان میں سے لاحقین محبین ہیں۔ اور ہر ایک اپنی سچائی کے مطابق اپنے مولائے حقیقی کی محبت میں سرگرم و مشغول

ہے۔

حضرت مصنفؒ کے کلام کا ظاہری مفہوم یہ ہے، کہ انسان بشریت اور روحانیت سے علیحدہ ایک زائد یعنی جداگانہ شئے ہے۔ کیونکہ انھوں نے فرمایا ہے:۔" اللہ تعالیٰ نے تم کو ملک یعنی بشریت اور ملکوت یعنی روحایت کے درمیان عالم متوسط میں بنایا ہے۔"

اس کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ دونوں کے درمیان ایک مستقل شے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ لہذا وہ بذات خود عالم متوسط ہے۔ یعنی ملک اور ملکوت سے مرکب ہے۔

لہذا اگر مصنفؒ اس طرح فرماتے:۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان عالم متوسط بنایا ہے۔" تو مفہوم آسانی سے سمجھ میں آتا۔ یعنی یہ کہ تم نہ صرف ملک ہو، اور نہ صرف ملکوت ہو۔ بلکہ تم کو دونوں کے درمیان متوسط یعنی دونوں سے مرکب بنایا ہے۔

جیسا کہ حضرت رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے:۔

((کُنْتُ نَبِیًّا وَ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ))

"میں اس وقت نبی تھا۔ جبکہ آدم (علیہ السلام) پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔"

یعنی آدم علیہ السلام پانی اور مٹی سے روح کے بغیر مرکب تھے۔

لہذا مصنفؒ کی عبارت اس بارے میں ایک رمز اور باریک اشارہ ہے۔ اور ہمارا علم تصوف سب کا سب اشارہ ہے۔

اور تم کو ملک اور ملکوت کے درمیان اس لئے بنایا ہے۔ تاکہ تم کو تمھارے مرتبے کی بزرگی، اور تمھاری حقیقت کی بلندی سے آگاہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

(وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ)

"اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:۔

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ O)

''ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔''

اور تا کہ تم کو یہ معلوم کرائے کہ تم ایک بہترین جوہر یعنی قیمتی موتی ہو جو بہترین سیپ کے اندر محفوظ ہے۔ اور وہ سیپ یہ ساری کائنات ہے۔ لہذا اس کی مخلوقات کی سیپیاں عرش سے فرش تک تم کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔

لہذا اے انسان! تم سیپ کے اندر یاقوت کی طرح ہو۔ زمین تم کو اٹھائے ہوئے اور آسمان تمھارے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور اطراف تمھاری حفاظت کر رہے ہیں۔ اور جانور تمھاری خدمت کرتے اور تم کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور جمادات تمھارے دشمنوں کو تم سے دور کرتے ہیں۔ اور تم ان سب کے بیچ میں ہو۔ آسمان تمھارے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اور سورج اور چاند اس زمین کو روشن کرتے ہیں جس میں تم ہو۔ لہذا تم سیپ کے قیمتی موتی، اور مخلوقات کا خلاصہ ہو۔ اور کل مخلوق کی گردش کا محور تم ہو۔

حضرت ابوالعباس مرسیؒ نے فرمایا ہے:- کل مخلوق تمھارے فرماں بردار غلام ہیں۔ اور تم اللہ تعالیٰ کے غلام ہو۔

بعض آسمانی کتابوں میں وارد ہوا ہے:- اے آدم کی اولاد میں تمھاری لازمی تدبیر ہوں۔ لہذا تم اپنی تدبیر مضبوطی سے اختیار کر لو۔

اور بعض آثار میں اللہ عزوجل سے روایت ہے:- اے آدم کی اولاد! میں نے کل اشیا تمھارے لئے پیدا کی ہے۔ اور تم کو اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ لہذا جس کے لئے تم پیدا کئے گئے ہو، تم اس کو چھوڑ کر ان اشیاء میں نہ مشغول ہو جو تمھارے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

صوفیائے کرام نے انسان کے عجائب کے بارے میں بیان فرمایا ہے:- کل موجودات انسان کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اور وہ عالم اکبر کا ایک نسخہ ہے۔

اسی مفہوم میں یہ اشعار ہیں۔ جو حضرت ابوالعباس مرسیؒ کی طرف منسوب ہیں:-

یَاتَائِهًا فِي مَهْمَهٍ عَنْ سِرِّهٖ X اُنْظُرْ تَجِدْ فِيْكَ الْوُجُوْدَ بِاَسْرِهٖ

''اے اپنے راز کے میدان میں سرگرداں و پریشاں! تو غور کر۔ تو اپنے اندر کل موجودات کو پائے

گا۔''

اَنْتَ الْکَمَالُ طَرِیْقَۃٌ وَ حَقِیْقَۃٌ X یَا جَامِعًا سِرَّ الْاِلٰہِ بِاَسْرِہٖ

''طریقت اور حقیقت کے اعتبار سے، اے تمام اسرار الٰہی کے جامع! تو ہی کمال ہے۔''

اور مباحث میں فرمایا ہے:- ؎

یَا سَابِقًا فِی مَوْکَبِ الْاِبْدَاعِ X وَ لَاحِقًا فِی جَیْشِ الْاِخْتِرَاعِ

'' اے پیدائش کی سواری پر پہلے سوار ہونے والے، اور ایجاد کے لشکر میں پہلے شامل ہونے والے۔''

اِعْقِلْ فَاَنْتَ نُسْخَۃُ الْوُجُوْدِ X لِلّٰہِ مَا اَعْلَاکَ مِنْ مَوْجُوْدٍ

''تو اس کو بخوبی سمجھ لے کہ تو اللہ تعالیٰ کے کل وجود کا نسخہ ہے: اس نے تم کو کل موجود سے کتنا اعلیٰ و افضل بنایا ہے۔''

اَلَیْسَ فِیْکَ الْعَرْشُ وَ الْکُرْسِیُّ X وَ الْعَالَمُ الْعُلْوِیُّ وَ السُّفْلِیُّ

''کیا تیرے اندر عرش و کرسی، اور عالم علوی و سفلی نہیں ہے۔''

مَا الْکَوْنُ اِلَّا رَجُلٌ کَبِیْرٌ X وَ اَنْتَ کَوْنٌ مِثْلُہٗ صَغِیْرٌ

''عالم ایک بڑا آدمی ہے۔ اور تو اسی کی طرح ایک چھوٹا عالم ہے۔''

میں کہتا ہوں:- انسان عالم کا ایک نسخہ ہے۔ یا ایک چھوٹا عالم ہے۔ اس وقت تک۔ جب تک کہ اس کی روحانیت اس کی بشریت پر، اور اس کا باطن اس کے ظاہر پر، اور اس کا نور اس کی ظلمت پر غالب نہیں ہے لیکن جب اس کی روحانیت اس کی بشریت پر اور اس کا باطن اس کے ظاہر پر اور اس کا نور اس کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت وہ ملکوتی جبروتی بن جاتا ہے۔ اور کل عالم پر چھا جاتا ہے۔ اور عالم اکبر ہو جاتا ہے۔ اور کل عالم اس کا نسخہ بن جاتا ہے۔

اسی حقیقت کے بارے میں حضرت ابن فارضؒ نے فرمایا ہے:- ؎

وَ اِنِّیْ وَ اِنْ کُنْتُ ابْنَ اٰدَمَ صُوْرَۃً X فَلِیْ فِیْہِ مَعْنًی شَاھِدٌ بِاُبُوَّتِیْ

''اور میں اگرچہ شکل و صورت کے اعتبار سے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ لیکن میری

حقیقت میرے باپ ہونے کی گواہ ہے۔''

اس لئے کہ روح کو نہ زمین اپنے اندر سما سکتی ہے نہ آسمان۔

جیسا کہ اس حقیقت کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

[وَ سَعَكَ الْكَوْنُ مِنْ حَيْثُ جِسْمَانِيَّتِكَ ، وَ لَمْ يَسَعْكَ مِنْ حَيْثُ ثُبُوْتِ رُوْحَانِيَّتِكَ]

''تم کو تمھاری جسمانیت کی حیثیت سے عالم خلق اپنے اندر سما سکتا ہے لیکن تمھاری روحانیت کی حیثیت سے وہ تم کو اپنے اندر نہیں سما سکتا ہے۔''

میں کہتا ہوں:- روح جب ظاہر کی کثافتوں سے پاک وصاف ہو جاتی ہے۔ تو وہ عالم جبروت کی طرف ترقی کرتی ہے۔ پھر اس کو اللہ تعالےٰ سے نہ زمین روک سکتی ہے، نہ آسمان، نہ عرش وکرسی۔ بلکہ یہ سب اس کے پیٹ میں حقیر شی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ اور یہ عارفین کے نزدیک ایک ذوقی امر ہے۔

لہذا جب وہ کل عالم کی طرف دیکھتے ہیں، تو وہ پگھل کر پانی ہو جاتا ہے۔ تو جب وہ اس کو پیتے ہیں، تو وہ ان کے قلوب میں ایک نقطہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور عارفین عالم کے احاطہ کرنے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ان میں کچھ عارفین ایسے ہیں جن کی نظر میں کل عالم ایک انڈے کے مثل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ عارفین ایسے ہیں۔ جن کی نظر میں رائی کی طرح ہوتا ہے۔

اور یہ فرق فکر ونظر کی فراخی اور تنگی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہذا روح جیسے جیسے جبروت کے سمندر میں غوطہ لگاتی ہے، ویسے ویسے یہ عالم اس کے نزدیک چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روح عالم کو محسوس بھی نہیں کرتی ہے۔

اسی لئے ایک عارف نے فرمایا ہے:- عارف کے قلب کے گوشوں میں سے کسی گوشہ میں اگر عرش سما جائے، تو وہ اس کو محسوس نہیں کرتا ہے۔

اور ایک دوسرے عارف نے فرمایا ہے:- عرش وکرسی میرے ڈھال میں چھپے ہوئے ہیں۔

اور ہمارے شیخ الشیوخ سیدی حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے:-

عرش و کرسی میری مٹھی کی لپیٹ میں ہیں۔

پھر عالم نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اور عالم ملکوت عالم جبروت سے مل جاتا ہے۔ لہذا صرف اللہ حی و قیوم باقی رہ جاتا ہے۔ جس کے لئے فنا نہیں ہے۔

اور اس حقیقت کو صرف وہی عارفین سمجھتے ہیں، جن کی روحانیت ان کی بشریت پر غالب ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہ روحانی ملکوتی ہو چکے ہیں۔ ان کے اجسام مخلوق کے ساتھ، اور ان کی ارواح اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں۔

لہذا اے انسان! تمھاری جسمانیت اور بشریت، اور گھری ہوئی محدود شکل کی حیثیت سے کائنات تم کو اپنی وسعت میں سمائے ہوئے اور تم کو گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن تمھاری روحانیت کی حیثیت سے کائنات کے اندر تمھاری گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ کائنات کو تم اپنی وسعت میں سمائے ہوئے اور گھیرے ہوئے ہو۔ کیونکہ تمھاری روح اس عالم جبروت سے ملی ہوئی ہے، جو کل کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔

لیکن جب روح کثیف ہو جاتی ہے اور اس شکل میں گھر جاتی ہے۔ تو اس پر قہریت لازم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ حکمت کے ساتھ محجوب، اور قدرت کے ساتھ مقید ہو جاتی ہے۔

لہذا جب تک بشریت خواہشات اور عادات کی محبت سے کثیف رہتی ہے۔ اس وقت تک وہ محجوب رہتی ہے لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے لطیف ہو جاتی ہے، اور ظاہر کا حجاب دور ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اور اپنے سمندر سے مل جاتی ہے۔ اس وقت ملک اور ملکوت اس کی مٹھی میں ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت اس کو نہ زمین اپنے اندر سما سکتی ہے نہ آسمان، نہ اس کو عرش گھیر سکتا ہے نہ فرش۔ اسی لئے کہا گیا ہے: صوفی کو نہ زمین اٹھا سکتی ہے نہ آسمان اس کو سایہ دے سکتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے:۔

يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالىٰ: لَمْ تَسَعْنِىْ اَرْضِىْ وَلَا سَمَائِىْ، وَوَسِعَنِىْ قَلْبُ عَبْدِىْ الْمُؤْمِنِ ، اَىِ الْكَامِلِ وَهُوَ الْعَارِفُ۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نہ میری زمین مجھے اپنے اندر سما سکتی ہے نہ میرا آسمان۔ لیکن میرے

مومن بندے کے قلب نے مجھ کو اپنے اندر سما لیا ہے'' یعنی وہ مومن جو کامل ہے۔ اور مومن کامل ہی عارف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

لہذا جبروت: وہ لطیف اور قدیم حقیقت ہے۔ جو عالم خلق میں داخل نہیں ہے۔ اور ملکوت: اپنے جمع اور اپنی اصل کے ساتھ ملنے ہونے کے اعتبار سے عالم خلق میں داخل ہے۔ اور ملک:۔ عالم خلق میں داخل ہے اور اس کا وجود فرق کے اعتبار سے ہے۔ اور اہل جمع کے نزدیک ملک کا وجود ہی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صرف ملکوت و جبروت ہے۔ اور جب تک ان کو لطیف اور کثیف نور کا فرق محسوس ہوتا ہے ان کی نظر میں ملکوت و جبروت رہتے ہیں۔ پھر جب وہ ہر شی کو اس کی اصل کے ساتھ ملا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو صرف جبروت باقی رہ جاتا ہے۔

اور اہل فرق، اپنے وہم کی وجہ سے ملک کو دیکھتے ہیں۔ اور اس میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ان کے درمیان ملک کا حجاب حائل کر دیا ہے:۔

(وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهٖ) ''اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم پر غالب ہے''۔

لہذا جب تک بندہ مخلوق میں محدود، اور اپنی بشریت میں گھرا ہوا ہے اس وقت تک وہ کائنات کے قید خانے میں مقید ہے۔

پھر اگر اس کی بصیرت کی روشنی بڑھتی ہے اور اس کی روح ملکوت کی بلندی کی طرف چڑھتی ہے۔ تو وہ کائنات کے قید خانے سے نکل کر ملکوت کی آزاد فضاء میں پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ مصنف ؒ نے اس حقیقت کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:

''اَلْكَائِنُ فِي الْكَوْنِ وَلَمْ تُفْتَحْ لَهُ مَيَادِيْنُ الْغُيُوْبِ مَسْجُوْنٌ بِمُحِيْطَاتِهٖ مَحْصُوْرٌ فِيْ هَيْكَلِ ذَاتِهٖ''

''مخلوق میں رہنے والا، جب کہ اس کے لئے غیوب کے میدان نہ کھولے گئے ہوں۔ اپنی گھیرنے والی اشیاء کی قید میں مقید، اور اپنی ذات کی شکل میں گھرا ہوا ہے''

میں کہتا ہوں:۔ غیوب کے میدان: وہ ہیں۔ جن کو روح اس وقت محسوس کرتی ہے، جب وہ اجسام کی تنگی سے نکل کر عالم ارواح میں پہنچتی ہے۔ اور شہود کی وسیع فضا سے گزر کر بادشاہ معبود اللہ

تعالیٰ کی معرفت تک پہنچتی ہے۔لہذا جب تک انسان اس حیثیت سے کائنات میں ہے، کہ وہ صرف کائنات کو دیکھتا ہے اور صرف ظاہر کو محسوس کرتا ہے۔اور اس کے لئے غیوب کے میدان نہیں کھلے ہیں۔اس وقت تک وہ اپنے کو گھیرنے والی کائنات کی قید میں مقید ہے۔جیسے کہ آسمان، اور اس کے چکر لگانے والے افلاک۔لہذا وہ کائنات کے قید خانے، نیز اپنی بشریت کی شکل، اور اپنے جسم کی کثافتوں کی قید میں گھرا ہوا ہے۔پھر جب اس کی روحانیت اس کی بشریت پر غالب ہو جاتی ہے تو وہ بشریت کی شکل کے گھیرے سے نکل جاتا ہے۔اور جب اس کی بصیرت ملکوت کی فضا کی طرف یا جبروت کے سمندر کی طرف بڑھتی ہے تو وہ مخلوق کی قید سے نکل کر خالق کے شہود میں پہنچ جاتا ہے۔
اس وقت وہ کائنات کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور شہود وعیاں کی نعمت سے فیضیاب ہوتا ہے۔

لیکن جب تک انسان بشریت کی شکل میں گھرا ہوا، کائنات کی قید میں مقید ہوتا ہے۔اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ سے محجوب رہتا ہے۔اگر چہ وہ رسمی علوم کا متبحر عالم ہو۔اس لئے کہ رسمی علوم کی مشغولیت، اللہ تعالیٰ سے اس کا حجاب زیادہ کرتی ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: علم ظاہر میں مشغول ہونا، عالم کو خصوصیت کا علم حاصل کرنے میں نقصان پہنچاتا ہے۔یا ایسی ہی بات فرمائی، جس کا مفہوم یہی ہے۔

قوت القلوب میں اس کے مصنف ؒ نے فرمایا ہے: جس شخص کے لئے علم ظاہر کی وجہ سے علم باطن کا دروازہ نہ کھلے۔وہ اہل یمین (دائیں طرف والوں) میں سے ہے۔اور جس شخص کے لئے علم باطن کا دروازہ کھل جاتا ہے وہ مقربین سابقین میں سے ہے۔اور یہ ظاہر بات ہے کہ، علم رسوم (کتابی علم) مخلوق کے قید خانے سے اس کو نہیں نکالتا ہے۔لہذا وہ ہمیشہ مخلوق ہی کے ساتھ رہتا ہے۔
اور چونکہ وہ مخلوق کے ساتھ رہتا ہے۔اس لئے وہ خالق کے شہود سے محروم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

”اَنْتَ مَعَ الْاَکْوَانِ مَا لَمْ تَشْهَدِ الْمُكَوِّنَ ، فَإِذَا شَهِدْتَهُ كَانَتِ الْاَكْوَانُ مَعَكَ۔“
”تم اس وقت تک مخلوق کے ساتھ ہو جب تک تم نے خالق کا مشاہدہ نہیں کیا ہے لیکن جب تم کو خالق کا مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو مخلوق تمہارے ساتھ ہو جاتی ہے“۔

میں کہتا ہوں: جب تک بندہ مخلوق کی قید میں مقید، اور اپنے جسم کی شکل میں گھرا ہوا ہوتا ہے اس وقت تک مخلوقات اس پر حاکم ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سے عشق و محبت کرتا ہے۔ اور مخلوقات اس کو قابل نفرت بنا دیتی، اور اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہیں۔ وہ مخلوقات کا محتاج رہتا ہے۔ اور مخلوقات اس سے بے نیاز رہتی ہے۔ وہ مخلوقات کی طرف مائل رہتا، اور ان سے حرص رکھتا ہے۔ اور مخلوقات اس سے بھاگتی ہیں۔ وہ مخلوقات سے ڈرتا، اور ان سے مرعوب رہتا ہے اور مخلوقات اس کو ڈراتی اور مرعوب کرتی ہیں۔ پھر جب وہ خالق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور مخلوقات سے غائب، اور ان کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس وقت مخلوقات اس کی خادمہ بن جاتی ہیں۔ اور وہ ان پر حاکم ہو جاتا ہے۔ اور مخلوقات اس سے محبت کرتی ہیں۔ اور وہ ان کے خالق سے محبت کرتا ہے۔ مخلوقات اس کی محتاج ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مخلوقات اس سے حرص رکھتی ہیں۔ اور وہ ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ مخلوقات اس سے ڈرتی اور مرعوب رہتی ہیں۔ اور وہ ان سے بے خوف رہتا ہے۔ لہذا جنت بھی اس کی مشتاق ہوتی ہے اور وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

''اِشْتَاقَتِ الْجَنَّةُ اِلٰی عَلِيٍّ وَّصُهَيْبٍ وَّ بِلَالٍ''

''جنت حضرت علی اور حضرت صہیب اور حضرت بلال ؓ کی مشتاق ہے''۔

یہ حضرات اصحابہ صفہ میں سے تھے۔

اور جہنم عارف سے ڈرتی ہے حالانکہ وہ اس سے غائب ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جہنم قیامت کے دن کہے گی:

جُزْ يَا مُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَاكَ نُوْرُكَ لَهَبِیْ ،اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ

''اے مومن تو جلدی گزر جا۔ کیونکہ تیرا نور میری آگ کی تیزی کو ٹھنڈی کئے دیتا ہے''۔ یا حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے جس طرح فرمایا ہو،

تو اے انسان تم عالم اجسام میں مخلوقات کے ساتھ گرفتار ہو۔ اور ان کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہو۔ لہذا جب تک تم ان سے محبت رکھتے ہو اور ان سے حرص رکھتے ہو اور ان کے مشتاق ہو خواہ

وہ حاضر ہوں یا غائب۔ اس وقت تک جو ہونا ہے ہو۔ وہ تمہارے اندر جس طرح چاہتی ہیں تصرف کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جب تم خالق کا مشاہدہ کرے، اور اس کی معرفت حاصل کر لیتے ہو۔ تو مخلوقات تمہارے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ تم ان سے آزاد ہو جاتے ہو۔ اور وہ تمہاری کنیز بن جاتی ہیں۔ تم ان کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے، ان میں سے کسی شی سے نہ محبت کرتے ہو۔ نہ ڈرتے ہو۔ کیونکہ تم ان سے رخصت ہو کر عالم ارواح میں پہنچ جاتے ہو۔ لہذا اب وہ تمہارے قبضے میں ہوتی ہے۔ تم ان میں جس طرح چاہتے ہو تصرف کرتے ہو، اس لئے کہ اب تم اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے خلیفہ ہو جاتے ہو۔ اور کل مخلوقات تمہارے قبضے میں اور تمہاری ہمت کے قریب ہوتی ہیں۔ کیونکہ جب تم اپنی ہمت اللہ تعالیٰ سے متعلق کر دیتے ہو۔ تو کل اشیاء تمہاری ہمت کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہوئی بعض آثار میں ہے: اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے: تم مجھ کو اپنی فکر کی جگہ بناؤ (یعنی صرف میری فکر میں مصروف رہو) میں تمہاری ہر فکر میں تمہارے لئے کافی ہوں گے۔ جب تک تم اپنے ساتھ رہو گے۔ اس وقت تک تم دوری کے مقام میں رہو گے۔ اور جب تم میرے ساتھ ہو جاؤ گے تو قرب کے مقام میں پہنچ جاؤ گے۔ لہذا تم اپنے لئے دونوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔

ایک عارف نے فرمایا ہے: میں بازار جاتا ہوں، تو کل اشیاء میری مشتاق ہوتی ہیں۔ اور مجھ کو ان کی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

حضرت ابن جلا رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ جس شخص کی ہمت مخلوقات سے اٹھ جاتی ہے۔ وہ ان کے خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جو شخص اپنی ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شی میں مشغول ہو جاتا ہے وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بلند ہے کہ اپنے ساتھ کسی شی کے شریک کرنے پر راضی ہو۔

لہذا جس شخص نے مخلوقات سے اپنی ہمت اٹھالی، اور ان کے خالق اللہ تعالیٰ کے شہود سے فیضیاب ہو گیا۔ اس کے لئے ولایت کبریٰ اور ولایت عظمیٰ ثابت ہو گئی۔ اور مخلوقات سے ہمت اٹھا لینے سے ان بشری صفات اور ضروریات سے بے نیاز ہونا اس پر لازم نہیں ہوتا ہے۔ جو اس کی

بشریت کے وجود کے لئے لازمی ہیں۔ مصنفؒ نے اس کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:

لَا يَلْزِمُ مِنْ ثُبُوْتِ الْخُصُوْصِيَّةِ عَدَمُ وَصْفِ الْبَشَرِيَّةِ

''خصوصیت کے ثابت ہونے سے بشریت کے اوصاف کا ختم ہو جانا لازم نہیں ہوتا ہے''۔

بشری وصف سے مراد: وہ اوصاف ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انسان کو اس کا وجود قائم رہنے کے لئے حاجتمند بنایا ہے۔ مثلاً کھانا، اور پینا، اور لباس، اور مکان، اور وہ جائز خواہش جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ جیسے نکاح اور غیر محرم کی خواہش۔ تو یہ اوصاف خصوصیت کے منافی نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین علیہ الصلاۃ والسلام کی شان میں فرمایا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ

''اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسولوں کو بھیجا۔ وہ سب کھانا کھاتے تھے۔ اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے'' اور دوسری جگہ فرمایا

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً

''اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا اور ان کے لئے ہم نے بیویاں اور اولاد بنائی''۔

ہاں، اہل خصوصیت کے لئے بشریت کا وصف دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ اہل خصوصیت کے کل معاملات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے فوائد حقوق بن جاتے ہیں۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے کہ ان کے نفوس ان پر غالب ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی تمام حرکتیں اپنے نفوس کے فوائد کے لئے ہوتی ہیں۔ اس بیان سے تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خصوصیت یعنی ولایت و معرفت یا آزادی کے ثابت ہونے سے بشریت کے وصف کا خاتمہ ہونا لازم نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خصوصیت کا مقام باطن ہے۔ اور بشری وصف کا مقام ظاہر ہے۔ اور ان کے اوپر انہیں ظاہری بشری اوصاف کے ظاہر ہونے کی وجہ سے انبیاء علیہ السلام اور اولیائے کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کی

نگاہوں سے پوشیدہ ہوئے۔

کیونکہ تم ایک ایسے شخص کو کس طرح پہچان سکتے ہو، جو تمہاری ہی طرح کھاتا، اور پیتا، اور تمہاری ہی طرح سوتا، اور عورتوں سے نکاح کرتا ہے، لہذا ان حضرات کو صرف وہی شخص پہچانتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک بخت اور خوش نصیب بنانا چاہا ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رضی اللہ عنہم سے لوگوں کا انکار صرف ایسی بنا پر واقع ہوا ہے کہ لوگوں نے یہ اعتقاد کر لیا ہے کہ بشریت کے اوصاف خصوصیت کی ضد ہیں۔

چنانچہ کافروں نے حضرت رسول کریم ﷺ کی شان میں کہا:

وَقَالُوْا مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ

''اور کافروں نے کہا: یہ کیا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے''۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے جواب میں یہ آیہ کریمہ نازل کر کے واضح فرمایا کہ دونوں یعنی خصوصیت، اور بشریت کا وصف ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہے:

(وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) الایۃ۔

لہذا ان اوصاف سے جو ہم نے بیان کیا۔ بشری طبیعت ختم نہیں ہوتی ہے وہ نبوت اور ولایت کی خصوصیات کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ لیکن برے اوصاف: مثلاً حسد اور تکبر اور بغض، اور خود پسندی اور ریاء اور غصہ اور قلق، اور محتاجی کا خوف اور روزی کی فکر، اور تدبیر اور اختیار وغیرہ۔ تو نبوت اور ولایت کی خصوصیت میں ان سے پاک ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

حضرت مصنف کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے: تم اپنی بشریت کے اوصاف میں سے ہر اس وصف سے نکل جاؤ، جو تمہاری عبودیت کے مخالف ہو۔ تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی پکار کے جواب دینے والے، اور اس کی بارگاہ سے قریب ہو جاؤ۔

لیکن نبی کو ان اوصاف سے پاک سمجھنا واجب ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام تمام عیوب سے پاک اور معصوم ہیں۔ لیکن ولی کو معصوم سمجھنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اولیاء اللہ ان اوصاف سے محفوظ ہیں۔ لہذا کبھی ان برے اوصاف میں سے کوئی وصف غلطی اور لغزش کے طریقے پر ان سے صادر ہو

جاتا ہے۔اور یہ ان کی خصوصیت کے وجود کے منافی (ختم کرنے والا) نہیں ہے لیکن وہ اس پر اصرار نہیں کرتے ہیں (یعنی اس کو دوبارہ نہیں کرتے ہیں) اور نہ اس میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں۔لہذا کبھی غضب اور قلق اور تدبیر اور اختیار وغیرہ اولیائے کرام سے صادر ہوتا ہے۔لیکن وہ ہوا کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

نصیحت کافیہ میں بیان کیا ہے: اولیائے کرامؒ سے کبھی غلطی اور غلطیاں، اور لغزش اور لغزشیں صادر ہوتی ہیں لیکن وہ ان پر اصرار نہیں کرتے ہیں۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: کیا عارف زنا کر سکتے ہیں؟ وہ کچھ دیر خاموش رہے۔پھر انہوں نے فرمایا۔

(وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَراً مَّقْدُوْرًا o) ''اور اللہ تعالیٰ کا حکم پہلے ہی مقدر ہو چکا ہے''۔

حضرت ابن عطاء اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کاش کہ ہم کو (یعنی لوگوں کو) سوال کرنے کا شعور ہوتا۔اگر حضرت جنید سے اس طرح دریافت کیا جاتا: کیا عارف کی ہمت غیر اللہ کے ساتھ ہو سکتی ہے۔تو وہ جواب دیتے: نہیں ہو سکتی۔

پھر مصنفؒ نے خصوصیت کے نور، اور بشریت کی ظلمت کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّمَا مَثَلُ الْخُصُوْصِيَّةِ كَاِشْرَاقِ شَمْسِ النَّهَارِ ظَهَرَتْ فِي الْاُفُقِ، وَلَيْسَتْ مِنْهُ تَارَةً تَشْرَقُ شُمُوْسُ اَوْصَافِهٖ عَلٰى لَيْلِ وُجُوْدِكَ، وَ تَارَةً يَقْبِضُ ذَالِكَ عَنْكَ فَيَرُدُّكَ اِلٰى حُدُوْدِكَ، فَالنَّهَارُ لَيْسَ مِنْكَ اِلَيْكَ وَلٰكِنَّهٗ وَارِدٌ عَلَيْكَ۔

''خصوصیت کی مثال: دن کے سورج کی روشنی کی طرح ہے۔ جو افق میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن وہ روشنی افق سے نہیں ہوتی ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اوصاف کا سورج کبھی تمہارے وجود کی رات پر روشن ہوتا ہے۔اور کبھی یہ روشنی تم سے رک جاتی ہے تو وہ تم کو تمہاری حدوں کی طرف لوٹا دیتی ہے۔لہذا وہ نور جو تمہاری طرف پہنچتا ہے تمہارے وجود سے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تمہارے اوپر وارد ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں: ربوبیت کے اس نور کی مثال: جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیائے کرام کے قلوب میں روشن کیا ہے۔ اور اس کو بشریت کے ظہور کے ساتھ چھپا دیا ہے۔ سورج کی روشنی کی طرح ہے۔ جب وہ روشنی آفاق پر روشن ہوتی ہے اور آفاق: افق کی جمع ہے، اور زمین اور آسمان کی درمیانی فضا کو کہتے ہیں۔ تو وہ فضا سورج نکلنے سے پہلے تاریک (اندھیری) ہوتی ہے اس میں کچھ بھی روشنی نہیں ہوتی ہے۔ پھر جب سورج کی روشنی اس پر پہنچتی ہے تو وہ صاف و شفاف ہو کر روشنی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لہذا فضا کی روشنی بذات خود نہیں ہے۔ بلکہ وہ سورج سے حاصل کی ہوئی ہے۔

اسی طرح ربوبیت کا نور ہے۔ جو بشریت کے باطن میں امانتاً رکھا گیا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی خصوصیت ظاہر کرنی چاہتا ہے۔ تو وہ نور اس کی بشریت کے ظاہر پر جلوہ گر کر دیتا ہے تو اس کی روحانیت اس کی بشریت پر غالب ہو جاتی ہے۔ پھر بشریت کا کچھ نشان باقی نہیں رہتا ہے۔ اور بشریت سراپا نور ہو جاتی ہے۔ لہذا بشریت کا نور بشریت میں سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ربوبیت کے سورج سے اس پر وارد ہوا ہے۔

پس کبھی اللہ تعالیٰ کے اوصاف، وجود اور قدم اور بقاء، اور تمام اوصاف سلبیہ، اور وجودیہ اور معنویہ کے سورج، تمہارے ظلمانی کثیف وجود کی رات پر روشن ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے قدیم ازلی اوصاف کے ظاہر ہونے کے ساتھ، تمہارے حادث عدمی اوصاف ختم ہو جاتے ہیں۔ لہذا وصال ثابت ہو جاتا ہے۔ اور جدائی ختم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی وہ اس کو روک دیتا ہے۔ اور اس کو تم سے غائب کر دیتا ہے اور اس کو تمہارے باطن کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ لہذا تم اپنی عبودیت کے شہود کی طرف لوٹ جاتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے حدود کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ اور وارد الٰہی کی شان یہی ہے کہ جب وہ انسان پر آتا ہے تو وہ اس کو اس کے نفس سے غائب کر دیتا ہے۔ اور اس کو اس کے ظاہر سے جدا کر دیتا ہے۔ لہذا وہ صرف اپنے رب تعالی کے اوصاف کو دیکھتا ہے۔ اور اپنے نفس کے وجود کا بالکل انکار کر دیتا ہے۔ پھر جب وارد ٹھہر جاتا ہے تو وہ اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ اپنے نفس کے شہود کی طرف لوٹتا ہے۔ اور یہ نور اس کے باطن کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لہذا اس کا باطن ہمیشہ کے لئے نورانی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ظاہر پر کبھی یہ نور غالب ہوتا ہے اور کبھی اس پر ظلمت یعنی

عبودیت غالب ہوتی ہے۔

لہٰذا وارد کا نور انسان کی بشریت کی حیثیت سے اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ وہ اس کی روحانیت کی حیثیت سے اس پر وارد ہوتا ہے۔ جیسا کہ افق کی روشنی افق کی ذات سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے اوپر دن کا سورج طلوع ہونے سے وہ اس پر وارد ہوتی ہے۔

اور یہاں ایک دوسری مثال بھی ہے: اور وہ لوہا اور کوئلہ کی مثال ہے: جب تم ان کو آگ میں ڈالتے ہو، اور پھونکتے ہو۔ تو وہ دونوں آگ کی طرح سرخ ہو کر آگ کی جنس بن جاتے ہیں۔ اور آگ سب لوہے اور کوئلے پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ان میں اور آگ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ہے۔ پھر جب وہ دونوں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ تو لوہا، لوہا رہ جاتا ہے اور کوئلہ کوئلہ رہ جاتا ہے۔

اسی طرح جب بشریت پر روحانیت ہو جاتی ہے تو بشریت سراپا روحانی حقیقی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ صرف حقیقتوں ہی کو دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔ اور تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس نور کے وارد ہونے کے اعتبار سے آدمیوں کی تین قسمیں ہیں:

ایک قسم: وہ لوگ ہیں جن کے نور کی حد ان کا باطن ہے۔ لہٰذا اس نور کی کوئی شعاع ان کے ظاہر تک نہیں پہنچتی ہے۔ اور وہ عوام ہیں۔

دوسری قسم: وہ لوگ ہیں جن کا نور ان کے ظاہر اور باطن پر غالب ہو گیا ہے اور وہ لوگ مجذوبین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھینچ لئے گئے ہیں۔

تیسری قسم: وہ لوگ ہیں جن کا باطن نور سے معمور ہے۔ اور اس کی شعاع ان کے ظاہر پر جلوہ گر ہے۔ لہٰذا ان کے ظاہر پر ہمیشہ نور چھایا رہتا ہے۔ اور وہ لوگ جذب کے بعد سالکین ہیں۔ جو معرفت میں مضبوطی سے قائم ہو چکے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر مصنفؒ نے خصوصیت تک پہنچنے والا طریقہ بیان فرمایا:

دَلَّ بِوُجُوْدِ اٰثَارِہٖ عَلٰی وُجُوْدِ اَسْمَائِہٖ ، وَبِوُجُوْدِ اَسْمَائِہٖ عَلٰی ثُبُوْتِ اَوْصَافِہٖ، وَبِوُجُوْدِ اَوْصَافِہٖ عَلٰی وُجُوْدِ ذَاتِہٖ، اِذْ مَحَالٌ اَنْ یَّقُوْمَ الْوَصْفُ بِنَفْسِہٖ۔

''اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے وجود کے ذریعے اپنے اسماء حسنیٰ کے وجود کی طرف اور اپنے

اسماء حسنیٰ کے وجود کے ذریعے اپنے اوصاف عالی کے وجود کی طرف، اور اپنے اوصاف عالی کے وجود کے ذریعے اپنی ذات اقدس کے وجود کی طرف رہنمائی کی۔ کیونکہ یہ محال ہے کہ وصف بذات خود قائم ہو''۔

میں کہتا ہوں: ترقی کا طریقہ یہی ہے۔ کہ مخلوق کا وجود، قادر اور مرید (ارادہ کرنے والا) اور علیم اور حق کے وجود پر دلیل ہے۔ مثلاً قادر، اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے ساتھ قدرت اس طرح قائم ہے کہ وہ اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ محال ہے کہ وصف بذات خود قائم ہو۔ وصف کے ساتھ اس کے موصوف کا ہونا لازمی ہے۔

اسی مقام پر اہل ظاہر، اہل باطن سے جدا ہو گئے ہیں۔

اہل ظاہر نے مخلوق کے وجود سے اسماء و صفات کا وجود ثابت کیا۔ اور ان کو ذات اقدس کے شہود تک پہنچنے کی قدرت نہیں حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان کو ظاہر نے باطن کے شہود سے، اور وہم نے علم کے ثابت ہونے سے، اور حکمت کے شہود نے قدرت کے شہود سے مغلوب اور عاجز کر دیا۔

اور اہل باطن:۔ چونکہ انہوں نے اپنے قلوب کو اغیار سے خالی کر لیا۔ اور اپنے قلوب کو اللہ واحد قہار کے ہاتھ فروخت کر کے اس کے سپرد کر دیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بصیرت کی آنکھ کھول دی۔ اور ان کو اپنے پوشیدہ راز سے آگاہ فرمایا۔ لہذا انہوں نے وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو منفرد کر دیا۔ (یعنی انہوں نے صرف اللہ تعالیٰ کا تنہا وجود تسلیم کیا) اور ان کی بصیرت سے ہر موجود کا دیکھنا زائل ہو گیا۔ اس لئے کہ صفت کا اپنے موصوف سے جدا ہونا، یا بذات خود قائم ہونا محال ہے۔

لہذا صفات کے وجود سے ذات کا وجود لازم ہو گیا ہے۔ اور یہی اس خصوصیت کا راز ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیائے کرام کو مخصوص فرمایا۔ اور اس میں ان کے ساتھ ان کے سوا دوسروں کو شریک نہیں کیا۔

پھر مصنف ؒ نے اہل جذب اور اہل سلوک، اور اہل نزول اور اہل عروج، (یعنی مجذوب اور سالک) کی کیفیت بیان فرمائی:۔

فَاَهْلُ الْجَذْبِ يَكْشِفُ لَهُمْ عَنْ كَمَالِ ذَاتِهِ ، ثُمَّ يَرُدُّهُمْ اِلٰى شُهُوْدِ صِفَاتِهٖ، ثُمَّ

يَرُدُّهُمْ إِلَى التَّعَلُّقِ بِأَسْمَائِهِ، ثُمَّ يَرُدُّهُمْ إِلَى شُهُوْدِ اٰثَارِهِ، وَالسَّالِكُوْنَ عَلٰى عَكْسِ هٰذَا، فَنِهَايَةُ السَّالِكِيْنَ بِدَايَةُ الْمَجْذُوْبِيْنَ، لٰكِنْ لَا بِمَعْنًى وَاحِدٍ، فَرُبَّمَا الْتَقَيَا فِيْ الطَّرِيْقِ، هٰذَا فِيْ تَرَقِّيْهِ وَهٰذَا فِيْ تَدَلِّيْهِ۔

''مجذوبین کے سامنے اللہ تعالیٰ اپنی ذات اقدس کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنی صفات کے شہود کی طرف لوٹاتا ہے۔ پھر ان کو اپنے اسماء حسنیٰ کے ساتھ تعلق کی طرف لوٹاتا ہے۔ پھر ان کو اپنے آثار یعنی مخلوقات کے شہود کی طرف لوٹاتا ہے۔ اور سالکین کا حال اس کے برعکس ہے۔ وہ آثار کے شہود سے ترقی کر کے یکے بعد دیگرے ذات اقدس کے کمال کے شہود تک پہنچتے ہیں۔ لہذا سالکین کی انتہا، مجذوبین کی ابتداء ہے۔ لیکن ایک حقیقت میں نہیں ہوتے ہیں۔ اور اکثر اوقات دونوں راستے میں ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ سالکین اپنے عروج میں اور مجذوبین اپنے نزول میں''۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو خصوصیت کے راز کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اپنی سیر کی حالت کے اعتبار، ان کی دو قسمیں ہیں:۔

ایک قسم:۔ وہ لوگ ہیں جن کی ابتداء جذب سے ہوتی ہے۔ پھر وہ سلوک کی طرف لوٹتے ہیں۔

دوسری قسم:۔ وہ لوگ ہیں۔ جو سلوک سے ابتدا کرتے ہیں اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں ترقی کرتے ہیں۔ پھر ان کے اوپر جذب طاری ہوتا ہے۔ پھر وہ ہوش میں آتے ہیں۔

لہذا مجذوبین کے سامنے ابتدا ہی میں بغیر کسی مجاہدے کے ذات اقدس کا شہود ظاہر ہوتا ہے۔ تو وہ ذات اقدس کے نور کے شہود کے نشے میں مست ہو جاتے ہیں۔ لہذا وہ واسطہ اور شرعی احکام کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ نور کے شہود میں مغلوب الحال ہو کر عقل و شعور سے خارج ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ذات اقدس کے شہود سے صفات عالی کے شہود کی طرف نزول کرتے ہیں۔ تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کو کثیف اور ظاہر حالت میں دیکھتے ہیں۔ اور اثر یعنی مخلوق کے دیکھنے سے وہ گم ہوتے ہیں۔ اور جب وہ صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو وہ ان اسماء سے متعلق ہو جاتے ہیں۔

جو صفات کے ساتھ لازم ہیں۔ پھر وہ اس کے آثار یعنی مخلوقات کی طرف نزول کرتے ہیں۔ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت کے احکام کے ساتھ قائم ہوتے ہیں (یعنی شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں)

اور سالکین اس کے برعکس ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے وجود سے اس کے اسمائے حسنیٰ کے وجود کی طرف، اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے وجود سے اس کی صفات عالیہ کے وجود کی طرف، اور اس کی صفات کے وجود سے اس کی ذات اقدس کے وجود کی طرف رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

لہذا سالکین کی انتہا یعنی ذات اقدس کے نور کا شہود: مجذوبین کی ابتداء ہے۔ اور مجذوبین کی انتہا، یعنی مخلوق کا شہود: سالکین کی ابتدا ہے۔ لیکن دونوں کی حقیقت ایک نہیں ہے۔ بلکہ ایک یعنی مجذوبین: نزول کی حالت میں اشیاء کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اور دوسرا، یعنی سالکین: عروج کی حالت میں اشیاء کو اپنے نفس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اکثر اوقات دونوں یعنی مجذوبین اور سالکین راستے میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً صفات کے شہود، اور اسماء حسنیٰ کے ساتھ تعلق کے مقام میں، سالکین اپنے عروج کی حالت میں، اور مجذوبین اپنے نزول کی حالت میں، جب دونوں ایک ساتھ پہنچتے ہیں۔ تو ایک مقام میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ عروج کرنے والے سالکین اسی اثر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی انتہا تک ذات کے شہود کے بعد مجذوبین پہنچتے ہیں۔ اور ان کا رجوع اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

لہذا سالک اور مجذوب دونوں بقا کے مقام میں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور مریدین کی تربیت کے معاملے میں اہل عروج سالکین، اہل نزول مجذوبین سے زیادہ کامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ راستے کی سختیوں اور خطروں سے گزر کر بخوبی آگاہ اور مضبوط اور تجربہ کار ہو چکے ہیں۔ بخلاف مجذوبین کے، کہ وہ اچانک اٹھا لئے گئے ہیں۔ اور راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ اور ایسا بہت کم ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر لوگ پہلے سلوک اختیار کرتے ہیں۔ پھر بعد میں ان پر جذب طاری ہوتا ہے۔ اور طریقہ شاذلیہ میں پہلے ہی قدم سے اکثر مریدین پر جذب اور سلوک ایک

ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ اور جذب کے معنی: مخلوق کے شہود سے خالق کے شہود کی طرف روح کو اچانک کھینچ لینا ہے۔ اور تم یہ معلوم کرلو: اہل خصوصیت کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: صرف سالکین۔ دوسری قسم:۔ صرف مجذوبین۔ تیسری قسم: سالکین، مجذوبین۔ چوتھی قسم: مجذوبین سالکین۔

پہلی دونوں قسموں کے لوگ، یعنی صرف سالکین، اور صرف مجذوبین، مریدین کی تربیت اور ہدایت کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔

صرف سالکین:۔ اسلئے تربیت کے اہل نہیں ہیں کہ وہ صرف ظاہر والے ہیں ان کے باطن میں کوئی نور نہیں ہے۔ کہ وہ اس کے ذریعے دوسروں کو کھینچیں۔ اور صرف مجذوبین:۔ اس لئے اہل نہیں ہیں کہ ان کے پاس سلوک نہیں ہے۔ جس کے ذریعے وہ مریدین کو سیر کرائیں۔

اور آخری دونوں قسموں کے لوگ، یعنی سالکین مجذوبین، اور مجذوبین سالکین:۔ دوسروں کی تربیت اور ہدایت کے اہل ہیں۔ لیکن سالکین مجذوبین، مجذوبین سالکین سے افضل ہوتے ہیں۔

اور تم یہ جان لو:۔ پہلے سلوک کی حقیقت:۔ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر مخلوق کا شہود ہے۔ اور پہلے جذب کی حقیقت:۔ یہ ہے کہ مخلوق کے بغیر اللہ تعالیٰ کا شہود ہو۔ اور دوسرے سلوک کی حقیقت:۔ یہ ہے کہ مخلوق کا شہود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور واصل، شہود وعیاں کے جن انوار کو پاتا ہے، وہ محسوس ظاہر نہیں ہے کہ ہر انسان ان کو پا جائے۔ بلکہ وہ درحقیقت قلبی حقیقتیں، اور باطنی ملکوتی اسرار ہیں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس حقیقت کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

لَا يُعْلَمُ قَدْرُ اَنْوَارِ الْقُلُوْبِ وَالْاَسْرَارِ اِلَّا فِي غَيْبِ الْمَلَكُوْتِ، كَمَا لَا تَظْهَرُ اَنْوَارُ السَّمَاءِ اِلَّا فِيْ شَهَادَةِ الْمُلْكِ۔

”قلوب کے انوار اور اسرار کی قدر ومنزلت ملکوت کے غیب ہی میں ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ آسمان کے انوار ملک کی شہادت ہی میں ظاہر ہوتے ہیں“۔

میں کہتا ہوں: تم یہ جان لو، کہ سب آدمیوں کے قلوب میں نور موجود ہے اس کی دلیل حضرت

رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث شریف ہے۔

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ "ہر لڑکا فطرت پر پیدا ہوتا ہے"۔

یعنی ہر لڑکا ابتدائی پیدائش پر ہوتا ہے۔اور ابتدائی پیدائش قبضہ نورانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ) "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔

اہل ظاہر مفسرین نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین میں رہنے والوں کا نور ہے۔اور وہ آسمانوں اور زمین میں موجود ہر ہستی کے لئے عام ہے۔

لہذا یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نور سب کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔تو آدمیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اس نور سے محجوب اور اندھے ہو گئے ہیں۔اور وہ وہی لوگ ہیں جو ملک کے ظاہر میں مشغول ہو کر ٹھہر گئے ہیں۔اور ملک کا ظاہر اس کائنات کا چھلکا، اور اس کا محسوس ظاہر ہے۔اور اس کا نام عالم اجسام ہے۔اور وہ لوگ اس کے باطن تک نہیں پہنچتے ہیں۔اور اس کا باطن ملکوت ہے اور اس کا نام عالم ارواح ہے۔لہذا وہ لوگ اس کے باطنی نور سے محجوب ہیں۔اور صرف محسوس ظاہری نور کو دیکھتے ہیں۔کیونکہ وہ لوگ مخلوقات کے جیل خانے میں بند ہیں۔حس اور وہم کی ظلمت میں گھرے ہوئے ہیں۔اور آدمیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی بصیرت ملک کے باطنی نور کے شہود تک پہنچی۔اور وہ لوگ چھلکے کے ساتھ نہیں ٹھہرے۔بلکہ مغز کے شہود تک پہنچ گئے۔اور وہ مغز: ملکوت کے انوار اور جبروت کے اسرار ہیں:۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف مباحث میں اشارہ فرمایا ہے:۔

مَهْمَا تَعَدَّيْتَ عَنِ الْاَجْسَامِ اَبْصَرْتَ نُوْرَ الْحَقِّ ذَا ابْتِسَامِ

"جب تم اجسام سے گزر کر آگے بڑھے تو تم نے اللہ تعالیٰ کے نور کو مسکراتے ہوئے دیکھا"

اور اس نور کو عارفین کے قلوب دیکھتے ہیں۔نہ کہ غافلین کے قلوب۔

جیسا کہ حضرت منصور حلاج نے اپنے اس شعر میں فرمایا ہے:

قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ لَهَا عُيُوْنٌ تَرٰى مَا لَا يُرٰى لِلنَّاظِرِيْنَ

''عارفین کے قلوب کے لئے ایسی آنکھیں ہیں۔ جو ان چیزوں کو دیکھتی ہیں جو دوسرے دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی ہیں''۔

تو جب تم نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، تو تم کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ''لایعلم'' مفعول مالیسم فاعلہ کے لئے ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ قلوب کے غیبی انوار اور اس کی بزرگی، اور اسرار کے قدسی انوار اور ان کا کمال کی قدر ملکوت اور جبروت کے غیب ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔

لہذا قلوب کے انوار کی قدر و منزلت ملکوت کے غیب ہی میں معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ انوار جبروت کے سمندروں سے اچھلتے ہیں۔ لہذا جو شخص ملکوت کے شہود تک نہیں پہنچتا ہے۔ وہ ان کی قدر و منزلت نہیں جانتا ہے۔ بلکہ وہ سرے سے پہچانتا ہی نہیں ہے۔ اور اسرار کے انوار کی قدر و منزلت جبروت کے غیب ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ اصلی ازلی انوار ہیں۔ اور وہ عالم خلق میں داخل نہیں ہیں۔ لہذا جو شخص عالم ملک میں رکا ہوا ہے۔ وہ ملکوت کے انوار کی قدر، نہ جانتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے۔ بلکہ وہ ان کا انکار کرتا ہے۔

ہم نے بہت سے خصوصیت کے دعوے کرنے والوں کو ان انوار کا انکار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ وہ خصوصیت سے بہت دور ہیں۔ اور جو شخص ملکوت کے انوار کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے، وہ جبروت کے انوار کی قدرت و منزلت نہیں جانتا ہے۔ اور جو شخص ان دونوں سے گزر کر آگے بڑھ جاتا ہے، وہ سب کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اور جس طرح غیبی انوار عالم ملکوت یا جبروت کے غیب ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے محسوس انوار، عالم شہادت یعنی محسوس عالم ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کا نام ملک ہے۔

حاصل یہ ہے: قلوب کے انوار ہی ملکوت کے انوار ہیں۔ اور اسرار کے انوار ہی جبروت کے انوار ہیں۔ اور وہ غیبی انوار ہیں۔ ان کی قدر و منزلت وہی شخص جانتا ہے جو عالم ملکوت یا جبروت تک پہنچتا ہے۔ لہذا جب وہ اس مقام میں پہنچتا ہے، اسی وقت وہ ان کو پاتا ہے۔ اور علم اور حال کے اعتبار سے ان کی قدر اس کو معلوم ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تنبیہ:۔ میں نے اس کتاب کی شرح لکھنے والوں میں سے اکثر حضرات کو دیکھا ہے کہ

انہوں نے ملک اور ملکوت اور جبروت کی تعبیر بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے گمان کیا ہے۔ کہ ملک یہ عالم دنیا ہے۔ اور ملکوت وہ عالم آخرت ہے۔ اور جبروت وہ عالم ہے جس کو کوئی نہیں جانتا ہے۔ حالانکہ یہ تشریح غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر درحقیقت ویسا ہی ہوتا جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ تو ملک سے ملکوت کی طرف، اور ملکوت سے جبروت کی طرف ترقی صحیح نہ ہوتی۔ اس لئے کہ ان کی تشریح کے مطابق یہ لازم آتا ہے کہ عالم ملک، عالم ملکوت نہیں ہوتا ہے۔ اور عالم ملکوت، عالم جبروت نہیں ہوتا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے محققین نے اس حقیقت کو قطعی قرار دیا ہے۔ کہ اہل ملکوت، عالم ملک کو بالکل نہیں دیکھتے ہیں۔ اور اہل جبروت، عالم ملکوت سے محجوب ہوتے ہیں۔ حضرت نقشبندی رضی اللہ عنہ نے شرح ہائیہ میں اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

اور صحیح یہ ہے: مقام ایک ہے۔ اور وہ اصلی اور فرعی وجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جو عظمت عالم خلق میں داخل نہیں ہوئی ہے وہ عالم جبروت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جو عظمت عالم خلق میں داخل ہوئی۔ تو جس شخص نے اس عظمت کو اس کی اصل عالم جبروت سے ملی ہوئی مشاہدہ کیا۔ اور اس میں جمع کر دیا۔ وہ اس کے لئے عالم ملکوت ہے اور جس شخص نے اس کو فرق کر دیا۔ اور اس کے ساتھ محجوب ہو گیا۔ وہ اس کے حق میں ملک ہے۔

تو حاصل یہ ہوا: مقام ایک ہے اور کل معاملہ صرف اعتباری ہے۔ نظر اور فکر کی تبدیلی کے ساتھ نام بدلتا رہتا ہے۔ اور معرفت میں ترقی کے اختلاف کے ساتھ ساتھ نظر اور فکر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لہذا جو شخص مخلوق کے ساتھ ٹھہر گیا، وہ اس کے حق میں ملک ہو گیا۔ اور جو شخص ترقی کر کے اس نور تک پہنچا جو عالم جبروت سے جاری ہوتا ہے مگر یہ کہ اس نے اس نور کو کثیف نورانی دیکھا۔ اور عالم جبروت کے نور کی طرح اس کو لطیف نہیں دیکھا۔ اس کے حق میں اس کا نام ملکوت رکھا گیا۔

اور جس شخص نے اس نور کو اس کی اصل کے ساتھ شامل دیکھا۔ اور لطیف اور کثیف نور کے درمیان امتیاز نہیں کیا۔ اس کا نام اس کے حق میں جبروت رکھا گیا۔ میں نے اپنے قصیدہ تائیہ میں ملک اور ملکوت اور جبروت کی حقیقت بیان کی ہے۔ اس قصیدے کا کچھ حصہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح شرح تصلیہ مشیشیہ میں بھی ان کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے اوپر یہ انوار ظاہر ہوں اور وہ ان مقامات پر پہنچے۔ اس کے لئے اعمال کی پابندی، اور احوال کی سختیوں کا ذائقہ چکھنا لازمی ہے لہذا جب وہ کوئی عمل کرے۔ اور وہ اس عمل کی شیرینی چکھے، تو اس کو اسے اپنے لئے معرفت کا دروازہ کھلنے کی خوشخبری سمجھنی چاہیے کیونکہ یہی سائرین کی سیر کا نتیجہ ہے''۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:

وِجْدَانُ ثَمَرَاتِ الطَّاعَةِ عَاجِلاً ، بَشَائِرُ الْعَامِلِیْنَ لِوُجُوْدِ الْجَزَاءِ عَلَیْهَا اٰجِلاً ۔

''عبادت کا نتیجہ فوراً یعنی اسی دنیا میں پانا، اس عمل کا بدلہ مقررہ وقت پر پانے کی خوشخبری ہے''۔

میں کہتا ہوں: جو شخص اپنی ابتداء میں اپنے مجاہدہ کی شیرینی پا جائے اس کو اپنا مشاہدہ پانے کی خوشخبری سمجھنی چاہیے۔ اور جو شخص اپنے مجاہدہ کی شیرینی نہ پائے اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واردات قلوب پر آتے ہیں۔ تو وہ علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یا تم اس طرح کہو: جو شخص اپنے عمل کا پھل فوراً اس دنیا میں پا جائے تو اس کو اس مقررہ وقت پر آخرت میں بدلہ پانے کی خوشخبری سمجھنی چاہیے۔ اور اس موضوع کے بارے میں مصنفؒ کا قول کئی مرتبہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور عامل جس بدلے کی خوشخبری حاصل کرتا ہے اس کو اس کا ارادہ اور اس کی طلب نہ کرنی چاہیے تاکہ یہ اخلاص میں عیب نہ ثابت ہو۔ جیسا کہ اس کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

كَیْفَ تَطْلُبُ الْعِوَضَ عَلٰی عَمَلٍ هُوَ مُتَصَدِّقٌ بِهٖ عَلَیْكَ ؟ اَمْ كَیْفَ تَطْلُبُ الْجَزَاءَ عَلٰی صِدْقٍ هُوَ مُهْدِیْهِ اِلَیْكَ؟

''تم اللہ تعالیٰ سے اس عمل پر بدلہ کس طرح چاہتے ہو اس نے تم کو صدقہ عطا فرمایا ہے۔ یا تم اس صدق پر اللہ تعالیٰ سے بدلہ کس طرح چاہتے ہو جو اس نے تمہاری طرف ہدیہ ارسال فرمایا ہے''۔

میں کہتا ہوں: بندہ صرف ایک تابع فرمان آلہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کو فرمان بردار کرتا ہے تو وہ عمل کرتا ہے۔ ورنہ نہیں کرتا ہے۔ تو جب حالت ایسی ہے، تو عمل کی کوئی نسبت تمہاری

طرف نہیں ہے۔ بلکہ تم سے اس کا ظاہر ہونا ایک حکمت ہے۔تو تم اس عمل پر بدلہ کیسے چاہتے ہو، جو اس نے تمہارے اوپر صدقہ کیا ہے؟

اور جب اللہ تعالیٰ نے بندگی کی سچائی کے ساتھ تمہارے اوپر احسان فرمایا ہے۔اور بندگی کی سچائی: اخلاص کا راز ہے تو تم اس صدق واخلاص پر بدلہ کیسے چاہتے ہو، جو اس نے تمہاری طرف ہدیہ بھیجا ہے؟

اور مصنفؒ نے عمل کے لئے صدقہ کا لفظ استعمال کیا۔ جو محتاجوں کے لئے ہوتا ہے۔اور صدق کے لئے ہدیہ کا لفظ استعمال کیا۔ جو محبوبین کے لئے ہوتا ہے کیونکہ عمل میں بہت سے لوگ مشترک ہیں۔اس لئے کہ عمل اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن ان میں اخلاص کم ہوتا ہے۔اور اہل اخلاص کم سے بھی بہت کم ہیں۔اور وہ خواص یا خواص الخواص ہیں۔حضرت شیخ ابوالعباسؒ نے حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کے اس قول کے بارے میں "انما انا نعمة مهداة" "میں درحقیقت بطور ہدیہ کے بھیجا ہوا نعمت ہوں"۔ فرمایا:۔انبیاء کرام علیہم السلام اپنی امتوں کے لئے عطیہ ہیں۔اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے ہدیہ ہیں۔اور عطیہ محتاجوں کے لئے ہوتا ہے اور ہدیہ دوستوں کے لئے ہوتا ہے۔حضرت واسطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ عبادت پر اجر وثواب چاہنا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کو فراموش کر دینا ہے۔حضرت ابوالعباس بن عطا رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے سب اشیاء سے زیادہ قریب نفس اور اس کے افعال کو دیکھنا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سخت اس کے افعال پر بدلہ چاہنا ہے۔اور سب اعمال سے زیادہ جس عمل کا اجر وثمرہ دنیا وآخرت میں ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔اور اس کا ثمرہ وہ نور ہے جو قلب میں روشن ہوتا ہے اور اس سے تمام باطل نیست ونابود ہو جاتا ہے۔اور اس نور کے اعتبار سے آدمیوں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم:۔وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں نور کا فیضان ہوا ہے۔اس وجہ سے وہ لوگ ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔

دوسری قسم:۔ وہ لوگ ہیں جو اپنے اذکار کے ذریعے نور کا فیضان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

قَوْمٌ تَسْبِقُ اَنْوَارُهُمْ اَذْكَارَهُمْ ، وَ قَوْمٌ تَسْبِقُ اَذْكَارُهُمْ اَنْوَارَهُمْ

''کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے انوار ان کے اذکار سے پہلے ہوتے ہیں (یعنی اذکار سے پہلے ان کے قلب میں انوار کا فیضان ہوتا ہے) اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اذکار ان کے انوار سے پہلے ہوتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں: وہ لوگ، جن کے اندر اذکار و مجاہدوں سے پہلے انوار کا فیضان ہوتا ہے، وہ واصلین ہیں۔ اور وہ لوگ، جن کو انوار حاصل کرنے کے لئے اذکار اور مجاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سائرین ہیں۔ واصلین کے لئے انوار مواجہت ہیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے ہیں اس لئے وہ ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ لہذا جب وہ زبان سے ذکر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے قلوب کی طرف انوار بڑھ جاتے ہیں۔ اور وہ ان کو اذکار کے لئے ابھارتے ہیں۔ اور سائرین کے لئے انوار توجہ ہیں۔ وہ انوار کے محتاج ہوتے، اور ان کو طلب کرتے ہیں۔ لہذا وہ ان انوار کی طلب میں اپنے نفوس سے مجاہدہ کرتے ہیں

پھر مصنفؒ نے دونوں فریق کا حال بیان فرمایا:

ذَاكِرٌ ذَكَرَ لِيَسْتَنِيرَ قَلْبُهُ ، وَذَاكِرٌ اِسْتَنَارَ قَلْبُهُ فَكَانَ ذَاكِرًا

''ایک ذاکر ایسا ہے جو اس لئے ذکر کرتا ہے کہ اس کا قلب نور حاصل کرے (روشن ہو) اور ایک ایسا ہے، کہ اس کا قلب (انوار الٰہی کے فیضان سے) منور ہو جاتا ہے تو وہ ذاکر ہو جاتا ہے''۔

میں کہتا ہوں: جو شخص اس لئے ذکر کرتا ہے کہ اس کا قلب روشن ہو، وہی ہے، جس کا ذکر اس کے قلب میں نور پیدا ہونے سے پہلے ہوتا ہے۔ لہذا وہ ان لوگوں میں سے ہے، جن کے اذکار ان کے قلب میں انوار پیدا ہونے سے پہلے ہوتے ہیں۔ اور جس شخص کا قلب پہلے نور سے روشن ہوتا ہے پھر وہ ذاکر ہو جاتا ہے۔ وہ ہے، جس کے قلب میں نور کا فیضان اس کے ذکر سے پہلے ہوتا ہے۔ لہذا وہ ان لوگوں میں سے ہے، جن کے قلب میں انوار کا فیضان ان کے اذکار سے پہلے ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ عارفین باللہ ہیں۔ تم ان کو دیکھو گے، کہ وہ ہمیشہ بارگاہ الٰہی کی حضوری میں ہیں۔ اور ذکر یا

فکر یا نظر میں مشغول ہیں۔ یا بارگاہ الٰہی کی حضوری کے لئے مریدین کی ہدایت اور تربیت میں مصروف ہیں۔ ان کے قلوب انوار الٰہی سے معمور ہیں۔ اور ان کی ارواح ہمیشہ اسرار الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔

اور بلاشبہ ظاہری ذکر باطنی شہود کا دیباچہ ہے اس لئے کہ اگر وارد نہ ہوتا، تو ورد بھی نہ ہوتا۔ اسی حقیقت کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:

مَا كَانَ ظَاهِرُ ذِكْرٍ اِلَّا عَنْ بَاطِنِ شُهُوْدٍ اَوْ فِكْرٍ

''ذکر کا ظاہر، شہود یا فکر کے باطن ہی سے پیدا ہوتا ہے''۔

میں کہتا ہوں:۔ جب ظاہر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے، تو یہ باطن میں اللہ تعالیٰ کی محبت موجود ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو وہ اس کا ذکر اکثر کرتا ہے۔ اور محبت ذوق و شوق اور معرفت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا ذکر کا ظاہر شہود کے باطن ہی سے پیدا ہوتا ہے اگر چہ اس کو اپنے شہود کی خبر نہ ہو۔

لہذا روح جب تک فنا نہیں ہوتی ہے وہ ذکر نہیں کرتی ہے اور وہ جب تک مشاہدہ نہیں کرتی ہے، فنا نہیں ہوتی ہے۔ تو ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں فنا ہو جاتا ہے۔ بے شک اس کی روح بارگاہ الٰہی کے جمال کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یا بارگاہ کے جمال اور اس کی رونق کے غور و فکر میں مستغرق رہتی ہے۔ یا اس کے بہترین ثواب اور جزا کی فکر میں محو ہوتی ہے۔

لہذا حاصل یہ ہوا کہ ظاہری ذکر یا تو باطنی شہود سے پیدا ہوتا ہے اور وہ مریدین یا عارفین کا حال ہے۔ یا فکر سے پیدا ہوتا ہے اور وہ ثواب یعنی بدلہ چاہنے والوں کا حال ہے۔ اور ذکر کے اعتبار سے آدمیوں کی تین قسمیں ہیں:۔

ایک قسم: وہ لوگ ہیں جو بدلہ چاہتے ہیں۔ دوسری قسم: وہ لوگ ہیں جو حضور چاہتے ہیں۔ تیسری قسم: وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچ گئے اور حجاب کو دور کر چکے ہیں۔ پھر مصنفؒ نے ظاہری ذکر کے باطنی شہود سے پیدا ہونے کی وجہ بیان فرمائی:۔

اَشْهَدَكَ مِنْ قَبْلِ اَنِ اسْتَشْهَدَكَ فَنَطَقَتْ بِاُلُوْهِيَّتِهِ الظَّوَاهِرُ، وَتَحَقَّقَتْ بِاَحَدِيَّتِهِ

الْقُلُوْبُ وَالسَّرَائِرُ

''اللہ تعالیٰ نے تم سے شہادت طلب کرنے سے پہلے ہی تم کو مشاہدہ کرایا۔ تو ظاہر نے اس کے معبود ہونے کا اقرار کیا۔ اور قلوب اور سرائر (سر کی جمع) نے اس کے ایک ہونے کا یقین کیا''۔

میں کہتا ہوں: روح، اپنے پیدا ہونے کی ابتداء میں نہایت ہی پاکیزہ اور صاف تھی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس کو عالم ارواح میں ظاہر کیا۔ تو وہ بڑی عالم اور ذہین تھی۔ اس وقت اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور جلال اور جمال اور اپنی وحدانیت کے کمال کا مشاہدہ کرایا۔ پھر اس سے فرمایا:

(اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى) ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو میرا رب ہے''۔

تو سب روحوں نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے روح کو اس خاکی جسم میں مرکب کیا۔ اس وقت ان روحوں میں سے کچھ نے اس ازلی عہد کا اقرار کیا۔ اور ان میں سے کچھ نے اس کو بھلا دیا۔ اور انکار کیا۔

پس جب تم عالم ارواح میں تھے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنی ربوبیت اور وحدانیت کا مشاہدہ کرایا۔ لہٰذا تم نے اس کی ربوبیت اور وحدانیت کو اس سے پہلے جان لیا، اور یقین کر لیا۔ کہ وہ تم سے شہادت طلب کرے۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے ازل میں تم سے شہادت طلب کی۔ تو اس وقت اس نے تمہاری روح کو اپنی ربوبیت اور وحدانیت کا عالم پایا۔ لہٰذا تم نے اپنی ظاہری زبانوں سے اس کی اس الوہیت کا اقرار کیا، جس کو تم نے ازل میں پہچانا تھا۔ اور تم نے اس کی اس وحدانیت کا یقین کیا، جس کا مشاہدہ تم نے قلوب اور سرائر کے مرکب ہونے سے پہلے کیا تھا۔ لہٰذا ربوبیت کا جو اقرار عالم شہادت میں ظاہر ہوا، وہ اس شہادت کی شاخ ہے، جو عالم غیب میں پہلے ہو چکی ہے۔ اور وحدانیت پر قلوب کا جو یقین ظاہر ہوا، وہ اس علم کی شاخ ہے۔ جو علوم غیب میں پہلے حاصل ہوا۔

لہٰذا بندے پر واجب ہے، کہ وہ ظاہری اقرار اور باطنی توحید کے درمیان جامع ہو۔ لہٰذا پہلے یعنی ظاہر کی شہادت فرق ہے۔ اور دوسرا یعنی قلب کا یقین جمع ہے۔ حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے

اسی حقیقت کی طرف اپنے اس کلام میں اشارہ فرمایا ہے:۔

قَدْ تَحَقَّقْتَ بِسِرِّیْ حِیْنَ نَاجَاكَ لِسَانِیْ

فَاجْتَمَعْنَا لِمَعَانٍ وَافْتَرَقْنَا لِمَعَانٍ

''تم نے میرے راز کا یقین کیا جس وقت میری زبان نے تم سے سرگوشی کی۔ لہذا ہم حقیقت کے لئے جمع ہوئے اور حقیقت کے لئے متفرق ہوئے۔

اِنْ یَكُنْ غَیَّبَكَ التَّعْظِیْمُ عَنْ لَحْظِ عَیَانِیْ

فَقَدْ صَیَّرَكَ الْوَجْدُ مِنَ الْاَحْشَاءِ دَانِیْ

''اگر تعظیم تم کو میری آنکھوں کے دیکھنے سے غائب کر دیتی ہے تو وجد تم کو میرے قلب وجگر سے قریب کر دیتی ہے''۔

پھر مصنف ؒ نے ذکر کی فضیلتیں بیان فرمائیں۔

اَكْرَمَكَ كَرَامَاتٍ ثَلَاثاً: جَعَلَكَ ذَاكِراً لَهٗ وَلَو لَا فَضْلُهٗ لَمْ تَكُنْ اَهْلاً لِجرْیَانِ ذِكْرِهٖ عَلَیْكَ، وَجَعَلَكَ مَذْكُوْراً بِهٖ اِذْ حَقَّقَ نِسْبَتَهٗ ، لَدَیْكَ، وَجَعَلَكَ مَذْكُوْراً عِنْدَهٗ فَتَمَّمَ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ

''اللہ تعالیٰ نے تم کو تین فضیلتیں عطا فرمائیں۔

پہلی فضیلت: یہ ہے کہ اس نے تم کو اپنا ذکر کرنے والا بنایا۔ اور اگر اس کا فضل وکرم نہ ہوتا، تو تم اپنے اوپر اس کا ذکر جاری کرنے کے اہل نہ ہوتے۔

دوسری فضیلت: یہ ہے کہ اس نے تم کو اپنے ساتھ مذکور بنایا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی نسبت تمہارے ساتھ ثابت کی۔

تیسری فضیلت: یہ ہے کہ اس نے تم کو اپنے نزدیک مذکورہ بنایا لہذا اس نے اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی۔

میں کہتا ہوں: اے انسان! اللہ تعالیٰ نے تم کو بہت سی فضیلتیں عطا فرمائیں، اور بے شمار نعمتیں تم کو بخشی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْ نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

''اور اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو، تو نہیں شمار کر سکتے ہو''۔

اور سب فضیلتوں سے بڑی فضیلت ذکر کی فضیلتیں ہیں۔

حدیث شریف میں ہے۔

مَا مِنْ يَوْمٍ اِلَّا وَلِلّٰهِ فِيْهِ نِعَمٌ يُنْعِمُ اللّٰهُ بِهَا عَلٰى عِبَادِهٖ، وَمَا اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلٰى عَبْدٍ اَفْضَلَ مِنْ اَنْ يُّلْهِمَهٗ ذِكْرَهٗ۔

''ہر دن میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جو وہ اپنے بندوں پر انعام کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اپنے ذکر سے افضل کوئی نعمت نہیں عطا کی''۔

یا حضرت رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے جس طرح فرمایا ہو۔ اس حدیث شریف کو حضرت منذری نے بیان فرمایا ہے۔

اور ذکر کے یہ فضائل تین ہیں۔

پہلی فضیلت :۔ یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنا ذاکر بنایا۔ ورنہ ایک ذلیل بندے کی کیا حیثیت ہے کہ ایک جلیل القدر آقا کا ذکر کرے۔ لہذا اگر تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا۔ تو تم اپنی زبان پر اس کا ذکر جاری کرنے کے اہل نہ ہوتے۔

دوسری فضیلت: یہ ہے کہ تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ اس حیثیت سے مذکور بنایا۔ کہ جب تم اس کا ذکر کرتے ہو، تو وہ بھی تمہارا ذکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (فاذکرونی اذکرکم) ''تم لوگ مجھے یاد کرو۔ تو میں تم لوگوں کو یاد کروں گا''۔

اور تمہارے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے سبب، جب اللہ تعالیٰ نے تمہارا ذکر کیا۔ تو تمہاری خصوصیت اس کے پاس ثابت ہوگئی۔ لہذا اس سے بڑی فضیلت کیا ہے؟ کہ اس نے تمہارے لئے خصوصیت ثابت کر کے اپنی نسبت تمہارے ساتھ ثابت کر دی اور تم سے فرمایا: اے میرے ولی اور اے میرے صفی! (مقبول اور مخلص)

لہذا اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اپنا فضل و کرم نہ فرماتا۔ تو کہاں تم، اور کہاں یہ نسبت۔ (چہ

نسبت خاک رابا عالم پاک)

بعض مفسرین نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

(وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ) ''اور البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کا ذکر کرنا، بندے کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے بہت بڑا ہے۔

تیسری فضیلت:۔ یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نزدیک مقربین فرشتوں میں تم کو مذکور بنایا۔ یعنی تمہارا ذکر کیا۔

چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف میں ہے۔ انہوں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمائی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ حِيْنَ يَذْكُرُنِیْ، فَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ، وَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِیْ مَلَاٍ خَيْرٌ مِّنْ مَلَاءٍ، وَاِنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ شِبْراً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعاً وَاِنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعاً ، وَاِنْ اَتَانِیْ يَمْشِیْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً۔

''میں اپنے بندے کے اس گمان کے ساتھ .... ہوں، جو وہ میرے ساتھ رکھتا ہے۔ اور جس وقت وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ اس وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ پھر اگر وہ میرا ذکر اپنے دل میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اپنے دل میں کرتا ہوں۔ اور اگر وہ میرا ذکر کسی جماعت میں کرتا ہے۔ تو میں اس کا ذکر اس کی جماعت سے بہتر جماعت (یعنی فرشتوں کی جماعت) میں کرتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت کے برابر قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ کے برابر قریب ہوتا ہوں۔ اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے برابر قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دونوں ہاتھ پھیلانے کے برابر قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں''۔

اور دوسری حدیث شریف میں ہے:۔

مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِساً يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ فِيْهِ اِلَّا غَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنْ عِنْدَهٗ

''جب کوئی جماعت کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اس جماعت میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہے یعنی فرشتوں کی جماعت میں۔''

حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے :- اے غافل ! اے جاہل ! اگر تم قلم چلنے کی آواز اس وقت سنتے، جب وہ تمھارا ذکر لوح محفوظ میں لکھتا ہے۔ تو تم خوشی کی زیادتی سے مر جاتے۔

لہذا اگر تمھارے اوقات اللہ تعالےٰ کے ذکر میں گذریں۔ تو تمھاری عمر دراز ہے۔ اگر چہ اس کی مدت کم ہو۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے :-

رُبَّ عُمْرٍ اِتَّسَعَتْ اٰمَادُهٗ وَ قَلَّتْ اِمْدَادُهٗ ، وَ رُبَّ عُمْرٍ قَلِيْلَةٌ اٰمَادُهٗ كَثِيْرَةٌ اِمْدَادُهٗ

''بہت سے عمریں ہیں، جن کی مدتیں دراز ہوتی ہیں، لیکن ان کے فوائد کم ہوتے ہیں۔ اور بہت سی عمریں ہیں، جن کی مدتیں کم ہوتی ہیں، لیکن ان کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں :- بہت سی عمریں جن کی مدتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یعنی بہت سے لوگ ہیں کن کی عمریں لمبی اور ان کی مدتیں دراز ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے فوائد کم ہوتے ہیں۔ لہذا ان کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بیہودہ کاموں اور کوتاہیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے عمر کی یہ قیمتی مدتیں نیند کے خیالات اور پریشان خوابوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔

اور بہت عمریں ایسی ہیں۔ جن کی مدتیں کوتاہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے فوائد زیادہ ہوتے ہیں۔ لہذا وہ تھوڑی سی مدت میں علم اور اعمال اور معارف و اسرار کے وہ فوائد حاصل کر لیتے ہیں، جو دوسرے لوگ مدت دراز میں حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔

اور اس کی مثال :- سلوک کے ساتھ اہل جذب اور صرف اہل سلوک ہیں۔ کیونکہ اہل جذب جو سالکین کے موافق عمل کرتے ہیں۔ وہ ایک گھڑی میں قرب کا وہ فاصلہ طے کر لیتے ہیں، جو اہل سلوک برسوں میں نہیں طے کر پاتے ہیں۔ اور یہ حضرات اہل خدمت کے ساتھ اہل فکر ہیں۔

فِكْرَةُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَبْعِيْنَ سَنَةٍ

''ایک گھڑی کی فکر ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔''

اسی کے بارے میں ایک شاعر نے فرمایا:-

كُلُّ وَقْتٍ مِّنْ حَبِيْبِيْ قَدْرُهٗ كَالْفِ حَجَّهْ

''میرے دوست کے ہر وقت کی مقدار ہزار سال کے برابر ہے۔''

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- ہمارے سب اوقات شب قدر ہیں۔یعنی ہمارا ہر وقت دوسروں کے ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

حضرت قاضی ابوبکر بن عربی مغافری، حضرت امام غزالی رضی اللہ عنہ کے شاگرد نے فرمایا ہے:- میں نے حضرت ابو حامد غزالیؒ کو ان کی مخلوق سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اور ان کے اس علم ظاہر اور علم باطن کی فیض یابی سے لوگوں کو محروم کر دینے پر، جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، ملامت کی۔تو حضرت غزالیؒ نے مثال کے طور پر فرمایا:-

قَدْ تَيَمَّمْتُ بِالصَّعِيْدِ زَمَانًا وَ اَنَا الْاٰنَ قَدْ ظَفِرْتُ بِالْمَاءِ

''میں ایک مدت تک مٹی سے تیمّم کرتا رہا۔اور اب میں پانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

(یعنی ایک مدت تک میں ظاہر پر عمل کرتا رہا۔اور اب میں نے حقیقت کو پالیا۔'')

مَنْ سَرٰى مُطْبِقُ الْجُفُوْنِ وَاَضْحٰى فَاتِحًا لَا يَرُدُّهَا لِلْعَمَاءِ

''جو شخص آنکھیں بند ہونے کی حالت میں چل رہا تھا۔اور اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔تو وہ پھر اپنی آنکھوں کا اندھی ہونا گوارا نہ کرے گا۔'' (یعنی میں اندھا تھا اس لئے میری نظر صرف ظاہر اور مخلوق پر تھی۔اور اب میں بینا ہو گیا ہوں۔لہذا ظاہر اور مخلوق سے کنارہ کش ہو کر صرف خالق پر نظر رکھتا ہوں) حضرت ابوبکر فرماتے ہیں:- میں نے کہا:- یا حضرت! علم کے ساتھ مشغول ہونے میں عام فائدہ ہے۔اور وہ عبادتوں سے افضل ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ

اگر اللہ تعالیٰ تمھارے ذریعے ایک شخص کو بھی ہدایت فرمادے۔ تو یہ تمھارے لئے ان تمام چیزوں سے بہتر ہے، جن پر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔''

تو حضرت غزالیؒ نے جواب دیا:- جب ارادت کے افق میں نیک بختی کا چاند نکل آیا۔ اور اصول کی زمین پر وصول کا سورج روشن ہوگیا۔ تو:-

تَرَکْتُ هَوٰی سُعْدٰی وَلَیْلٰی بِمَعْزَلٍ وَصِرْتُ اِلٰی عَلْیَاءِ اَوَّلِ مَنْزِلِ

''میں نے سعدیٰ اور لیلیٰ کی محبت کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور میں پہلی منزل کی بلندی کی طرف منتقل ہوا۔

فَنَادَتْنِیْ الْاَکْوَانُ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ اَلَا اَیُّهَا السَّاعِیْ رُوَیْدَکَ فَاَمْهِلِ

''پھر مجھ کو مخلوق نے ہر طرف سے پکارا:- اے دوڑنے! ذرا ٹھہر جا۔ یا اے کوشش کرنے والے!

غَزَلْتُ لَهُمْ غَزْلًا رَقِیْقًا فَلَمْ اَجِدْ لِغَزْلِیْ نَسَّاجًا فَکَسَّرْتُ مِغْزَلِیْ

''میں نے ان کے لئے باریک دھاگا تیار کیا۔ لیکن میں نے اپنے تیار کردہ دھاگے کا کوئی بننے والا نہیں پایا۔ تو میں نے چرخا ہی توڑ ڈالا''

لہذا تم اس شخص کو دیکھو جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر کی برکت سے آگاہ فرمایا اور اس کے وقت کا نتیجہ اس کو دکھایا۔ کس طرح اس نے مضبوط سے مضبوط اور بہتر سے بہتر کو اختیار کیا۔ تا کہ وہ ان فوائد کو حاصل کرے جن کی طرف تم شوق سے دیکھتے ہو۔ اور خصوصیتوں اور فضیلتوں سے سرفراز ہو۔

حضرت شطیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:- حضرت شیخ احمد بن ابوالحواری رضی اللہ عنہ نے حضرت شیخ ابوسلیمان دارانی رضی اللہ عنہ سے کہا:- مجھ کو بنی اسرائیل پر رشک آتا ہے۔ حضرت ابوسلیمان نے دریافت کیا:- آپ کو بنی اسرائیل پر کس شی میں رشک آتا ہے۔ حضرت احمد نے کہا:- وہ آٹھ سو سال تک جنگلوں میں رہے۔ یہاں تک کہ وہ پرانی گھاس کی طرح زرد اور کمان کی طرح ٹیڑھے اور تانت کی طرح لاغر ہو گئے۔ حضرت ابوسلیمان نے فرمایا:- میں نہیں گمان کرتا ہوں کہ آپ نے کسی بہترین شی پر رشک کیا ہے۔ یہ قابل رشک شی نہیں ہے۔ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ ہم

سے یہ نہیں چاہتا ہے کہ ہمارے چمڑے خشک ہو کر ہماری ہڈیوں میں چمٹ جائیں۔ وہ ہم سے صرف اس میں صدق نیت چاہتا ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور نیت اگر دس دن میں صادق ہو جائے۔ تو وہ ان فضائل اور درجات کو حاصل کر لیتا ہے۔ جن کو دوسرے لوگ اپنی لمبی عمروں میں بھی نہیں حاصل کر پاتے ہیں۔

اور قوت القلوب میں بیان فرمایا ہے:- عمر میں برکت:- یہ ہے کہ تم اپنی مختصر عمر میں اپنی بیداری سے وہ مقامات اور اسرار حاصل کر لو، جو دوسرے شخص نے اپنی لمبی عمر میں اپنی غفلت سے کو دیا ہے۔ یعنی تمھارے سامنے وہ مقامات ایک سال میں اجائیں، جو اس کے سامنے بیس سال میں آئیں۔

اور مقربین میں سے خواص، مقامات قرب میں اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلی کے وقت بلند درجاتحاصل کر لیتے ہیں۔ اور ان اوقات میں وہ اپنے تھوڑے سے اذکار اور قلبی اعمال سے فوت شدہ اعمال کی تلافی کر لیتے ہیں۔

کیونکہ ان کے ذکر، یا تسبیح یا تہلیل، یا حمد وثنا، یا تدبر وتبصرہ یا فکر وتذکرہ، کا ہر ذرہ، قرب کے مشاہدہ اور رب تعالیٰ کے وجدان (پالینے) اور دوست کی طرف نظر کرنے اور قریب (اللہ تعالیٰ) سے نزدیک ہونے کے لئے، ان غافلین کے پہاڑ جیسے اعمال سے افضل ہے، جو اپنے نفوس کو دیکھتے اور مخلوق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اور عارفین کی مثال:- ان کے قرب اور حضور کے وقت، اپنی شہادت سے ان کے فنا ہونے اور اپنی امانت اور عہد کے رعایت کرنے میں، شب قدر میں عمل کرنے والے کی طرح ہے۔ شب قدر میں عمل کرنا، اس شخص کے لئے جو اس کے موافق عمل کرتا ہے، ہزار مہینے کے عمل سے افضل ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- عارف کی ہر رات شب قدر کے برابر ہے۔

لہذا عمر میں برکت:- مختصر زمانے میں بڑے بڑے فوائد کا حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ پہلے

بیان کیا جا چکا ہے۔اور جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول بین فرمایا ہے:-

مَنْ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْ عُمْرِهٖ اَدْرَكَ فِيْ يَسِيْرٍ مِنَ الزَّمَانِ مِنْ مِنَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَالَا يَدْخُلُ تَحْتَ دَوَائِرِ الْعِبَارَةِ وَلَا تَلْحَقُهُ الْاِشَارَةُ

’’جس شخص کو اس کی عمر میں برکت عطا کی جاتی ہے۔وہ کمتر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات میں سے اس قدر حاصل کر لیتا ہے۔جو تحریر کے دائروں سے باہر ہوتا ہے اور اشارہ بھی اس کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔‘‘

میں کہتا ہوں:-انسان کی عمر میں برکت:-اس کے دنوں کے زیادہ ہونے اور اس کے زمانوں کے لمبے ہونے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔بلکہ اس کے عمر میں برکت:-یہ ہے کہ عنایت الٰہی اس کے شامل حال ہو۔اور اس کے اوپر ہدایت کی ہوا چلے۔تاکہ وہ کم سے کم زمانے میں اللہ تعالیٰ کے احسانات یعنی اس کے علوم اور معارف و اسرار میں سے اس قدر حاصل کرے، جو تحریر اور تقریر کے دائروں میں نہ آ سکے۔کیونکہ جس قدر وہ حاصل کرے گا، وہ تحریر اور تقریر کی تنگی سے زیادہ وسیع ہو گا۔

حدیث قدسی میں ہے:-

اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَاَتْ ، وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَ لَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ

’’میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ انعامات تیار کر رکھے ہیں۔جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے۔نہ کسی آدمی کے قلب میں ان کا خیال گزرا ہے۔‘‘

لہذا عارف اسرار کی باریکیوں میں سے اتنا حاصل کر لیتا ہے۔جس کے بیان کرنے سے زبان عاجز ہوتی ہے۔اور یہ بہت ہی مختصر زمانے میں ہوتا ہے۔

اور ان میں سے اکثر، اہل اللہ کی ملاقات اور ان کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔کیونکہ ان کے ساتھ ایک گھڑی کی صحبت میں جو فیض اور فائدہ انسان کو حاصل ہوتا ہے۔وہ ان کے سوا دوسروں کی صحبت میں مدت دراز میں بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔اگرچہ ان لوگوں کی نمازیں اور روزے زیادہ ہوں۔اس لئے کہ اوراد و وظائف کی زیادتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔بلکہ اعتبار صرف فوائد کی زیادتی

کا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلَا اِلٰی اَمْوَالِکُمْ ، وَ اِنَّمَا یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ

''بیشک اللہ تعالےٰ نہ تمھاری صورتوں کو دیکھتا ہے، نہ تمھارے مالوں کو بلکہ وہ صرف تمھارے قلب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔'' اس حدیث کو جامع میں بیان کیا ہے۔

اور قلوب کے اعمال کا ایک ذرہ پہاڑ کی طرح جسمانی اعمال سے افضل ہے۔ اور جو عمل معرفت کے ساتھ ہو۔ وہ اس عمل کی طرح نہیں ہے جو جہالت کے ساتھ ہو۔ اور یہ بات معلوم اور مسلم ہے۔

حضرت شیخ حضرمیؒ نے اپنی بعض وصیتوں میں فرمایا ہے :- جو شخص جمع کی دوات سے مدد یعنی فیض حاصل کرتا ہے۔ وہ ان اشیاء کو بھی لکھتا ہے جو ہوتی ہیں اور ان اشیاء کو بھی لکھتا ہے جو نہیں ہوتی ہیں۔ (لمبا لمبا لمبا۔ کوتاہ کوتاہ کوتاہ۔ شی شی شی ۔ کوئی شی نہیں ہے۔ عدم عدم عدم ۔ وجود وجود وجود۔

یعنی حقیقت لمبی ہے۔ اور محسوس ظاہر کوتاہ ہے۔ اور قدیم موجود اللہ تعالےٰ شی ثابت ہے اور اس کے ماسوا کوئی شی نہیں ہے۔ اور ماسویٰ عدم ہے۔ اور اللہ واحد قہار وجود ہے۔

لہذا جو شخص جمع کی دوات سے لکھتا ہے یعنی جمع کی بارگاہ سے فیض حاصل کرتا ہے۔ وہ کل اشیاء کو لکھتا ہے اور کل اشیاء سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کل اشیاء میں خواہ وہ چھوٹی ہوں۔ یا بڑی، وجودی ہوں یا عدمی، اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

وَ بِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ

اور عمر میں برکت کا سبب :- شواغل، (اپنے میں مشغول کر کے غافل کرنے والی اشیاء) اور شواغب (تعلقات) سے فارغ ہونا ہے۔ لہذا جس شخص کے شواغل اور تعلقات زیادہ ہیں۔ اس کی عمر میں کچھ برکت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنے اور تمناؤں کے حاصل کرنے کے سبب اپنے مولائے حقیقی کی اطاعت سے رک جاتا ہے۔

اور جو شخص شواغل سے فارغ ہو کر بھی اپنے مولائے حقیقی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ انتہائی بدنصیب اور محروم ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی استقامت اور ہدایت کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔

جیسا کہ اس کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

اَلْخُذْلَانُ كُلُّ الْخُذْلَانِ اَنْ تَتَفَرَّغَ مِنَ الشَّوَاغِلِ ثُمَّ لَا تَتَوَجَّهُ اِلَيْهِ ، وَتَقِلَّ عَوَائِقُ ثُمَّ لَا تَرْحَلُ اِلَيْهِ

''بدنصیبی، بلکہ پوری بدنصیبی یہ ہے۔ کہ تم شواغل سے فارغ ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہوؤ۔ اور مانعات کے کم ہونے پر بھی تم اللہ تعالیٰ کی طرف سفر نہ کرو۔''

میں کہتا ہوں:۔ جب تمھارے ظاہری شواغل اور باطنی مانعات کم ہوں۔ پھر بھی تم اپنے ظاہر میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہو، اور اپنے باطن میں اللہ کی طرف سفر نہیں کرتے ہو۔ تو یہ تمھاری انتہائی بدنصیبی اور محروی کی علامت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے ان کے ظاہری مشغولیتوں کی کثرت ہی نے روکا ہے۔ کیونکہ ان کے جسمانی اعضارات اور دن اور مہینوں اور برسوں دنیا کی خدمت میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ ان کی پوری قیمتی عمر بیہودہ کاموں اور کوتاہیوں میں گزر گئی۔ لہذا یہی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

اور آدمیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جن کے ظاہری شواغل اس شخص کی وجہ سے کم ہیں جو ان کے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ (یعنی خادم یا ملازم) لیکن ظاہری تعلقات کی زیادتی کی وجہ سے ان کے باطنی تعلقات زیادہ ہو گئے ہیں۔ لہذا وہ تدبیر اور اختیار میں غرق ہیں۔ اور آدمیوں میں سے جن لوگوں سے ان کا تعلق ہے۔ انھیں کے کاموں کی تدبیر اور فکر میں مشغول ہو گئے ہیں۔ خاص کر جاہ و مرتبہ، ریاست و جاگیر ، سیاست وحکومت والوں کے کاموں کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ عادت کے اعتبار سے اپنے مولائے حقیقی کی طرف متوجہ ہونے سے بہت دور ہے۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی سابق عنایت اس کی طرف بڑھے۔ اور اس کو اس کے رب کی رحمت اور رضامندی کی طرف کھینچ لے۔

حاصل یہ ہے:- کہ کل بھلائیاں شواغل اور تعلقات کے کم کرنے ہی میں ہے۔ لہذا جو شخص ان دنوں سے فارغ ہو گیا۔ وہ بارگاہ الٰہی کی حضوری سے قریب ہو گیا۔

لیکن جس شخص کے شواغل اور تعلقات زیادہ زیادہ ہو گئے۔ اس کا معاملہ بہت دور ہے کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو کھینچنے والی اشیاء اس کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ اور وہ انھیں کے ساتھ گرد ہو کر باقی رہ جاتا ہے۔

مصنف ؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

اَلْفِكْرُ سَيْرُ الْقَلْبِ فِيْ مَيَادِيْنِ الْاَغْيَارِ

''فکر:- اغیار کے میدانوں میں قلب کا سیر کرنا ہے۔''

لہذا جس کے پاس فراغت نہیں ہے، اس کے پاس کوئی فکر نہیں ہے۔ اور جس کے پاس فکر نہیں ہے، اس کے لئے کوئی سیر نہیں ہے۔ اور جس کے لئے سیر نہیں ہے۔ اس کے لئے وصول نہیں ہے۔

لہذا فکر بارگاہ الٰہی کی طرف قلب کا سیر کرنا ہے۔ اور یہ سیر اغیار کے شہود کے میدانوں میں ہوتی ہے۔ تاکہ مخلوقات کے ذریعے انوار کے وجود کی طرف رہنمائی حاصل کرے اور یہ اہل حجاب کی فکر ہے۔

اور اہل شہود کی فکر:- انوار کے میدانوں میں روح کا سیر کرنا ہے۔ یا اسرار کے میدانوں میں سر کا سیر کرنا ہے۔

اور مصنف ؒ نے فکر کی ابتدا کو بیان کیا ہے۔ فکر کی انتہا کو بیان نہیں کیا۔ حالانکہ اگر دونوں کو ایک ساتھ بیان کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ جیسا کہ انھوں نے اس کے بعد جو عنقریب آئے گا۔ اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

اَلْفِكْرُ فِكْرَتَانِ

''فکر کی دو قسمیں ہیں۔''

حضرت شیخ زروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- فکر:- عالم غیب و شہادت میں قوت

ادراکیہ کو اس لئے ابھارنا ہے۔تاکہ وہ اشیا کی حقیقت کا ادراک اسی حالت میں کرے جس حالت میں وہ حقیقتاً ہیں۔اور جس شخص نے اس حقیقت کو پالیا۔وہی عارف ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے:- مصنفؒ نے اغیار کے ساتھ مخلوقات کی تعبیر حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی اس حدیث شریف کی بنا پر کی ہے۔

تَفَكَّرُوْا فِي الْخَلْقِ وَ لَا تَفَكَّرُوْا فِي الْخَالِقِ ، فَإِنَّكُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ اللهَ حَقَّ قَدْرِهٖ

''تم لوگ مخلوق میں فکر کرو۔اور خالق میں فکر نہ کرو۔کیونکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی قدر ویسی نہیں کر سکتے ہو جیسی اس کی قدر کرنی چاہئے۔

میں کہتا ہوں:- حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے صرف اللہ تعالےٰ کی ذات اقدس کی ماہیت اور حقیقت کے ادراک میں فکر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن ذات اقدس کی عظمت اور قدامت اور بقا اور وحدانیت اور ظاہری و باطنی تجلیات میں فکر کرنا۔تو اس سے منع نہیں فرمایا ہے۔کیونکہ یہ فکر، ذات کی حقیقت کے ادراک سے عاجزی کے ساتھ،معرفت الٰہی کا سبب ہے۔

اور تحقیق یہ ہے:- اہل حجاب کے لئے مصنوعات میں فکر کرنا درست ہے۔اور اہل عرفان :- ذات اقدس کی عظمت یعنی صانع مطلق کی عظمت اور توحید اور قدامت اور بقا اور ظہور اور احتجاب اور ظاہر سے غائب ہونے اور حقیقت کے شہود، یا خالق کے شہود کے ساتھ مخلوق سے غائب ہونے، یا نور کے شہود کے ساتھ ظلمت سے غائب ہونے میں فکر کرتے ہیں۔

اور فکر:- قلب کا چراغ ہے۔جس کی طرف مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

اَلْفِكْرَةُ سِرَاجُ الْقَلْبِ ، فَإِذَا ذَهَبَتْ فَلَا إِضَاءَةَ لَهٗ

''فکر قلب کا چراغ ہے۔لہٰذا جب وہ ختم ہو جاتی ہے۔تو قلب کے لئے کوئی روشنی باقی نہیں رہتی ہے۔''

میں کہتا ہوں:- باری تعالےٰ کی عظمت اور اس کی توحید میں فکر کرنا نور ہے۔لہٰذا جب

قلب اللہ تعالیٰ کی عظمت کی فکر میں مشغول ہوتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن رہتا ہے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی فکر سے خالی ہوتا ہے۔ تو اس میں غیروں کی فکر داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہ ظلمت یعنی تاریکی ہے۔ اور ظلمت اور نور دونوں ایک ساتھ کبھی جمع نہیں ہوتے ہیں۔

لہذا فکر قلب کا چراغ ہے۔ تو جب فکر ختم ہو جاتی ہے۔ تو قلب کا چراغ بجھ جاتا ہے اور اس میں مخلوق کی تاریکی داخل ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں کوئی روشنی باقی نہیں رہتی ہے۔

اسی لئے حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:-

سب مجلسوں سے اعلیٰ و اشرف مجلس توحید کی فرش پر فکر کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھنا ہے۔

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- چار چیزیں ایسی ہیں، کہ جو شخص ان چاروں کو اپنے اندر پیدا کرے وہ صدیقین مقربین میں سے ہے۔ اور جو شخص اپنے اندر ان میں سے تین پیدا کرے، وہ اولیاء مقربین میں سے ہے۔
اور جو شخص اپنے اندر ان میں سے دو پیدا کرے، وہ شہداء مؤمنین سے ہے اور جو شخص ان میں سے ایک اپنے اندر پیدا کرے، وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں میں سے ہے۔

پہلی چیز:- ذکر ہے اور اس کا فرش عمل صالح ہے۔ اور اس کا پھل، نور ہے۔

دوسری چیز:- فکر ہے اور اس کا فرش صبر ہے۔ اور اس کا پھل علم ہے۔

تیسری چیز:- فقر ہے اور اس کا فرش شکر ہے اور اس کا پھل، فقر میں زیادتی ہے۔

چوتھی چیز:- محبت ہے اور اس کا فرش، دنیا اور اہل دنیا سے بغض ہے۔ اور اس کا پھل، محبوب حقیقی تک پہنچنا ہے۔

پھر مصنف ؒ نے ابتدا اور انتہا کی فکر کو بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا:-

اَلْفِكْرُ فِكْرَتَانِ :- فِكْرَةُ تَصْدِيْقٍ وَ اِيْمَانٍ ، وَ فِكْرَةُ شُهُوْدٍ وَ عَيَانٍ

''فکر دو قسم کی ہے:- ایک قسم:- تصدیق اور ایمان کی فکر ہے۔ اور دوسری:- شہود وعیان کی فکر ہے۔

میں کہتا ہوں:- اہل تصدیق وایمان کی فکر:- وہ اغیار کے میدانوں میں قلب کا سیر کرنا ہے۔ لہذا وہ لوگ مصنوعات ومخلوقات میں فکر کرتے ہیں۔ تا کہ وہ صانع حقیقی اور اس کی قدرت اور علم اور حیات اور ان کے علاوہ دوسری صفات کی معرفت تک پہنچیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-(يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ)

''وہ لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔''

اور اہل شہود وعیاں کی فکر:- وہ انوار کے میدانوں میں روح کا سیر کرنا ہے۔ اور ان کے حق میں اغیار، انوار اور دلائل، مدلولات ہو گئے۔ اور غیب، شہادت بن گیا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے راز سے آگاہ فرمایا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''آپ فرما دیجئے:- تم لوگ اس میں غور کرو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

پھر مصنفؒ نے دونوں فریق کا حال بیان فرمایا:-

فَالْاُوْلٰى لِاَرْبَابِ الْاِعْتِبَارِ

''پہلی فکر، اہل اعتبار کے لئے ہے۔''

میں کہتا ہوں:- پہلی فکر یعنی تصدیق وایمان کی فکر، اہل اعتبار کے لئے ہے۔ اور وہ اہل استدلال ہیں، جو صنعت سے صانع کی طرف رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اور وہی لوگ انوار توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے والے ہیں۔

وَالثَّانِيَةُ لِاَرْبَابِ الشُّهُوْدِ وَالْاِسْتِبْصَارِ

''اور دوسری فکر، اہل شہود واہل بصیرت کے لئے ہے۔''

میں کہتا ہوں:- دوسری فکر یعنی شہود وعیان کی فکر، اہل شہود اور اہل بصیرت کے لئے ہے۔ کیونکہ وہ لوگ دلیل سے ترقی کر کے مدلول تک اور مخلوق سے ترقی کر کے خالق تک اور اغیار سے ترقی کر کے انوار کے شہود تک اور فرق سے ترقی کر کے جمع تک اور ملک سے ترقی کر کے ملکوت تک

پہنچ گئے ہیں۔ لہذا وہ ملکوت کے انوار کو جبروت کے سمندروں سے اچھل کر آتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں۔ لہذا وہ انوار کے سمندروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور مخلوقات کا وجود ان سے گم ہے۔ پھر اگر وہ مخلوقات کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ تو وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف قائم دیکھتے ہیں۔

لہذا ان کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے پاس کتنی بڑی ہے اور وہ لوگ کتنے عظیم الشان ہیں۔

اور ایسے ہی حضرات کی شان میں ایک عارف شاعر نے فرمایا ہے :-

هُمُ الرِّجَالُ وَ غُبْنٌ اَنْ يُّقَالَ لِمَنْ ۔۔۔ لَمْ يَتَّصِفْ بِمَعَانِيْ وَصْفِهِمْ رَجُلُ

''وہی لوگ اہل اللہ ہیں اور جو شخص ان کے وصف کی حقیقتوں سے موصوف نہ ہو، اس کو اہل اللہ کہنا یا سمجھنا خیانت ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہم کو اس حقیقت تک پہنچائے، جس حقیقت تک ان کو پہنچایا ہے۔

آمین

یہاں پچیسواں باب ختم ہوا۔ اور اسی پر اس کتاب کے ابواب ختم ہو گئے۔ اور اب صرف مراسلات اور مناجات باقی ہیں۔

مراسلات

پہلا مراسلہ

سلوک کے بیان میں

مراسلہ:۔ کے معنی مکتوب۔ مراسلات:۔ مکتوبات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ کے کل مکتوبات کا حاصل، تین مکتوبات ہیں۔ جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

سلوک اور اس کی ابتداء اور انتہا

پہلا مکتوب:۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف سلوک اور اس کی ابتداء اور انتہا کے بیان میں ارسال کیا گیا۔

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض اصحاب کو یہ مکتوب تحریر فرمائی۔

(اَمَّا بَعْدُ ، فَاِنَّ الْبِدَ ایَاتِ مُجَلَّاتُ النِّھَا یَاتِ)

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد، تم یہ معلوم کرو کہ ابتداء، انتہا کا مظہر ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں:۔ ابتداء:۔ اس مجاہدہ اور مکابدہ اور صدق اور تصدیق کا نام ہے، جو طریقت میں داخل ہونے کے شروع ہی میں مرید پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ انتہا کا مظہر اور تجلی گاہ ہے۔ یعنی جو انتہا میں ہوتا ہے، وہ ابتداء میں ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا جس شخص کی ابتداء روشن ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی روشن ہوتی ہے۔

لہٰذا جس شخص کو ہم دیکھتے ہیں، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طلب میں کوشش کرتا ہے اور اپنا نفس، جان و مال اور عزت و مرتبہ عبودیت کے حقوق، اور ربوبیت کے وظائف کے ساتھ قائم رہنے کے مقام پر پہنچنے کیلئے خرچ کرتا ہے۔ تو ہم یہ جان لیتے ہیں کہ اس کی انتہا روشن ہوگی اور وہ اپنے محبوب حقیقی تک

پہنچ جائے گا۔

اور جب کسی شخص کو ہم مذکورہ بالا امور میں کوتاہی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ وہاں تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔

اسی بارے میں ایک عارف کے اشعار ہیں:۔

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِىْ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهَرَ اللَّيَالِىْ

"محنت اور کوشش کے مطابق بلند مرتبے حاصل ہوتے ہیں۔ اور جو شخص بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ شب بیداری کرتا ہے"۔

تُرِيْدُ الْعِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلاً يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِىْ

"تم عزت اور مرتبہ چاہتے ہو پھر رات کو سوتے ہو۔ حالانکہ جو شخص موتیاں حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ سمندر میں غوطہ لگاتا ہے"۔

لہٰذا جس شخص کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ عزم و ارادے کا سچا ہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ وہ اہل عنایت میں سے ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی عنایت اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے)

اور جو شخص اپنے سلوک میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ اپنے سلوک کی انتہا میں اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اس سے آگاہ فرمایا ہے:۔

وَمَنْ كَانَتْ بِاللّٰهِ بِدَايَتُهٗ كَانَتْ اِلَيْهِ نِهَايَتُهٗ

"جس شخص کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے اس کی انتہا اسی کی طرف ہوتی ہے۔"

میں کہتا ہوں:۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ابتداء یہ ہے کہ کسی عمل اور حال اور مجاہدہ اور مکابدہ میں اپنے نفس کیلئے کوئی اختیار اور قوت نہ دیکھے۔ بلکہ اس سے جو بھی عمل اور حال ظاہر ہو اس کو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا احسان، اور اپنی طرف اللہ تعالیٰ کو ہدیہ سمجھے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کی حالت اس طرح ہو، تو بیشک اس کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہے اور اس کی انتہا اسی کی طرف ہوگی۔

اور ان اشیاء میں سے جو ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی طرف نظر (توجہ) رکھنے کو مضبوط کرتی ہیں۔

شریعت اور طریقت کے اس علم کو درست کرنا ہے۔ جس کی حاجت اس کو اپنے سلوک میں ہوتی ہے۔
کیونکہ بغیر علم کے عمل گناہ ہے اور بغیر عمل کے علم بے مقصد وسیلہ ہے۔

اسی کے بارے میں ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:-

اِذَا كُنْتَ ذَا عَمَلٍ وَلَمْ تَكُ عَالِمًا فَأَنْتَ كَذِیْ رِجْلٍ وَلَیْسَ لَهٗ نَعْلُ

"اگر تم اہل عمل ہو، لیکن اہل علم نہیں ہو، تو تم اس پاؤں والے کی طرح ہو جس کے پاس جوتا نہیں ہوتا"۔

وَاِنْ كُنْتَ ذَاعِلْمٍ وَلَمْ تَكُ عَامِلاً فَأَنْتَ كَذِیْ نَعْلٍ وَلَیْسَ لَهٗ رِجْلُ

"اگر تم اہل علم ہو لیکن عمل نہیں کرتے ہو، تو تم اس جوتے والے کی طرح ہو جس کے پاس پاؤں نہیں ہیں"۔

جَوَادُكَ مَسْبُوْق" اِلٰی كَلِّ غَایَةٍ وَهَلْ ذُوْجَوَادٍ رِیْءَ یَسْبِقُهُ الْبَغْلُ

"تمہارا تیز رفتار گھوڑا ہر مقصد تک پہنچ جاتا ہے، اور کیا کسی گھوڑے سوار سے خچر آگے بڑھ جاتا ہے"۔

میں نے ان اشعار کو مکمل کرنے کیلئے ایک شعر ان میں شامل کیا ہے:-

وَاِنْ كُنْتَ ذَا عِلْمٍ وَّحَالٍ وَّهِمَّةٍ جَوَادُكَ سَابِق" یَصِحُّ لَهُ الْوَصْلُ

"اور اگر تم اہل علم اور اہل حال اور اہل ہمت ہو، تو تمہارا گھوڑا آگے بڑھ جائے گا اور اس کیلئے پہنچنا یقینی ہو جائے گا"۔

لہٰذا جب مرید کو اپنی طہارت اور نماز اور روزے کی وہ مضبوطی حاصل ہو جائے جس کی اس کو ابتداء میں حاجت ہوتی ہے تو اس کو اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہنا چاہیے اور جو اشیاء اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتی ہیں، ان سے منہ پھیر لینا چاہیے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

وَالْمُشْتَغِلُ بِهٖ هُوَ الَّذِیْ اَحْبَبْتَهٗ وَسَارَعْتَ اِلَیْهِ ، وَالْمُشْتَغِلُ عَنْهُ هُوَ الْمُؤَثَّرُ عَلَیْهِ

"وہ شَی جس کے ساتھ تم مشغول رہتے ہو، وہی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو اور اسی کی طرف دوڑتے ہو، اور وہ شَی جس سے تم غافل ہوتے ہو، وہی ہے جس پر تم اپنے محبوب کی محبت کو ترجیح دیتے ہو"۔

میں کہتا ہوں:۔ مصنفؒ کی عبارت میں الف لام (اَلْ) دونوں جگہ موصول ہے۔ یعنی وہ شَی جس کے ساتھ تم ہمہ وقت مشغول رہتے ہو اور جس کی طرف تم ہمہ تن متوجہ رہتے ہو وہی محبوب حقیقی ہے، جس کی طرف تم دوڑتے ہو۔ اور تمہارے سب اشغال سے بہتر شغل اسی محبوب کا ذکر ہے۔ لیکن ایک ذکر اور ایک ارادہ چاہیے، جو تم کو تمہاری مراد یعنی تمہارے محبوب تک پہنچادے۔

اور وہ شَی جس سے تم غافل یعنی غائب رہتے ہو وہی ہے جس کو تم نے چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو اس پر ترجیح دی۔

حاصل یہ ہے:۔ جس کے ساتھ تم مشغول ہوتے ہو اور جس کا تم ارادہ کرتے ہو وہ وہی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو اور اس کی طرف پہنچنے میں تم جلدی کرتے ہو اور جس سے تم غائب رہتے ہو، وہ وہی ہے، جس کو تم نے چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو اس پر ترجیح دی ہے۔ تو یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے مقصود یعنی محبوب تک پہنچادے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ الْعَبْدَ عَلٰى قَدْرِ هِمَّتِهٖ "بیشک اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی ہمت کے مطابق روزی عطا فرماتا ہے"۔

(یعنی اللہ تعالیٰ بندے کو عبادت کی توفیق اس کی ہمت کے مطابق عطا فرماتا ہے) اسی کے متعلق ایک عارف کے یہ اشعار ہیں:۔

اِذَاالْعَبْدُ اَلْقٰى بَيْنَ عَيْنَيْهِ عَزْمَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ كُلِّ الشَّوَاغِلِ جَانِبًا

"جب بندہ اپنے ارادے کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور تمام شواغل سے منہ پھیر کر کنارہ کش ہو جاتا ہے"۔

فَقَدْ زَالَ عَنْهُ الْعَارُ بِالْعَزْمِ جَالِبًا عَلَيْهِ قَضَاءُ اللّٰهِ مَا كَانَ جَالِبًا

"تو اس کے ارادے کے سبب عیب اس سے دور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قضا جو چاہتی ہے

اس کے اوپر جاری کرتی ہے"۔

بیان کیا گیا ہے:۔صادق کی علامت یہ ہے کہ وہ انتہا کے بغیر کبھی راضی نہیں ہوتا ہے۔ باوجودیکہ انتہا کبھی حاصل نہیں ہوتی ہے۔

حضرت فضیل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص کو تم دیکھو کہ اس کا کلام حکمت ہے اور اس کی خاموشی فکر ہے اور اس کی نظر نصیحت ہے تو تم لوگ اس سے بدگمانی نہ کرو کیونکہ اس نے اپنی عمر عبادت میں گزاری ہے اور اس کا سلوک ہمیشہ بڑھ رہا ہے اور جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ لمبی امیدیں رکھتا، اور بد اعمالی کرتا ہے تو تم سمجھ لو کہ اس کا مرض سخت اور مہلک ہے۔

اور سب سے بڑی شئی جس سے مرید غافل ہوتا اور اس سے غائب ہوتا ہے وہ دنیا کی محبت ہے کیونکہ وہ زہر قاتل ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سیر، دنیا کی محبت سے قلوب کی صفائی کے بغیر ممکن نہیں ہے اگرچہ اس کی محبت کا کچھ اثر باقی رہے اور دنیا کی محبت تھوڑی بھی بہت ہے۔

روایت ہے:۔ کہ ایک مرید ایک رات اپنی عبادت کیلئے کھڑا ہوا تو اس نے اپنے قلب کو حاضر نہیں پایا اس نے اپنے دل میں کہا جب صبح ہوگی تو میں اس شیطانی وسوسے کی شکایت شیخ سے کروں گا تو شیطان نے شیخ کے سامنے آکر کہا آپ کا فلاں مرید آپ سے میری شکایت کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ حالانکہ میں نے اس کے اوپر کچھ ظلم نہیں کیا ہے، دنیا میرا باغیچہ ہے اور میں اس کا محافظ ہوں۔ لہٰذا جو شخص میری کوئی چیز لے گا تو میں اس کو اس وقت تک ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک وہ میری اس چیز کو نہ چھوڑ دے جو اس نے لی ہے۔ جب صبح ہوئی، تو مرید شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے اس سے فرمایا: ابلیس میرے پاس آکر تمہاری شکایت کر رہا تھا، تم نے اس کی کونسی چیز لے لی ہے؟ مرید نے کہا: یا حضرت میرا کپڑا پھٹ گیا ہے اس لیے مجھکو سوئی کی خواہش ہوئی تاکہ میں اس میں پیوند لگاؤں لہٰذا رات بھر میں سوئی ہی کی فکر میں مبتلا رہا۔ شیخ نے فرمایا: تم کپڑا ہی اتار کر اس کو دیدو اور اپنے نفس سے کہہ دو کہ موت اس سے زیادہ قریب ہے لہٰذا اس نے کپڑا اتار کر پھینک دیا تب اس نے اپنے قلب کو حاضر پایا۔

اسی کے متعلق ایک عارف کے ہی اشعار ہیں:۔

لَا تَحْقِرَنَّ ضَعِيفًا عِنْدَ رُؤْيَتِهٖ   اِنَّ الْبَعُوْضَةَ تَدْمِيْ مُقْلَةَ الْاَسَدِ

"تم کسی کمزور کو دیکھ کر اس کو حقیر نہ سمجھو، کیونکہ بیشک مچھر شیر کی آنکھ زخمی کر کے خون نکال دیتا ہے"۔

وَلِلشَّرَارَةِ حَقْرٌ" حِيْنَ تَنْظُرُهَا   وَرُبَّمَا اَضْرَمَتْ نَارًا عَلٰى بَلَدِ

"اور تم لوگ آگ کی ایک چنگاری کو دیکھ کر اس کو حقیر سمجھتے ہو، لیکن اکثر اوقات وہ ایک شہر کو آگ سے جلا ڈالتی ہے"۔

پھر وہ ذات اقدس جس کے ساتھ تم مشغول ہوتے ہو اور اس کی طرف پہنچنے میں تم جلدی کرتے ہو۔ وہ بھی تم کو چاہتا ہے اور تمہاری طرف پہنچنے میں جلدی کرتا ہے اور اگر تم اس کی طرف ایک بالشت قریب ہوتے ہو تو وہ تمہاری طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

وَمَنْ اَيْقَنَ اَنَّ اللّٰهَ يَطْلُبُهٗ صَدَقَ الطَّلَبَ اِلَيْهِ

"جس نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اس کو چاہتا ہے وہ اس کی طرف توجہ اور اس کی طلب کو صادق کر لیتا ہے"۔

میں کہتا ہوں:- یقین قلب کا ایسا سکون اور اطمینان ہے کہ اس میں کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہ باقی رہے اور نہ کسی معاملے میں کوئی شک باقی رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا بندے کو چاہنا کئی وجھوں سے ہے۔

ایک وجہ:- یہ ہے کہ بندے کو اس لیے چاہتا ہے کہ وہ عبودیت کے حقوق، اور ربوبیت کے وظائف کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

دوسری وجہ:- یہ ہے کہ بندے کو اپنی طرف متوجہ ہونے اور اپنے ماسوا سے نفرت کرنے کے سبب چاہتا ہے۔

تیسری وجہ:- یہ ہے کہ وہ بندے کو اپنی بارگاہ میں ادب اور محبت کے ساتھ بیٹھے رہنے کے سبب چاہتا ہے۔

لہٰذا جو شخص یہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان وجوہ سے چاہتا ہے تو وہ اس کی طلب کو سچا کر لیتا ہے۔

اور صدق طلب یعنی طلب کی سچائی:۔ قلب اور جسم کو مطلوب کیلئے ایسا تنہا کر لینا ہے کہ اس کی کوئی توجہ اس کے غیر کی طرف باقی نہ رہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا سہارا نہ لے اور اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرے۔

جیسا کہ اس کی طرف مصنف ؒ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وَمَنْ عَلِمَ اَنَّ الْاَ مْرَ كُلَّهٗ بِيَدِهٖ اِنْجَمَعَ بِالتَّوَكُّلِ عَلَيْهِ

"اور جس شخص نے یہ جان لیا یہ سب امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ اس پر توکل کے ساتھ جمع رہتا ہے یعنی ثابت قدمی سے قائم رہتا ہے"۔

میں کہتا ہوں:۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ "اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سب امور لوٹتے ہیں۔ لہٰذا آپ اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ رکھیے"۔ اور دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ "آپ فرما دیجیے، بیشک تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں"۔

لہٰذا جو شخص یہ یقین کر لیتا ہے کہ دنیا و آخرت اور نفوس و قلوب کے سارے امور اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ تو اس کی نظر اس کے ماسوا کی طرف باقی نہیں رہتی ہے اور وہ اپنے کل کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ثابت قدمی سے جمع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ "جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کیلئے کافی ہے"۔

اور جس شخص کیلئے اللہ تعالیٰ کافی ہو جائے تو اس سے کون سی شئی فوت ہو سکتی ہے؟

حکایت: ایک شیخ اپنے مریدین کے ساتھ حجاز کے میدان میں بغیر توشہ کے داخل ہوئے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد بھوک نے ان کو ستایا اور وہ بہت تکلیف میں مبتلا ہو گئے تو شیخ توکل کے راستے سے پھر گئے اور ایک درخت کو ہلایا، اس درخت سے پختہ کھجوریں گریں۔ ایک نوجوان کے سوا

سب لوگوں نے ان کھجوروں کو کھایا۔ شیخ نے اس نوجوان سے دریافت کیا: تم نے کیوں نہیں کھایا؟ اس نوجوان نے جواب دیا میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کی نیت کی ہے اور کل اسباب کو ترک کر دیا ہے تو اب میں آپ کو اپنے لیے سبب کیوں بنالوں تاکہ نفس اس کا مشتاق ہو جائے جو میں نے آپ ہی سے معلوم کیا ہے۔ پھر وہ نوجوان اپنے یقین کو درست رکھنے، اور اپنے عہد کو پورا کرنے کیلئے ان لوگوں کی صحبت ترک کر کے علیحدہ ہو گیا۔

اور ان اشیاء میں سے جو یقین کو مضبوط کرنے، اور توکل کو خالص کرنے میں مدد کرتی ہیں دنیا اور اہل دنیا کو ترک کر دینا ہے۔

اسی کی طرف مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

وَاِنَّهٗ لَا بُدَّ لِبَنَاءِ هٰذَا الْوُجُوْدِ اَنْ تَنْهَدِمَ دَعَائِمُهٗ ، وَاَنْ تَسْلُبَ كَرَائِمُهٗ۔

"اور یہ ضروری ہے کہ اس وجود کی بنیاد کے ستون منہدم ہو جائیں اور اس کی زینتیں ختم ہو جائیں"۔

میں کہتا ہوں:- اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری وجود کیلئے یہ حکم جاری کیا ہے، کہ وہ باطن ہو جائیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کے ستون منہدم ہو جائیں۔

اور ستون:- وہ اشیاء ہیں جن کے ذریعے کسی شی جو عادتاً قائم رہتا ہے اور وہ یہاں ظاہری وجود کے منہدم ہونے اور اس کے دوسرے خلقت میں تبدیل ہونے کیلئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوَاتِ

"جس دن یہ زمین اور آسمان دوسری زمین اور آسمان سے بدل دیئے جائیں گے"۔

اور اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے:-

كُلُّ شَيْئٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

"اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شی ہلاک ہو جانے والی ہے"۔ اہل ظاہر کی تفسیر کے مطابق۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی زینتیں ختم ہو جائیں اور وہ دنیا کی وہ زینتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ

نے اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمائی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ

"خواہشات کی محبت انسان کیلئے مرغوب کردی گئی ہے"۔

لہٰذا جو شخص اس وجود کے فنا ہونے اور اس فانی عرض (دوسرے کی بنا پر قائم ہونے والی شی) کے ختم ہونے کا یقین کر لیتا ہے۔ وہ دنیا کو صرف گزرگاہ سمجھتا، اور اس سے گزر کر آخرت کی طرف چلا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی سختیوں پر صبر کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے دنیا کے دن گزر جاتے ہیں۔

اور یہی وہ عقلمند ہے جس کا بیان مصنفؒ نے اپنے اس قول میں فرمایا ہے:-

فَالْعَاقِلُ مَنْ كَانَ بِمَا هُوَ اَبْقٰى اَفْرَحَ مِنْهُ بِمَا هُوَ يَفْنٰى

"پس عقلمند وہ شخص ہے جو باقی رہنے والی اشیاء سے زیادہ خوش ہوتا ہے بہ نسبت فنا ہونے والی اشیاء کے"۔

میں کہتا ہوں:- اس لیے کہ عقل کی علامات وہ ہیں جو حدیث شریف میں بیان کی گئی ہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

اَلتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ ، وَالْاِ نَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالتَّزَوُّدُ لِسُكْنَى الْقُبُوْرِ وَالتَّاَهُّبُ لِيَوْمِ النُّشُوْرِ

"دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور آخرت کی طرف متوجہ ہونا اور قبر میں رہنے کیلئے توشہ کا انتظام کرنا اور قیامت کے دن کیلئے تیاری کرنا"۔

لہٰذا عقلمند وہ شخص ہے جو حق اور باطل اور مفید اور مضر اور اچھے اور برے میں تمیز کرتا ہے اور ہر فنا ہونے والی شی اگر چہ وہ زمانہ دراز تک قائم رہے، بری ہے اور ہر باقی رہنے والی شی اگر چہ وہ نظروں سے غائب ہو، اچھی ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:- ایسے شخص پر بہت تعجب ہے جو دنیا سے مطمئن اور اس کی طرف سے مائل اور اس پر حریص ہے حالانکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ دنیا جلد ختم ہو جاتی ہے اور وہ اہل دنیا سے اکثر بدل جاتی ہے اور اس کے حادثات اچانک آجاتے ہیں۔ اسی کو ایک عارف نے اشعار میں بیان

فرمایا ہے:-

أَيْنَ الْمُلُوْكُ وَأَبْنَاءُ الْمُلُوْكِ وَمَنْ　　كَانُوْا إِذَا النَّاسُ قَامُوْا هَيْبَةً جَلَسُوْا

"بادشاہ اور شہزادے اور وہ لوگ کہاں ہیں کہ جب وہ بیٹھتے تھے تو لوگ ان کی ہیبت اور خوف سے کھڑے رہتے تھے"۔

كَأَنَّهُمْ قَطُّ مَا كَانُوْا وَلَا خُلِقُوْا　　وَمَاتَ ذِكْرُهُمْ بَيْنَ الْوَرٰى وَنُسُوْا

"وہ اس طرح فنا ہو گئے گویا کہ وہ کبھی نہیں تھے اور پیدا ہی نہیں کیے گئے تھے اور مخلوق کے درمیان ان کی یاد ختم ہو گئی اور وہ بھلا دیے گئے"۔

حَطُّوْا الْمَلَابِسَ لَمَّا أُلْبِسُوْا حُلَلًا　　مِنَ التُّرَابِ عَلٰى أَجْسَادِهِمْ وَكُسُوْا

"انہوں نے اپنا بہترین لباس اتار دیا جبکہ ان کو مٹی کا لباس پہنا کر مٹی میں چھپا دیا گیا"۔

حکایت بہلول دانا

حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:- میں ایک روز قبرستان میں گیا۔ تو میں نے قبروں کے درمیان بہلول دیوانہ کو بیٹھا ہوا پایا۔ وہ برہنہ تھے صرف شرم گاہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تا کہ ان کی عجیب وغریب باتوں سے فائدہ حاصل کروں۔ میں نے ان کو اس حال میں پایا کہ وہ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور کبھی زمین کی طرف دیکھتے اور نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اور کبھی اپنی داہنی طرف دیکھتے اور ہنستے ہیں اور کبھی بائیں طرف دیکھتے اور روتے ہیں۔ میں نے ان کو سلام کیا انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے جو حالت ان کی دیکھی تھی۔ اس کے متعلق ان سے دریافت کیا:- انہوں نے جواب دیا۔ اے مالک! جب میں اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد کرتا ہوں:-

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔

"اور تم لوگوں کی روزی اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے، آسمان میں ہے"۔

لہٰذا میں خوش ہوتا ہوں۔ اور جب میں زمین کی طرف دیکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کو یاد کرتا ہوں:-

مِنْهَا خَلَقْنَا كُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى

"ہم نے تم لوگوں کو زمین سے پیدا کیا۔ اور ہم تو کو اسی میں لوٹاتے ہیں اور ہم تم کو دوبارہ اسی میں سے نکالیں گے"۔

پس اس سے میں نصیحت حاصل کرتا ہوں۔ اور جب میں اپنی داہنی طرف دیکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کو یاد کرتا ہوں:-

وَاَصْحَابُ الْيَمِيْنِ مَا اَصْحَابُ الْيَمِيْنِ

"اور دائیں طرف والے، دائیں والے کیا ہیں"۔

لہٰذا میں ہنستا ہوں۔ اور جب میں اپنی بائیں طرف دیکھتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کو یاد کرتا ہوں:-

وَاَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا اَصْحَابُ الشِّمَالِ

"اور بائیں طرف والے، بائیں طرف والے کیا ہیں"۔

تو میں روتا ہوں میں نے کہا:- اے بہلول! بیشک آپ حکیم ہیں کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کیلئے ایک سوتی قمیص خرید لاؤں؟ انہوں نے کہا: ہاں خرید لائیے۔ لہٰذا میں فوراً بازار گیا اور ایک قمیص لے کر ان کے پاس آیا۔ انہوں نے اس قمیص کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کو میری طرف پھینک دیا۔ اور فرمایا: میں ایسی قمیص نہیں چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا، آپ کیسی قمیص چاہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: میں ایسی قمیص چاہتا ہوں، جو اخلاص سے بنی ہو، ہر برائی اور عیب سے پاک ہو، جس روئی کے سوت سے وہ بنی ہو اس روئی کا درخت حقائق کی زمین میں لگایا گیا ہو، اور برائیوں اور خباثتوں سے اس کی حفاظت کی گئی ہو۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے سلسبیل کے پانی سے اس کو سینچا ہو جس سے وہ درخت بڑا ہوا ہو اور اس میں روئی کا پھل لگا ہو۔ پھر بزرگ اور مقبول فرشتوں نے سورۂ "الحمد" اور سورۂ "بقرہ" پڑھتے ہوئے اس پھل کو توڑا ہو۔ پھر وفا کے ہاتھوں نے عزت اور صفائی کے ساتھ جفا کی آمیزش کے بغیر اس روئی کو دھنا ہو۔ پھر ایسے تانتوں میں اس کو صاف کیا ہو جو انوار سے ملی ہوں اور حمد وثناء کے چرخوں نے محبت اور توجہ کے ساتھ اس کو کاتا ہو۔ اس

کے بننے والے کی اجرت جنت مقرر کی گئی ہو اور وہ اپنے پہننے والے کیلئے دوزخ سے پردہ ہو۔ تو اے مالک! کیا آپ ایسی قمیص لا سکتے ہیں؟ میں نے ان سے کہا: ایسی قمیص وہی اللہ تعالیٰ لاسکتا ہے، جس نے آپ کو اپنے وصف کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اور جس نے آپ کو اپنا معائنہ اور کشف الہام فرمایا ہے پھر میں نے ان سے کہا: اے بہلول! آپ مجھے بتا دیجئے کہ ایسی قمیص کون پہنا سکتا ہے؟ میں اسکو پہننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: ایسی قمیض وہی شخص پہنا سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انوار کے ساتھ خاص کیا ہو اور اس کا نام اپنے صالح بندوں کے رجسٹر میں لکھا ہو اور اس کو اپنی سابق عنایت سے زندہ کیا ہو اور سچی عزیمت سے اس کو طاقتور کیا ہو۔ لہٰذا اس کا جسم مخلوق کے درمیان چلتا ہو اور اس کا قلب ملکوت میں چرتا ہو (یعنی ملکوت سے فیض حاصل کرتا ہو) اور وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کوئی لفظ نہ بولتا ہو۔ اور غیر اللہ کی طرف ایک نظر بھی نہ دیکھتا ہو پھر وہ بہت زور سے چیخے اور یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اے میرے رب! بھاگنے والے تیرے ہی طرف بھاگے ہیں اور طلب کرنے والے تیرا ہی ارادہ کیے ہوئے ہیں اور توبہ کرنے والے تیرے ہی دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اے میرے اللہ ہم تیرے ہی دروازے پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تو ہم کو اپنے دروازے سے نہ ہٹا اور ہم نے اپنی نسبت تیری بارگاہ قدس سے کی ہے لہٰذا تم ہم کو محروم نہ کر۔ یا ارحم الراحمین۔ آمین۔ لہٰذا جو شخص باقی سے خوش ہوتا ہے اور فانی سے منہ پھیر لیتا ہے اس کے اوپر انوار روشن ہوتے ہیں اور اس کے سامنے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے۔

قَدْ اَشْرَقَ نُوْرُهٗ ، وَظَهَرَتْ تَبَاشِيْرُهٗ

"اس کا نور روشن ہو گیا، اور اس کی بشارتیں ظاہر ہو گئیں"۔

میں کہتا ہوں:۔ اللہ تعالیٰ کا نور ترک دنیا اور مولائے حقیقی کی طرف توجہ کی شیرینی سے روشن ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی محبت تاریکی ہے لہٰذا جب وہ قلب سے نکل جاتی ہے اس وقت اس میں نور داخل ہوتا ہے۔

اور یہ نور:۔ زہد کی شیرینی، اور قناعت کا آرام، اور رضا کی ٹھنڈک اور تسلیم کی خوش گوار ہوا

ہے۔

اور بشارتیں ظاہر ہونے کا مفہوم :۔وہ بشارتیں ہیں جو سائر کو آگے بڑھنے اور وصال کی روح اور معارف اور جمال کی جنت کی خوشخبری سناتی ہیں۔اسی سے متعلق ایک عارف کے یہ اشعار ہیں :۔

اِذَا ھَبَّتْ عَلَیْنَا مِنْ حِمَاکُمْ نُسَیْمَاتٌ تُذَکِّرُنَا الْوِصَالَا

"جب تمہارے سبزہ زار سے ہمارے اوپر خوشگوار ہلکی ہوائیں چلتی ہیں تو وہ ہم کو وصال کی یاد دلاتی ہیں"۔

مُبَشِّرَۃٌ بِاِقْبَالٍ وَسَعْدٍ وَعِزٍّ دَائِمٍ دَھْرًا طَوِیْلًا

"وہ ایسے اقبال اور نیک بختی اور عزت کی خوش خبری دیتی ہیں جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے"۔

مُبَلِّغَۃٌ شَذَا تِلْکَ الْمَعَانِیْ مُذَکِّرَۃٌ رُبَاھَا وَالطُّلُوْلَا

"وہ حقیقتوں کی خوشبوئیں پہنچاتی ہیں اوران کے اونچے اور بلند مقامات کی یاد دلاتی ہیں"۔

فَذَالِکَ خَیْرُ وَقْتٍ بِالْمُعَنّٰی وَ اَحْسَنُ مَاتَعَاطَی السَّلْسَبِیْلَا

"لہٰذا غم اور تکلیف میں مبتلا عاشق کیلئے یہ سلسبیل کے ملنے سے زیادہ بہتر وقت ہے"۔

لہٰذا جب اس کا نور روشن ہوتا ہے اوراس کی بشارتیں ظاہر ہوتی ہیں تو وہ دنیا سے بالکل منہ پھیر لیتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے :۔

فَصَرَفَ عَنْ ھٰذِہِ الدَّارِ مُغْضِیًا ، وَ اَعْرَضَ عَنْہُ مُوَلِّیًا

"پس اس نے دنیا سے آنکھ بند کر کے منہ پھیر لیا اور پیٹھ پھیر کر اس سے پھر گیا"۔

میں کہتا ہوں :۔جب نور روشن ہو جاتا ہے اور بشارتیں ظاہر ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے والا اس دنیا سے بالکل منہ پھیر لیتا ہے اور اپنی بصر اور بصیرت کی آنکھیں اس دنیا کی رونق و زیبائش اور حسن و جمال سے بالکل بند کر لیتا ہے۔

اس کی مثال یہ آیۂ کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول کریم ﷺ سے فرمایا ہے :۔

(وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ) اَىْ اَصْنَافًا مِنَ الْكُفَّارِ (زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ)

"آپ اپنی آنکھیں دنیاوی زندگی کی ان آرائشوں اور زینتوں کی طرف نہ بڑھایئے جو ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو عطا کر رکھا ہے۔ تا کہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں"۔

لہٰذا وہ اس سے اپنے قلب اور جسم کے ساتھ اس کی طرف سے پیٹھ پھیر کر منہ پھیر لیتا ہے اور اپنے مولائے حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

حضرت شطیبیؒ نے فرمایا ہے:- تم یہ جان لو کہ دنیا سے منہ پھیرنا قلب کے ساتھ ہوتا ہے اور جبکہ قلب اس میں لٹکا ہوا ہو تو ہاتھ سے دنیا زائل ہونا اور اس کے اسباب کا ختم ہو جانا کچھ مفید نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا مقصود قلب سے اس کا ختم ہو جانا ہے ہاتھ میں اس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ سے فرمایا جن کو اللہ تعالیٰ نے کل زمین کی بادشاہت عطا فرمائی تھی:-

هٰذَا عَطَاءُ نَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

"یہ ہماری بے حساب یعنی بے انتہا بخشش ہے، لہٰذا آپ لوگوں پر احسان کریں یا روک رکھیں"۔ اور انہیں کے بارے میں یہ بھی فرمایا:-

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ

"وہ بہترین بندے تھے، اور بیشک وہ ہماری طرف بہت بڑے رجوع کرنے والے تھے"۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کیلئے جن سے دنیا کو بالکل دور رکھا تھا، فرمایا ہے: -

وَوَهَبْنَا لَهٗ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ

"اور ہم نے ایوب کو ان کے اہل اور انہیں کی طرح لوگ عطا فرمایا"۔

اسی لیے کہا گیا ہے:- جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس سے کوئی کمال صادر ہو، تو اس سے کوئی کمال صادر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی خواہش کا بندہ ہے اور اپنے نفس کے فائدے کیلئے عمل کرتا ہے۔ لہٰذا جب اس سے نفسانی فوائد اور دنیاوی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اس وقت اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی

طرف درست ہوتا ہے اور اس کا قلب اپنے مولائے حقیقی کی طرف توجہ میں خالص اور تنہا ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں:- حضرت ابوانوار تطوانیؒ کا ایک قصیدہ اسی مفہوم کے بارے میں ہے جس کے بعض اشعار میں انہوں نے فرمایا ہے:-

وَمَنْ كَانَ قَصْدُهٗ فِيْ نَيْلِ مَا يُرِيْدُ فَمَا قَامَ بِالْحُجَّةِ

"جس شخص کا ارادہ اس شی کے حاصل کرنے کا ہے جس کو وہ چاہتا ہے تو وہ کسی دلیل پر قائم نہیں ہے"۔

وَاصِلْ طَرِيْقَنَا وَارْفُضِ الْعِلَلْ مَعَ الصَّبْرِ وَارْفَعْ لِلْهِمَّةِ

"تم ہمارے طریقے میں شامل ہو جاؤ اور اسباب کو صبر کے ساتھ چھوڑ دو اور ہمت کو بلند کر لو"

وَحَسْبُ الْمُحِبِّ مُشَاهَدَةٌ يَقِيْنًا لِمَ يَبْدُوْمِنْ حَضْرَةِ

"اور محبت کرنے والے کیلئے یقیناً اس تجلی کا مشاہدہ کافی ہے جو بارگاہ الٰہی سے ظاہر ہوتی ہے"۔

وَفَهْمُكَ عَنْهُ جَدِيْرٌ بِاَنْ يُّعَوِّ ضَكَ الْمَنْعَ بِالْمَنْحَةِ

"اور اللہ تعالیٰ سے تمہاری سمجھ اس لائق ہے کہ وہ تمہاری محرومی کو بخشش سے بدل دے"۔

حضرت ابوالانوار، سیدی حضرت ابوالمحاسن یوسف فاسی کے شاگرد ہیں۔ ان کا مزار شریف تطوان میں پرانی مسجد کے قریب قصبہ کے کنارے واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے ذکر سے فائدہ پہنچائے۔

اور جس شخص نے دنیا سے منہ پھیر لیا، تو دنیا میں اس کا کوئی وطن نہیں ہے بلکہ اس کا وطن اسکے مولائے حقیقی کے پاس ہے۔

جیسا کہ اس کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

فَلَمْ يَتَّخِذْ هَا وَطَنًا ، وَلَا جَعَلَهَا سَكَنًا

"پھر اس نے دنیا کو اپنا وطن، اور اپنے آرام کا ذریعہ نہیں بنایا"۔

میں کہتا ہوں:- اس لیے کہ جو شخص کسی جگہ کو وطن بناتا ہے تو وہاں قیام کرتا ہے اور سائر کیلئے کوئی مقام نہیں ہے، مگر اس کے رب کے پاس۔

سیدنا حضرت عیسےٰ علیہ السلام دنیا کی شام میں فرمایا کرتے تھے:- تم لوگ دنیا سے گزر جاؤ اور اس کو آباد نہ کرو۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ الدُّنْیَا کَرَاکِبٍ سَافَرَ فِی یَوْمٍ صَائِفٍ فَاسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ عَنْھَا وَ تَرَکَھَا

"مجھکو دنیا سے کیا واسطہ، میری مثال اور دنیا کی مثال اس سوار کی طرح ہے جو گرم دن میں سفر کرتا ہے پھر وہ کسی درخت کے سایہ میں کچھ دیر ٹھہر کر آرام کرتا ہے، پھر اس کو چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے۔

لہٰذا دنیا ٹھہرنے اور آرام کرنے کا گھر نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچنے کیلئے صرف ایک پل ہے۔

پس عارف باللہ کو غیر اللہ کے ساتھ قرار نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کی کل ہمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:-

بَلْ اَنْھَضَ الْھِمَّۃَ فِیْھَا اِلَی اللّٰہِ وَسَارَ فِیْھَا مُسْتَعِیْنًا بِہٖ فِی الْقُدُوْمِ عَلَیْہِ

"بلکہ اس نے اس دنیا میں اپنی ہمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے کیلئے مضبوط کیا اور اس نے اس تک پہنچنے کیلئے اسی سے مدد طلب کرتے ہوئے سیر کی"۔

میں کہتا ہوں:- اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرنے والا اس عالم سے عالم ملکوت میں داخل ہونے کا ارادہ کر کے اپنی ہمت کو مضبوطی سے قائم کرتا ہے۔

اور ہمت کا مضبوطی سے قائم کرنا:- اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنے اور اس کے قہر کے سامنے سرنگوں رہنے اور اپنے سفر میں اس سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور مصنفؒ کے اس قول کا یہی معنی ہے:- اور اس نے اس تک پہنچنے کیلئے اسی سے مدد طلب

کرتے ہوئے سیر کی۔

اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنا:۔اس کی معرفت اور اس کے علم کی تحقیق تک پہنچنا ہے اور یہ صرف اس وقت تک صحیح ہوتا ہے جب اپنے اختیار اور قوت سے بری ہو جائے۔ کیونکہ جس شخص نے یہ گمان کیا کہ اس کی محنت اور کوشش اس کو اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے گی۔اس نے جہالت کی اور جس شخص کا اعتماد اللہ تعالیٰ پر درست ہو گیا، وہ منزل تک پہنچ گیا۔

پھر مصنفؒ نے اس کا راز بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

فَمَا زَالَتْ مَطِيَّةُ عَزْمِهِ لَا يَقِرُّ قَرَارُهَا

"لہٰذا اس کے عزم (ارادہ) کی سواری کو کبھی قرار نہیں ہوتا ہے"

میں کہتا ہوں:۔مطیہ:۔سواری کو کہتے ہیں، یہاں مضبوط ارادہ کیلئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔یعنی ہمیشہ اس کا ارادہ مضبوط رہتا، اور اس کی روح شائق رہتی ہے۔اس کو کبھی قرار و سکون نہیں ہوتا یعنی اس کو اپنے مولائے حقیقی تک پہنچے بغیر کسی جگہ سکون نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ شوق اس کو بیقرار رکھتا ہے اور وصول کے فوت ہو جانے کا خوف اس کو تھرتھراتا رہتا ہے۔لہٰذا وہ ہمیشہ سیر کرتا رہتا ہے۔جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:۔

دَائِمًا تَسْيَارُهَا

"اس کی سیر ہمیشہ جاری رہتی ہے"

میں کہتا ہوں:۔اس کی سیر اس کے مانعات کی کمی کی وجہ سے ہمیشہ جاری رہتی ہے اس لیے کہ جب اس نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی تو اس کے مانعات کم ہو گئے کیونکہ دنیا ہی مانعات کا جال، اور تعلقات کی جڑ ہے۔لہٰذا جس شخص نے اپنے قلب سے دنیا کی رگوں کو کاٹ دیا اس سے دنیا کے تعلقات ختم ہو گئے۔

جیسا کہ شیطان جو دنیا کا باپ ہے تو جب اس نے اس کی لڑکی دنیا کو طلاق دی دیدیا تو شیطان نے اس کو چھوڑ دیا۔

اور جیسا کہ نفس، چونکہ اس کی اصل اور روح دنیا ہے۔لہٰذا جن دنیا ختم ہو گئی تو وہ بھی مر گیا۔

اور جیسا کہ لوگ ، تو چونکہ دنیا مردار ہے اور لوگ اس کے کتے ہیں لہٰذا جب اس نے ان کے مردار کو ان کیلئے چھوڑ دیا تو ان سے محفوظ ہو گیا۔

لہٰذا اس کی سیر اس وقت تک برابر جاری رہتی ہے کہ وہ اپنے اصلی وطن میں پہنچ جائے اور اس کا اصلی وطن بارگاہ الٰہی ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے۔

اِلٰی اَنْ اَنَاخَتْ بِحَضْرَةِ الْقُدْسِ وَبِسَاطِ الْاُنْسِ

"یہاں تک کہ وہ بارگاہ قدس میں انسیت کے فرش پر بیٹھ جاتی ہے"

میں کہتا ہوں:- اناخت:- کے معنی اترنا اور بوجھ گرا دینا ہیں۔

لہٰذا جب روح احباب کے مشاہدے تک پہنچ جاتی ہے اور اس کیلئے دروازہ کھل جاتا ہے تو اس پر جو کچھ بوجھ ہے اس کو اتار دیتی ہے اور پاکیزگی اور کمال کے فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔

اور یہی بارگاہ قدس ہے، جس کو ولایت کا دائرہ کہتے ہیں جو بندے سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے مولائے حقیقی کو ہر ایسے وصف سے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے، پاک اور مقدس یقین کرے۔ یہاں تک کہ وہ یہ پہچان لے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کا پہچانا جا سکے اور اس کی شان اس سے بہت اعلیٰ ہے کہ اس کی تعریف کی جا سکے۔ پھر وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے ہوئے کہے۔

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ

"میں تیری تعریف کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہوں"

پھر وہ تعظیم میں ڈوب جاتا ہے اور تقدیس میں مضبوطی سے قائم ہو جاتا ہے۔ تو اس کی تقدیس کا عکس اس پر اس طرح پڑتا ہے کہ اس کا مولائے حقیقی اس کی حفاظت کرتا ہے۔ لہٰذا وہ کوئی نافرمانی نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے اللہ تعالیٰ کے پاک بنانے کی وجہ سے وہ مقدس ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس نے اپنے مولائے حقیقی کے مقدس ہونے کا یقین کیا، اس لیے اس کے مولائے حقیقی نے اس کو مقدس بنا دیا ہے۔ ہر شئی اسی پر قائم رہتی ہے جو اس کے وصف کے لائق ہوتا ہے اور اسی تقدیس کی

بنا پر وہ اپنے مولائے حقیقی کے ساتھ ہر شی کو بھول جاتا ہے پھر وہ اس کے ماسوا کو ترک کر کے، اس کے عین جلال اور اس سے ہیبت میں تعظیم کے طریقے پر، نہ کہ فرق یا عین ذلیل کرنے میں ذلیل ہونے کے طریقے پر، اس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ تم اس کو بخوبی سمجھو۔ یہ حضرت شیخ زروق ؒ نے فرمایا ہے۔

اور انسیت کا فرش:- دوست کے قرب، اور قریب کی سرگوشی سے خوشی کا مقام ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہر شی سے غائب ہو جائے اور ہر شی میں اس سے مانوس ہو جائے۔

پھر مصنف ؒ نے بارگاہ الٰہی کے اسرار بیان فرمائے اور وہ چھ ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

فِيْ مَحَلِّ الْمُفَاتَحَةِ ، وَالْمُوَاجَهَةِ ، وَالْمُجَالَسَةِ ، وَالْمُحَادَثَةِ ، وَالْمُشَاهَدَةِ ، وَالْمُطَالَعَةِ

"مفاتحہ، اور مواجہہ، اور مجالسہ، اور محادثہ، اور مشاہدہ اور مطالعہ کے مقام میں"

میں کہتا ہوں:- مفاتحہ:- غیوب کے علوم کا کھلنا ہے۔ پس تم اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کر کے کشادگی چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر سے حجاب دور کر کے تم کو کشادگی عطا فرماتا ہے تم اسی سے زیادتی طلب کر کے کشادگی چاہتے ہو اور وہ تم کو مسلسل فائدہ پہنچا کر کشادگی عطا فرماتا ہے تم اس سے مقامات میں ترقی کی کشادگی چاہتے ہو اور وہ تمہارے سامنے علوم و مکاشفات کے اسرار منکشف فرماتا ہے۔

اور مواجہہ:- ملکوت کے انوار، اور جبروت کے اسرار کا سامنے ہونا ہے۔

پس تم انوار توجہ کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے ہو اور وہ انوار مواجہت کے ساتھ تمہارے سامنے ہوتا ہے اور یہ حجاب کا دور ہونا اور دروازے کا کھلنا ہے۔ تم عبادت کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے ہو اور وہ محبت کے ساتھ تمہارے سامنے ہوتا ہے تم اس کی طرف بڑھنے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے ہو اور وہ وصال کے ساتھ تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ تم ملکوت کے انوار ظاہر ہونے کی طلب کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے ہو اور وہ جبروت کے اسرار ظاہر کرنے کے ساتھ تمہارے سامنے ہوتا ہے۔

اور مجالسہ:- ادب اور ہیبت کے ساتھ بیٹھنا ہے۔ پس تم ادب اور حیاء کے ساتھ اس کے ساتھ بیٹھتے ہو اور وہ قریب کرنے اور منتخب کرنے کے ساتھ تمہارے ساتھ بیٹھتا ہے۔ تم اس کے مراقبہ کے ساتھ اس کے ساتھ بیٹھتے ہو اور وہ اپنی حفاظت اور نگرانی کے ساتھ تمہارے ساتھ بیٹھتا ہے۔ تم اس کے ذکر کے ساتھ اس کے ساتھ بیٹھتے ہو اور وہ اپنے احسان کے ساتھ تمہارے ساتھ بیٹھتا ہے۔
جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:-

اَنَا جَلِیْسٌ مَنْ ذَکَرَنِیْ

"میں اس شخص کا ہم نشین ہوں، جو میرا ذکر کرتا ہے"

اور محادثہ:- وہ قلب کا کلام ہے، اور وہ فکر کرنا، اور جبروت کی عظمت میں چکر لگانا ہے۔ پس تم اپنے سر میں اس کی مناجات اور سوال کے ساتھ اس سے کلام کرتے ہو اور وہ اپنے احسان اور بخشش زیادہ کرنے کے ساتھ تم سے کلام کرتا ہے۔ تم اپنے سر اور روح میں اس کے دائمی حضور کے ساتھ اس سے کلام کرتے ہو اور وہ تمہارے قلب میں علوم و اسرار اور حکمتوں کے القا کے ساتھ تم سے کلام کرتا ہے۔ تم عالم شہادت میں اس سے کلام کرتے ہو اور وہ عالم غیب میں تم سے کلام کرتا ہے۔

اور تحقیق یہ ہے کہ، کہ وہاں عالم غیب ہی ہے جو عالم شہادت میں ظاہر ہوا ہے۔

حضرت جنیدؒ نے اسی مفہوم میں فرمایا ہے:- چالیس سال سے میں اللہ تعالیٰ سے بات کرتا ہوں حالانکہ لوگ یہ دیکھتے ہیں، کہ میں مخلوق سے بات کرتا ہوں اور حضرت رابعہ عدویہؒ نے فرمایا ہے:-

وَلَقَدْ جَعَلْتُکَ فِی الْفُؤَادِ مُحَدِّثِیْ　　وَ اَبَحْتُ جِسْمِیْ مَنْ اَرَادَ جُلُوْسِیْ

"اور میں نے اپنے قلب میں تجھ کو اپنا ہم کلام بنایا ہے اور میں نے اپنے جسم کو اس شخص کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی ہے جو میرے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے"

فَالْجِسْمُ مِنِّیْ لِلْجَلِیْسِ مُؤَانِسٌ　　وَحَبِیْبُ قَلْبِیْ فِی الْفُؤَادِ اَنِیْسِیْ

"لہٰذا میرا جسم ہم نشین سے مانوس ہے اور میرے قلب کا دوست میرے قلب میں مجھ سے مانوس ہے"

اور مشاہدہ:- نور قدس سے محسوس ظاہر کا حجاب دور ہونا ہے۔

یا تم اس طرح کہو:- مشاہدہ:- مخلوق سے حفاظت کی چادر ہٹ جانی ہے۔

پس تم اس کی ذات اقدس کا مشاہدہ اس کے عالم ملکوت میں کرتے ہو اور وہ تمہارا مشاہدہ اپنے عالم ملک میں کرتا ہے تم اس کی ربوبیت کا مشاہدہ کرتے ہو اور وہ تمہاری عبوبیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

حاصل یہ ہے:- بندے کی طرف سے مشاہدہ:- عظمت کے ساتھ عظمت کا مشاہدہ کرنا ہے۔

جیسا کہ ہمارے شیخؒ نے فرمایا ہے:- بندے کیلئے رب کا مشاہدہ:- اپنے احوال اور اسرار کو اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطہ کرنے کا مشاہدہ کرنا ہے۔

اور مطالعہ:- وہ ملک اور ملکوت اور جبروت کے اسرار اور قدر کے اسرار کا مطالعہ کرنا ہے۔ پس تم توجہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہو اور وہ اپنی طرف ترقی دینے کے ساتھ تم کو دیکھتا ہے۔ تم اس کی قضا و قدر کے مواقع کو دیکھتے ہو پھر قبولیت اور رضا مندی کے ساتھ ان سے ملتے ہو اور وہ تمہارے احوال اور سرائر کو دیکھتا ہے۔ تو تمہارے اوپر سے حجابات کو دور کر دیتا ہے۔ اور تمہارے لیے فضا کو کشادہ کر دیتا ہے۔ تم قریب اور متوجہ ہونے کے ساتھ اس کو دیکھتے ہیں ہو اور وہ محبت اور وصال کے ساتھ تم کو دیکھتا ہے۔ اور پیش قدمی اور وصال کے ساتھ تم سے ملاقات کرتا ہے اور یہ اسرار صرف اہل ذوق ہی چکھتے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص اپنے ذوق اور حال کے مطابق ان کا مزہ چکھتا ہے۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

لہٰذا اگر روح ان مرتبوں میں قائم ہو جاتی ہے تو بارگاہ الٰہی اس کا ٹھکانا اور پناہ گاہ ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

فَصَارَتِ الْحَضَرَةُ مُعَشَّشَ قُلُوْبِھِمْ ، اِلَیْھَا یَاوُوْنَ ،وَفِیْھَا یَسْکُنُوْنَ

"پس بارگاہ الٰہی ان کے قلوب کا آشیانہ ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف وہ پناہ لیتے ہیں اور وہ اسی میں آرام کرتے ہیں"

میں کہتا ہوں:- عش الطیر:- چڑیوں کا آشیانہ ہے جس میں وہ پناہ لیتی ہیں پس عارفین کی ارواح بارگاہ الٰہی کی چڑیاں ہیں، جو ملکوت میں اڑتی ہیں، اور جبروت میں چگتی ہیں، پھر ظاہر میں

عبوبیت کے آشیانے میں، اور باطن میں شہود کے آشیانے میں وہ پناہ لیتی ہیں۔ لہٰذا وہ بارگاہ جو عارفین کے قلوب کا آشیانہ ہے وہی ذات اقدس کی بارگاہ قدس ہے جس میں وہ پناہ لیتے اور آرام کرتے ہیں۔ یعنی ملکوت کی فضا اور جبروت کے اسرار کی طرف اڑنے کے بعد جب وہ لوٹتے ہیں تو اسی میں آرام کرتے ہیں پھر اس میں سے کبھی نہیں نکلتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ

"اس میں ان کو کوئی مشقت اور تکان نہ پہنچے گی، اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے"

اور بارگاہ قدس کا مقام:- اعلیٰ علیین ہے اور وہ عارفین کے قلوب کا عرش ہے

فَاِنْ نَزَلُوْا اِلَى سَمَاءِ الْحُقُوْقِ اَوْ اَرْضِ الْحُظُوْظِ ، فَبِا الْاِذْنِ وَالتَّمْكِيْنِ ، وَالرُّسُوْخِ فِي الْيَقِيْنِ

"پھر اگر وہ بارگاہ قدس سے حقوق کے آسمان یا فوائد کی زمین کی طرف نزول کرتے (اترتے) ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی اجازت اور تمکین، اور یقین میں مضبوطی کے ساتھ نزول کرتے ہیں"

حضرت شیخ زروق ؒ نے فرمایا ہے:- اللہ تعالیٰ کی توحید، عرش ہے اور شریعت مطہرہ اس عرش کی کرسی ہے اور اس میں فضیلت والے حقوق اس کے آسمان ہیں اور نفسانی فوائد اس کی زمین ہے۔

لہٰذا جس حقیقت کے ساتھ شریعت نہ ہو اس حقیقت والے کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور جس شریعت کی مدد حقیقت نہ کرے اس شریعت والے کیلئے کوئی کمال نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں:- نزول:- یہاں مجاز ہے، گویا کہ آزادی، عرش ہے اور بندگی آسمان یا زمین ہے۔

یا تم اس طرح کہو:- حقیقت:- عرش ہے اور شریعت زمین ہے تو جب تک روح وحدت کے سمندر میں ہے گویا کہ وہ عرش الٰہی پر ہے اور جب وہ عبودیت کی طرف نزول کرتی ہے اس وقت وہ گویا کہ آسمان یا زمین کی طرف نزول کرتی ہے۔

اور مصنف ؒ کے کلام، اور ان شارحین کے کلام کا جنہوں نے مصنف ؒ کی پیروی کی ہے۔

ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حقوق کے آسمان یا فوائد کی زمین کی طرف نزول کرنا:- بارگاہ الٰہی سے نکل جانا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جس شخص کا عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو اور جس کے کل تصرفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوں اس کیلئے بارگاہ الٰہی سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے اس کے حق میں نزول صرف جسم کے ساتھ ہے نہ کہ قلب کے ساتھ کیونکہ قلب اپنے آشیانے سے اس میں ٹھہر جانے کے بعد کبھی نہیں نکلتا ہے۔

لہٰذا جو شخص اس مقام میں پہنچ جاتا ہے اس کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی طرف اس کا نزول کرنا، بارگاہ الٰہی سے خاص کر اس نماز سے اس کا نکلنا نہیں ہوتا ہے جو اخلاص اور صفائی کی کان ہے کیونکہ نماز میں اسرار کے میدان کشادہ ہوتے ہیں اور اسی میں انوار الٰہی کی روشنیاں چمکتی ہیں۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مصنف ؒ کے کلام میں نزول کو جسم کے ساتھ نزول پر محمول کیا جائے قلب کے ساتھ نزول نہ سمجھا جائے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اس مفہوم پر مصنف ؒ کا یہ قول دلیل ہے جس کی تشریح عنقریب آئے گی:-

(بلکہ وہ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ داخل ہوئے)

حضرت شعرانی ؒ نے اپنے بعض جوابات میں فرمایا ہے:- میں نے اپنے شیخ سیدی علی خواص ؒ سے دریافت کیا:- بندے کیلئے نماز کی حالت میں، دو حالتوں میں سے کون سی حالت افضل ہے؟ کیا یہ حالت کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے؟ یا یہ حالت کہ، گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے؟ انہوں نے مجھکو یہ جواب دیا:- بندے کی یہ حالت کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ، گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی اس حالت سے افضل ہے کہ گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے پھر اس کی وجہ بہت تفصیل سے بیان فرمائی۔

میں کہتا ہوں:- میں اس کلام پر اعتراض کیا تھا اور اس کو لکھا تھا اس کا مضمون یہ ہے:-

عارفین باللہ اس پر متفق ہیں کہ عمل باللہ (اللہ تعالیٰ کے ساتھ عمل) عمل للہ (اللہ تعالیٰ کیلئے عمل) سے افضل ہے۔ کیونکہ باللہ مشاہدہ ہے اور عمل للہ مراقبہ ہے۔ اور مشاہدے کا مقام، مراقبہ کے مقام

سے افضل واعلیٰ ہے۔ لہٰذا مشاہدہ کے ساتھ نماز مراقبہ کے ساتھ نماز سے افضل ہے اور جس کو حضرت علی خواص ؒ نے لازم قرار دیا ہے، وہ غیر لازم ہے۔ پھر میں نے اپنا اعتراض اپنے شیخ الشیوخ حضرت مولائے عربی ؒ کے سامنے پیش کیا تو وہ اس سے بہت خوش ہوئے اور حضرت علی خواص ؒ پر میرے اعتراض کو پسند فرمایا اور یہ خواص سے کچھ عجیب وغریب نہیں ہے۔

اور حضرت شعرانی نے تسہیل میں فرمایا ہے:۔ جبکہ علوم عطائے الٰہی اور خصوصی بخششیں ہیں۔ تو یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ بہت سے متاخرین کیلئے علوم ومعارف کے وہ ذخیرے جمع ہو جائیں، جو بہت سے متقدمین کیلئے دشوار ہو گئے تھے۔

لہٰذا حقوق کے آسمان یا فوائد کی زمین کی طرف ان کا نزول صرف اجازت اور تمکین سے ہوتا ہے۔

لیکن حقوق کی طرف ان کے نزول میں اجازت، شریعت کی اجازت سے متعلق ہے۔ کیونکہ شریعت کے کل حقوق یقینی اور مسلم ہیں اور مقررہ وقت کے ساتھ مقید ہیں اور اس میں تمکین اس حیثیت سے ہے کہ اس کو کوئی شرعی یا طبعی رکاوٹ نہ لاحق ہو جو نزول سے روک دے۔

لیکن فوائد کی زمین کی طرف ان کے نزول میں اجازت الہام اور اعلام (خبر دینا) سے متعلق ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ اس معاملے میں آہستہ روی اختیار کر لے۔ یہاں تک کہ وہ بخوبی یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔

شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر جیلانی ؒ اپنی سیاحت کی حالت میں کچھ نہیں کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ کہا جاتا تھا:۔ میرا حق ادا کرنے کیلئے تم کچھ کھالو۔

میں کہتا ہوں:۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی سمجھ رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرتا ہے۔ اور لکیر کے فقیر سخت دل فقہاء میں سے بعض وہ فقیہ جس کے قلب پر اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے وہ اس سے انکار کرتا ہے کہ عارفین اللہ تعالیٰ کی اجازت سے تصرف کرتے ہیں۔ لیکن وہ کمزوری کے شہر میں ہونے کی وجہ سے معذور ہے اس لیے کہ جو شخص کسی شَی کو نہیں جانتا ہے، وہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔

اور تمکین سے مراد:-اللہ تعالیٰ کی صحیح سمجھ رکھنی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اس سمجھنے میں کوئی شک وشبہ نہ باقی رہے کہ یہی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اس حیثیت سے کہ اس کیلئے کوئی شرعی یا طبعی رکاوٹ نہ دیکھے۔

اور ایسے ہی یقین میں رسوخ (مضبوطی):- کسی فعل کے ارادے کے حال میں معرفت میں ثابت ہوتا ہے۔

میں اس کے سمجھانے کیلئے ایک مثال بیان کرتا ہوں:-ایک شخص اپنے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا اور اس کو کسی باغ یا گھر میں اتار دیا۔ پھر اس کو وہیں چھوڑ کر چلا آیا، پھر کچھ لوگ آئے اور اس سے اس جگہ اترنے کیلئے اس کے باپ کی اجازت کے بارے میں مخالفت کرنے لگے اور اس سے کہنے لگے کہ تم اس جگہ بغیر اجازت کے اترے ہو تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ اس جگہ باپ کی اجازت سے اترا ہے۔ تو وہ اپنی قسم میں سچا ہوگا کیونکہ جب اس کے باپ نے اس کو اس جگہ اتارا تو یہی اس کے باپ کی صریح اجازت ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی زبان سے اجازت کا لفظ نہ کہا ہو اور کسی جاہل یا مغرور کے سوا کوئی اس سے انکار نہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے تمام معاملات میں ہم کو اپنی سمجھ عطا کر کے ہمارے اوپر احسان فرمائے۔ آمین۔

پھر مصنفؒ نے اپنے قول "اذن اور تمکین کے ساتھ" کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

فَلَمْ يَنزِلُوْا اِلَى الْحُقُوْقِ بِسُوْءِ الْاَدَبِ وَالْغَفْلَةِ ، وَلَا اِلَى الْحُظُوْظِ بِالشَّهْوَةِ وَالْمُتْعَةِ

"پس وہ حقوق کی طرف بے ادبی اور غفلت کے ساتھ نہیں اترے۔ اور نہ فوائد کی طرف خواہش اور نفس کے فائدے کیلئے اترے"

میں کہتا ہوں:- بے ادبی کے ساتھ نزول:-یہ ہے کہ ان کا نزول بدلہ حاصل کرنے کیلئے ہو۔ اور غفلت کے ساتھ نزول:- عمل کی حالت میں نفس کا دیکھنا ہے۔ اور نفس کا دیکھنا عارفین کے نزدیک گناہ ہے جس سے وہ استغفار کرتے ہیں۔ لہٰذا نماز کے بعد ان کا استغفار، ان کے عمل میں ان کے نفس کے حاضر ہونے سے ہوتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے:-

وُجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ

"تمہارا وجود ایسا گناہ ہے جس کی طرح کسی دوسرے گناہ کا خیال نہیں کیا جا سکتا ہے"

حاصل یہ ہے:- اہل بارگاہ قدس کا نزول اور ان کا عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے وہ اپنی ذات کیلئے کوئی اختیار اور قوت نہیں دیکھتے ہیں، اور نہ وہ اپنے رب سے کوئی جزا اور بدلہ چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسرے کے عمل پر جزا اور بدلہ چاہنا محال ہے، اور یہ حقوق کے آسمان کی طرف ان کے نزول کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن فوائد کی زمین کی طرف ان کا نزول:- تو وہ صرف عبودیت کے حقوق کے ادا کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کا نزول نفس کی خواہش اور فائدہ کیلئے نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے نفوس فنا ہو چکے اور مر چکے ہیں اور ان کے فوائد حقوق بن گئے ہیں۔

اسی حقیقت کی بناء پر سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا:- میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں اور ان سے مباشرت کرتا ہوں حالانکہ مجھکو اس کی خواہش نہیں ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا:- اے امیر المومنین! پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا:- میں ایسا اس امید پر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری پشت سے کوئی اولاد پیدا کرے جس سے حضرت محمد ﷺ اپنی امت کی تعداد بڑھائیں۔

اور سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ نے فرمایا ہے:- جب حق خواہش کی موافقت کرتا ہے تو وہ شہد ملے ہوئے مکھن کی طرح ہو جاتا ہے۔ یعنی جن خواہش کے ساتھ صالح نیت شامل ہوتی ہے تو وہ خواہش شہد ملے ہوئے مکھن کی طرح ہو جاتی ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا:-

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَابِعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش اس شریعت کی تابع نہ ہو جائے، جو میں لے کر آیا ہوں"

لہٰذا حاصل یہ ہوا:- نزول کے مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کل فوائد سے فنا ہو جائے اور صرف اللہ واحد احد باقی رہ جائے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

بَلْ دَخَلُوْا فِيْ ذَالِكَ بِاللّٰهِ وَلِلّٰهِ وَمِنَ اللّٰهِ وَاِلَى اللّٰهِ

"بلکہ وہ لوگ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کیلئے اور اللہ تعالی کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف داخل ہوئے"

میں کہتا ہوں:۔ بل:۔ اضراب (منہ پھیر لینے) کے مفہوم کیلئے ہے اس سے جو پہلے بیان کیا گیا ہے یعنی حقوق میں بے ادبی اور غفلت کے ساتھ داخل ہونے، یا فوائد کی زمین میں خواہش اور فائدے کے ساتھ نزول کرنے سے۔

اور حقوق یا حظوظ میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس لیے داخل ہوئے کہ ان کے نفوس کی فنا ثابت ہو چکی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کیلئے اس لیے داخل ہوئے کہ ان کا اخلاص ثابت ہو چکا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے داخل ہوئے کہ وہ ہر فعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیکھتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے داخل ہوئے کہ وہ یقین کر چکے ہیں کہ کل امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ

"اور تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، لہٰذا آپ اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ رکھیئے"

لہٰذا بندوں کے کل معاملات اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں اور اسی کی طرف سے صادر ہوتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

پھر مصنفؒ نے اس پر آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ اشیاء میں داخل ہونا اور ان سے خارج ہونا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ ، لِيَكُوْنَ نَظْرِيْ اِلٰى حَوْلِكَ وَ قُوَّتِكَ اِذَا اَدْخَلْتَنِيْ وَانْقِيَادِيْ اِلَيْكَ اِذَا اَخْرَجْتَنِيْ ، وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا يَنْصُرُنِيْ وَلَا يَنْصُرُ عَلَيَّ ، يَنْصُرُنِيْ عَلٰى شُهُوْدِ نَفْسِيْ وَيُغَيِّبُنِيْ عَنْ دَائِرَةِ حِسِّيْ

" آپ کہیے:- اے میرے رب! تو مجھکو داخل کر سچائی کا داخل کرنا اور تو مجھکو نکال سچائی کا نکالنا، یہ اس لیے کہ میری نظر اس وقت تیرے اختیار اور قوت کی طرف ہو، جب تو مجھکو داخل کرے اور میری اطاعت تیرے لیے ہو جب تو مجھکو اس سے نکالے اور تو میرے لیے اپنے پاس سے ایک ایسی مدد کرنیوالی طاقت عطا فرما، جو میری مدد کرے اور میرے مقابلے میں دوسرے کی مدد نہ کرے۔ اپنے نفس کے شہود کے مقابلے میں وہ میری مدد کرے اور مجھ کو میرے ظاہر کے دائرے سے غائب کر دے"

میں کہتا ہوں:- اس آیت کریمہ کی ایک ظاہری تفسیر ہے اور ایک باطنی تفسیر ہے، یعنی اہل اشارہ کے طریقے پر۔

اہل ظاہر کی تفسیر یہ ہے:- مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت کریمہ فتح مکہ میں نازل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا! آپ فتح مکہ ہونے کی حالت میں مکہ معظمہ میں داخل ہونے کے وقت یہ دعا کیجئے:-

اے میرے رب! تو مجھکو مکہ معظمہ میں داخل کر سچائی کا داخل کرنا اس طریقے پر میرا داخل ہونا تیرے ساتھ اور میرا بھروسہ تیرے اوپر ہو اس حال میں کہ میں تیرے اختیار اور تیری قوت سے تیرے دین کی مدد کرنے والا ہوؤں۔

اور یہ حضرت نبی کریم ﷺ کی ان بعض دعاؤں کے قول کی طرح ہے کہ جب آپ سفر سے تشریف لاتے تھے تو فرمایا کرتے تھے:-

صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَ اَعَزَّ جُنْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ

"اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کو سچا کیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اپنے لشکر کو غالب کیا اور فوجوں کو تنہا شکست دیدی"

اور تو مجھکو مکہ معظّمہ سے نکال سچائی کا نکالنا اس حال میں کہ میں تیرے دشمن سے جہاد کیلئے ہجرت کرنے والا ہوؤں اس طریقے پر کہ میں تیرے ساتھ فتح یاب ہوؤں۔ اور تیری حفاظت ونگرانی کے ساتھ میں محفوظ رہوں اور تو میرے لیے اپنے پاس سے ایک ایسی طاقت عطا فرما جو ہر باطل کا سر

توڑ دے اور ایسا مددگار ہو جو میرے دشمن کے مقابلہ میں میری مدد کرے۔

اور اہل باطن کی تفسیر:-وہ ہے کہ جس کی طرف مصنفؒ نے اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے اشارہ فرمایا ہے، کہ کل اشیاء میں عارفین کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ان میں سے نکلنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-اے عارف! تم اس طرح دعا کرو۔

اے میرے رب! تو مجھکو اشیاء میں خواہ وہ حقوق ہوں یا حظوظ (فوائد) داخل کر، سچائی کا داخل کرنا اس طریقے پر کہ یہ داخل کرنا تیرے ساتھ ہو اس حال میں کہ اس داخل کرنے میں تیری اختیار اور قوت پر میں بھروسہ کرنے والا رہوں اور اپنے اختیار اور قوت اور اپنے نفس کے شہود سے میں بری رہوں۔

اور مجھکو اشیاء سے نکال، سچائی کا نکالنا اس طریقے پر کہ مجھکو اس نکالنے میں تیری خاص اجازت سے اجازت حاصل ہوتی ہو۔ اس حال میں کہ تیرے خوف اور اخلاص کا سر میرے ساتھ ہو۔

اور مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:- تاکہ میری نظر اس وقت تیرے اختیار اور قوت کی طرف ہو جب تو مجھ کو اشیاء میں داخل کرے اور میری اطاعت تیرے لیے ہو جب تو مجھکو ان سے نکالے، اور تو میرے لیے اپنے پاس سے یعنی اپنے امور کے پوشیدہ خزانے سے بلا واسطہ اور بغیر سبب کے غالب طاقت عطا فرما۔

اور وہ غالب طاقت:-وہی طاقتور وارد ہے، جو بارگاہ قہار سے آتا ہے اور جو شئی اس کے مقابلے میں آتی ہے وہ اس کو توڑ کر پاش پاش کر دیتا ہے پس وہ حق کو قائم کر دیتا اور باطل کو مٹا دیتا ہے۔

اور وہ طاقت ایسی ہو جو میری مدد کرے اور میرے مقابلے میں دوسرے کی مدد نہ کرے یعنی وہ ظاہر اور ماسوئی سے غائب ہونے میں میری مدد کرے۔ یہاں تک کہ میں ان کے مولائے حقیقی کے شہود میں ان دونوں سے گم ہو جاؤں اور وہ میرے مقابلے میں وہم اور حس اور غیر کے شہود کی مدد نہ کرے۔

پھر مصنف نے اس کی تشریح فرمائی:- اپنے نفس کے شہود سے غائب ہونے میں میری مدد کرے۔ یعنی اس سے غائب ہونے میں مجھکو طاقت پہنچائے پھر جب میں اس کے شہود پر غالب ہو جاؤں اور وہ مجھ سے شکست کھا جائے تو اس کا شہود ختم ہو جائے اور اس کے رب کا شہود باقی رہ جائے۔

اور کسی شَی پر نصرت (مدد) کے معنی:- اس شَی پر غالب ہونا ہے یہاں تک کہ وہ کمزور اور ختم ہو جائے۔

اور نفس کا شہود:- گویا کہ ایسا دشمن ہے جو تم سے جنگ کرتا ہے اور تم کو تمہارے رب تعالیٰ کے شہود سے جدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے تمہاری مدد فرماتا ہے تو تم اس پر غالب ہو جاتے ہو اور اس کو اپنے سے دور کر دیتے ہو۔ تو تم اپنے محبوب حقیقی کے شہود سے قریب ہو جاتے ہو۔

اور جب نفس کا شہود فنا ہو جاتا ہے تو ظاہر کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے اور مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:- "اور مجھ کو میرے ظاہر کے دائرے سے غائب کر دے"

لہٰذا جب ظاہر کا دائرہ فنا ہو گیا تو باطن کا وسیع میدان اور شہود کی کشادہ فضا باقی رہ گئی۔

اور یہی دوسری ولادت ہے۔

کیونکہ بیشک انسان اپنی ماں کے شکم سے باہر آنے کے بعد "جو پہلی ولادت ہے" اپنے کو گھیرنے والی کائنات میں مقید ہو جاتا' اور اپنی ذات کی شکل میں گھر جاتا ہے۔ خواہشات اس کو لقمہ بنا لیتے ہیں اور وہ حس اور وہم کے پیٹ میں اور کائنات کے قید خانے میں جو اس کی جسمانیت کو گھیرے ہوئے ہے مقید ہوتا ہے۔

لیکن جب اس کے ظاہر کا دائرہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عادتوں کے پیٹ سے اور اپنے نفس کی خواہشات سے باہر آتا ہے تو اس کی روح کل کائنات میں سوراخ کر دیتی ہے اور اس میں سے گزر کر کائنات کے خالق تک پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا بیشک وہ دوسری مرتبہ پیدا ہوا اور یہی وہ ولادت ہے جس کے بعد نہ فنا ہے نہ موت۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى

"وہ اس میں صرف پہلی موت کا مزہ چکھیں گے"

اہل ظاہر کے نزدیک ضمیر "ھا" کا مرجع جنت ہے اور اہل باطن کے نزدیک یہی دوسری ولادت ہے۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:-

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يُوْلَدْ مَرَّتَيْنِ

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو دو مرتبہ نہیں پیدا ہوا"

حضرت شطیبیؒ نے حضرت عیسیٰؑ کے اقوال میں سے اس قول کو اسی طرح بیان فرمایا ہے:-

حضرت نبی کریم ﷺ کے اس قول کے بارے میں بعض عارفین نے فرمایا ہے:-

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ

"فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے بلکہ جہاد اور نیت ہے"

ہجرت کی دو قسمیں ہیں:-

ایک ہجرت صغریٰ (چھوٹی ہجرت):- وہ اپنے وطنوں سے جسموں کی ہجرت ہے۔

دوسری ہجرت کبریٰ (بڑی ہجرت):- وہ نفوس کا اپنے مرغوبات اور اپنی عادات سے ہجرت کرنا ہے۔

حضرت رسول کریم ﷺ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:-

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ

"ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے"

آنحضرت ﷺ نے جہاد نفس کو جہاد اکبر، اور جسم کو جہاد اصغر قرار دیا ہے۔ اور حضرت نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:-

اَلْهِجْرَةُ بَاقِيَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

"ہجرت قیامت کے دن تک باقی رہے گی، یعنی ظاہری اور باطنی ہجرت۔

لہٰذا جس شہر یا ملک میں اپنے دین کا مددگار نہ پائے یا جس مقام میں اپنے قلب کو حاضر نہ پائے وہاں سے ہجرت واجب ہے۔ اور جو خواہش اس کو اس کے رب سے جدا کردے اس خواہش سے ہجرت واجب ہے۔ وباللہ التوفیق۔

یہاں پہلا مکتوب ختم ہوا جو مصنفؒ نے اپنے بعض اصحاب کے پاس روانہ فرمایا۔

اور اس مکتوب کا حاصل:- اول سے آخر تک سلوک کا بیان ہے، اہل عقل کیلئے اس مکتوب کا مطالعہ پوری کتاب کے مطالعہ سے کافی ہے۔

دوسرا مراسلہ

شریعت کی حرمت کی حفاظت کے ساتھ حقیقت کے سمندر تک پہنچنے کے بیان میں

یہ دوسرا مکتوب بھی مصنفؒ نے اپنے بعض اصحاب کو لکھا

چنانچہ حضرت مصنفؒ نے جو کچھ اپنے بعض اصحاب کو لکھا اس کو بیان فرمایا۔

میں کہتا ہوں:۔ پہلا مکتوب سلوک اور اس کی ابتدا اور انتہا کے بیان میں ہے اور یہ دوسرا مکتوب شریعت کی حرمت کی حفاظت کے ساتھ حقیقت کے سمندر تک پہنچنے کے بیان میں ہے۔

اور اس کی دو طرفیں اور ایک وسط یعنی درمیان ہے۔ کچھ لوگوں نے تفریط کی یعنی حد سے پیچھے رہ گئے اور کچھ لوگوں نے افراط کیا یعنی حد سے آگے بڑھ گئے، اور کچھ لوگوں نے اعتدال اور جمع کو اختیار کیا۔

مصنفؒ نے تقسیم کو مکمل کرنے کیلئے تینوں قسموں کو بیان فرمایا۔ چنانچہ تقسیم کی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِنْ كَانَتْ عَيْنُ الْقَلْبِ تَنْظُرُ اَنَّ اللّٰهَ وَاحِدٌ فِي مِنَّتِهٖ ، فَالشَّرِيْعَةُ تَقْتَضِيْ اَنَّهٗ لَا بُدَّ مِنْ شُكْرِ خَلِيْقَتِهٖ

"اگر قلب کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان میں واحد اور لاشریک ہے تو شریعت اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس کی مخلوق کا شکر ادا کرنا ضروری سمجھے"

میں کہتا ہوں:۔ قلب کی آنکھ:۔ بصیرت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ وہ صرف حقیقتوں کو دیکھتی ہے۔ محسوسات کو نہیں دیکھتی ہے جیسا کہ بصر (ظاہری آنکھ) صرف محسوسات کو دیکھتی ہے۔ حقیقتوں کو نہیں دیکھتی ہے اور بصیرت اور بصر دونوں میں سے جو غالب ہوتی ہے، اسی کا حکم چلتا ہے۔

لہٰذا جس شخص کی بصر اس کی بصیرت پر غالب ہوتی ہے وہ صرف محسوسات کو دیکھتا ہے اور وہ غافل ہے۔

اور جس شخص کی بصیرت اس کے بصر پر غالب ہوتی ہے وہ صرف حقائق کو دیکھتا ہے اور حقائق :- توحید کی حقیقتیں ، اور تفرید کے اسرار ہیں ۔ لہٰذا بصیرت صرف اللہ تعالیٰ کا نور دیکھتی ہے۔ مخلوق کی ظلمت نہیں دیکھتی ہے۔ لیکن حکمت کا ثابت کرنا ضروری ہے۔ اور اس کے متعلق مصنفؒ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:-

(مخلوقات اللہ تعالیٰ کے ثابت کرنے کے ساتھ ثابت ہیں اور اس کی احدیت کے ساتھ نیست ونابود ہیں)

لہٰذا حکمت کے ساتھ قائم ہونے کی بناء پر ان کو ثابت کرنا' اور وحدت کے ساتھ قائم ہونے کی بناء پر ان کی نفی کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا اگر قلب کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان میں واحد ہے بلکہ اپنی تمام تصرفات میں واحد ہے تو شریعت اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی مخلوق کا شکر ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ

" تم میرا اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرو"

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی وسیلے سے تم کو کوئی نعمت عطا فرمائے خواہ وہ دینی نعمت ہو یا دنیاوی ، تو اس میں تمہارے اوپر دو وظیفے واجب ہوتے ہیں۔ ایک وظیفہ قلبی ہے:- اور وہ یہ ہے کہ تم یہ اعتقاد رکھو کہ وہ نعمت تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ ملی ہے، اور یہ کہ اس کا ماسوا اس کے پہنچانے پر مجبور ہے۔

دوسرا وظیفہ زبانی ہے:- اور وہ یہ ہے کہ تم اس وسیلہ کیلئے دعا کرو اور شریعت پر عمل کرنے کیلئے تم کا شکر ادا کرو۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے حضرت محمد ﷺ سے روایت فرمائی ہے:-

مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ الْقَلِيْلَ لَمْ يَشْكُرِ الْكَثِيْرَ ، وَمَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ

"جس شخص نے تھوڑی نعمت کا شکر نہیں ادا کیا، اس نے زیادہ نعمت کا شکر نہیں ادا کیا اور جس نے انسان کا شکر نہیں ادا کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں ادا کیا"

اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں ایک اسم "شکور" ہے۔ لہٰذا بندے کو اللہ تعالیٰ کے وصف سے موصوف ہونا چاہیے۔

اور واسطہ کے اعتبار کی تین حکمتیں ہیں:-

ایک حکمت:- یہ ہے کہ واسطہ اللہ تعالیٰ کے بھیجنے سے ہدیوں کو تمہاری طرف پہنچاتا ہے، لہٰذا قاصدوں کو بزرگی حاصل ہوتی ہے۔

دوسری حکمت:- یہ ہے کہ واسطہ ظرف ہے (برتن)۔ جس میں تمہاری طرف فوائد پہنچتے ہیں۔ لہٰذا حکمت یہ ہے کہ فوائد کے برتن یعنی واسطہ کا مرتبہ بلند کرنا ہے۔

تیسری حکمت:- یہ ہے کہ واسطہ سمجھنے سے احسان کا وہم دور ہو جاتا ہے کیونکہ وہم تم کو اس شخص کی طرف مائل کرتا ہے جس نے تمہارے اوپر احسان کیا ہے لیکن جب تم نے زبان سے شکر ادا کر کے اس کا بدلہ چکا دیا تو تم اس کی غلامی سے آزاد ہو گئے۔

پھر مصنفؒ نے حقیقت کے اعتبار سے لوگوں کو دو طرف اور وسط میں تقسیم کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی مفرط (حد سے پیچھے رہنے والے) اور مفرط (حد سے آگے بڑھنے والے) اور متوسط (اعتدال اختیار کرنے والے) چنانچہ فرمایا:

وَاِنَّ النَّاسَ فِي ذَالِكَ عَلٰى اَقْسَامٍ ثَلَاثَةٍ

"اور اس معاملے میں لوگ تین قسم کے ہیں"

پہلی قسم:- ظاہر کے ساتھ ٹھہرنے والے، اسباب پر نظر رکھنے والے ہیں۔

دوسری قسم:- ظاہر اور اسباب سے غائب ہونے والے لوگ ہیں۔

تیسری قسم:- دونوں کے درمیان جمع کرنے والے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:- عام، یا خاص، یا خاص الخاص۔

پھر مصنفؒ نے پہلی قسم کی طرف اشارہ فرمایا:-

غَافِلٌ مُنْهَمِكٌ فِيْ غَفْلَتِهٖ

"غافل جو اپنی غفلت میں منہمک (انتہائی کوشش کرنے والا) ہے"

یعنی اپنی غفلت میں مست، اور اپنی نیند میں ڈوبا ہوا ہے۔ نیند کی وجہ سے جو حالت پیدا ہوئی ہے اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی غفلت کی نیند سے بیدار نہیں ہوتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے اس کی غفلت کی بنیاد بیان فرمائی:-

قَوِيَتْ دَائِرَةُ حِسِّهٖ

"اس کے ظاہر کا دائرہ طاقتور ہو گیا ہے"

یعنی اس کے گھیرنے والے ظاہر کی کثافت مضبوط ہو گئی۔ لہٰذا اس کا حجاب کثیف ہو گیا اور اس کی جہالت بڑھ گئی، تو اس کی غفلت اور زیادہ ہو گئی۔ اور اگر اس کے ظاہر کا دائرہ فنا ہو جاتا تو اس کی روح عالم ملکوت یا جبروت کے قریب ہو جاتی۔ پھر وہ صرف جمع کو دیکھتی یا عین فرق میں جمع کو، اور عین جمع میں فرق کو دیکھتی۔ لیکن چونکہ اس کے ظاہر کا دائرہ مضبوط ہو گیا۔ اس لیے اس کی بصیرت کی روشنی بجھ گئی۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:-

وَانْطَمَسَتْ حَضْرَةُ قُدْسِهٖ

"اس کی بارگاہ قدس غائب ہو گئی"

یعنی اس سے وہ بارگاہ قدس جو ملکوتی حقیقتوں کا دیکھنا ہے اس کی بصیرت کے اندھی ہونے کی وجہ سے غائب ہو گئی۔ کیونکہ ان حقیقتوں کو صرف بصیرت ہی محسوس کرتی ہے۔ لہٰذا جب اس کی بصیرت اس کے ظاہر کی کثافت مضبوط ہونے کی وجہ سے اندھی ہو گئی تو اس سے بارگاہ قدس کا نور غائب ہو گیا۔

پھر مصنفؒ نے بارگاہ قدس کے غائب ہونے کا انجام بیان فرمایا اور وہ اللہ تعالیٰ کو ترک کر کے مخلوق کو دیکھنا ہے، چنانچہ فرمایا:-

فَنَظَرَ الْاِحْسَانَ مِنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ ، وَلَمْ يَشْهَدْهُ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ

"پس اس نے احسان کو مخلوقات کی طرف سے دیکھا، اور اس نے اس کو رب العالمین کی طرف سے نہیں مشاہدہ کیا"

میں کہتا ہوں :۔ جو شخص اپنے ظاہر کے دائرے میں فنا نہیں ہوا۔ اور اپنے رب کے شہود میں اپنے نفس کے شہود سے غائب نہیں ہوا، خواہ اعتقاد کے طریقے پر ہو، یا استناد (پوشیدہ توجہ) کے طریقے پر۔ اس کو مخلوق کے احسان کی غلامی سے آزاد ہونے کی خواہش نہ کرنی چاہیے، اگرچہ اس کا نفس توحید کی حفاظت کی کوشش کرتا ہو کیونکہ یہ ضروری ہے کہ طبیعت چرالی جائے۔

بخلاف اس شخص کے جس کی فنا ثابت ہوگئی ہے، اور وہ وحدت کے سمندر میں غرق ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کو کوئی شئی نہیں چرا سکتی ہے۔ اور اگر کبھی غفلت اس کو لاحق بھی ہو جاتی ہے تو وہ فوراً ہوشیار ہو جاتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے احسان کو مخلوق کی طرف سے دیکھنے میں دونوں فریق کا حال بیان فرمایا:۔

اِمَّا اِعْتِقَادًا فَشِرْكٌ جَلِيٌّ

"یا اعتقاد کے طریقے پر اس نے احسان کو مخلوق کی طرف سے دیکھا۔ لہٰذا یہ شرک جلی ہے"

یعنی وہ کوئی پوشیدہ مسئلہ نہیں ہے کہ جس شخص نے کسی فعل کو مستقل طور پر غیر اللہ کی طرف منسوب کیا، وہ کافر ہے۔ ایمان سے خارج ہے۔ اگرچہ اس کے ظاہر پر شرعی وظائف کے آثار ظاہر ہوں، کیونکہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی خالق یا رازق کا مستقل طور پر اعتقاد کیا۔ وہ بالا جماع (متفقہ طور پر) کافر ہے۔ پھر دوسرے فریق کا حال بیان فرمایا:۔

وَاِمَّا اِسْتِنَادًا فَشِرْكٌ خَفِيٌّ

"یا استناد کے طریقے پر اس نے احسان کو مخلوق کی طرف سے دیکھا۔ لہٰذا یہ شرک خفی ہے"

میں کہتا ہوں :۔ استناد:۔ پوشیدہ توجہ اور میلان ہے۔ اس طرح کہ جب تم اس سے پوچھو:۔ تم کو روزی کون دیتا ہے؟ تو وہ کہتا ہے:۔ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا قلب خالق کے دیکھنے سے پہلے مخلوق کو دیکھتا ہے اور اکثر اوقات تو زبان حال یا زبان قال سے کہتا ہے:۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا، تو یہ احسان مجھکو نہ ملتا۔ یعنی اگر سبب نہ ہوتا، تو مسبب نہ ہوتا۔ لہٰذا اس کا اسباب کے ساتھ ٹھہر جا

نا، اور مسبب الاسباب (اسباب کے پیدا کرنے والے) تک نہ پہنچنا، یہ اس کا شرک خفی ہے۔

اور اگر اس نے اسباب کو نظر انداز کر دیا اور اس کی بصیرت مسبب الاسباب کے مشاہدے تک پہنچی، تو شرک جلی اور خفی سے پاک ہو گیا، اور کامل اخلاص سے آراستہ ہو گیا۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وَصَاحِبُ حَقِيْقَةٍ غَابَ عَنِ الْخَلْقِ بِشُهُوْدِ الْمَلِكِ الْحَقِّ وَفَنِىَ عَنِ الْأَسْبَابِ بِشُهُوْدِ مُسَبِّبِ الْأَسْبَابِ

"اور اہل حقیقت بادشاہ حق اللہ تعالیٰ کے شہود کے ساتھ مخلوق کے شہود سے غائب ہو گیا اور مسبب الاسباب کے شہود کے ساتھ اسباب کے شہود سے فنا ہو گیا"

میں کہتا ہوں:۔ حقیقت:۔ مخلوق کے مظہروں میں اللہ تعالیٰ کے نور کا دیکھنا ہے یا عبودیت کے جسموں میں ربوبیت کے نور کا مشاہدہ کرنا ہے۔ لہٰذا اہل حقیقت وہی ہے جو بادشاہ حق اللہ تعالیٰ کے نور کے مشاہدہ میں مخلوق کے مشاہدہ سے غائب ہو جاتا ہے اور مسبب الاسباب کے مشاہدہ میں سبب کے مشاہدہ سے فنا ہو جاتا ہے۔

لہٰذا وہ اگر حکمت کا خیال رکھتے ہوئے غائب ہے، تو وہ کامل ہے اور اگر حکمت کا لحاظ رکھے بغیر وہ اسباب اور مخلوق سے غائب ہے۔ تو اگر وہ ایسا غائب ہے کہ اس کی اصلیت سے اس کا تعلق ختم ہو چکا ہے تو وہ معذور ہے۔

اسی کو مصنفؒ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:۔

فَهٰذَا عَبْدٌ مُوَاجَهٌ بِالْحَقِيْقَةِ

"پس یہ ایسا بندہ ہے جو حقیقت کے سامنے ہے"

یعنی حقیقت کا نور اس پر منکشف ہو چکا ہے۔

ظَاهِرٌ عَلَيْهِ سَنَاهَا

"حقیقت کا نور اس پر غالب ہے"

لہٰذا جب انوار اس پر غالب ہو گئے تو وہ مست ہو گیا، اور حکمت کو بھول گیا۔ پس وہ اپنی سابق

حالت کے اعتبار سے اس لیے کامل ہے کہ وہ وحدت کے سمندر میں مستغرق (ڈوبا ہوا) ہے۔ اور وہ وجد اور سکر غالب ہونے کی وجہ سے حکمت کی نفی کرنے میں معذور ہے۔

اور وہ اپنی بعد کی حالت کے اعتبار سے اس لیے ناقص ہے کہ اس کا فائدہ اس کو کم پہنچتا ہے۔ اگر چہ اس نے طریقت کا سلوک اختیار کیا، اور اس کی انتہا تک سیر کر کے حقیقت تک پہنچ گیا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے بیان فرمایا:-

سَالِكٌ لِلطَّرِيْقَةِ

"وہ طریقت کا سالک ہے"

یعنی اگر طریقت کا سلوک اس کو حاصل نہ ہوتا تو حقیقت کے عالم اس پر ظاہر نہ ہوتے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے صرف شریعت کے انوار اور حکمت کے اسرار گم ہو گئے ہیں۔ لیکن اس نے طریقت کا سلوک کیا ہے اور اس کی انتہا تک سیر کی ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے:-

قَدِ اسْتَوٰى عَلٰى مَدَّاهَا

"وہ طریقت کی انتہا پر مضبوطی سے قائم ہو گیا ہے"

اور حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی ہے مگر طریقت کے سلوک اور ظاہر شریعت پر ثابت قدمی سے قائم ہونے کے بعد۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

"اور تم لوگ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ"

اور حقیقت کے گھر کیلئے شریعت اور طریقت کے سوا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ پھر جب بندہ حقیقت تک پہنچ جاتا ہے تو آدمیوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا سینہ تنگ ہوتا ہے وہ ان انوار کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور ان اسرار کے مشاہدہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ وحدت کے مشاہدے میں گم ہو جاتے، اور حکمت کو بھول جاتے ہیں۔

اور آدمیوں میں کچھ لوگ کشادہ سینہ والے اور طاقتور نور کے اہل ہوتے ہیں۔ تو جب ان کے اوپر حقیقت کے انوار روشن ہوتے ہیں، تو وہ ان کو حکمت کے ساتھ قائم ہونے سے مغلوب نہیں

کرتے ہیں۔

اور حکمت کے ساتھ قیام:- حقیقت اور شریعت کے درمیان برزخ (درمیانی شی) ہو جاتا ہے۔اسی طرح اس کی سیر فنا اور بقا میں ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ دونوں میں متمکن (مضبوطی سے قائم) ہو جاتا ہے اور اس کا معاملہ دونوں کے درمیان معتدل رہتا ہے اور یہ طاقتور لوگوں کی حالت ہے۔

اور طریقہ شاذلیہ سراپا ایسا ہی ہے۔اس طریقے پر چلنے والا حقیقت اور شریعت کے درمیان سیر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تمکین اور اعتدال پر قائم ہو جاتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے اس قسم کے لوگوں کو کامل قرار دیا ہے جن پر حقیقت غالب ہو چکی ہے، چنانچہ فرمایا:-

غَيْرَ اَنَّهٗ غَرِيْقُ الْاَنْوَارِ

"وہ انوار میں ڈوبا ہوا ہے"

یعنی اس پر حقیقت کے انوار غالب ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ احکام شریعت سے گم ہو گیا۔

مَطْمُوْسُ الْاٰثَارِ

"آثار یعنی مخلوقات سے غائب ہے"

یعنی مخلوقات کے دیکھنے سے اس حیثیت سے غائب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لیے قائم کیا ہے کہ وہ ان کے ذریعے پہچانا جائے۔

اور ایسا اس لیے ہے کہ جب اس پر حقیقت کے انوار روشن ہوئے تو اس نے فروع کو اس کے اصول سے، اور ملکوت کے انوار کو جبروت سے ملا دیا۔اور اس کے اوپر سکر غالب ہونے کی وجہ سے وہ واسطوں کو بھول گیا۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا:-

قَدْ غَلَبَ سُكْرُهٗ عَلٰى صَحْوِهٖ

"اس کا سکر اس کے صحو پر غالب ہے"

سکر:-اس طاقتور وارد کو کہتے ہیں جو قلب کو ظاہر کے دیکھنے سے غائب کر دیتا ہے۔

صحو:-اس طاقتور وارد کے چلے جانے کو کہتے ہیں، یہاں تک کہ قلب غائب ہونے کے بعد احساس کی طرف لوٹ جائے۔

[وَ] غَلَبَ عَلَيْهِ اَيْضًا [جَمْعُهٗ عَلٰى فَرْقِهٖ]

"اور نیز اس کا جمع اس کے فرق پر غالب ہے"

جمع:-بغیر مخلوق کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ہے۔

فرق:-بغیر اللہ تعالیٰ کے مخلوق کو دیکھنا ہے، لیکن اگر جمع کے بعد فرق ہو، تو مخلوق اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ہے۔

حاصل یہ ہے:-اہل جمع صرف اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور اہل فرق، صرف مخلوق کو دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر استدلال کرتے ہیں اور جمع کے بعد اہل فرق، مخلوق اور خالق دونوں کو دیکھتے ہیں، یعنی واسطہ اور موسوط کو دونوں کے درمیان فرق کے بغیر دیکھتے ہیں۔

[وَ] غَلَبَ عَلَيْهِ اَيْضًا [فَنَاءُهٗ عَلٰى بَقَائِهٖ

"اور نیز اس کی فنا اس کی بقا پر غالب ہے"

فنا:-اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کے ساتھ مخلوق سے غائب ہونا ہے۔

بقا:-اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کا مشاہدہ ہے، اگر فنا کے بعد ہو۔ اور اگر فنا کے پہلے ہو، تو اللہ تعالیٰ کے بغیر مخلوق کا مشاہدہ ہے اور وہ اہل حجاب کا مقام ہے۔

[وَ] غَلَبَ عَلَيْهِ اَيْضًا [غَيْبَتُهٗ عَلٰى حُضُوْرِهٖ

"اور نیز اس کی گمشدگی اس کے حضور پر غالب ہے"

غیبت:- مخلوق کے دیکھنے سے قلب کا علٰحدہ ہو جانا ہے۔

حضور:- ظاہر اور ماسویٰ سے غائب ہونے کے بعد بارگاہ الٰہی کا مشاہدہ کرنا ہے۔

پس یہ سالکین میں سے اہل جذب کے حالات ہیں، لیکن اگر ان کو کوئی شیخ ہے، تو یہ ضروری ہے کہ وہ ان کو ان حالات سے نکال کر سلوک میں پہنچائے گا اور وہ بقا کا مقام ہے۔ پس بقا جذب کو

چاہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو پالیتا ہے۔ جیسا کہ جذب کا طالب اپنی زندگی میں اس کو پالیتا ہے۔

اور ہمارے بعض شیوخ فرمایا کرتے تھے :۔ تم ہمیں وہ شخص دکھاؤ جو ہمارے سامنے فرق کو پیش کرے، تو ہم اس کیلئے فرق سے نکل کر بقا کے میدان تک پہنچنے کے ضامن ہیں۔

اور بقا کی طرف مصنفؒ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وَاَكْمَلَ مِنْهُ عَبْدٌ شَرِبَ فَازْدَادَ صَحْوًا ، وَ غَابَ فَازْدَادَ حُضُوْرًا ،فَلَا جَمْعُهٗ يَحْجُبُهٗ عَنْ فَرْقِهٖ ، وَلَا فَرْقُهٗ يَحْجُبُهٗ عَنْ جَمْعِهٖ ، وَلَا فَنَاءُهٗ يَصُدُّهٗ عَنْ بَقَائِهٖ ، وَلَا بَقَائُهٗ يَصُدُّهٗ عَنْ فَنَائِهٖ ، يُعْطِيْ كُلَّ ذِيْ قِسْطٍ قِسْطَهٗ ، وَيُوْفِيْ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ

"اوران میں سے زیادہ کامل وہ بندہ ہے جس نے حقیقت کا شراب پیا، تو وہ زیادہ ہوشیار ہو گیا۔ اور گم ہوا، تو اس کی حضوری بڑھ گئی۔ لہٰذا نہ اس کا جمع اس کو اس کے فرق سے روکتا ہے، اور نہ اس کا فرق اس کو اس کے جمع سے محجوب کرتا ہے۔ اور نہ اس کی فنا اس کو اس کی بقا سے روکتی ہے۔ اور نہ اس کی بقا اس کو اس کی فنا سے روکتی ہے۔ وہ ہر حصہ والے کو اس کا حصہ عطا کرتا ہے اور ہر حقدار کو اس کا حق پورا پورا دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں :۔ یہی تیسری قسم کے لوگ ہیں اور یہ خاص الخاص کا مقام ہے اور یہ لوگ اہل رسوخ و تمکین ہیں۔

پس جب ان لوگوں نے حقیقت کی شراب پی، تو ان کی ہوشیاری زیادہ ہو گئی اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے شہود میں مخلوق کے شہود سے غائب ہوئے تو ان کی حضوری بڑھ گئی۔ لہٰذا تم ان کو فکر و نظر میں غرق دیکھو گے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چیونٹی کے رینگنے کی آواز بھی سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو شخص ان کے مقام میں نہیں پہنچا ہے، وہ ان کی ذہانت اور ہوشیاری کی زیادتی کی بنا پر یہ خیال کرتا ہے، کہ یہ اہل غفلت میں سے ہے۔ حالانکہ یہ لوگ بارگاہ قدس میں غرق ہیں۔

حضرت رسول کریم ﷺ لوگوں کے نماز کی امامت کرتے تھے، لیکن جب آپ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے تو بچے کی ماں پر شفقت و مہربانی کے خیال سے نماز کو مختصر کر دیتے تھے۔

یعنی اس کامل مقام والے کو اس کا جمع اس کے فرق سے نہیں روکتا ہے۔

لہٰذا وہ اپنی فرق کی حالت میں جمع کے مقام میں ہیں، اور اپنی جمع کی حالت میں فرق کے مقام میں ہیں۔ وہ اپنے مخلوق کے شہود کے حال میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ان کو ان کی فنا، ان کی بقا سے نہیں روکتی ہے۔ پس وہ اپنے نفوس سے فانی، اور اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ باقی ہیں، اور نہ ان کو ان کی بقا ان کی فنا سے روکتی ہے۔ لہٰذا ان کا ظاہر، ظاہر میں مشغول ہے لیکن ان کا باطن حقیقت سے معمور ہے۔ وہ ہر حقدار کو اس کا حق دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ حقیقت کو اس کا حق، باطن میں اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اور شریعت کو ن کا حق ظاہر میں شریعت کے حقوق میں اپنی جسمانی اعضا کو استعمال کر کے ادا کرتے ہیں۔ اور وہ ہر حصہ دار کو اس کا حصہ پورا پورا دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ آدمیوں کو احسان میں سے ان کو حصہ، اور اللہ تعالیٰ کو اس کا حصہ قلب کے ساتھ اس کی توحید میں پورا پورا دیتے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:۔ وہ انعام اور احسان کے شہود میں اللہ تعالیٰ کو واحد سمجھتے ہیں اور زبان سے واسطوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

یا تم اس طرح کہو:۔ وہ ربوبیت کو اس کا حق تنہا اس کی طرف سے احسان کا مشاہدہ کر کے ادا کرتے ہیں اور مخلوق کو اس کا حق عبودیت کا نشان قائم کرنے کیلئے واسطہ کا شکر ادا کر کے دیتے ہیں۔

حاصل یہ ہے:۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کہ حضرت شاذلیؒ نے فرمایا ہے:۔

تمہارے باطن میں جمع حاضر ہے اور تمہاری زبان پر فرق موجود ہے۔

تنبیہ:۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اس کامل مقام میں بغیر صحبت اور بغیر جذب کے تیر اندازی کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ صرف شریعت کے علم اور عمل کی مضبوطی کے ذریعے وہ اس کامل مقام تک پہنچ جائیں گے۔ حالانکہ یہ خیال قطعی غلط ہے کیونکہ اس مقام تک پہنچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ان مقامات سے گزرے جو اس سے پہلے ہیں۔

اور وہ مقامات:۔ جذب ہے، اور جذب:۔ مخلوق کے شہود سے خالق کے شہود کی طرف اچانک کھنچ جانا ہے۔ اور جذب کیلئے سکر ضروری ہے۔ پھر صحو اور جذب، پھر سلوک اور جمع، پھر فرق اور فنا، پھر بقا ہے۔

ہاں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض افراد بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ مخلوق کے مشاہدہ کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں کھینچ لیے جاتے ہیں اور وہ جذب اور سلوک کے درمیان سیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ طریقہ، شاذلیہ اور اسی کے مثل دوسرے طریقوں میں ہوتا ہے، جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

لیکن جس شخص نے ان عارفین کی صحبت نہیں اختیار کی ہے، جنہوں نے ان مقامات کا سلوک اختیار کیا ہے وہ کبھی اس مقام پر پہنچنے کی تمنا نہ کرے۔

اور اگر کبھی کوئی خاص شخص اس مقام پر پہنچ جائے تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر مصنف ؒ نے دوسرے مقام یعنی جذب وفنا پر، اور تیسرے مقام یعنی صحو وبقا پر سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس معاملے سے استدلال کیا، جو ان کو اپنے والد بزرگوار سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ واقعہ افک میں پیش آیا تھا۔ چنانچہ فرمایا:-

وَقَالَ اَبُوْبَكْرِ نِ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا لَمَّا نَزَلَتْ بَرَاءَ تُهَا مِنَ الْاِفْكِ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:- اُشْكُرِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَتْ:- وَاللّٰهِ لَا اَشْكُرُ اِلَّا اللّٰهَ

"حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے اس وقت جبکہ افک (بہتان) سے ان کے بری ہونے کی آیت حضرت رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر نازل ہوئی، فرمایا:-

اے عائشہ ؓ! تم رسول اللہ ﷺ کا شکر ادا کرو۔ تو انہوں نے جواد دیا:-

اللہ تعالیٰ کی قسم، میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا شکر نہ ادا کروں گی۔

میں کہتا ہوں:- واقعہ افک (بہتان) مشہور ہے۔ سورۂ نور میں اس کا ذکر ہے۔ اہل ظاہر نے اس کی تفسیریں لکھی ہیں۔ جو تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے۔ مگر مصنف ؒ کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے، یہ بات کہنے والے:- "تم رسول اللہ ﷺ کا شکر اد اکرو" ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق ؓ تھے۔ لیکن صحیح بخاری شریف میں یہ ہے کہ جنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے کہا۔ "تم رسول اللہ ﷺ کا شکر ادا کرو"۔ وہ ان کی والدہ محترمہ تھیں۔

اور ایک روایت میں اس طرح ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے بیان کیا ہے۔

فَقَالَتْ لِيْ اُمِّيْ لَمَّا نَزَلَتْ بَرَاءَتِيْ مِنَ السَّمَاءِ : قُوْمِيْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَقُلْتُ: وَاللّٰهِ لَا اَقُوْمُ اِلَيْهِ وَلَا اَشْكُرُ اِلَّا اللّٰهَ

"جب میری پاکیزگی کی آیہ آسمان سے نازل ہوئی۔تو میری والدہ نے مجھ سے فرمایا:-اے عائشہ! حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کھڑی ہو۔تو میں نے ان سے کہا:-اللہ تعالیٰ کی قسم، نہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس کھڑی ہوں گی، نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا شکرادا کروں گی۔

اوراس کی تاویل اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ بات ان کے والد کے اشارے سے کہی گئی ہو یا ان کے والد اور والدہ دونوں نے ایک ساتھ ان سے کہی ہو، یا ان کی والدہ نے کہی ہو۔اوران کے والد خاموش سامنے موجود رہے ہوں اوران کی خاموشی گویا کہ اس بات سے ان کے متفق ہونے کی دلیل ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر مصنفؒ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کے واسطہ کا شکرادا کرنے سے انکار پر جواعتراض وارد ہوتا ہے۔اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:-

دَلَّهَا اَبُوْ بَكْرٍ عَلَى الْمَقَامِ الْاَ كْمَلِ مَقَامِ الْبَقَاءِ الْمُقْتَضِيْ لِاِثْبَاتِ الْاٰثَارِ

"حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کامل ترین مقام بقا کی طرف حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رہنما فرمائی، جوآثار یعنی مخلوقات کے ثابت کرنے کا تقاضا کرتا ہے"

میں کہتا ہوں:-اثر یعنی مخلوق سے فنا ہوجانے کے بعد اس کے ثابت کرنے سے مراد:-

قدرت اور حکمت کے درمیان جمع کرنے کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کو ثابت کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی نفی کرنا ہے۔

اور یہ مقام اپنے پہلے مقام سے زیادہ کامل ہے کہ یہ دونوں مقامات کا جامع ہے اس نے باطن میں قدرت کا حق اس کو دیا۔اور یہ شہود ہے اور ظاہر میں حکمت کا حق اس کو دیا، اور یہ عبودیت ہے۔لہٰذا وہ اپنی ذات سے سالک ہے اور دوسرے کیلئے رہنما ہے۔کامل، عالم، معلم، عارف، معرف (اللہ تعالیٰ کی پہچان کرنے والا) ہے۔اور یہی قصد اور طلب کی انتہا ہے۔کیونکہ کامل خلافت اور رفاہ عام کا مقام ہے۔اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رفاہ عام، رفاہ خاص سے بہتر ہے اور رفاہ

عام یہی ہے کہ وہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرے اور ہر حصہ دار کو اس کو پورا حصہ دیدے۔

ایک عارف سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں دریافت کیا گیا:-

اِتَّقُوْ اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ

"تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ایسا ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے"

اور اس کے ساتھ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:-

اِتَّقُو اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

"تم لوگ اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو، جتنا تم ڈرنے کی طاقت رکھتے ہو"

عارف نے جواب دیا:- تم اپنے قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ایسا ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور اپنے جسم کے ساتھ اتنا ڈرو، جتنا ڈرنے کی تمہارے اندر طاقت ہے۔ تا کہ شریعت اور طریقت کے جامع ہو جاؤ۔

پھر مصنفؒ نے مخلوق کے ثابت کرنے پر قرآن اور سنت سے استدلال کیا، چنانچہ فرمایا:-

وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ :- اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ

"اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، تم میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو"

تو پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ پیدا کرنے کی نعمت کا متولی ہے۔ پھر بعد میں ان کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا جن کے ذریعے پیدا کرنے کی نعمت ظاہر ہوئی۔

لہٰذا واسطہ اللہ تعالیٰ کے ثابت کرنے کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اس کی ذات کی وحدانیت کے ساتھ نیست و نابود ہے اور واسطہ کے ثابت کرنے میں ادب کے اعتبار سے آیت واضح ہے۔ اور واسطہ سے غائب ہونا توحید کی بنا پر عہد ہے۔

پھر مصنفؒ نے سنت کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وَقَالَ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ :- لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ

"حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:- جو شخص آدمیوں کا شکر ادا نہیں کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا ہے"

میں کہتا ہوں :- اس حدیث شریف میں اسم پاک اللہ تعالیٰ کو فاعل ہونے کی حیثیت میں پیش، اور مفعول ہونے کی حیثیت میں زبر، پڑھنا دونوں طرح صحیح ہے۔

لہٰذا اللہ کو پیش پڑھنے کی صورت میں یہ معنی ہوگا :- اللہ تعالیٰ اس شخص کے کسی فعل کا شکر نہیں کرتا ہے، یعنی اس کے فعل کو پسند نہیں کرتا ہے، جو انسان کا شکر ادا نہیں کرتا ہے۔

اور اللہ کو زبر پڑھنے کی صورت میں یہ معنی ہوگا :- جو شخص انسان کا شکر نہیں ادا کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی نہیں ادا کرتا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار نہیں کہا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت کردہ حدیث شریف پہلے گزر چکی ہے :-

مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ الْقَلِيْلَ لَمْ يَشْكُرِ الْكَثِيْرَ ، وَمَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ

"جس شخص نے کم کا شکر نہیں ادا کیا اس نے زیادہ کا شکر ادا نہیں کیا، اور جس شخص نے انسان کا شکر نہیں ادا کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں ادا کیا"

پھر مصنفؒ نے اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے واسطہ (حضرت رسول اللہ ﷺ) کا شکر ادا کرنے سے انکار پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس کو جواب بیان کرتے ہوئے فرمایا :-

وَكَانَتْ فِي ذٰلِكَ الْوَقْتِ مُصْطَلِمَةٌ عَنْ شَاهِدِهَا

"اور حضرت عائشہ صدیقہؓ اس وقت اپنے حاضر سے (حال سے) غائب تھیں"

یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ اس وقت اپنے حال سے غائب، اور اپنے ظاہر سے فانی تھیں۔ جیسا کہ جذب کا حال ہوتا ہے۔

اور مصنفؒ نے "اس وقت" اس لیے کہا کہ ان کی یہ حالت ہمیشہ نہیں رہی، اور وہ طاقتور وارد الٰہی تھا۔ جس نے ان کو اچانک جس سے اچک لیا تھا۔

جیسا کہ یہ وارد حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کو اس وقت لاحق ہوا، جب حضرت جبریلؑ ان کے سامنے تشریف لائے اور فرمایا :- کیا آپ کو کچھ حاجت ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا :- اگر آپ سے، تو میری کوئی حاجت نہیں ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ سے، تو میری حاجت ہے۔ پس وہ واسطہ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ تو حضرت جبریلؑ نے کہا :- آپ اللہ تعالیٰ سے مانگیے۔ حضرت

ابراہیم ؑ نے جواب دیا:- میرے حال پر اللہ تعالیٰ کا علم، میرے مانگنے سے زیادہ میرے لیے کافی ہے۔ اور جیسا کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:-

لِيْ وَقْتٌ لَّا يَسَعُنِيْ فِيْهَا غَيْرُ رَبِّيْ

"میرے لیے ایک وقت ایسا ہے کہ اس وقت میرے قریب میرے رب کے سوا کسی کی گنجائش نہیں ہوتی ہے"

لہٰذا حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اس وقت اس حال میں تھیں:-

غَائِبَةٌ عَنِ الْاٰثَارِ ، فَلَمْ يَشْهَدْ اِلَّا لِوَاحِدِ الْقَهَّارِ

"وہ آثار یعنی مخلوقات سے غائب تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ واحد قہار کے سوا کچھ نہیں دیکھا"

میں کہتا ہوں:- تنہا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے عذر کو حضرت نبی کریم ﷺ کا یہ قول تقویت دیتا ہے:-

يَا عَائِشَةُ اُشْكُرِيْ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ بَرَّاَكِ

"اے عائشہ! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بہتان سے بری یعنی پاک فرمایا"

لہٰذا یہ قول اپنا شکر نہ ادا کرنے پر حضرت نبی کریم ﷺ کے حکم کی دلیل ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن ابی جمرہ نے بیان کیا ہے۔ لیکن اس ضمیمہ کے ساتھ جو مصنف ؒ نے بیان فرمایا ہے:- زیادہ کامل مقام میں صحو (ہوش) کی حالت میں واسطوں کا ترک کرنا درست نہیں ہے۔

یہ حضرت شیخ زروق ؒ نے بیان فرمایا ہے:-

یہاں دوسرا مکتوب ختم ہوا، جو مصنف ؒ نے اپنے بعض اصحاب کے پاس روانہ فرمایا۔

یہ مکتوب مضبوطی اور کمال کی انتہا کے بیان میں ہے۔

پس اگر اس کتاب میں اس مکتوب اور پہلے مکتوب کے سوا کچھ نہ ہوتا، تو بھی کافی ہوتا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ حضرت مصنف ؒ کو اہل طریقت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔

تیسرا مراسلہ

نماز، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ فرحت، اور احسانات کے ساتھ فرحت کے بیان میں

چونکہ عارفین کی نماز غافلین کی نماز کی طرح نہیں ہوتی ہے اس لیے مصنفؒ نے اس تیسرے مکتوب میں آنکھ کی اس ٹھنڈک پر جو نماز میں حاصل ہوتی ہے۔ کلام کیا ہے۔

کیا وہ انبیاء علیہ السلام کیلئے مخصوص ہے، یا اس میں اولیاء کرامؒ کیلئے بھی کچھ حصہ ہے؟

چنانچہ حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

لَمَّا سُئِلَ عَنْ قَوْلِهٖ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِیْ فِی الصَّلَاةِ ؟ هَلْ ذَالِكَ خَاصٌّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْ بِغَيْرِهٖ مِنْهُ شِرْبٌ وَّ نَصِيْبٌ؟ فَاَجَابَهٗ:- اِنَّ قُرَّةَ الْعَيْنِ بِالشُّهُوْدِ عَلٰى قَدْرِ الْمَعْرِفَةِ بِالْمَشْهُوْدِ

"جب ان سے حضرت محمد ﷺ کے اس قول کے بارے میں سوال کیا گیا:- میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے:- کیا یہ آنکھ کی ٹھنڈک خاص طور پر آنحضور ﷺ کیلئے مخصوص ہے، یا ان کے سوا دوسروں کیلئے بھی اس میں سے کچھ حصہ ہے؟ تو انہوں نے اس کو جواب دیا:- آنکھ کی ٹھنڈک شہود کے ساتھ مشہود کی معرفت کے مطابق ہوتی ہے"

میں کہتا ہوں:- آنکھ کی ٹھنڈک:- فرحت یعنی خوشی کی زیادتی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ جو رونا خوشی سے ہوتا ہے۔ اس کا آنسو ٹھنڈا ہوتا ہے قرۃ کے معنی ٹھنڈک کے ہیں۔ کسی شخص کو دعا کے طور پر اس طرح کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھ ٹھنڈی کرے۔ یعنی تم ایسا خوش کرے کہ تمہاری آنکھ خوشی کے آنسوؤں سے ٹھنڈی ہو جائے۔

اور اس کے جواب میں مصنفؒ کے کلام کا مفہوم یہ ہے:- نماز میں آنکھ کی ٹھنڈک، معرفت اور

شہود میں فرق کے مطابق متفرق (جدا، جدا) ہوتی ہے۔اور معرفت، تخلیہ اور تحلیہ کے مطابق ہوتی ہے۔

اور کوئی معرفت حضرت نبی کریم ﷺ کی معرفت کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اور کوئی شہود حضرت نبی کریم ﷺ کے شہود کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتی ہے۔لیکن شہود کی حیثیت سے مطلق شہود میں شرکت حاصل ہوتی ہے اور آنکھ کی ٹھنڈک شہود ہی کے مطابق ہوتی ہے۔

اور جبکہ حضرت نبی کریم ﷺ کے وارثوں کیلئے ان کے مشرب کی صفائی، اوران کے قلوب کی پاکیزگی، اورن کے اسرار کی نورانیت کے مطابق آنکھ کی ٹھنڈک سے حصہ حاصل ہوتا ہے۔تو علماء کرام یعنی عارفین باللہ چونکہ انبیاءؑ کے وارث ہیں۔لہٰذا مکمل وراثت میں سے جتنی وراثت کے وہ وارث ہوتے ہیں اسی کے مطابق نماز میں آنکھ کی ٹھنڈک کا حصہ ان کو حاصل ہوتا ہے۔

اسی لیے وہ لوگ نماز میں غائب ہوجاتے تھے، اوراس میں اتنی نعمت اور لذت پاتے تھے کہ اس کے بیان سے عبارت عاجز ہے۔

اوران میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ایک رکعت میں پوری رات گزار دیتے تھے اور ہر رات ایک قرآن کریم ختم کرتے تھے۔

تو اگر وہ مناجات کی لذت نہ پاتے تو ان کی یہ حالت ہمیشہ نہ رہتی۔

اور جواب میں مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:۔ شہود کے ساتھ آنکھ کی ٹھنڈک مشہود کی معرفت کے مطابق ہوتی ہے۔

لہٰذا مصنفؒ نے ایک ایسی عام عبارت استعمال کی ہے، جو ہراس شخص پر صادق آتی ہے جس کو شہود کا کچھ حصہ حاصل ہے۔

لیکن حضرت نبی کریم ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک، تو اس کا مقابلہ کسی آنکھ کی ٹھنڈک نہیں کر سکتی ہے۔

اور حضرت محمد ﷺ کے مقام کے بعد ایسا ہی حال تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔

مصنفؒ نے اسی کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:۔

وَالرَّسُوْلُ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ لَيْسَ مَعْرِفَةٌ كَمَعْرِفَتِهِ فَلَيْسَ قُرَّةٌ كَقُرَّتِهِ

"اور حضرت محمد ﷺ، تو کوئی معرفت ان کی معرفت کی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا کسی آنکھ کی ٹھنڈک ان کی آنکھ کی ٹھنڈک کی طرح نہیں ہے"

میں کہتا ہوں:۔ مصنفؒ نے دونوں جگہ فعل مجازی "لیس" کو مؤنث اس لیے نہیں استعمال کیا ہے، کہا کوئی معرفت حضرت محمد ﷺ کی معرفت کے برابر نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ ان کو پہلا قدم (یعنی روز ازل سے) احسان کے مقام میں ہے۔ اس لیے کہ وصول کے اعتبار سے ان کیلئے نہ مجاہدہ کی ضرورت ہے نہ سیر کی، کیونکہ وہ روز ازل سے واصل باللہ ہیں۔

لہٰذا اولیائے کرام کی انتہا، انبیاءؑ کی ابتداء ہے، اور انبیاءؑ کی انتہا، رسولوں علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ابتداء ہے۔ اور رسولوں علیہم الصلوٰۃ والسلام کی انتہا حضرت محمد ﷺ کی ابتداء ہے۔

اور ہم نے جو یہ کہا ہے:۔ اور وصول کے اعتبار سے ان کیلئے سیر کی ضرورت نہیں ہے، تو یہ اس لیے کہا ہے کہ سیر برے اوصاف کے مجاہدے میں ہوتی ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ تمام برے اوصاف سے بالکل پاک ہیں۔

جیسا کہ ایک شان مبارک میں کہا ہے:۔

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

"آپؐ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں، گویا کہ آپ جس طرح چاہتے تھے اسی طرح پیدا کیے گئے ہیں"

لیکن ترقی کے معنیٰ میں:۔ تو وہ حضور انور ﷺ کیلئے کامل طریقے پر ثابت ہے کیونکہ حضرت محمد ﷺ ایک ساعت میں ترقی کر کے بہت سے مقامات پر پہنچے ہیں اور جس مقام سے آپؐ ترقی فرماتے تھے اس مقام سے استغفار کرتے تھے۔

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ حضرت محمد ﷺ کے اس قول کو مبہم اور مشکل سمجھتے تھے:۔

(اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ فَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً) وَفِي رِوَايَةٍ (مِائَةَ مَرَّةً)

"میرے قلب پر تاریکی یا حجاب چھا جاتا ہے تو میں ایک دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں"۔

اور دوسری روایت میں ہے۔ "میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں"

یہاں تک کہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو دیکھا، اور آنحضرت نے فرمایا:۔ اے مبارک!

حجاب سے مراد:۔ انوار کا حجاب ہے، نہ کہ اغیار کا حجاب۔

لہٰذا حضرت ابوالحسن اس وقت یہ سمجھے کہ غین سے مراد:۔ شہود کے انوار کا ڈھانپ لینا ہے یا یہ کہ ان میں کشف کے قوی اور ضعیف ہونے کے اعتبار سے کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا جب آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی مقام منکشف ہوا، تو آپؐ نے اس پہلے مقام کو بعد والے مقام سے ناقص دیکھا اور آپؐ نے اس مقام کو اس سے اعلیٰ مقام کیلئے حجاب سمجھا۔ اور اسی طرح برابر سمجھتے رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کیلئے کوئی وحد اور انتہا نہیں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا:۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

"آپؐ کہیے! اے میرے رب! مجھکو علم میں ترقی عطا فرما"

حضرت ابوالعباسؒ نے فرمایا ہے:۔ انبیاءؑ رحمت سے پیدا کیے گئے ہیں اور ہمارے نبی کریم ﷺ عین رحمت ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ

"اور ہم نے آپؐ کو تمام عالم کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے"

حضرت شیخ حضرمیؒ نے آنحضرت کا کچھ بیان کرنے کے بعد فرمایا:۔

حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے مظہر اکبر ہیں اور آپؐ موجودات میں اللہ تعالیٰ کے سب مظہروں سے بہت بڑے مظہر ہیں اسی لیے آپؐ کے کلام کا ہر حرف دوسرے کلاموں کے جم غفیر (بہت زیادہ) کے برابر ہوتا ہے اور آپؐ کے سمندر کے فیض کا ہر قطرہ بہت بڑے موج مارنے والے سمندر کے برابر ہے۔ بلکہ اس سے لاکھ گنا زیادہ بڑا اور عظیم الشان ہے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ

"آپ کے عمر کی قسم، بیشک یہ لوگ اپنی مستی میں اندھے ہو رہے ہیں"

لہٰذا حاصل یہ ہوا:- عرفان میں حضرت محمد ﷺ کے مقام کا مقابلہ کسی دوسرے کا مقام نہیں کر سکتا ہے اور اسی طرح حضور ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک کو انبیاء اور اولیاء میں سے کوئی بھی نہیں پا سکتا ہے۔ ہاں اس میں سے ان کیلئے ان کے شہود اور معرفت کے مطابق کچھ حصہ ہے۔

حضرت شیخ ابو العباس مرسیؒ نے فرمایا ہے:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ

"وہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، جو اپنے بندے کو لے گیا"

اور اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:-

بِنَبِیِّہٖ وَلَا بِرَسُوْلِہٖ

"اپنے نبی کو یا اپنے رسول کو لے گیا" تا کہ آنحضرت ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں کیلئے بھی معراج اور ترقی کا دروازہ کھول دیا جائے لہٰذا جس شخص کیلئے عبودیت میں حصہ ہے اس کیلئے سیر کرنے میں بھی حصہ ہے۔

اور چونکہ حضرت محمد ﷺ کی عبودیت کامل ہے۔ اس لیے آپ کی سیر (معراج) بھی کامل ہے۔ لہٰذا آپؐ نے اپنی روح اور جسم کے ساتھ سیر کی اور اس طرح کی سیر ان کے سوا کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوئی، نہ ہوگی۔

پس جب روح کے ساتھ ملکوت کی طرف سیر واقع ہوتی ہے تو بندے کو اس کی سیر کے مطابق عبادت میں آنکھ کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے اور روح کی سیر:- تعلقات اور قاطعات سے اس کے تصفیہ (صاف کرنے) کے مطابق ہوتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور چونکہ مصنفؒ کے اس جواب میں "شہود کے ساتھ آنکھ کی ٹھنڈک مشہود کی معرفت کے مطابق ہوتی ہے" مقصود سے پوشیدگی ہے۔ (یعنی مقصد واضح نہیں ہوتا ہے) لہٰذا اس کو وضاحت کے ساتھ اپنے اس قول میں بیان فرمایا:-

[وَاِنَّمَا قُلْنَا اِنَّ قُرَّةَ عَیْنِہٖ فِیْ صَلَاتِہٖ بِشُھُوْدِہٖ جَلَالَ مَشْھُوْدِہٖ] لِاَنَّہٗ اَشَارَ اِلٰی ذَالِكَ

بِقَوْلِهٖ (فِی الصَّلَاةِ) وَلَمْ یَقُلْ بِالصَّلَاةِ

"اور ہم نے جو یہ کہا ہے:۔اس کی نماز میں اس کی آنکھ کی ٹھنڈک اس کے مشہود کے جلال کے شہود کے مطابق ہوتی ہے، یہ اس لیے کہا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے قول "فی الصلاۃ" سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور آپ ؐ نے بالصلاۃ نہیں فرمایا"

میں کہتا ہوں:۔ ظرفیت میں اصل یہ ہے کہ وہ اپنے دروازے پر ہوتی ہے۔لہٰذا حضرت محمد ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک اپنے رب کے شہود، اور اس کی طرف بڑھنے اور اس سے کلام کرنے کے سبب ہے۔اور صلاۃ ہی اس ٹھنڈک کا مقام ہے اور حضرت محمد ﷺ کا یہ قول:۔

اَرِحْنَا بِھَا یَا بِلَالُ

"اے بلال تم ہم کو نماز کے ساتھ راحت پہنچاؤ "

اور اس قول میں "ب" سببیہ ہے، یعنی نماز کے سبب راحت پہنچاؤ۔

اور حضرت محمد ﷺ کی راحت صرف اپنے رب کی مناجات (سرگوشی) سے تھی کسی دوسری شئی سے نہیں تھی۔

پھر مصنف ؒ نے حضرت محمد ﷺ کے اس حال کی وجہ بیان فرمائی، کہ حضرت محمد ﷺ کی چشم مبارک نماز سے نہیں ٹھنڈی ہوتی تھی، بلکہ آپ کی چشم مبارک اپنے رب تعالیٰ سے ٹھنڈی ہوتی تھی۔چنانچہ فرمایا:۔

اِذْ ھُوَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَیْهِ لَا تَقِرُّ عَیْنُهٗ بِغَیْرِ رَبِّهٖ

"اس لیے کہ حضرت محمد ﷺ کی چشم مبارک اپنے رب کی غیر کے ساتھ نہیں ٹھنڈی ہوتی تھی"

لہٰذا آپ کی فرحت صرف اپنے رب کے ساتھ تھی۔اور آپ ؐ کا سرور اسی کی طرف بڑھنے میں تھا۔آپ ؐ نے اپنی ہمت عالیہ کونین (علوی وسفلی) سے اٹھالی تھی اور اپنا نعل مبارک (جوتا، یا قدم) دارین (دنیا و آخرت) سے نکال لیا تھا۔

ایک عارف شاعر نے حضرت محمد ﷺ کی شان مبارک میں فرمایا ہے:۔

لَهٗ هِمَمٌ لَا مُنْتَهٰی لِكِبَارِهَا   وَ هِمَّتُهُ الصُّغْرٰی اَجَلُّ مِنَ الدَّهْرِ

"حضرت محمد ﷺ کی ایسی ہمتیں ہیں کہ ان کی بڑی ہمتوں کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، جبکہ ان کی بہت چھوٹی ہمت زمانہ سے بہت بڑی اور بلند ہے"

لَهٗ رَاحَةٌ لَوْ اَنَّ مِعْشَا رَجُوْدِهَا عَلَى الْبَرِّ كَانَ الْبَرُّ اَنْدٰى مِنَ الْبَحْرِ

"ان کیلئے ایسی راحت ہے کہ اگر ان کی بخشش کا دسواں حصہ بھی خشکی پر نازل ہو جائے، تو خشک میدان سمندر سے بھی زیادہ تر ہو جائے"

كَيْفَ وَهُوَ يَدُلُّ عَلٰى هٰذَا الْمَقَامِ

"ایسا کیوں نہ ہوتا، جبکہ حضرت محمد ﷺ اس مقام کی طرف سے دوسرے لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے"

اور وہ احسان کا مقام ہے، اس لیے کہ اسی سے آنکھ کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔

[وَيَاْمُرُ بِهٖ مَنْ سِوَاهُ] مِنَ الْاَنَامِ [لِقَوْلِهٖ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ (اُعْبُدِ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)

"اور مخلوق میں سے دوسرے لوگوں کو اپنے اس قول کے ذریعے حکم دیتے تھے۔ تم اللہ تعالیٰ کے عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

حضرت شیخ زروق ؒ نے فرمایا ہے:۔ یہ جملہ حدیث شریف میں ان لفظوں کے ساتھ وارد نہیں ہوا ہے بلکہ یہ صرف احسان کی تفسیر میں فرمایا گیا ہے:۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

"تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اس کو دیکھتے ہو۔ لیکن اگر (تم اس حال میں نہیں پہنچے ہو، بلکہ تم اس حال میں ہو کہ) تم اس کو نہیں دیکھتے ہو۔ (تو یہ تصور کرو کہ) وہ تم کو دیکھتا ہے"

میں کہتا ہوں:۔ اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ حضرت معاذ بن جبل ؓ کی روایت کردہ حدیث شریف کی عبارت اس طرح ہے:۔

[قُلْتُ:-يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْ صِنِيْ ، قَالَ:- اُعْبُدِ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، وَاعْدُدْ نَفْسَكَ فِي الْمَوْتٰى ، وَاذْكُرِ اللّٰهَ عِنْدَ كُلِّ حَجَرٍ وَّعِنْدَ كُلِّ شَجَرٍ ، وَاِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَاعْمَلْ بِجَنْبِهَا حَسَنَةً تَمْحُهَا ، اَلسِّرُّ بِالسِّرِّ ،وَالْعَلَانِيَةُ بِالْعَلَا نِيَةِ] رَوَاهُ الطِّبْرَانِيْ كَمَافِي الْمُنْذِرِيْ

"میں نے کہا:-یارسول اللہ! آپ مجھ کو وصیت فرمایئے۔حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:- تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو۔گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور تم اپنے نفس کو مردوں میں شمار کرو اور تم ہر پتھر اور ہر درخت کے پاس (یعنی تم جہاں کہیں بھی رہو) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔اور جب تم کوئی گناہ کرو، تو اس کے برابر ایسی نیکی کرو، جو اس گناہ کو مٹا دے۔ پوشیدہ گناہ کے برابر پوشیدہ نیکی ،اور علانیہ گناہ کے برابر علانیہ نیکی"۔اس حدیث کو حضرت امام طبرانی نے بیان فرمایا ہے جیسا کہ منذری میں ہے۔

لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرتا ہے گویا کہ وہ اس کو دیکھتا ہے تو اس کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ماسویٰ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی طرف متوجہ ہوں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے:-

وَمَحَالٌ اَنْ يَّرَاهُ وَيَشْهَدُ مَعَهُ سِوَاهُ

"اور یہ محال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے اور اس کے ساتھ غیر اللہ کو بھی دیکھے"

میں کہتا ہوں :-اس لیے کہ غیر اللہ کا ثابت ہونا حجاب ہے۔لہٰذا شہود اس وقت تک درست نہیں ہوتا ہے۔جب تک کل موجود فنا نہ ہو جائے اور واجب الوجود اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ باقی نہ رہے اور اس کے ماسویٰ کو اس طرح دیکھے گویا کہ وہ سایہ ہے، یا خیال ہے۔جو تحقیق کرنے پر گم ہو جاتا ہے یعنی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

پس اگر تم یہ اعتراض کرو:-جب غیر اللہ نیست و نابود ہے۔تو حضرت محمد ﷺ نے احسان کی تفسیر میں یہ کیوں فرمایا:-

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

"تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھتے ہو"

اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے اس طرح فرمایا:-

اُعْبُدِ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

"تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھتے ہو"

پس حضرت محمد ﷺ نے تشبیہ کی کاف استعمال فرمائی، تو جبکہ رویت حاصل ہے تو آنحضرت علیہ السلام نے اس شخص کے ساتھ کیوں تشبیہ دی جو دیکھتا ہے۔

تمہارے اس اعتراض کا جواب یہ ہے:- حضرت محمد ﷺ تشریع اور تحقیق کے مقام میں تھے اور یہ حدیث ایک بڑی محفل میں کہی گئی:- اس محفل میں ایسے لوگ بھی تھے جو اہل مراقبہ تھے اور اس میں ایسے لوگ بھی تھے جو اہل مشاہدہ تھے۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ایسا کلام فرمایا جس کا خاص و عام دونوں قسم کے لوگ قبول کریں۔ لہٰذا عبادت کی ایسی مضبوطی کے ساتھ کہ گویا وہ مشاہدہ کرتا ہے سب لوگ مخاطب تھے کیونکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ذوق کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکے تھے اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مجاہدہ کر کے اس مقام پر پہنچ سکتے تھے۔

اور اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ بھی ہے:- ملکوت کے انوار کا شہود، ربوبیت کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور وہ اس شخص کے سامنے ظاہر نہیں کیا جا سکتا ہے جو اس کا اہل نہیں ہے۔

اور اگر حضرت محمد ﷺ اس طرح فرماتے:- تم لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کو یعنی اس کے جبروت کے انوار کو ملکوت کے باغ میں پہنچتے ہوئے دیکھتے ہو تو اس طرح کہنے میں ربوبیت کا راز فاش ہو جاتا۔ اور اس کو خواص کے سوا کوئی نہ سمجھ سکتا اور حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے:-

خَاطِبُوا النَّاسَ بِقَدْرِ مَا يَفْهَمُوْنَ

"تم لوگوں سے ان کو سمجھ کے مطابق بات کرو"

لہٰذا حضرت محمد ﷺ نے ایسا بہترین کلام فرمایا جس کا اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں قسم کے لوگ قبول کر سکیں۔

لیکن اہل ظاہر کاف کو دروازے ہی پر چھوڑ دیتے ہیں اور اہل باطن اس کو لام کے معنی میں

استعمال کرتے ہیں۔

اس لیے کہ بصیرت کو دیکھنا:- اہل باطن کے نزدیک بصر سے دیکھنے کے شمار میں ہے، کیونکہ جب بصیرت کھل جاتی ہے تو وہ بصر پر غالب ہو جاتی ہے اور بصر کیلئے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ہے۔

اس اعتراض کا تیسرا جواب یہ ہے:- جب مطلق دیکھنا کہا جاتا ہے تو بصر یعنی ظاہری آنکھ سے دیکھنا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر حضرت محمد ﷺ تشبیہ کی کاف نہ لاتے تو یہ وہم پیدا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ

"اس کو آنکھیں نہیں پا سکتی ہیں"۔ یعنی ظاہری آنکھیں

اور اس کو صرف کھلی ہوئی بصیرتیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا جب بصیرت کھل جاتی ہے تو وہ بصر پر غالب ہو جاتی ہے۔ پھر ملکوت کے انوار میں سے جو انوار بصیرت دیکھتی ہے وہی بصر بھی دیکھتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور جب مصنفؒ نے یہ ثابت کیا:- کہ آنحضرت ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھی۔ نماز کے ساتھ نہیں تھی تو ایک بحث کرنے والے نے ان سے بحث کی۔ لہٰذا مصنفؒ نے بحث کی طرف اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

قَالَ لَهُ سَائِلٌ:- قَدْ تَكُوْنُ قُرَّةُ الْعَيْنِ بِالصَّلَاةِ لِاَ نَّهَا فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ وَبَارِزَةٌ مِّنْ عَيْنِ مِنَّةِ اللّٰهِ ، فَكَيْفَ لَا يَفْرَحُ بِهَا؟ وَكَيْفَ لَا تَكُوْنُ قُرَّةُ الْعَيْنِ بِهَا وَقَدْ قَالَ تَعَالٰى:- فَبِذَالِكَ فَلْيَفْرَحُوْا؟

"مصنفؒ سے ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا:- بیشک نماز آنکھ کی ٹھنڈک ہوتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فضل ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کا سرچشمے سے ظاہر ہوئی ہے۔ تو حضرت محمد ﷺ اس سے کیوں نہیں خوش ہوتے تھے؟ اور ان کی آنکھ کی ٹھنڈک نماز سے کیوں نہیں ہوئی تھی؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:- پس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہونا چاہیے"

میں کہتا ہوں:- بحث کا مضمون، حضرت محمد ﷺ کو یہ قول ہے:-

وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ

"میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے"

یہ بھی ممکن ہے۔ کہ "فی" "ب" کے معنیٰ میں ہو۔ یعنی بالصلاۃ نماز کے ساتھ۔ یا نماز سے۔

اور نماز خوشی کی وجہ اس لیے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے اور اس کی رحمت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے احسان و کرم سے ظاہر ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

" آپ فرما دیجیے:- اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے، پس لوگوں کو اس سے خوش ہونا چاہیے"

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہونے کا حکم دیا ہے۔ اور نماز اللہ تعالیٰ کا ایک فضل اور اس کی ایک رحمت ہے۔ لہٰذا اس سے خوش ہونا واجب ہے اور آنکھ کی ٹھنڈک کا یہی مفہوم ہے۔

پس مصنفؒ نے سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:-

[اِعْلَمْ اَنَّ الْاٰيَةَ هٰذِهٖ قَدْ اَوْمَاتَ] اَیْ اَشَارَتْ اِلَى الْجَوَابِ لِمَنْ تَدَبَّرَ سِرَّ الْخِطَابَ، اِذْ قَالَ - فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا - وَمَا قَالَ:- فَبِذٰلِكَ فَافْرَحْ، يَا مُحَمَّدُ قُلْ لَّهُمْ لِيَفْرَحُوْا بِالْاِحْسَانِ وَالتَّفَضُّلِ، وَلْيَكُنْ فَرْحُكَ اَنْتَ بِالْمُتَفَضِّلِ كَمَا قَالَ فِيْ لْاٰيَةِ لْاُخْرٰى - قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔

"تم یہ جان لو۔ اس شخص کیلئے جو اس خطاب کے راز میں غور کر لے، اس آیت کریمہ ہی نے جواب ہی نے جواب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:- پس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:- پس آپ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہوں۔ اے محمد ﷺ! آپؐ ان لوگوں سے فرما دیجیے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان سے خوش ہوں اور لیکن آپؐ کی خوشی فضل کرنے والے اللہ تعالیٰ

سے ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت کریمہ میں فرمایا ہے:- آپ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیجیے اور ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے وہ اپنے خیال خام میں کھیلتے رہیں "

میں کہتا ہوں:- جواب کا مقصد یہ ہے کہ نماز سے آنکھ کی ٹھنڈک حضرت نبی کریم ﷺ کے سوا، ان کی امت کے حق میں صحیح ہے اس لیے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی علامت ہے۔

لیکن حضرت محمد ﷺ کی آنکھ کی ٹھنڈک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شَی سے نہیں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس پر دلیل ہے۔

فَبِذَالِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

"پس ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور رحمت سے خوش ہونا چاہیے"

اور اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:- اے محمد ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے خوش ہوں۔

لہٰذا اس آیت کریمہ کا خطاب ہی اس بات کی دلیل ہے کہ فضل اور رحمت سے خوشی آنحضرت ﷺ کی امت کیلئے ہے اور حضور انور ﷺ کی خوشی صرف اللہ تعالیٰ سے ہے کسی دوسری شَی سے نہیں ہے۔

جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت کریمہ میں ہے:-

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ

" آپ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیجیے اور ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے وہ اپنے وہم و خیال میں کھیلتے رہیں" اور تحقیق یہ ہے:- کہ اس کو اس طرح کہا جائے کہ جس شخص نے ربوبیت کے شہود کی نعمت حاصل کر لی اس کی خوشی صرف اپنے محبوب کے شہود میں ہے اس کے سوا کسی میں نہیں خواہ کوئی شَی بھی ہو۔

اور جو شخص عبودیت کے مقام میں ہے اور ربوبیت کے انوار کے مشاہدے کا لطف نہیں حاصل کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت ہی سے خوشی ہوتی ہے۔

اور جس شخص نے ربوبیت کے انوار کے مشاہدے کا ذوق حاصل کر لیا لیکن اس میں ثابت

قدمی سے قائم نہیں ہوا اس کی خوشی کبھی اللہ تعالیٰ کے شہود سے ہوتی ہے اور کبھی اس کے فضل اور رحمت سے ہوتی ہے۔

لہٰذا حضرت محمد ﷺ کی امت کا اکابرین یعنی اولیائے عظام کو اللہ تعالیٰ سے اس کے ماسوا کو چھوڑ کر، خوشی کا کچھ حصہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اکابرین امت حضرت رسول کریم ﷺ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے اس لئے کہ حضرت محمد ﷺ کے شہود کے برابر کوئی شہود نہیں ہوسکتا ہے اور اسی طرح ان کی آنکھ کی ٹھنڈک کے مساوی کسی کے آنکھ کی ٹھنڈک نہیں ہوسکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

خاتمہ

اس حدیث شریف کے بیان میں جس کی طرف مصنفؒ نے اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس سے متعلق اشیاء کے بیان میں۔

رُوِیَ:- (اَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ صَنَعَ طَعَامًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَاجْتَمَعَ هُوَ وَنَفَرٌ مِّنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فِيْهِمْ اَبُوْ بَكْرٍ وَّ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَعَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ ، فَتَذَا كَرُوْا فِي الطَّاعَةِ لِلّٰهِ وَ لِرَسُوْلِهٖ ، اِلٰی اَنْ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ :- اِنَّمَا حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ثَلَاثٌ:- اِنْفَاقُ مَالِيْ عَلَيْكَ ، وَالْجُلُوْسُ بَيْنَ يَدَيْكَ ، وَ كَثْرَةُ الصَّلَاةِ عَلَيْكَ وَقَالَ عُمَرُ :- وَاَنَا حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا ثَلَاثٌ :- اِكْرَامُ الضَّيْفِ ، وَالصِّيَامُ فِي الصَّيْفِ ، وَالضَّرْبُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِا لسَّيْفِ۔ وَقَالَ عُثْمَانُ :-حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا ثَلَاثٌ:- اِطْعَامُ الطَّعَامِ ، وَاِفْشَارُ السَّلَامِ ، اَلصَّلَاةُ بِا للَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ ۔ وَقَالَ عَلِيٌّ :-مِثْلَ ذَالِكَ ۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :- وَاَنَا حُبِّبَ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ :- اَلنِّسَاءُ ،اَلطِّيْبُ ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ ، فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ فَقَالَ :-وَاَنَا حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا ثَلَاثٌ :-تَبْلِيْغُ الرِّسَالَةِ ، وَاَدَاءُ الْاَ مَانَةِ ، وَعِيَادَةُ الْمَرْضٰی ، ثُمَّ غَابَ وَظَهَرَ وَقَالَ:- يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَرَبُّ الْعِزَّةِ يَقُوْلُ :-وَاَنَا حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا ثَلَاثٌ:-لِسَانٌ ذَاكِرٌ ، قَلْبٌ شَاكِرٌ وَجِسْمٌ عَلَی الْبَلَاءِ صَابِرٌ)

ذَكَرَهُ الشَّطِيْبِيْ ، فَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِصِحَّتِهٖ ، غَيْرَ اَنَّهٗ كَلَامٌ صَحِيْحٌ فِيْ نَفْسِهٖ

"روایت کی گئی ہے:- حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت محمد ﷺ کیلئے کھانا تیار کیا، پس حضرت محمد ﷺ اور آپ کے کچھ اصحاب رضی اللہ عنہ جمع ہوئے۔ ان حضرات میں حضرت ابوبکرؓ ، حضرت عمرؓ ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ تھے۔ ان حضرات نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

اطاعت کے بارے میں باہم گفتگو شروع کی۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فرمایا:- یارسول اللہ ﷺ! میرے نزدیک دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- آپ ؐ کی ذات اقدس پر اپنا مال خرچ کرنا، دوم:- آپ ؐ کے پاس بیٹھنا، سوم:- آپ ؐ کے اوپر کثرت سے درود و سلام پڑھنا۔

حضرت عمر ؓ نے فرمایا:- اور میری نزدیک دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- مہمان کی تعظیم و تکریم کرنی، دوم:- گرمی کے دنوں میں روزہ رکھنا، سوم:- رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر تلوار سے جہاد کرنا۔

حضرت عثمان ؓ نے فرمایا:- میرے نزدیک دنیا میں تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- کھانا کھلانا، دوم:- سلام کی اشاعت کرنی، سوم:- رات میں نمازیں پڑھنی، جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔

حضرت علی ؓ نے بھی اسی طرح فرمایا:-

پھر حضرت محمد ﷺ نے ان حضرات سے فرمایا:- میری نزدیک تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- عورتیں، دوم:- خوشبو، سوم:- میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

پھر حضرت جبریل ؑ نازل ہوئے اور فرمایا:- میری نزدیک دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- رسالت کا پہنچانا، دوم:- امانت کا ادا کرنا، سوم:- بیماروں کی عیادت کرنی۔

پھر حضرت جبریل ؑ غائب ہو گئے، اور پھر ظاہر ہوئے اور فرمایا:- یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- میری نزدیک دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں:-

اول:- ذکر کرنے والی زبان، دوم:- شکر کرنے والا قلب، سوم:- بلا پر صبر کرنے والا جسم۔

اس حدیث شریف کو حضرت شطیبی ؒ نے بیان فرمایا ہے اور اس کے صحیح ہونے کا بہتر علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ لیکن اپنے معنیٰ و مفہوم کے لحاظ سے یہ حدیث شریف صحیح ہے۔

اور عورتوں کے محبوب ہونے میں حکمت :- زیادہ نکاح کرنے کی ترغیب دینی ہے تا کہ نسل زیادہ ہو، جو اس عالم پر چھا جائیں۔

اور خوشبو :- تو حضور اکرم ﷺ خود سراپا خوشبو تھے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے وجود میں پھیلا دیا، اور کل کائنات اس خوشبو سے معطر ہو گئی اور حضرت محمد ﷺ کے جسم مبارک سے خوشبو پھیلتی تھی خواہ آپ خوشبو لگاتے یا نہ لگاتے۔ آپ کبھی کبھی خوشبو اس لیے استعمال کرتے تھے تا کہ اس کی وجہ سے وہبی (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) خوشبو چھپ جائے اور ایسا اس خوف سے کرتے تھے، تا کہ لوگ آپ کی شان مبارک میں غلو نہ کریں۔ جیسا کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان مبارک میں غلو کیا اور حد سے آگے بڑھ گئے۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے :- خوشبو اہل جنت کی صفت ہے اور حضرت محمد ﷺ جنت میں تھے اس کی خوشبو آپؐ کے جسم اطہر میں بس گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر مصنفؒ نے اس تیسرے مکتوب میں اللہ تعالیٰ سے خوشی بیان کرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ کے احسانات سے خوشی کا بیان فرمایا:-

اَلنَّاسُ فِي وَرُوْدِ الْمِنَنِ عَلَيْهِمْ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَقْسَامٍ

"احسانات کے نازل ہونے میں انسانوں کی تین قسمیں ہیں"

عوام، خواص اور خواص الخواص

پھر مصنفؒ نے عوام کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

فَرِحَ بِالْمِنَنِ لَا مِنْ حَيْثُ مُبْدِيْهَا وَمُنْشِئِهَا ، وَلٰكِنْ بِوُجُوْدِ مَتْعَتِهِ فِيْهَا

"وہ احسانات سے خوش ہوتے ہیں لیکن اس کے پیدا کرنے والے اور بھیجنے والے کی حیثیت سے خوش نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ان سے اپنا فائدہ حاصل ہونے کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں"

میں کہتا ہوں :- یہ لوگ چار پایہ جانوروں کی طرح ہیں ان کی کل شان اور ہمت ان کو نفس اور ان کا ظاہر ہے۔

حضرت ابن البناءؒ نے ان لوگوں کی شان میں کیا خوب فرمایا ہے:-

وَاعْلَمْ بِاَنَّ عُصْبَةَ الْجُھَّالِ بَھَائِمٌ فِی صُوْرَةِ الرِّجَالِ

"تم یہ جان لو کہ جاہلوں کا گروہ آدمیوں کی شکل میں جانور ہیں"

پھر مصنفؒ نے ان لوگوں کا حکم بیان فرمایا:-

فَھٰذَا مِنَ الْغَافِلِیْنَ

"پس یہ لوگ غافلوں میں سے ہیں"

اس لیے کہ جب ان کو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو یہ ان میں مشغول ہو کر لذت اور آسودگی حاصل کرتے اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں اور جب نعمتیں ان سے واپس ہو جاتی ہیں تو وہ ان کی طلب اور حرص میں متفکر ہوتے ہیں اور جب وہ نعمتیں پاتے ہیں، تو ان کا فائدہ اور لطف ان کو نعمتوں کی شکر گزاری سے غافل کر دیتا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ غفلت ان نعمتوں کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ

"اور اگر تم لوگ میری ناشکری کرو گے تو بیشک میرا عذاب سخت ہے"

اور اکثر اوقات ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ قول صادق آتا ہے:-

حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنَاھُمْ بَغْتَةً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ

"یہانتک کہ جب وہ ان نعمتوں میں جو ان کو دی گئی ہیں مگن ہو گئے، تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا تو اب وہ محروم ناامید ہیں"

یہ آیت کریمہ اگرچہ کافروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کا حکم عام ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو دنیا کی نعمتوں اور اس کی زینتوں میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے، اور اپنے مطلوبہ فرائض سے غافل ہو جاتا ہے اس کے اوپر یہ صادق آتا ہے کہ وہ ان نعمتوں میں جو اس کو دی گئیں، مگن ہو گیا۔ تو اسی درمیان میں کہ وہ اپنی غفلت میں منہمک اور اپنی شہوت میں غرق رہا۔ اچانک اس کو موت نے پکڑ لیا، تو وہ نعمتوں کی طرف لوٹنے سے ناامید، اور ان سے فائدہ حاصل کرنے سے مایوس ہو گیا۔ اور کبھی وہ نعمتیں اس کی موت کے پہلے ہی اس سے چھین لی جاتی ہیں تو وہ ان پر سخت

حسرت وافسوس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے:- جو شخص نعمتوں کا شکر نہیں ادا کرتا ہے، وہ ان کو زوال کیلئے پیش کر دیتا ہے (یعنی ناشکری نعمتوں کے زائل ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے)۔ اور جو شخص نعمتوں کے موجود ہونے کی حالت میں ان کی قدر نہیں پہچانتا ہے وہ ان کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی قدر پہچانتا ہے۔

پھر مصنفؒ نے دوسری قسم کے لوگوں یعنی خواص کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

وَفَرِحَ بِالْمِنَنِ مِنْ حَيْثُ اِنَّهٗ شَهِدَهَا مِنَّةً مِمَّنْ اَرْسَلَهَا وَ نِعْمَةً مِمَّنْ اَوْ صَلَهَا

"اور وہ یعنی خواص احسانات سے اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ وہ اس کو اس اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان اور نعمت سمجھتے ہیں جس نے ان کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں ہیں"

میں کہتا ہوں:- وہ ان نعمتوں سے اس ذات مقدس کی طرف بڑھنے، اور اس کے ذکر کا فائدہ حاصل کرتے ہیں جس نے وہ نعمتیں ان کو عطا فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی:- اے موسیٰ! تم یہ جان لو، کہ جب میں تم کو کوئی تازہ کھجور عطا کرتا ہوں تو میں اس کے ذریعے تم کو یاددہانی کرتا ہوں۔ لہٰذا تم اس پر میرا شکر ادا کرو کیونکہ وہ میرے سوا کوئی دوسرا تم کو نہیں دیتا ہے۔

لہٰذا وہ نعمت منعم حقیقی کی طرف ان کے کھنچنے کا سبب بنتی ہے پھر وہ ترقی کر کے تیسرے درجے میں پہنچ جاتے ہیں۔

پھر مصنفؒ نے اس قسم کے لوگوں یعنی خواص کی شہادت قرآن کریم سے پیش فرمائی:-

فَيَصْدُقُ عَلَيْهِ قَوْلِهٖ تَعَالٰے ، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ

"پس ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ قول صادق ہوتا ہے۔ پس ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے خوش ہونا چاہیے وہ ان کیلئے ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں"

میں کہتا ہوں:- یعنی ان کی خوشی اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل:- ایمان ہے، اور اس کی رحمت:- قرآن ہے اور اس کے علاوہ دوسری نعمتیں ہیں۔

وہ یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت، دنیا کے حقیر مال اور اس کی دھوکہ دینے والی خواہشات سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں بہتر ہے۔

اسی کے بارے میں یہ اشعار غالباً سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:-

طَلِّقِ الدُّنْيَا ثَلَاثًا وَالْتَمِسْ زَوْجًا سِوَاهَا

"تم دنیا کو تین طلاقیں دیدو، اور اس کے سوا کوئی دوسری رفیقۂ حیات تلاش کرو"

تُبْ اِلٰى رَبِّكَ مِنْهَا وَاحْتَرِسْ قَبْلَ اَذَاهَا

"تم اس سے منہ پھیر کر اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور ان کی ایذا رسانی سے پہلے تم اس سے اپنی حفاظت کرو"

اِنَّهَا زَوْجَةُ سُوْءٍ لَا تُبَالِيْ مَنْ اَتَاهَا

"وہ بدترین بیوی ہے وہ اپنے پاس آنے والے کی پرواہ نہیں کرتی ہے"

اِنْهَ نَفْسَكَ عَنِ الْغَيِّ وَجَانِبْ هَوَاهَا

"تم اپنے نفس کو سرکشی اور گمراہی سے روکو، اور اس کی خواہش سے پرہیز کرو"

منقول ہے:- ابلیس نے ایک عابد کو بہکانے کا ارادہ کیا، تو وہ عابد اس کے پاس دنیا کی رغبت کے دروازے سے آیا تو اس نے دیکھا کہ عابد نے دنیا کی رغبت کا دروازہ زہد و قناعت سے بند کر دیا ہے۔ پھر وہ اس کے پاس شہوت اور خواہش کے دروازے سے آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عابد نے شہوت اور خواہش کا دروازہ دائمی رنج و مشقت سے بند کر رکھا ہے۔ پھر وہ ان کے پاس غصہ اور تیز مزاجی کے دروازے سے آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عابد نے غصہ اور تیز مزاجی کا دروازہ تواضع اور انکساری سے بند کر رکھا ہے۔ تو ابلیس نے چیخ کر کہا:- یہ ایک ایسا بندہ ہے جو مجھ سے محفوظ ہے اور اس پر میرا کوئی اختیار نہیں چل سکتا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے۔

((اِنَّ الْمُنَادِيْ يُنَادِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ:- اَيْنَ اَصْحَابُ الْمَتَاجِرِ الرَّابِحَةِ مِنْ اَهْلِ الْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ ؟ فَيَقُوْمُ الْاَوْلِيَاءُ وَالْاَصْفِيَاءُ وَالْعُبَّادُ وَالزُّهَّادُ ، فَيُؤْتُوْنَ بِنَجَائِبَ مِنَ النُّوْرِ فَتَطِيْرُ بِهِمْ نَحْوَ الْعَرْشِ وَتَسْبِقُهُمُ الْمَلَائِكَةُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ اِلٰى اَنْ تُنْزِلَهُمْ فِيْ مَنَازِلِهِمْ

مِّنَ الْجَنَّةِ ، وَيَقُوْلُوْنَ لَهُمْ:-هٰذِهِ اَحْمَالُكُمْ وَ فِيْهَا اَعْمَالُكُمْ ، وَيُنَادِيْ الْمُنَادِيْ اَيْضاً:- اَيْنَ اَبْنَاءُ الدُّنْيَا)) اَيِ الْمُخَلِّفُوْنَ وَ الْمُقَصِّرُوْنَ ((اَيْنَ مَنْ عَصَى الْمَوْلٰى ؟ هَلُمُّوْا اِلٰى دَارِ الْبَلْوٰى ، فَيَاتُوْنَ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَ هُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ، اَلَا سَاءَ مَا يَزِرُوْنَ ، فَيُؤْمَرُ بِهِمْ اِلَى الْعَذَابِ))

"قیامت کے دن ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا:-اعمال صالحہ کی نفع مند تجارت کرنے والے کہاں ہیں؟ تو اولیاءاور اصفیاءاور عابدین اور زاہدین کھڑے ہو جائیں گے۔تو ان لوگوں کو نور کی بہترین سواریوں پر سوار کیا جائے گا۔وہ سواریاں ان کو لے کر عرش کی طرف پرواز کریں گی۔اوران کے آگے آگے فرشتے چل رہے ہوں گے، یہاں تک کہ وہ فرشتے ان کو لے جا کر جنت میں ان کے مکانوں میں اتاریں گے اوران سے کہیں گے:-یہ تمہارے سامان ہیں اور انہیں میں تمہارے اعمال ہیں۔

پھر اعلان کرنے والا اعلان کرے گا:-اعمال صالحہ کو ترک کرنے والے، اوران میں کوتاہی کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ وہ لوگ جو اپنے مولائے حقیقی کی نافرمانی کرتے تھے، کہاں ہیں؟ سختی اور مصیبت کے گھر کی طرف آؤ۔تو وہ لوگ اس حال میں آئیں گے کہ اپنی پیٹھ پر اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوں گے۔خبر دار ہو جاؤ،وہ بوجھ کتنا برا ہے جس کو وہ اٹھائے ہوں گے پھر ان کو عذاب کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا"

پھر مصنفؒ نے تیسری قسم کے لوگوں یعنی خواص الخواص کا مقام بیان فرمایا:-

وَفَرِحَ بِاللّٰهِ ، مَاشَغَلَهُ مِنَ الْمِنَنِ ظَاهِرُ مُتْعَتِهَا وَلَا بَاطِنُ مِنَّتِهَا

"اور وہ لوگ یعنی خواص الخواص اللہ تعالیٰ سے خوش ہوتے نہ احسان کا ظاہری فائدہ ان کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے،نہ باطنی احسان۔

میں کہتا ہوں:-احسانات کا ظاہری فائدہ:-بشریت کا فائدہ ہے اور وہ محسوس لذت ہے اور وہ پہلے مقام والے غافلین عوام کا حال ہے۔

اور احسانات کا باطنی فائدہ:- منعم حقیقی کا ذکر اوراس کی طرف بڑھنا ہے اور وہ دوسرے مقام

والے خواص کا حال ہے۔

پھر مصنفؒ نے تیسرے مقام والے خواص الخواص کے حال کی طرف اشارہ فرمایا:-

[بَلْ شَغَلَهُ النَّظَرُ اِلَى اللّٰهِ عَمَّا سِوَاهُ] مِنَ الْمَتْعَةِ الْحِسِّيَّةِ اَوِ الْمَعْنَوِيَّةِ [وَ] شَغَلَهُ [الْجَمْعُ]عَلَى اللّٰهِ بِالتَّوَكُّلِ [عَلَيْهِ]فَكَفَاهُ شُئُوْنَهُ وَ اُمُوْرَهُ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ لَهُ اِهْتِمَامٌ بِغَيْرِ مَوْلَاهُ ، بَلْ اَغْنَاهُ بِهٖ عَمَّا سِوَاهُ [فَلَا يَشْهَدُ اِلَّا اِيَّاهُ] وَلَا يُحِبُّ شَيْئًا سِوَاهُ

"بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ اس کے ماسوا ظاہری یا باطنی فوائد سے غافل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر جمع ، ان کو اللہ تعالیٰ پر توکل میں مشغول کر دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کے تمام حالات اور معاملات میں ان کیلئے کافی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر اللہ کے ساتھ ان کو کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ساتھ مشغول کر کے اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے سوا نہ کسی شی کو دیکھتے ہیں نہ اس کے سوا کسی شی سے محبت کرتے ہیں۔ اور بعض نازل شدہ آسمانی کتابوں میں جو باتیں پائی گئی ہیں ان میں سے یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اے میرے بندے! اگر تو میری اطاعت کرے گا، تو میں تیری سرپرستی کروں گا اور اگر تو مجھ سے ڈرے گا، تو میں تجھ کو اپنے قریب کر لوں گا۔ اور اگر تو مجھ سے شرم کرے گا، تو میں تیرے اوپر بخشش کروں گا۔ اور تجھ کو بزرگی عطا کروں گا۔ اور اگر تو میری اوپر توکل کرے گا، تو میں تیرے لیے کافی ہوں گا۔ اور اگر تو میری نافرمانی کرے گا، تو میں تجھ کو عذاب دوں گا لیکن تیرے لیے میرا عذاب تیری ہی وجہ سے ہے۔ (تیری نافرمانی و بداعمالی کی وجہ سے ہے)۔ میرا مرتبہ بہت بلند اور میرا فضل بہت بڑا ہے۔

اے میرے بندے! میں تیرے ان عیوب کو بخوبی جانتا ہوں ، جو اگر تیری بیوی کو معلوم ہو جائیں تو وہ تجھ سے طلاق کا مطالبہ کرے اور اگر وہ تیرا غلام جان لے، تو تجھ سے آزادی طلب کرے اور اگر تیرا باپ معلوم کر لے، تو تجھ سے جدا ہونا اس کیلئے آسان ہو جائے۔

اے میرے بندے! اگر تو یہ کہتا ہوا میرے پاس آئے کہ میں نے خطا کیا یا برا کیا۔ تو میں تجھ کو یہ جواب دوں گا کہ میں نے تجھ کو معاف کر دیا اور اگر تو کہے کہ میں نے توبہ کی تو میں جواب دوں گا کہ

میں نے قبول کیا۔

پھر مصنفؒ نے اس تیسری قسم یعنی خواص الخواص کی شہادت پیش فرمائی:۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ

"آپ اللہ کا ذکر کیجئے، اور ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے، وہ اپنے وہم وخیال میں کھیلتے رہیں"

میں کہتا ہوں:۔ اس آیت کریمہ میں اللہ کہنے سے مراد:۔ دل کا کہنا ہے۔ یعنی تم تمام اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی یاد کرو۔ اس طرح کہ یہ فنا ہو جائیں گی اور صرف ان کا خالق اللہ تعالیٰ باقی رہے گا، پھر تم لوگوں کو ان کے وہم وخیال میں کھیلتے ہوئے چھوڑ دو۔

اور تمام اشیاء میں وہ نعمتیں بھی ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تجلی ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا جب وہ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا، تو وہ اللہ تعالیٰ کے شہود میں ان اشیاء سے غائب ہو جائے گا پھر وہ اللہ تعالیٰ میں مشغول ہو کر اس کے ماسوا سے غائب ہو جائے گا۔

حضرت شبلیؒ نے فرمایا ہے:۔ شکر منعم حقیقی کا دیکھنا ہے نعمت کا دیکھنا شکر نہیں ہے۔

حضرت ابو محمد جریریؒ نے فرمایا ہے:۔ جس شخص نے نعمتوں کو دیکھا اور منعم حقیقی کو نہیں دیکھا۔ وہ شکر ادا کرنے سے رک گیا۔ اور جس نے نعمتوں کو نظر انداز کر کے منعم حقیقی کو دیکھا۔ اس نے منعم حقیقی کا شکر ادا کیا۔

تنبیہ:۔ اکثر صوفیائے کرام اس آیت کریمہ سے ہر شی سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف منفرد ہو جانے اور غیر اللہ سے غائب ہونے پر استدلال کرتے ہیں لیکن یہ تفسیر اشارہ ہے۔ لفظ کے معنیٰ کی ظاہری تفسیر نہیں ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ یہودیوں کی تردید میں نازل ہوئی ہے، جبکہ انہوں نے کہا:۔

مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ

"اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شی (کوئی کتاب) نہیں نازل کی"

تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى

"آپ ان سے کہیے، وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جس کو لے کر موسیٰ علیہ السلام آئے تھے"

پھر جب یہودیوں نے جواب نہیں دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:۔

کہیے اللہ، یعنی ان سے کہیے:۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل فرمایا، پھر ان سے بحث نہ کیجئے ، بلکہ ان کو چھوڑ دیجئے ، وہ اپنے وہم وخیال میں کھیلتے رہیں۔

صوفیائے کرام ظاہر کو اس کے ظاہر پر قائم رکھتے ہیں اور اس سے پوشیدہ اشارے حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے لوگ ان کا مفہوم نہیں سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین نے ان کی تردید کی ہے کیونکہ انہوں نے ان کا مقصد نہیں سمجھا ہے۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ

"ہر شخص نے اپنے پینے کا گھاٹ معلوم کر لیا ہے"

اسم ذات کا صرف زبانی ذکر، اس میں تین قول ہیں

لیکن اسم ذات "اللہ" کا ذکر صرف زبان سے کرنا، تو اس بارے میں تین قول ہیں:۔

پہلا قول:۔ یہ ہے، کہ بالکل جائز ہے۔

دوسرا قول:۔ یہ ہے، کہ بالکل مکروہ ہے۔

تیسرا قول:۔ یہ ہے، کہ علیحدہ علیحدہ حکم ہے۔ انتہا والوں کیلئے جائز ہے۔ اور ابتداء والوں کیلئے جائز نہیں۔ لیکن مشہور پہلا قول ہی ہے یعنی یہ بالکل جائز ہے۔ اور یہی طریقہ شاذلیہ اور اس سے متعلق حضرات کا معمول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور جبکہ مصنفؒ نے اس سے استدلال کیا جو ہماری کتاب قرآن مجید میں ہے۔ تو اس کا بیان بھی فرمایا، جو ہم سے پہلے کی نازل شدہ کتاب میں ہے چنانچہ فرمایا:۔

وَقَدْ اَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ :-يَا دَاوُدُ قُلْ لِلصِّدِّيْقِيْنَ ، بِيْ فَلْيَفْرَحُوْا وَبِذِكْرِيْ فَلْيَتَمَتَّعُوْا

"اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کی طرف وحی نازل فرمائی:۔ اے داؤد! آپ صدیقین سے کہہ دیجئے:۔ وہ مجھ سے خوش ہوں اور میرے ذکر سے فائدہ حاصل کریں"

میں کہتا ہوں :- اللہ تعالیٰ سے فرحت وخوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک کہ قلب اس کے ماسویٰ کی محبت سے پاک نہ ہو جائے۔ لہٰذا جب تک بندہ ماسویٰ میں سے کسی شئے کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشی مکمل نہیں ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اس کو پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

یا تم اس طرح کہو :- روح جب تک جسم کے قید خانے میں مقید ہوتی ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی خوشی مکمل نہیں ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اس کو پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا جب وہ جسم کی قید سے اور مخلوقات کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے تو اللہ واحد منان کے ساتھ اس کی خوشی مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی سے متعلق ایک عارف کے اشعار ہیں :-

اَنْتُمْ سُرُوْرِیْ وَاَنْتُمْ مُشْتَکٰی اَلَمِیْ وَاَنْتُمْ فِی ظَلَامِ اللَّیْلِ اَقْمَارِیْ

"تم میری خوشی ہو، اور تم میرے درد کی دوا ہو، اور تم رات کی تاریکی میں میرے چاند ہو"

فَاِنْ نَطَقْتُ فَلَمْ اَنْطِقْ بِغَیْرِکُمْ وَاِنْ صَمَتُّ فَاَنْتُمْ عِقْدُ اِضْمَارِیْ

"لہٰذا اگر میں بات کرتا ہوں تو تمہارے غیر کے ساتھ نہیں کرتا ہوں اور اگر میں خاموش رہتا ہوں تو میری خاموشی کی گرہ تم ہی ہو"

اور یہی حقیقی فرحت اور اصلی سرور ہے، اور اس کے سوا اغراض کی خوشی ہے۔

حضرت مقدسی نے فرمایا ہے :- سرور، فرحت سے اوپر ہوتا ہے کیونکہ فرحت اکثر اس غم سے ختم ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آتی ہے لیکن سرور کی حالت میں کوئی غم محسوس نہیں ہوتا ہے۔

اور کچھ لوگوں نے بیان کیا ہے :- فرحت اور سرور دونوں ایک شئے ہیں۔

سرور کی تین اقسام

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے :- سرور کی تین قسمیں ہیں۔

ابتداء اور وسط اور انتہا

سرور کی ابتداء :- یہ ہے، کہ اس حالت میں جدائی کا خوف اور جہالت کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے۔

سرور کا وسط یعنی درمیان:۔ یہ ہے، کہ اس حالت میں علم کا حجاب دور ہو جاتا ہے اور تکلیف کی غلامی مٹ جاتی ہے اور تدبیر و اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

سرور کی انتہا:۔ یہ حالت، وحشت کے آثار کو مٹا دیتی ہے اور مشاہدہ کے دروازے کو کھٹکھٹاتی ہے اور تجلی کی بشارت کیلئے روح کے چہرے کو بشاش (ہنس مکھ) بنا دیتی ہے۔

لہٰذا سرور کی ابتداء میں تصدیق حاصل ہوتی ہے اور اس کے وسط میں انسیت حاصل ہوتی ہے اور اس کی انتہا میں جمع اور وصال حاصل ہوتا ہے۔

سرور کی اقسام ثلثہ کی مثال

ایک عارف نے سرور کی تینوں قسموں کی مثال بیان کی ہے:۔ یعنی ایک وہ شخص ہے جو نعمتوں سے اس وجہ سے خوش ہوتا ہے کہ اس میں اس کی خواہش پوری ہوتی ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے، اس وجہ سے خوش ہوتا ہے کہ وہ نعمتوں میں نعمت دینے والے کا احسان دیکھتا ہے اور تیسرا وہ شخص ہے جو صرف نعمت دینے والے سے خوش ہوتا ہے۔

ان عارف نے فرمایا:۔ اس کی مثال اس طرح ہے:۔ تین اشخاص بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ نے ہر شخص کو ایک گھوڑا اور ایک تلوار دی۔

تو ایک شخص نے کہا:۔ ہم اس گھوڑے سے فائدہ حاصل کریں گے۔ اور اپنی حاجتیں پوری کرنے کیلئے ہم اس پر سوار ہوں گے اور ہم اس پر سوار ہو کر اپنے دشمن سے جنگ کریں گے۔ تو وہ اس سے اس لیے خوش ہوا کہ اس میں اس کے فوائد حاصل ہوں گے۔ اور اس کی خواہش پوری ہو گی۔ اس کے دل میں بادشاہ کی محبت نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنی حاجت پوری کرنے کیلئے اس کے پاس آیا۔

دوسرے شخص نے کہا:۔ ہم بادشاہ کی خدمت کیلئے، اور اس کے پاس حاضر ہونے کیلئے اور اس کے دشمن سے جہاد کرنے کیلئے اس گھوڑے سے مدد لیں گے۔ تو وہ گھوڑے سے اس لیے خوش ہوا کہ وہ بادشاہ کی ضروریات اور فوائد کیلئے نہ کہ اپنی ذات کی حاجتوں کیلئے گھوڑے سے مدد لے گا۔

تیسرے شخص نے کہا:۔ بادشاہ میری اتنی محبت اور تعظیم کرتا ہے کہ اس نے مجھ کو یہ گھوڑا عطا

فرمایا۔ اور یہ کہ میرے اوپر بادشاہ کی خاص توجہ ہے تو وہ گھوڑے سے اس لیے خوش ہوا کہ وہ بادشاہ کی محبت اور توجہ کی دلیل ہے یہ تینوں قسموں کی مثال ہے۔

حضرت امام غزالیؒ نے اس کے متعلق باب شکر میں تفصیل کے ساتھ بحث فرمائی ہے اگر تم چاہتے ہو تو اس کا مطالعہ کرو۔

پھر مصنفؒ نے اپنے مکتوب کو مناسب دعا کے ساتھ ختم کیا، چنانچہ فرمایا:-

[وَاللّٰهُ يَجْعَلُ فَرَحْنَا وَاِيَّاكَ بِهٖ] اَىْ دُوْنَ غَيْرِهٖ

"اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری خوشی کو اپنے ساتھ بنائے، اپنے غیر کے ساتھ نہ بنائے یعنی ہم اس کے سوا کسی شَی سے خوش نہ ہوں۔

اور مصنفؒ کا مخاطب وہ ہے جس کے پاس انہوں نے یہ مکتوب روانہ کیا۔ یا ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اس کتاب کا مطالعہ کرے یا اس کو یاد کرے یا اس پر عمل کرے یا اس کو سنے یا اس کے سامنے پڑھی جائے۔

اور جب ہماری خوشی تنہا اسی کے ساتھ متعلق ہو جائے گی تو ہم اس تیسری قسم میں شامل ہو جائیں گے جو خواص الخواص کا مقام ہے۔

اور جس شخص کی خوشی صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:-

وَبِالرِّضٰى مِنْهُ

"اور ہماری خوشی اپنی رضامندی کے ساتھ بنائے"

یعنی ہماری خوشی کو اپنی رضامندی کے ساتھ اس طرح وابستہ کردے، کہ ہم اس کی رضامندی کے سوا کسی شئے سے نہ راضی ہوں۔ پھر ہم اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے"

اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے قلعے میں پناہ لی، وہ ایک مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو کر غفلت سے محفوظ ہو گیا۔ اسی لیے مصنفؒ نے فرمایا:-

وَاَنْ لَّا یَجْعَلَنَا مِنَ الْغَافِلِیْنَ

"اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو غافلین میں سے نہ بنائے"

یعنی ان لوگوں میں سے جو منعم حقیقی کے شہود سے خوش ہونے کی بجائے نعمتوں سے خوش ہوتے ہیں۔

اور مصنفؒ کی دعا نزول کے طریقے پر تینوں قسموں کو شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوشی :- تیسرا مقام ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی سے خوشی :- دوسرا مقام ہے اور پہلے مقام سے مصنفؒ نے پرہیز کیا ہے کہ وہ ہم کو اس میں سے نہ بنائے۔

اور جب بندہ غفلت سے نکل جاتا ہے تو وہ بیدار و ہوشیار ہو جاتا ہے اور بیداری ہی تقویٰ ہے جس کی طرف مصنفؒ نے اپنے قول میں اشارہ فرمایا ہے:-

وَاَنْ یَّسْلُکَ بِنَا مَسْلَکَ الْمُتَّقِیْنَ

"اور اللہ تعالیٰ ہم کو متقین کے راستے پر چلائے"

یعنی ان لوگوں کے راستے پر جنہوں نے پہلے شرک اور گناہوں سے پرہیز کیا اور دوسری مرتبہ خواہشوں اور عادتوں سے پرہیز کیا اور تیسری مرتبہ ماسویٰ اور غیر سے پرہیز کیا۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی معنیٰ ہے:-

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَااتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ

"جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا ان کے اوپر اس میں کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے کھایا۔ جبکہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں اور عمل صالح کریں۔ پھر وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں۔ پھر وہ تقویٰ اختیار کریں اور احسان کریں، اور اللہ تعالیٰ احسان والوں کو دوست رکھتا ہے"

تقوی کی تین اقسام

لہٰذا مقامات کے اعتبار سے تقویٰ کی تین قسمیں ہیں:۔

تقویٰ کی پہلی قسم:۔ اہل مقام اسلام کا تقویٰ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے بچنے کیلئے شرعی احکام کی مخالف اشیاء سے جسمانی اعضاء کی حفاظت کرنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آیت کریمہ میں انہیں لوگوں سے خطاب فرمایا ہے:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ

"تم لوگ اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو"

تقویٰ کی دوسری قسم:۔ اہل مقام ایمان کا تقویٰ ہے اور وہ لغزشوں اور وسوسوں سے قلوب کی حفاظت کرنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آیت کریمہ میں انہیں لوگوں سے خطاب فرمایا ہے:۔

فَاتَّقُوْنِ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ

"اے عقل والو! مجھ سے ڈرو"

تو جب قلب لغزشوں اور وسوسوں سے پاک ہو جاتا ہے تو صفات ربانی کی حقیقتوں کے شہود سے فیضیاب ہو جاتا ہے۔

تقویٰ کی تیسری قسم:۔ اہل مقام احسان کا تقویٰ ہے اور وہ ماسوی اللہ تعالیٰ سے سر کی حفاظت کرنی ہے کیونکہ جب سر اغیار سے پاک ہو جاتا ہے تو وہ انوار کے شہود سے کامیاب ہو جاتا ہے اور یہی ذات مقدس کی عظمت ہے۔

اور تقویٰ کے مقامات میں سے ہر مقام کیلئے ایسے اسباب ہیں جو ان کے تقویٰ کے سبب بنتے ہیں۔

پس اہل مقام اسلام کے تقویٰ کا سبب:۔ ثواب کی امید اور عذاب کا خوف ہے۔ لہٰذا ان کا تقویٰ خوف و رجا کی بنا پر ہے۔

اور اہل مقام ایمان کے تقویٰ کا سبب:- جلال اور جمال کا شہود ہے۔ لہٰذا ان کا تقویٰ ہیبت اور شرم کی بنا پر ہے۔

اور اہل مقام احسان کے تقویٰ کا سبب:- عظمت اور کمال کا شہود ہے۔ لہٰذا ان کا تقویٰ محبت اور تعظیم کی بنا پر ہے۔

اسی کے بارے میں ایک عارف کے اشعار ہیں:-

فَكُنْ اَيُّهَا الْعَبْدُ الْمُعَنّٰى اَخَاتُقًى حَيْثُ التَّرَقِّى فِى الْمَعَارِجِ وَاللُّطْفِ

"پس اے مکلّف (تکلیف دیے گئے) بندے، عروج اور لطف میں جلد ترقی کرنے کیلئے تم اہل تقویٰ ہو جاؤ"

وَثِقْ بِلَطِيْفِ الصُّنْعِ تَحْظَ بِفَضْلِهٖ وَخَلِّصْ اِلَيْهِ الْقَصْدَ يُغْنِيْكَ بِالْعَطْفِ

"اور لطیف صنعت والے اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ کرو، تو تم اس کے فضل سے فائدہ حاصل کرو گے اور تم اس کی طرف اپنا ارادہ خالص کر لو تو وہ تم کو خواہشات سے بے نیاز کر دے گا"

وَفَوِّضْ وَسَلِّمْ وَارْقِ فِى دَرَجِ الصَّفَا عَلَى الْكَوْنِ تَحْظَ بِالْمَعَارِفِ وَالْعُرْفِ

"اور تم اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کو سپرد کر دو، اور اس کے سامنے سر تسلیم خم رکھو، اور صفائی و خلوص کے درجے میں مخلوق سے آگے بڑھو۔ تو تم معارف و اسرار سے فیضیاب ہو گے"

وَتُدْرِكُ مَا اَمْسَى الْوَرٰى عَنْهُ فِى غِنًى وَتَعْرِفُ اَشْيَاءً تَجِلُّ عَنِ الْوَصْفِ

"اور تم وہ شی پاؤ گے، جس سے مخلوق غنی ہو جاتی ہے اور تم ان اشیاء کو پہچانو گے جو بیان سے باہر ہیں۔

اور جو شخص تقویٰ حاصل کر لیتا ہے اور اس کے انتہائی درجے پر پہنچ جاتا ہے وہ ہمیشہ سرور اور فرحت میں رہتا ہے اور رنج و فکر اس سے دور ہو جاتی ہے۔

حکایت

روایت ہے:- حضرت رابعہ عدویہؒ کی ملاقات عتبہ غلام سے ہوئی۔ اس حال میں کہ وہ نئی قمیص پہنے ہوئے فخر کی چال چل رہا تھا۔ حضرت رابعہؒ نے اس سے دریافت فرمایا:- یہ غرور اور خود

پسندی کی رفتار کیوں ہے۔ جو میں نے اس سے پہلے تم سے صادر ہوتے نہیں دیکھی؟ اس نے جواب دیا:- مجھ سے زیادہ اس حال کا مستحق کون ہو سکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ میرا آقا ہو گیا ہے اور میں اس کا غلام ہو گیا ہوں۔

حکایت

حضرت ذوالنون ؒ نے فرمایا ہے:- میں نے ایک بوڑھے شخص کو اس حال میں دیکھا کہ وہ سواروں کے ساتھ پیدل چل رہا ہے اس کے ہاتھ میں قرآن مجید ہے، وہ اس کو پڑھتا ہے اور اچھلتا کودتا اور ناچتا ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا:- اے شیخ آپ کیوں ناچ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا:- میں نے اپنے دل میں کہا:- میں کس کا غلام ہوں؟ اور میں کس کا کلام پڑھ رہا ہوں؟ اور کس کے گھر جانے کا میں نے ارادہ کیا ہے؟ تو فرحت و سرور سے میرے اندر یہ بے اختیاری حرکت پیدا ہوئی اور میں بغیر ارادے کے ناچنے لگا۔

پھر مصنف ؒ نے اپنی دعا میں جو شے طلب کی اس کیلئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احسان اور کرم کو وسیلہ بنایا، چنانچہ فرمایا:-

بِمَنِّهٖ وَ كَرَمِهٖ

"اپنے احسان اور کرم کے وسیلے سے"

یعنی جن چیزوں کا بیان پہلے ہو چکا ہے میں ان کو اللہ تعالیٰ کے احسان و کرم کے وسیلے سے مانگتا ہوں کسی عمل اور حال کے سبب نہیں۔

اور یہ سب بندے کا اپنے مولائے حقیقی پر مکمل اعتماد ہے ان حالات میں جن کی طرف اس نے بندے کو رجوع کیا اور وہی بندے کا اس کی ابتداء اور انتہا میں سرپرست ہے۔ یہاں مکتوبات ختم ہو گئے اور اب صرف اللہ کریم وہاب کی مناجات باقی ہے۔

مناجات

بعض شارحین کرام نے فرمایا ہے:۔ان مناجات کی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم:۔ کنایہ سے بات کرنے،اور آمادہ ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔

دوسری قسم:۔ تحقیق،(ثابت وقائم ہونے) اور ادب اختیار کرنے کی شہادت دیتی ہے۔

اور اس کی پیروی کرنے والے کیلئے اس کی فضیلت اکثر سحر کے وقت،اور نماز فجر کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔کیونکہ اس کیلئے وہ وقت ایک بڑا راز اور بڑی کشائش ہے۔لہٰذا جو شخص ان دو وقتوں میں ان مناجات کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے وہ اپنی عادت سے زیادہ کشادگی پاتا ہے اور ان دو وقتوں میں مناجات کی بڑی خاصیتیں اور اسرار ہیں۔عابدین وزاہدین اور اللہ رب العالمین کے طالبین میں سے جس شخص نے ان کا تجربہ کیا ہے وہ ان کے خواص اور اسرار کو پہچانتا ہے۔

ان میں سے بعض خواص اور اسرار حضرت شیخ ابن عبادؒ نے اپنی نظم الحکم میں بیان فرمائے ہیں جن میں سے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:۔

لَمْ یَبْقَ اِلَّا مَابِهِ الْمُنَاجَاةُ سِیَاقُهٗ حَقَّتْ لَهُ الْمُرَاعَاةُ

"وہی باقی رہ گیا ہے جس کے ذریعے مناجات کی جاتی ہے اس کے پیش کرنے کیلئے توجہ لازمی ہے۔

لِكَوْنِهٖ یُهَذِّبُ الْاَ سْرَارَا وَ یَجْلِبُ الْاَ ضْوَاءَ وَالْاَ نْوَارَا

"اس لیے کہ مناجات اسرار کو درست کرتی ہے اور انوار کو کھینچتی ہے"

وَاَنْتَ یَا خِلِّی وَیَا صَفِیِّی اِنِ انْتَهَجْتَ نُهُجَ ذَا الْوَلِیِّ

"اور اے میرے مخلص دوست!اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہو"

وَسَقْتَهُ مَسَاقَهُ الْجَمِيْلَا مُنْكَسِرًا وَخَاضِعًا ذَلِيْلَا

"تو تم اس کے بہترین راستے پر انکساری اور عاجزی اور ذلت کی حالت میں چلو"

رَأَيْتَ فِي بَا طِنِكَ الزِّيَادَهْ وَالْخَيْرَ وَاسْتَبْشَرْتَ بِالسَّعَادَهْ

"تم اپنے باطن میں ترقی اور بھلائی دیکھو گے، اور تم نیک بختی کی خوشخبری پاؤ گے"

اور مناجات کی مناسبت اپنے سے پہلے بیان کے ساتھ اس وجہ سے ہے کہ قلب جب دوست کے ساتھ خوشی سے کشادہ ہوتا ہے، تو زبان قریب کی مناجات کیلئے بولنے لگتی ہے:-

پہلی مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:۔

اِلٰهِیْ اَنَا الْفَقِیْرُ فِیْ غِنَائِیْ فَكَیْفَ لَا اَكُوْنُ فَقِیْرًا فِیْ فَقْرِیْ؟

"اے میرے اللہ! جب میں اپنی غنا (دولتمندی) کی حالت میں محتاج ہوں، تو میں اپنی محتاجی کی حالت میں کیسے محتاج نہ ہوں گا؟

میں کہتا ہوں:۔ مصنفؒ نے اپنی مناجات محتاجی ثابت کرنے کے ساتھ شروع کی کیونکہ اس کے بعد غنا جلدی ہی آتی ہے اور میں نے اس کو اپنے ایک قصیدے میں بیان کیا ہے، جو پہلے گزر چکا ہے:۔

تَحَقَّقْ بِوَصْفِ الْفَقْرِ فِیْ كُلِّ لَحْظَةٍ فَمَا اَسْرَعَ الْغِنٰی اِذَا صَحَّ الْفَقْرُ

"تم ہر لحہ محتاجی کے وصف کے ساتھ ثابت قدمی سے قائم رہو کیونکہ جب محتاجی درست ہو جاتی ہے تو غنا بہت جلدی آتی ہے"

حضرت شیخ ابوعثمانؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں فرمایا ہے:۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً

"تم لوگ اپنے رب سے عاجزی اور پوشیدگی کے ساتھ دعا کرو"

تضرع:۔ یہ ہے کہ تم اپنی محتاجی اور اپنی عاجزی اور اپنا عیب اور اپنی ضرورت اور اپنے اختیار اور قوت کی کمی کو سامنے رکھو، اور تضرع زبان سے ظاہر کرنا نہیں ہے اور نہ عبادتوں کا ظاہر کرنا ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں:۔ جب میں اپنی وہمی اور ادعائی غنا کی حالت میں محتاج ہوتا ہوں تو میں اپنی حقیقی اور اصلی محتاجی کی حالت میں کیوں محتاج نہ ہوں گا؟

کیونکہ میری غنا ظاہری اسباب کی موافقت سے ہے اور اس کا وجود میری ذات سے نہیں ہے اور اس کا باقی رہنا میرے اختیار میں نہیں ہے لہٰذا میں اس کے موجود ہونے کی حالت میں محتاج

ہوں، تو میں اس کے موجود نہ ہونے کی حالت میں کیسے محتاج نہ ہوں گا؟

یا مصنفؒ فرماتے ہیں:- میں اپنی زندگی کی اس حالت میں جبکہ میرے خاندان اور احباب کے ساتھ میری غنا کی صورت ظاہر ہے محتاج ہوں۔ تو میں اپنی موت کے بعد جبکہ میرے احباب اور خاندان جدا ہو جائیں گے، کیسے محتاج نہ ہوں گا؟

یا مصنفؒ فرماتے ہیں:- جب میں تیرے ساتھ اپنی غنا کی حالت میں محتاج ہوں کیونکہ تیری مدد کی زیادتی سے میں بے نیاز نہیں ہوں، (یعنی میں تیری مزید مدد کا ہر وقت محتاج ہوں) اور یہ مفہوم ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک عارف شاعر نے فرمایا ہے:-

اَنَا الْفَقِيْرُ اِلَيْكُمْ وَالْغَنِيُّ بِكُمْ وَلَيْسَ لِيْ بَعْدَكُمْ حِرْصٌ عَلٰى اَحَدٍ

"میں تمہارے سامنے محتاج ہوں اور تمہارے ساتھ غنی ہوں اور تمہارے سوا مجھکو کسی شی کی حرص نہیں ہے"

تو میں تیرے سامنے اپنی محتاجی کی حالت میں کیسے محتاج نہ ہوں گا؟

یعنی جب میں تیرے ساتھ اپنی غنا دیکھنے کے حال میں محتاج ہوں تو میں تیرے سامنے اپنی محتاجی دیکھنے کے حال میں کیسے محتاج نہ ہوں گا؟

ایک عارف شاعر نے فرمایا ہے:-

اِنِّيْ اِلَيْكَ مَعَ الْاَنْفَاسِ مُحْتَاجٌ لَوْكَانَ فِيْ مَفْرَقِى الْاِ كْلِيْلُ وَالتَّاجُ

"میں ہر سانس کے ساتھ تیرے سامنے محتاج ہوں اگرچہ میرے سر پر شاہی تاج ہو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجیاں ظاہر کرنے اور اس کے ماسویٰ سے اپنی ہمت کو اٹھا کر اپنے مولائے حقیقی کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنے میں اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فوائد، اور عزت اور مرتبے کی اتنی بلندی حاصل ہوتی ہے جس کے بیان سے زبان گونگی ہوتی ہے اور اس کے برداشت سے وسیع قلب عاجز ہوتا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ نے فرمایا ہے:- جب بندہ دعا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتا ہے:- لبیک، لیکن بندہ اللہ تعالیٰ کے لبیک کہنے کو سننے کی

طاقت نہیں رکھتا ہے۔

اور بعض نازل شدہ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام پہلے گزر چکا ہے:۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب بندہ اپنی حاجت میری مخلوق کو چھوڑ کر میرے سامنے پیش کرتا ہے، حالانکہ میں اس کی نیت سے زیادہ اس کی حاجت کا علم رکھتا ہوں۔ تو اگرچہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمین اس کے ساتھ مکروفریب کریں لیکن میں اس کیلئے اس کے معاملے سے نکلنے کا اور اس کی کشادگی کا راستہ پیدا کر دیتا ہوں، (یا جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو)

حضرت ابوالقاسم قشیریؒ نے فرمایا ہے:۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر اپنی حاجتیں غیر اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کا محتاج بنا دیتا ہے۔ پھر اس کیلئے مخلوق کے قلوب سے ہمدردی اور رحمت نکال دیتا ہے۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجی کا مقام دیکھتا ہے اور اپنی حاجتیں اسی کے سامنے پیش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے طریقے پر غنی کرتا ہے جس کو وہ سمجھ بھی نہیں سکتا ہے اور ایسی جگہ سے اس کو عطا کرتا ہے جہاں سے ملنے کی اس کو امید بھی نہیں ہوتی ہے۔

ایک عارف سے دریافت کیا گیا:۔ کیا بندہ روزی کو تلاش کرے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ ہاں ، اگر اس کو معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے۔ تو اس کو تلاش کرنی چاہیے۔

پھر ان سے دریافت کیا گیا:۔ کیا بندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ ہاں، اگر اس کو اللہ تعالیٰ کے متعلق شک ہو، تو اس کو آزمائش کرنی چاہیے۔

پھر ان سے دریافت کیا گیا:۔ کیا بندہ اللہ تعالیٰ سے مانگے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ ہاں، اگر اس کو یہ علم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھول گیا ہے، تو اس کو یاددہانی کرنی چاہیے۔

پھر ان سے دریافت کیا گیا:۔ بندہ پھر کیا کرے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ بندہ وہی کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے۔

لہٰذا بندہ کو اپنے رب تعالیٰ پر کامل اعتماد رکھنا چاہیے اور اس نے اس کو جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل میں اس کو مشغول رہنا چاہیے اور اس کو ایسا ہو جانا چاہیے جیسا کہ بہلول دیوانے نے فرمایا ہے:۔

ہم اسی طرح اس کی عبادت کرتے ہیں جس طرح اس نے ہم کو حکم دیا ہے اور وہ ہم کو اسی طرح روزی دیتا ہے جس طرح اس نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے۔

اور اپنے قلب اور جسم کے مخلوق کے ساتھ بالکل تعلق نہ رکھنا چاہیے اور ان خطروں اور وسوسوں کو مٹا دینا چاہیے جو مخلوق سے تعلق کی بنا پر اس کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ وسوسے اس کے قلب میں مضبوطی سے قائم ہو جائیں، پھر وہ محرومی کا شکار ہو کر بدنصیبی اور رسوائی میں مبتلا ہو جائے۔

ایک عجیب حکایت

حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا ہے:- میں جنگل و میدان میں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا، یہاں تک کہ حال نے مجھکو پریشان کر دیا میں نے کتے کے رونے کی آواز سنی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی طرف چلا۔ اچانک میری ملاقات ایک چور سے ہوئی، اس نے میری گردن میں گھونسہ مارا، میں نے اپنے دل میں کہا:- جو شخص مخلوق پر بھروسہ کرتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے تو مجھ سے میرے سر میں کہا گیا:- اے ابراہیم جب تک تو میری حفاظت و نگرانی میں تھا اس وقت تک تو عزیز تھا۔ لیکن جب تو کتے کی حمایت میں چلا گیا تو تیرے اوپر مخلوق مسلط ہوگئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی تو اب میں نے یہ دیکھا کہ وہ شخص جس نے مجھکو گھونسہ مارا تھا وہ ایک طرف گر گیا اور اس کا سر اڑ گیا ہے۔

ایک عارف کے اشعار ہیں:-

مَدَدْتُ يَدِىْ اَرْجُوْ نَوَالًا وَّرَحْمَةً ۔ وَمَالِىْ شَفِيْعٌ غَيْرَ جُوْدِكَ وَالرِّجَا

"میں نے بخشش اور رحمت کی امید کر کے اپنا ہاتھ پھیلایا، اور تیری بخشش اور امید کے سوا میرا کوئی شفیع نہیں ہے"

فَجُدْلِىْ بِمَعْرُوْفٍ مِنْكَ وَارْحَمْ تَذَلُّلِىْ ۔ فَاَنْتَ الَّذِىْ اَعْطَيْتَنِىْ الْفَقْرَ وَاللَّجَا

"لہٰذا تو اپنی معافی سے میرے لیے بخشش کر، اور میری ذلت و عاجزی پر رحم فرما۔ کیونکہ تو نے ہی مجھکو محتاجی اور پناہ عطا فرمائی ہے"

پس محتاجی اور جہالت عبودیت کے اوصاف میں سے ہے جیسا کہ غنا اور علم ربوبیت کے اوصاف میں سے ہے۔

لہٰذا مصنفؒ نے جب اپنی محتاجی اپنے مولائے حقیقی کی غنا کے سامنے پیش کی تو اب اپنی جہالت کو اپنے مولائے حقیقی کے علم کے کی وسعت کے سامنے پیش کرتے ہوئے دوسری مناجات میں فرمایا۔

دوسری مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

اِلٰھِیْ اَنَا الْجَاھِلُ فِیْ عِلْمِیْ ، فَکَیْفَ لَا اَکُوْنَ جَاھِلًا جُھُوْلاً فِیْ جَھْلِیْ؟

"اے میرے اللہ! جب میں اپنے علم کے حال میں جاہل ہوں تو میں اپنی جہالت و نادانی کے حال میں کیسے جاہل نادان نہ ہوں گا؟

میں کہتا ہوں:- حضرت مصنفؒ فرماتے ہیں:- میں اپنے اس عارضی علم کے حال میں جو تو نے مجھکو تعلیم دی ہے، جاہل ہوں۔ تو میں اس اپنی اس اصلی اور مقامی جہالت و نادانی کے حال میں کیسے جاہل نہ ہوں گا جس میں تو نے مجھکو قائم کیا ہے؟

یا مصنفؒ فرماتے ہیں:- جب میں اس علم سے جو تو نے مجھکو تعلیم دی ہے، اپنی نسبت کے حال میں جاہل ہوں تو میں اپنی اصلی اور مقامی جہالت کے حال میں کیسے جاہل نہ ہوں گا؟

اور ربوبیت کے علم کے ساتھ عبودیت کے علم کی نسبت ایسی ہی ہے، جیسے کہ سمندر سے چڑیا اپنی چونچ میں پانی بھرے۔

جیسا کہ حضرت خضرؑ نے حضرت سیدنا موسیٰؑ سے فرمایا:- اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً

"اور تم لوگوں کو تھوڑا علم دیا گیا ہے" اور اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْئٍمِنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ

"اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کسی شئی کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے ہیں"

اور تیسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا

"اور اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے

تھے"

لہٰذا عارضی (لاحق ہونے والا) علم، اصلی جہالت کو دور نہیں کر سکتا ہے یہ حکمت، اور بشریت کی اصلیت کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے ہے۔

لیکن روحانیت:- تو اس کی اصل بہت زیادہ سمجھنے والی علامت ہے کیونکہ وہ ربانی نمونہ، اور نورانی لطیفہ ہے۔ لیکن اس کو بشریت کی کثافت اور طبیعت کی ظلمت نے چھپا لیا ہے جیسا کہ مباحث کے مصنفؒ نے فرمایا ہے:-

فَلَمْ تَزَلْ كُلُّ نُفُوْسِ الْاَحْيَا عَلَامَةً دَرَّاكَةً لِلْاَ شْيَا

"زندہ لوگوں کی تمام روحیں ہمیشہ اشیاء کیلئے بہت بڑی سمجھنے والی علامت ہیں"

وَاِنَّمَا تَحْجُبُهَا الْاَ بْدَانُ وَالْاَنْفُسُ النُّزَّ غُ وَالشَّيْطَانُ

"اور ارواح کیلئے صرف اجسام اور بہکانے والے نفوس اور شیطان حجاب بنے ہوئے ہیں"

فَكُلُّ مَنْ اَذَاقَهُمْ جِهَادَهٗ اَظْهَرُ لِلْقَاعِدِ خَرْقِ الْعَادَهْ

"لہٰذا جس شخص نے ان کو اپنے مجاہدے کا مزہ چکھایا، اس نے بیٹھنے والے کیلئے خرق عادت ظاہر کیا"

لہٰذا جو شخص اپنی اصلی محتاجی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے وہ عارضی غنا سے سکون نہیں پاتا ہے اور جو شخص اپنی اصلی جہالت کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے اس کو اپنے فرعی علم سے سکون حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ تمام امور اور تمام قلوب غنی و کریم مدبر و حکیم اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو تیسری مناجات میں بیان فرمایا ہے۔

تیسری مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

اِلٰهِیْ اَنَّ اخْتِلَافَ تَدْبِیْرِكَ ، وَ سُرْعَةَ حُلُوْلِ مَقَا دِیْرِكَ ، مَنَعَا عِبَادَكَ الْعَارِفِیْنَ بِكَ مِنَ السُّكُوْنِ اِلٰى عَطَاءٍ ، وَالْیَاسِ مِنْكَ فِیْ بَلَاءٍ

"اے میرے اللہ! بیشک تیری تدبیر کے اختلاف، اور تیری قضاوقدر کے فوری نفوذ نے تیرے عارف بندوں کو کسی عطا میں سکون حاصل کرنے سے، اور کسی بلا میں تجھ سے مایوس ہونے سے روک دیا ہے"

میں کہتا ہوں:- تدبیر کا اختلاف:- بندے کا اللہ تعالیٰ کی حکمت مثلاً فقر یا غنا، علم یا جہالت، عزت یا ذلت، قبض یا بسط، مرض یا صحت، ایمان یا کفر اور ان کے علاوہ قدرت کے دوسرے آثار کے اختلافات، اور حکمت کے مظہروں کے اقسام میں اس کے ارادہ اور مشیت کے مطابق قائم ہونا ہے۔

اور قضاوقدر کا فوری نفوذ:- ان احوال کا ایک حال سے دوسرے حال میں مثلاً فقر سے غنا میں، اور غنا سے فقر میں، اور علم سے جہالت میں اور جہالت سے علم میں، اور عزت سے ذلت میں، اور ذلت سے عزت میں، اور قبض سے بسط میں، اور بسط سے قبض میں اور مرض سے صحت میں، اور صحت سے مرض میں اور ایمان سے کفر میں نعوذ باللہ، اور کفر سے ایمان میں جلد منتقل کر دینا ہے۔ کیونکہ مخلوق کے قلوب اللہ واحد قہار کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ ان کو جس طرح چاہتا اور پسند کرتا پھیرتا ہے اور ان کے ساتھ جو چاہتا کرتا ہے۔

لَا یُسْأَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْأَلُوْنَ

"اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا ہے جو وہ کرتا ہے اور ان لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا"

لہٰذا جب بندہ اس حقیقت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے تو وہ اس سے رک جاتا ہے کہ وہ اسی شی

سے سکون حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے کیونکہ کبھی وہ اس سے یہ عطیہ ایک گھڑی میں چھین لیتا ہے اور وہ اس سے بھی رک جاتا ہے کہ اپنی سختی اور مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے مایوس ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

"بیشک تنگی کے ساتھ آسانی ہے"، "بیشک تنگی کے ساتھ آسانی ہے"

اور کسی حال کا ہمیشہ قائم رہنا محال ہے لیکن اس حقیقت کے ساتھ ذوق کی حیثیت سے صرف عارفین ہی قائم ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ کسی عطا سے سکون نہیں حاصل کرتے ہیں اور نہ کسی بلا و مصیبت میں مایوس ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اس مقدس ذات سے سکول حاصل کرتے ہیں جس کے قبضہ قدرت میں محروم کرنا اور عطا کرنا ہے اس لیے ان کی بیقراری ہمیشہ رہتی ہے اور ان کو غیر اللہ کے ساتھ قرار نہیں ہوتا ہے۔

اور مصنفؒ نے جو فرمایا ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:-

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ

"اور اللہ تعالیٰ ہر روز ایک نئی شان ہے"

اس آیت کریمہ میں یوم کا مفہوم دن نہیں ہے بالکل وہ ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہے۔ وہ کچھ لوگوں کو بلند کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو پست کرتا ہے ایک قوم کو عزت عطا فرماتا ہے اور دوسری قوم کو ذلیل کرتا ہے کسی قوم کو مردہ کرتا ہے اور کسی قوم کو زندہ کرتا ہے کسی کو عطا فرماتا ہے، اور کسی کو محروم کرتا ہے یہ وہ امور ہیں جن کو وہ ظاہر کرتا ہے ابتداء نہیں کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:- اللہ تعالیٰ ہر روز تین لشکر روانہ کرتا ہے۔ ایک لشکر پشت سے رحم کی طرف روانہ کرتا ہے اور ایک لشکر رحم سے دنیا کی طرف روانہ کرتا ہے اور ایک لشکر دنیا سے قبروں کی طرف روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

اور عارف باللہ کی علامات کے بارے میں کچھ کلام پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت شطبیؒ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے:- عارفین کے قلوب اللہ تعالیٰ کے نور سے مشاہدہ کرتے ہیں اور عارفین کے سوا اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کوئی نہیں کرسکتا ہے اور ربوبیت کے مقامات

بشریت کے اوصاف سے خارج ہیں۔ لہٰذا عارف کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کا قلب آئینہ ہوتا ہے وہ اس میں ان اشیاء کو دیکھتا ہے جو اس کے سوا دوسروں سے غائب ہوتی ہے، اور قلب کی صفائی صرف ایمان اور یقین کے نور سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ایمان کی قوت کے مطابق قلب کو نور ہوتا ہے اور قلب کے نور کے مطابق اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کے مطابق اس کے اسماء اور صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسماء و صفات کی معرفت کے مطابق ذات اقدس کی تعظیم ہوتی ہے اور ذات اقدس کی تعظیم کے مطابق بندے کا کمال ہوتا ہے اور بندے کے کمال کے مطابق عبودیت کے اوصاف میں اس کا استغراق ہوتا ہے اور عبودیت کے اوصاف میں اس کے استغراق کے مطابق ربوبیت کے حقوق کے ساتھ اس کا قیام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَمَا قَدَرُ و االلّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ

"اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی قدر نہیں کی جیسا اس کی قدر کرنے کا حق ہے"

میں کہتا ہوں:۔ جس قدر وہ ربوبیت کے حقوق کے ساتھ قائم ہوتا ہے اسی قدر الوہیت کے اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

ایک عارف کے اشعار ہیں:۔

كَانَتْ مُحَادَثَةُ الرُّكْبَانِ تُخْبِرُنِيْ عَنْ فَضْلِكُمْ وَسَنَاكُمْ اَطْيَبَ الْخَبَرِ

"سواروں کی گفتگو مجھ کو تمہارے فضل اور بلندی کی بہترین خبر دیتی تھی۔

حَتّٰى الْتَقَيْنَا فَلَا وَاللّٰهِ مَاسَمِعَتْ اُذُنِيْ بِاَحْسَنَ مِمَّا قَدْرَاٰى بِصَرِيْ

"یہاں تک کہ ہم نے ملاقات کیا، تو اللہ تعالیٰ کی قسم، جو کچھ میرے کان نے سنا تھا وہ اس سے بہتر نہیں تھا، جو میری آنکھ نے دیکھا"

اور فقر اور جہالت کے بعد عبودیت کے اوصاف میں سے خساست (کمتری، کمینہ پن) اور لآمت (پستی، وبخیلی) ہے۔ جیسا کہ ربوبیت کے اوصاف میں سے غنا اور علم کے بعد احسان و کرم ہے۔

لہٰذا مصنفؒ نے چوتھی مناجات میں اپنے نفس کی پستی اور بخیلی کو اپنے مولائے حقیقی کے احسان اور کرم کے سامنے پیش کیا۔

چوتھی مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

اِلٰهِیْ مِنِّیْ مَا یَلِیْقُ بِلُؤْمِیْ ، وَمِنْكَ مَایَلِیْقُ بِكَرَمِكَ

"اے میرے اللہ! مجھ سے وہی صادر ہوتا ہے جو میری بخیلی اور پستی کے لائق ہے اور تجھ سے وہی صادر ہوتا ہے جو تیرے کرم کے لائق ہے"

میں کہتا ہوں:- مصنفؒ فرماتے ہیں:- اے میرے اللہ مجھ سے وہی پستی اور کمینہ پن اور بخیلی اور عیوب وغیرہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں جو میری پستی اور کمینہ پن کے لائق ہیں، اور تجھ سے وہی بھلائی اور احسان اور بزرگی اور بخشش اور عیوب ونقائص کی پردہ پوشی وغیرہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں جو تیرے بے انتہا کرم کے شایان شان ہیں۔ اور تیرے ظاہر احسان کے کمال کے لائق ہیں۔ لہٰذا تو ہماری برائیوں کو اپنے احسان کے سامنے کردے اور ہمارے عیوب کو اپنے احسان اور کرم کے وصف سے ڈھانپ لے، کیونکہ اے اکرم الاکرمین! تو اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔

تو، تو ہے اور میں، میں

حکایت:- ایک شخص نے کہا:- اے میرے اللہ! میں تیری کتنی نافرمانی کرتا ہوں، پھر بھی تو میری پردہ پوشی فرماتا ہے۔ تو اس نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے سنا:- تا کہ تو یہ جان لے کہ میں، میں ہوں ۔یعنی غفور رحیم وکریم ہوں اور تو، تو ہے یعنی عاصی ونافرمان ہے۔

بیان کیا گیا ہے:- اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا کیا ہے جو یہ پکارتا ہے:- اے آدم کی اولاد! اے مسکین! تو عدم میں گم تھا۔ بخشش والے اللہ کریم کے سوا کون ہے جس نے تم کو وجود کا نسخہ بنایا؟ وہ کون ہے جس نے تم کو عالم غیب سے عالم شہادت میں ظاہر فرمایا؟ وہ کون ہے جس نے تم کو کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی میں پہنچایا؟ اللہ کریم ومنان کے سوا کون ہے جو تمہارے ہر حال کا سرپرست بنا؟ لہٰذا تو اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرماں بردار رہ، اور تو اس کا سچا بندہ بن جا اور اپنے نفس اور اپنے

خواہش کی فرماں برداری نہ کر، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تو ان دونوں کا غلام ہو جائے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کی بخشش ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔

اور یہ بھی اس کی بخشش ہے کہ اس کی توجہ نافرمان اور فرماں بردار دونوں پر ہے، حدیث شریف میں ہے:-

(لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ قَالَ لِلْقَلَمِ:- اُكْتُبْ ، قَالَ:- وَمَا اَكْتُبُ ؟ قَالَ:- اُكْتُبْ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ ، فَكَتَبَهٗ وَاَلْقَى الْكِتَابَ فَوْقَ الْعَرْشِ) زَادَ بَعْضُهُمْ (فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رَاَى النَّاسُ ذَالِكَ الْكِتَابَ فَيَقْرَؤُهٗ كُلُّ مَنْ سَبَقَ لَهُ السَّعَادَةُ ، وَيُحْجَبُ عَنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ)

میری رحمت میرے غضب سے آگے بڑھ گئی

"جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ تو قلم کو حکم دیا:- لکھ، قلم نے دریافت کیا:- کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:- لکھ، میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی ہے۔ (بڑھی ہوئی ہے) پس قلم نے اس کو لکھا، اور اس مکتوب کو عرش پر رکھ دیا"

بعض محدثین نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے:- پس جب قیامت کا دن قائم ہوگا، تو لوگ اس مکتوب کو دیکھیں گے پھر اس کو ہر وہ شخص پڑھے گا جس کیلئے نیک بختی سبقت کر چکی ہے اور وہ مکتوب اہل شقاوت (بدبختوں) سے پوشیدہ رہے گی"

رحمت کی کرشماں سازیاں

اور یہ روایت بھی حدیث شریف میں ہے، حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا وَاحِدَةً اِلَى الْاَرْضِ وَاَمْسَكَ عِنْدَهٗ تِسْعًا وَّتِسْعِيْنَ ، فَمِنْ تِلْكَ الرَّحْمَةِ الْوَاحِدَةِ الَّتِيْ اُهْبِطَتْ اِلَى الْاَرْضِ تَرَاحَمَتِ الْخَلَائِقُ بَيْنَهُمْ ، حَتّٰى اِنَّ الدَّابَّةَ لِتَرْفَعُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ اَنْ تُصِيْبَهٗ ، فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ضَمَّ تِلْكَ الرَّحْمَةِ اِلَى التِّسْعِ وَالتِّسْعِيْنَ وَنَشَرَهَا بَيْنَ عِبَادِهٖ ، فَتَسَعَ الْخَلْقَ كَافَّةً ، وَيَحْرَمُ مِنْهَا مَنْ هُوَ كَافِرٌ

"اللہ تعالیٰ نے سو رحمتیں پیدا فرمائی ہیں ان میں سے ایک رحمت زمین پر نازل فرمائی ہے اور ننانوے رحمت کو اپنے پاس روک لیا ہے۔

اسی ایک رحمت کی جو زمین پر نازل کی گئی ہے، یہ برکت ہے کہ مخلوقات باہم ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔ یہاں تک کہ جانور اپنا کھر اپنے بچے اس سے خوف سے اٹھالیتا ہے کہ اس کو تکلیف نہ پہنچے۔ پس جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس ایک رحمت کو بھی انہیں ننانوے رحمتوں کے ساتھ شامل کر دے گا اور ان کو اپنے بندوں کے درمیان پھیلا دے گا تو وہ ساری مخلوق پر چھا جائیں گی اور ان رحمتوں سے وہی محروم ہوگا جو کافر ہے" اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی معنی ہے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

رحمت کی فراوانیاں

"میری رحمت ہر شئی کیلئے وسیع ہے۔ اور روایت کی گئی ہے۔

اِنَّ رَجُلًا اِصْطَادَ اَفْرَاخاً ، فَلَمَّا اَخَذَهُمْ جَعَلَتْ اُمُّهُمْ تَطِيْرُ فَوْقَهُمْ ثُمَّ سَقَطَتْ عَلَيْهِمْ فَضَمَّهَا مَعَ اَوْلَادِهَا ، فَاَتٰى بِهَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ خَبَرَهَا ، فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ:- اَتَعْجَبُوْنَ لِهٰذَا الطَّائِرِ؟ وَاللّٰهِ اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا الطَّائِرِ بِاَفْرَاخِهٖ

"ایک شخص نے چڑیا کے بچوں کا شکار کیا، پس جب اس نے ان کو پکڑ لیا۔ تو ان بچوں کی ماں ان کے اوپر اڑنے لگی پھر وہ ان بچوں پر گر گئی۔ اس شخص نے اس کو بھی اس کے بچوں کے ساتھ شامل کر دیا۔ پھر وہ ان کو لے کر حضرت محمد ﷺ کے پاس آیا۔ اور انحضرت ﷺ سے ان کا حال بیان کیا تو حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:- کیا تم اس چڑیا کی محبت پر تعجب کرتے ہو؟ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے پر اس سے بہت زیادہ مہربان ہے، جتنی یہ چڑیا اپنے بچوں پر مہربان ہے"

اور روایت ہے، حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے:-

يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ رَجُلَانِ ثُمَّ يُمْثَلَانِ ۔ اَيْ يُوْقَفَانِ ۔ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ ، فَيُؤْمَرُ بِرُجُوْعِهِمَا اِلَى النَّارِ فَيُسْرِعُ اَحَدُهُمَا فَيُلْقِيْ نَفْسَهٗ فِيْهَا ، وَيَتَعَاصِي الْاٰخَرُ عَنِ الرُّجُوْعِ ، فَيُقَالُ لِلَّذِيْ رَمٰى بِنَفْسِهٖ:- لِمَ اَلْقَيْتَ نَفْسَكَ فِي النَّارِ؟ فَيَقُوْلُ:- لِئَلَّا اَكُوْنَ عَاصِياً فِي الدُّنْيَا ثُمَّ

اَکُوْنَ عَاصِیًا فِی الْاٰخِرَۃِ ، وَیُقَالُ لِلْاٰخَرِ:- لِمَ لَمْ تَمْتَثِلِ الْاَمْرَ کَمَا فَعَلَ ھٰذَا ، فَیَقُوْلُ:- رَجَوْتُ مِنْ کَرَمِ اللّٰہِ اَنْ لَّا یُعِیْدَنِیْ اِلَیْھَا بَعْدَ اَنْ اَخْرَجَنِیْ ، فَیُؤْمَرُ بِھِمَا اِلَی الْجَنَّۃِ

"دو شخص دوزخ سے نکالے جائیں گے پھر وہ دونوں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ پھران کو دوزخ میں لوٹ جانے کا حکم دیا جائے گا۔ تو ان میں سے ایک شخص فوراً لوٹ جائے گا اور اپنے کو دوزخ میں ڈال دے گا۔ اور دوسرا شخص دوزخ میں لوٹ کر جانے کے حکم سے نافرمانی کرے گا۔ تو اس شخص سے دریافت کیا جائے گا جو اپنے کو دوزخ میں ڈالدے گا۔ تو نے کیوں اپنے کو دوزخ میں ڈالدیا؟ وہ جواب دے گا:- اس لیے کہ میں دنیا میں نافرمان نہیں تھا۔ تو اب میں آخرت میں کیون نافرمان ہوجاؤں۔ دوسرے شخص سے دریافت کیا جائے گا:- تو نے حکم کی تعمیل اس طرح کیوں نہیں کی، جس طرح اس نے کی؟ وہ جواب دے گا:- اس لیے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے کرم سے یہ امید کی کہ وہ مجھکو دوزخ سے نکالنے کے بعد پھر اس میں نہیں لوٹائے گا۔ لہٰذا ان دونوں کو جنت میں لے جانے کا حکم دیا جائے گا"

اسی کے متعلق ایک شاعر کے یہ اشعار ہیں:-

وگر دردہد یک حلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

وَلَوْ اَنَّ فِرْعَوْنَ لَمَّا طَغٰی وَقَالَ عَلَی اللّٰہِ قَوْلًا عَظِیْمًا

"اور جب فرعون نے سرکشی کی، اور اللہ تعالیٰ پر ایک بڑی بات کہی"

اَنَابَ اِلَی اللّٰہِ مُسْتَغْفِرًا لَمَا وَجَدَ اللّٰہَ اِلَّا رَحِیْمًا

"تو اگر وہ اپنی نافرمانی وسرکشی سے استغفار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا، تو وہ اللہ تعالیٰ کو رحیم ومہربان پاتا"

اور اللہ تعالیٰ کے حلم وکرم اور اس کی رحمت اور مہربانی کے شامل ہونے کی امید کیسے نہ کی جائے جبکہ اس کی رحمت اور مہربانی بندوں کے وجود پر پہلے ہی ہو چکی ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو پانچویں مناجات میں بیان فرمایا:-

پانچویں مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

اِلٰهِيْ وَصَفْتَ نَفْسَكَ بِاللُّطْفِ وَالرَّافَةِ بِيْ قَبْلَ وُجُوْدِ ضُعْفِيْ ، اَفَتَمْنَعُنِيْ مِنْهُمَا بَعْدَ وُجُوْدِ ضُعْفِيْ

"اے میرے اللہ! جب میری کمزوری ظاہر ہونے سے پہلے تو نے میرے اوپر مہربانی اور رحمت کے ساتھ اپنی ذات اقدس کو موصوف کیا۔ تو کیا میری کمزوری ظاہر ہونے کے بعد تو مجھکو اس مہربانی اور رحمت سے محروم کر دے گا؟

میں کہتا ہوں :- حضرت مصنفؒ اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوری اور محتاجی کی شکایت ، اور اپنے مولائے حقیقی سے اس کی مہربانی اور رحمت کی مدد مانگتے ہوئے فرماتے ہیں:-

اے میرے اللہ! تو نے اپنی بزرگ کتاب میں جس کو تو نے ہماری طرف نازل فرمایا ہے یعنی قرآن مجید میں اپنی ذات اقدس کو مہربانی اور رحمت کے ساتھ موصوف فرمایا ہے، جیسا کہ تو نے فرمایا ہے:-

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ

"اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے" اور تو نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

"بیشک اللہ تعالیٰ تم لوگوں پر رافت اور رحمت کرنے والا ہے"

اور مہربانی اور رحمت کے ساتھ تیرا موصوف ہونا قدیم ہے۔ تو، جب تو ہمارے اوپر ہماری کمزوری ظاہر ہرنے سے پہلے مہربان اور رحیم تھا۔ تو ہماری کمزوری ظاہر ہونے کے بعد، تو اپنی مہربانی اور رحمت ہم کو کیوں نہ عطا فرمائے گا؟ جب تو نے ہمارے اوپر اس وقت مہربانی فرمائی جبکہ ہم کسی مہربانی کے محتاج نہ تھے۔ تو کیا تو اب ہم کو اپنی مہربانی سے محروم کر دے گا جبکہ ہم اس کے محتاج

ہیں، حالانکہ تو ارحم الرحمین ہے؟ جب تو نے ہم کو اپنے گھر میں ظاہر کرنے سے پہلے ہمارے اوپر اپنی رحمت جاری فرمائی۔ تو کیا ہمارے ظاہر ہونے کے بعد اپنے عظیم احسان کے باوجود تو ہم کو اپنی رحمت سے مایوس کر دے گا؟ اور جس شخص نے انسان کی صنعت، اور اس کی خلقت اور مضبوطی کی اس خصوصیت کے عجائب میں جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مخصوص کیا ہے اور ان قسم قسم کے انعامات و احسانات میں جو اس کو حاصل ہوتی ہیں، غور وفکر کیا۔ اس نے اپنی ذات کو اپنے مولائے حقیقی کے لطف اور رحمت میں ڈوبا ہوا پایا، اور اپنی ابتداء اور انتہا میں اسی کو اپنی ذات کا رفیق دیکھا۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے:۔ انسان کے اندر جتنی حکمتیں امانت رکھی گئی ہیں ان میں سے عقلوں نے بارہ ہزار حکمتوں کو سمجھا ہے اور جن حکمتوں کو عقلیں نہیں سمجھ سکی ہیں۔ ان کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور یہ حکمتیں خاص اس کی ذات کے اندر ہیں لیکن اس کے کھانے اور پینے اور لباس اور تمام لوازمات میں تو اس سے بہت زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

"ہم نے انسان کو بہترین صورت میں بنایا ہے" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلٰى طَعَامِهٖ

"پس انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے میں غور کرے"

لہٰذا پاک ہے وہ ذات اقدس جس کے بے مثل الطاف کے سمجھنے سے عقلیں عاجز ہو گئیں اور اس کے عظیم اوصاف میں غور کرنے سے فکریں قاصر ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

"اور وہ اللہ تعالیٰ مہربان اور خبر رکھنے والا ہے" اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانیاں مبتدیوں کیلئے کتنی زیادہ کی ہیں اور بیدار ہونے والوں کیلئے ان کو کتنا واضح کیا ہے اور تمام مخلوقات میں ان کو کتنا عظیم بنایا ہے اس کا لطف تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور اس کی حکمت نے انسان اور جن کی فکروں کو روشن کر دیا ہے۔

اسی حقیقت کو ایک عارف نے نظم میں فرمایا ہے:۔

اَحَاطَ بِتَفْصِيلِ دَ قَائِقِ عِلْمِهٖ فَاَتْقَنَهَا صُنْعا وَ اَحْكَمَهَا فِعْلًا

"اللہ تعالیٰ کے علم نے باریکیوں کی تفصیل کا احاطہ کرلیا ہے۔ پس صنعت اور فعل کے اعتبار سے ان کو مضبوط کردیا ہے"

فَمِنْ لُطْفِهٖ حِفْظُ الْجَنِيْنِ وَصَوْنُهٗ بِمُسْتَوْدَعٍ قَدْ مَرَّ فِيْهِ وَقَدْ حَلَّا

"پس اس کے من جملہ لطف وکرم سے جنین (ماں کے شکم میں رہنے والا بچہ) کی شکم میں حفاظت اور نگہداشت بھی ہے وہ اسی میں چلتا پھرتا ہے اور اسی میں مقیم رہتا ہے"

تَكَفَّنَهٗ بِا للُّطْفِ فِي ظُلُمَا تِهٖ وَلَا مَالٌ يُغْنِيْهِ هُنَاكَ وَلَا اَهْلًا

"اللہ تعالیٰ اس کو اس کی تاریکیوں میں اپنے لطف وکرم سے ڈھانپے رہتا ہے حالانکہ وہاں نہ کوئی مال اس کے کام آسکتا ہے نہ کوئی اہل"

وَيَاْتِيْهِ رِزْقٌ سَابِغٌ مِنْهُ سَائِغٌ يَرُوْحُ لَهٗ طَوْلًا وَيَغْدُوْ لَهٗ فَضْلًا

"اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس کافی اور خوش مزہ روزی آتی رہتی ہے، وہ شام کو اس کیلئے احسان اور صبح کو اس کیلئے فضل ہوتا ہے"

وَمَا هُوَ يَسْتَدْعِيْ غِذَاءً بِقِيْمَةٍ وَلَا هُوَ مِمَّنْ يُحْسِنُ الشُّرْبَ وَالْاَكْلَا

"اور وہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی غذا قیمت سے منگائے اور نہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کھانا اور پینا بہتر بناتے ہیں"

جَرٰى فِيْ مَجَارِيْ عِرْقِهٖ بِتَلَطُّفٍ بِلَا طَلَبٍ جَرْيًا عَلٰى قَدْرِهٖ سَهْلًا

"وہ روزی اس کی رگ کی نالیوں میں لطافت کے ساتھ جاری ہوکر بغیر طلب کے اس کے اندازے کے مطابق آسانی سے پہنچتی ہے"

وَاَجْرٰى لَهٗ فِي الثَّدْيِ لُطْفَ غِذَائِهٖ شَرَابًا هَنِيْئًا مَا اَلَذَّ وَمَا اَحْلٰى

"اور اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے پستان میں ایسی لطیف غذا جاری کی، جو خوش گوار اور بہت مزے دار اور بہت شیریں مشروب ہے"

وَاَلْهَمَهٗ مَصًّا بِحِكْمَةِ فَاطِرٍ تَجَلّٰى لِاَرْبَابِ الْعُقُوْلِ بِمَا اَوْلٰى

"اور اللہ تعالیٰ نے اس کو چوسنے کا الہام کیا، اہل عقل کیلئے پیدا کرنے والی کی یہ حکمت بہتر طریقے پر ظاہر ہے"

وَاَخَّرَ خَلْقَ السِّنِّ لِوَ قْتِهَا فَاَبْرَزَ هَا عَوْنًا وَجَاءَ بِهَا طَوْلَا

"اور دانت کے پیدا ہونے کو اس کے مقررہ وقت کیلئے مؤخر کیا۔ پھر اس کو کھانے میں مدد کیلئے نکالا اور لمبا کیا"

وَقَسَّمَهَا لِلْقَطْعِ وَالْكَسْرِ قِسْمَةً وَلِلطَّحْنِ اَعْطٰى كُلَّ قِسْمٍ لَهَا شَكْلَا

"اور اللہ تعالیٰ نے دانتوں کو کاٹنے اور توڑنے اور چبانے کیلئے مختلف قسموں میں تقسیم کیا اور ہر قسم کیلئے ایک خاص شکل عطا فرمائی"

وَصَرَّفَ فِي لَوكَ الطَّعَامِ لِسَانَهٗ يُصَرِّفُهٗ عُلْوًا اِذَا شَاءَ اَوْ سُفْلَا

"اور کھانے کے چبانے میں اس کی زبان کو پھرنے والی بنایا وہ جب چاہتی ہے کھانے کو اوپر یا نیچے پھراتی ہے"

وَلَو رَامَ حَصْرًا فِي تَيَسُّرِ لُقْمَةٍ وَالْطَافَهٗ فِيْمَا تَكَفَّنَهَا كَلَّا

"اور اگر وہ لقمہ کے آسان ہونے میں اور ان تمام اشیاء میں جن میں اللہ تعالیٰ کی لطفوں نے اس کو ڈھانپ رکھا ہے اس کے لطفوں کو گھیر لینے (شمار کر لینے) کا ارادہ کرے تو وہ ہرگز نہیں کر سکتا ہے"

فَكَمْ خَادِمٍ فِيْهَا وَكَمْ صَانِعٍ لَهَا كَذَالِكَ مَشْرُوْبٌ وَمَلْبَسُهٗ كُلًّا

"پس اس کی غذا کے معاملے میں اس کیلئے بہت سے خادم ہیں اور بہت سے صانع ہیں اور اس کے پینے اور لباس سب کا یہی حال ہے"

وَكَمْ لُطْفٍ مِنْ حَيْثُ تَحْذَرُ اُكْرِمَتْ وَمَا كُنْتَ تَدْرِي الْفَرْعَ مِنْهَا وَلَا الْاَصْلَا

"اور بہت سی مہربانیاں اس حیثیت سے ہیں کہ تم نقصان دہ اشیاء سے بچتے ہو اور تمہارے اوپر اس وقت لطف وکرم کیا گیا جبکہ تم نہ کرم کی فرع کو جانتے تھے نہ اصل کو۔

وَمِنْ لُطْفِهٖ تَكْلِيْفُهٗ لِعِبَادِهٖ يَسِيْرًا وَاَعْطَاهُمْ مِنَ النِّعَمِ الْجَزْلَا

"اور اس کے لطف و کرم میں سے یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو آسان تکلیف (یعنی اس کی طاقت کے موافق عمل کی تکلیف) دی ہے اور ان کو نعمتیں بہت زیادہ عطا فرمائیں ہیں"

وَمِنْ لُطْفِهٖ تَوْفِيْقُهُمْ لِاِنَابَةٍ تُوْصِلُ لِلْخَيْرَاتِ مِنْ حَبْلِهِمْ حَبْلًا

"اور اس کے من جملہ لطف و کرم میں سے بندوں کو توبہ اور رجوع کرنے کی توفیق بھی ہے جو نیکیوں کیلئے ان کی رسی سے اللہ تعالیٰ کی رسی ملا دیتی ہے"

وَمِنْ لُطْفِهٖ بَعْثُ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ لِيَشْفَعَ فِي قَوْمٍ وَلَيْسُوْا لَهَا اَهْلًا

"اور اس کے لطف و کرم میں سے حضرت محمد ﷺ کا معبوث فرمانا ہے تاکہ وہ لوگوں کی شفاعت فرمائیں۔ حالانکہ لوگ شفاعت کے اہل نہیں ہیں"

وَمِنْ لُطْفِهٖ حِفْظُ الْعَقَائِدِ مِنْهُمْ وَلَوْ خَالَفَ الْعَاصِي الْمُسِيْئُ وَاِنْ زَلَّا

"اور اس کے لطف و کرم میں سے ان کے عقائد کی حفاظت کرنی ہے اگرچہ نافرمان بدکار مخالف عمل کرے اور اگرچہ وہ لغزش کرے"

وَمِنْ لُطْفِهٖ اِخْرَاجُهٗ عَسَلًا كَمَا تُشَاهِدُ مِمَّا كَانَ اَوْدَعَهُ النَّحْلَا

"اور اس کے لطف و کرم میں اس کا شہد پیدا کرنا ہے جیسا کہ تم وہ حکمت دیکھتے ہو جو اس نے شہد کی مکھی کو سپرد کی ہے"

وَاِخْرَاجُهٗ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ مُجَاوِرٍ دَمًا لَبَنًا صَرِفًا بِلَا شَائِبٍ رِسْلًا

"اور اس کے لطف و کرم میں سے خون کے قریب رہنے والے گوبر کے درمیان سے (خون اور گوبر کے درمیان سے) بغیر آمیزش کے صاف و شفاف خالص دودھ پیدا کرنا ہے"

وَاِخْرَاجُهٗ مِنْ دُوْدَةٍ مُلْبِسًا لَهٗ رِوَاقًا عَجِيْبًا اَحْكَمَتْهُ لَنَا غَزْلًا

"اور اس کے لطف و کرم میں سے ریشم کے کیڑے سے اس کو پہنانے کیلئے صاف اور خوبصورت لباس پیدا کرنا ہے جس کو وہ کیڑا ہمارے لیے مضبوط دھاگہ کی شکل میں بناتا ہے"

وَاَعْجَبُ مِنْ ذَا خَلْقُهُ الْقَلْبَ عَارِفًا بِهٖ شَاهِدًا بِلَا شَبِيْهٍ وَلَا مِثْلًا

"اور ان سب سے زیادہ عجیب لطف و کرم یہ ہے کہ اس نے قلب کو اپنا عارف بنایا کہ وہ بلا شبیہ

اور مثل کے اس کا مشاہدہ کرتا ہے"

وَاَلْطَافُهٗ لِلْبَحْرِ الْمُحِيْطِ فَخُذْ بِمَا بَدَالَكَ وَاشْهَدْ هَا وَاِيَّاكَ وَالْجَهْلَا

"اور اس کے الطاف احاطہ کرنے والے سمندر کیلئے ہیں پس تم اس کو اختیار کرو جو تمہارے لئے ظاہر ہوا ہے اور اس کا مشاہدہ کرو اور جہالت سے بچو"

وَصَلِّ عَلَى الْمُخْتَارِ اَفْضَلِ مُرْسَلٍ عَلٰى خَالِصِ الْعِرْفَانِ بِا للّٰهِ قَدْدَلَّا

"اور تم تمام رسولوں سے افضل نبی مختار حضرت محمد ﷺ پر درود وسلام پڑھو، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خالص عرفان کی طرف رہنمائی فرمائی"

پس یہ اللہ تعالیٰ کے وہ الطاف واکرام ہیں جو ہم تک برابر پہنچتے رہتے ہیں اور یہ اس کے احسانات ہیں جو ہمارے اوپر جاری رہتے ہیں۔

لہٰذا اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ بہترین افعال واقوال کے ساتھ ہم کو ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق ع فرمائے، تو یہ اس کا فضل وکرم ہے۔

اور اگر وہ ہماری بدافعالی کی وجہ سے ہم کو ان شکر ادا کرنے سے پھیر دے تو یہ اس کا قہر او انصاف ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو چھٹی مناجات میں بیان فرمایا ہے:-

چھٹی مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:-

اِلٰهِیْ اِنْ اَظْهَرْتَ الْمَحَاسِنَ مِنِّیْ فَبِفَضْلِكَ وَلَكَ الْمِنَّةُ عَلَیَّ ، وَاِنْ ظَهَرَتِ الْمَسَاوِیْ مِنِّیْ فَبِعَدْلِكَ وَلَكَ الْحُجَّةُ عَلَیَّ

"اے میرے اللہ! اگر تو مجھ سے نیکیاں ظاہر فرمائے تو یہ میرے اوپر تیرا فضل اور احسان ہے اور اگر مجھ سے برائیاں ظاہر ہوں تو یہ تیرا انصاف اور میرے اوپر تیری حجت ہے"

میں کہتا ہوں:- انسان سے اس کے اقوال و افعال و اخلاق میں نیکیوں کا ظاہر ہونا، یہ اللہ تعالیٰ کے بڑے احسانات اور بھاری ہدیوں میں سے ہے، کیونکہ یہ قبولیت کا پیش خیمہ ہے اور مقصود اور امید کی انتہا ہے۔

اور بندے سے اس کے اقوال و افعال میں برائیوں کا ظاہر ہونا، یہ اللہ تعالیٰ کا انصاف اور قہر ہے اور اس کے اوپر حجت ظاہر کرنی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ اَجْمَعِيْنَ

"آپ کہہ دیجیے! اللہ تعالیٰ ہی کیلئے حجت کاملہ ہے، پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا فرماتا"

پس اللہ تعالیٰ پر بندے کا کچھ اختیار نہیں ہے اور نہ اس کو کسی نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت ہے۔

لہٰذا اگر اس کو اس کا آقائے حقیقی اپنی رضامندی کے کاموں کی طرف پھیر دے تو یہ اس کے اسم پاک ''کریم'' کے ظاہر ہونے کی بنا پر ہے اور اگر اس کو وہ اپنی ناراضگی کے کاموں میں مصروف کر دے تو یہ اس کے "حکیم" کے تصرف، یا اس کے اسمائے حسنٰی "قھار، یامنتقم، یاجبار" کے اظہار کے باعث ہے۔

کیونکہ پیشانیاں اسی کے ہاتھ میں، اور قلوب اسی کے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت شیخ ابوالحسنؒ پر رحمت نازل فرمائے، انہوں نے اپنی بعض دعاؤں میں فرمایا ہے:۔اے میرے اللہ! میری نیکیاں تیری عطا (بخشش) ہیں اور میری برائیاں تیری قضا ہیں لہٰذا اے میرے اللہ! تو اپنی عطا کردہ نیکیوں کے ساتھ اپنی قضا کردہ (مقدر کی ہوئی) برائیوں پر اس طرح فضل وکرم فرما کہ نیکیوں سے برائیوں کو مٹا دے۔

اس شخص کے لئے جس نے تیری اطاعت کی (اس شے میں جس میں اس نے تیری اطاعت کی) کوئی شکر نہیں ہے۔اور اس شخص کے لئے جس نے تیری نافرمانی کی، (اس شی میں جس میں اس نے تیری نافرمانی کی) کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ تو نے فرمایا ہے۔اور تیرا فرمان سچا ہے:۔

لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُوْنَ

"اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق جو وہ کرتا ہے سوال نہیں کیا جا سکتا ہے۔اور ان لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا"۔

اے میرے اللہ اگر تیری عطا نہ ہوتی تو میں ہلاک ہونے والوں میں سے ہوتا۔اور اگر تیری قضا نہ ہوتی تو میں کامیاب ہونے والوں میں سے ہوتا۔اے میرے اللہ! تو اس سے اعلیٰ واعظم اور بزرگ وبرتر ہے کہ تیری اطاعت، تیری رضامندی کے بغیر کی جائے۔یا تیری نافرمانی تیری قضا کے بغیر کی جائے۔اے میرے اللہ! میں نے تیری اطاعت نہیں کی جب تک تو راضی نہیں ہوا اور میں نے تیری نافرمانی نہیں کی جب تک تو نے فیصلہ نہیں کیا۔میں نے تیری اطاعت تیرے ارادے سے کی۔اور یہ میرے اوپر تیرا احسان وکرم ہے۔اور میں نے تیری نافرمانی تیری قدرت سے کی۔اور یہ میرے اوپر تیری حجت ہے۔

لہٰذا تیری حجت کے قائم ہونے، اور میری حجت کے منقطع ہونے کے طفیل تو میرے اوپر رحم فرما۔اور تیرے سامنے میری محتاجی، اور مجھ سے تیری غنا کے وسیلہ سے سوال ہے کہ تو میرے لئے کافی ہو جا۔

اے میرے اللہ! میں نے تیرے سامنے اپنی جرات اور گستاخی کی وجہ سے، یا تیرے حق کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے گناہ نہیں کیا بلکہ اس کے لئے تیرا قلم چل چکا، اور تیرا حکم نافذ ہو چکا ہے اور تیرے سوا

کسی کو نہ کچھ اختیار ہے۔ نہ طاقت۔ اور عذر بھی تیرے ہی سامنے ہے۔ کیونکہ تو ارحم الراحمین ہے۔

اے میرے اللہ! بے شک میرا کان اور میری آنکھ اور میری زبان اور میرا قلب اور میری عقل سب تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو نے ان میں سے کسی ایک کا مجھ کو کچھ بھی مالک نہیں بنایا ہے۔ لہذا جب تو کسی شی کا فیصلہ فرمائے، تو اس میں تو ہی میرا ولی اور سرپرست بن جا۔ اور سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی فرما۔ اے سب سے بہتر مسئول کہ جس سے سوال کیا جائے اور سب سے بہتر عطا فرمانے والے۔

اے دنیا و آخرت کے رحمان۔ تو ایسے بندے پر رحم فرما جو نہ دنیا کا مالک ہے نہ آخرت کا۔

حضرت شیخ ابوالحسنؒ کی دعا ختم ہوئی۔

اسی دعا کو مصنفؒ نے بہتر عبارت اور مختصر لفظ میں اس مناجات میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے۔

اور طریقہ شاذلیہ کی درستگی میں مصنف کی یہی شان ہے اللہ تعالیٰ مصنف کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔

اور اسی قسم کی مناجات بعض صالحین کرام سے صادر ہوئی ہے۔

روایت ہے:۔ ایک نوجوان عابد نے خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر کہا:۔ اے میرے اللہ! اگر میں نے تیری اطاعت کی ہے تو تیرے فضل و کرم سے کی ہے۔ اور سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں۔ اور اگر میں نے تیری نافرمانی کی ہے۔ تو اپنی جہالت و نادانی سے کی ہے۔ اور یہ میرے اوپر تیری حجت ہے۔ لہذا تو اپنی حجت ثابت کرنے اور میری حجت منقطع ہونے کے سبب مجھ کو بخش دے۔ تو اس نے ہاتف غیب کو یہ کہتے ہوئے سنا:۔ تو دوزخ سے آزاد ہے۔

حضرت ذوالنون رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ میں نے ایک لونڈی کو اس حال میں دیکھا کہ بچے اس کو پتھر سے مار رہے تھے۔ میں نے ان بچوں کو روکا۔ تو اس لونڈی نے میری طرف دیکھا۔ اور کہا (گویا کہ وہ مجھ کو پہچانتی ہے) اے ذوالنون! صدق، کی علامت کیا ہے؟ میں نے جواب دیا:۔ دن میں روزہ رکھنا، اور رات میں قیام کرنا یعنی نمازیں پڑھنا۔ تو اس لونڈی نے کہا:۔ اس

شخص کو نیند کیسے مزے دار معلوم ہو سکتی ہے۔ جس کو یہ معلوم ہے کہ اس کا محبوب نہیں سوتا؟ پھر اس نے رو کر کہا:۔ اے میرے اللہ! اگر میں اپنے اوپر تیرے احسانات میں غور و فکر کروں تو میں اپنی فکر سے اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور اگر میں اپنے لئے تیری پردہ پوشی کو یاد کروں تو میں اس پر تیرا شکر نہیں ادا کر سکتی ہوں۔ لہذا تیرے عارفین کے قلوب پر سخت تعجب ہے۔ کہ ان کے قلوب تیرے مرتبے کے جلال اور تیرے وصف کی عظمت سے شق کیوں نہیں ہو جاتے؟

اے میرے مولا! تو بڑی برکت والا ہے۔ تو نے اس شخص پر کتنا حلم کیا، جس نے تیری نافرمانی کی۔ اور تو نے اس شخص پر کتنا فضل کیا، جس کے لئے تو نے اپنے ماسویٰ کے ساتھ مشغولیت نہیں چھوڑی۔ پھر وہ لونڈی یہ اشعار پڑھنے لگی:

يَا حَبِيْبَ الْقُلُوْبِ اَنْتَ الْحَبِيْبُ　　اَنْتَ اُنْسِيْ وَاَنْتَ مِنِّيْ قَرِيْبُ

"اے قلوب کے حبیب تو میرا حبیب ہے۔ تو میرا مونس ہے۔ اور تو مجھ سے قریب ہے"۔

يَا طَبِيْباً بِذِكْرِكَ يَتَدَاوٰى　　كُلُّ ذِيْ سَقَمٍ فَنِعْمَ الطَّبِيْبُ

"اے طبیب تیرے ذکر سے ہر مریض علاج حاصل کرتا ہے۔ لہذا تو بہترین طبیب ہے"۔

طَلَعَتْ شَمْسُ مَنْ اُحِبُّ بِلَيْلٍ　　وَاسْتَنَارَتْ فَمَا تَلَاهَا غُرُوْبُ

"میرے محبوب کا سورج رات میں طلوع ہوا اور ایسا روشن ہوا کہ پھر غروب نہیں ہوا"

اِنَّ شَمْسَ النَّهَارِ تَغْرُبُ بِلَيْلٍ　　وَشُمُوْسُ الْقُلُوْبِ لَيْسَتْ تَغِيْبُ

"دن کا سورج رات کو غروب ہو جاتا ہے لیکن قلوب کے سورج کبھی غائب نہیں ہوتے"۔

فَاِذَا مَا الظَّلَامُ اَسْبَلَ سِتْرًا　　فَاِلٰى رَبِّهَا تَحِنُّ الْقُلُوْبُ

"لہذا جب تاریکی اپنا پردہ لٹکا دیتی ہے (یعنی چھا جاتی ہے) تو قلوب اپنے رب کے مشتاق ہو جاتے ہیں"۔

اور جب قلوب اپنے مولائے حقیقی کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اور عشق و محبت کے ساتھ اس کے ساتھ متعلق ہو جاتے ہیں۔ تو وہ ان کو اپنے غیر کے سپرد کیسے کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ ان کا متولی ہو چکا ہے؟ اور وہ ان کی مدد کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ اس کے پاس پناہ لے چکے ہیں۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو ساتویں مناجات میں بیان فرمایا:۔

ساتویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اِلٰهِیْ کَیْفَ تَکِلُنِیْ"

"اے میرے اللہ تو مجھ کو کیسے سپرد کرے گا"۔ یعنی مجھ کو اپنے غیر کے سپرد کیسے کرے گا۔ یعنی مجھ کو اپنے غیر کا محتاج کیسے بنائے گا"۔

"وَقَدْ تَکَفَّلْتَ لِیْ"۔ جب کہ تو میرا کفیل (ضامن) ہو چکا ہے۔" یعنی میرے تمام امور اور احوال میں تو میری ذمہ داری لے چکا ہے۔

جیسا کہ تو نے خود فرمایا ہے:۔ (ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ) "جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے۔ تو وہ اس کے لئے کافی ہے"۔

اور تو نے دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا

"اور زمین میں جتنے چلنے والے جاندار ہیں۔ ان کی روزی (کی ذمہ داری) اللہ تعالیٰ پر ہے"۔

"وَکَیْفَ اُظْلَمُ" اور میں ظلم کیسے کیا جاؤں گا"۔ یعنی میرے اوپر ظلم کیسے کیا جا سکتا ہے اور میری عزت کیسے برباد کی جا سکتی ہے۔

"وَاَنْتَ النَّاصِرُ لِیْ" جب کہ میرا مددگار تو ہے، پس تو میری مدد کرتا ہے اور میرے لئے مدد کرتا ہے۔ اور میرے ساتھ مدد کرتا ہے۔

اور تو نے اپنی کتاب حکیم قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

"بے شک اللہ تعالیٰ ایمان والوں (کی طرف) سے مدافعت کرتا ہے"۔

اور دوسری جگہ تو نے فرمایا ہے۔ اور تیرا فرمان برحق ہے۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ

''اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کی مدد کرو گے۔ تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔''

اور تیسری جگہ تو نے فرمایا ہے:۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

''اور مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے''۔

لہٰذا اے خیر الناصرین: (بہترین مدد کرنے والے) ہماری مدد فرما۔ جس طرح تو نے اپنے انبیاء و مرسلین علیہم الصلاۃ والسلام اور اپنے خاص اولیائے مقربین رضی اللہ عنہم کی مدد فرمائی۔ یا ارحم الراحمین۔

''اَمْ كَيْفَ اَخِيْبُ'' یا میں ناکام و محروم کیسے ہو سکتا ہوں۔ یونی میں بھلائی سے کیسے محروم ہو سکتا ہوں۔

''وانت الحفی بی'' جبکہ میرے اوپر تو مہربان ہے۔

یعنی میرے تمام معاملات کو درست کرنے والا، یا میرے تمام احوال میں میرا رفیق تو ہے۔

تو نے خود فرمایا ہے:۔

''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی (دوست یا سرپرست) ہے''۔

اور تو نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے:۔

(وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِيْنَ) ''اور وہ یعنی اللہ تعالیٰ صالحین کی سرپرستی کرتا ہے''۔

لہٰذا اے ہمارے مولا! تو اپنی حفاظت کے ساتھ ہماری سرپرستی فرما۔ اور اپنی عنایت سے ہم کو گھیر لے۔ اور اپنے ساتھ ہم کو مدد پانے والا۔ اور اپنے اوپر توکل کرنے والا بنا۔

اے رب العالمین۔

هَا اَنَا اَتَوَسَّلُ بِفَقْرِيْ اِلَيْكَ

''لے، میں اپنے فقر (محتاجی) کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتا ہوں''۔

یعنی میں اپنے فقر ومحتاجی کو تیری بارگاہ قدس میں وسیلہ بناتا ہوں۔ کیونکہ تیرا محتاج ہونے کے سوا تجھ سے میری کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں ہرشی میں یہاں تک کہ اپنے فقر ومحتاجی میں بھی تیرا محتاج ہوں۔ لہذا اگر دولتمندوں نے تیرے حضور میں مال پیش کیا ہے۔ تو میں تیری بارگاہ قدس میں تمام حالات میں اپنی محتاجی پیش کرتا ہوں۔ اور اگر طاقت والوں نے تیرے حضور میں اعمال صالحہ پیش کئے ہیں۔ تو میں تیری بارگاہ قدس میں عاجزی اور گریہ وزاری پیش کرتا ہوں۔

مَالِي سِوَى فَقْرِيْ اِلَيْكَ وَسِيْلَةٌ فَبِا الْاِفْتِقَارِ اِلَيْكَ رَبِّيْ اَضْرَعُ

''میرے پاس میری محتاجی کے سوا تیرے حضور میں پہنچنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ لہذا اے میرے رب! میں اپنی محتاجی کے وسیلے سے تیری بارگاہ میں التجا کرتا ہوں۔''

مَالِي سِوَىٰ قَرْعِيْ لِبَابِكَ حِيْلَةٌ فَلَئِنْ رُدِدْتُّ فَاَيُّ بَابٍ اَقْرَعُ

''تیرا دروازہ کھٹکھٹانے کے سوا میرے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔ پس اگر میں تیرے دروازے سے واپس کر دیا گیا تو پھر کون سا دروازہ ہے، جس کو میں کھٹکھٹاؤں''۔

اور بندے کی محتاجی کی اس کے مولا کی غنا سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:۔

كَيْفَ اَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِمَا هُوَ مَحَالٌ اَنْ يَّصِلَ اِلَيْكَ

''اور تیری بارگاہ کے لئے میں اس شی کو وسیلہ کیسے بناؤں جس کا تیری بارگاہ میں پہنچنا محال ہے''۔

اس لئے کہ تو فوائد کے ساتھ فائدہ حاصل کرنے سے بے نیاز ہے۔ لہذا تو ہم کو اپنے ساتھ اپنے غیر کے سامنے محتاجی سے بے نیاز کر دے۔ یہاں تک کہ میں تجھ سے تیرے ساتھ ملوں۔ تیرے غیر کے ساتھ نہ ملوں۔ بے شک تو ہرشی پر قادر ہے۔

روایت ہے:۔ ہمارے شیخ الشیوخ قطب جامع مولائی عبدالسلام بن مشیش رضی اللہ عنہ نے حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ سے کس شی کے ساتھ ملاقات کرو گے؟

حضرت ابوالحسن نے جواب دیا: میں اپنے فقر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کروں گا۔

حضرت شیخ نے ان سے فرمایا اللہ کی قسم اگر تم اپنے فقر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملو گے تو تم بہت بڑے بت کے ساتھ اس سے ملو گے تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو کر اس سے کیوں نہ ملو؟ گویا کہ حضرت شیخ الشیوخ نے حضرت شیخ ابوالحسن کی رہنمائی اس طرف کی کہ وہ اپنے نفس سے اور ہر اس شی سے جو نفس کی طرف منسوب ہو مثلاً فقر وغیرہ سے دور ہو جائیں۔

حضرت شیخ زروقؒ نے فرمایا حضرت شیخ ابوالحسن کی طرف سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے فقر سے وہ فقر مراد لیا جو ان کی طرف منسوب ہے اور وہ زائل ہونا ہے۔ کیونکہ جب ہر شی سے ان کی محتاجی درست ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر شی سے ان کی محتاجی درست ہو گئی۔ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر شئے سے ان کی غنا درست ہو گئی اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی غنا درست ہو گئی تو وہ اللہ تعالیٰ سے اسی کے ساتھ ملاقات کریں گے۔

حضرت ہروی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: عوام کا فقر: ترک دنیا ہے۔ اور خواص کا فقر: ترکِ دنیا و آخرت ہے۔ اور خواص الخواص کا فقر: ترک دنیا و آخرت و نفس ہے۔ اور اللہ علیم و خبیر کے سامنے ان امور کا ظاہر کرنا خالص عبودیت ہے۔ اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا:۔

اَمْ كَيْفَ اَشْكُوْا اِلَيْكَ حَالِيْ وَهُوَ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ

''یا میں تجھ سے اپنے حال کا اظہار کیسے کروں۔ جب کہ وہ تیرے اوپر پوشیدہ نہیں ہے''۔

اس لئے کہ یہ محال ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی شی تجھ سے پوشیدہ رہے۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى

''اور اگر تو پکار کے بات کہے تو بے شک اللہ تعالیٰ چپکے سے کہی ہوئی بات کو، اور اس سے بھی پوشیدہ یعنی دل کی بات کو بھی جانتا ہے''۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

''اور تم اپنی بات چپکے سے کہو یا پکار کے کہو، بے شک وہ دلوں کے بھید کو جانتا ہے''۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

''کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ مہربانی کرنے والا اور خبر رکھنے والا ہے''۔

لہٰذا اس کا میرے حال سے باخبر ہونا، میرے سوال کرنے سے زیادہ میرے لئے کافی ہے۔

اَمْ كَيْفَ اَتَرَجَّمُ اِلَيْكَ بِمَقَالِيْ ؟

''یا میں تیرے سامنے اپنے دل کی ترجمانی اپنے قول سے کیسے کروں''

یعنی جو کچھ میرے دل میں ہے میں اس کو اپنے قول سے تیرے حضور میں کیسے پیش کروں۔

(وَهُوَ) ''جب کہ وہ'' یعنی میرے دل کی بات (مِنْكَ بَرَزَ) ''تیری ہی طرف سے ظاہر ہوئی ہے'' کیونکہ تیرے سوا کوئی ایجاد کرنے والا نہیں ہے''۔

مگر یہ کہ ربوبیت کا مقام، عبودیت کے وظائف کا تقاضا کرتا ہے۔ اور عبودیت کے وظائف: مقدر شدہ شے کے دفع کرنے کی خواہش کے بغیر، یا غیر مقدر شدہ شے کے حاصل ہونے کی خواہش کے بغیر، زبان اور گریہ وزاری سے فاقہ اور محتاجی اور عاجزی کا ظاہر کرنا ہے۔

جیسا کہ حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ہم تجھ سے اس شے کے دفع کرنے کی التجا نہیں کرتے ہیں، جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ بلکہ ہم تجھ سے یہ التجا کرتے ہیں، کہ اس شے میں جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ اپنے روح القدس (تائید غیبی) سے میری مدد فرما۔ جیسا کہ تو نے اپنی مخلوق میں سے اپنے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اپنے خاص صدیقین رضی اللہ عنہم کی مدد فرمائی۔ بے شک تو ہر شی پر قادر ہے۔

''اَمْ كَيْفَ تَخِيْبُ اٰمَالِيْ '' یا میری امیدیں ناکام کیسے ہوں گی'' یعنی میری خواہشیں اور حاجتیں ناکام کیسے ہوں گی۔

''وَهِيَ وَفَدَتْ عَلَيْكَ '' جب کہ وہ تیری بارگاہ میں حاضر ہو چکی ہیں۔

یعنی تیرے کرم کے صحن میں، اور تیری بخشش کے سمندر کے ساحل پر اتر چکی ہیں اور انہوں نے اپنا سامان تیرے فضل کے دروازے پر رکھ دیا ہے۔ اور انہوں نے تیری عزت کے قلعہ میں پناہ لی ہے۔ اور تیرے چاہنے والوں کی امیدیں ناکام کیسے ہوں گی۔ جب کہ تیرے کرم کا دروازہ کھلا ہوا ہے''۔

یا تیرا ارادہ کرنے والے محروم کیسے ہوں گے جب کہ تیرے فضل واحسان کا سمندر فیض رساں ہے۔

یا تیرا ہمسایہ عاجز ومظلوم کیسے ہوگا جب کہ تیرے غلبے کا مرتبہ بہت مضبوط ہے

یا تیرا ہمسایہ شرمندہ کیسے ہوگا جب کہ تمام اشیاء میں تیرا حکم سرعت سے نافذ ہے؟ ایک عارف کا شعر ہے:

اَیُضَامُ عَبْدٌ فِیْ حِمَاکُمْ قَدْ نَزَلْ　　　یَا مَنْ لَھُمْ کُلُّ الْاَمَانِیْ وَالْاَمَلْ

''کیا وہ بندہ جو تمہاری حمایت اور پناہ میں اتر چکا ہے، عاجز اور مظلوم ہو سکتا ہے۔ اے وہ ذات مقدس جس کے سامنے کل تمنائیں اور امیدیں ہیں''۔

''اَمْ کَیْفَ لَا تَحْسُنُ اَحْوَالِیْ'' یا میرے احوال بہتر کیسے نہ ہوں گے۔

بلکہ وہ نہایت بہتر ومکمل ہوں گے۔ (وَ) جب کہ وہ یعنی احوال (بِکَ قَامَتْ) ''تیرے ساتھ قائم ہیں''۔

اس لئے کہ بندے کا وجود صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ اور اپنی ذات سے اس کی ذات کا وجود نہیں ہے۔ اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متعلق اور اللہ تعالیٰ سے قائم، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ اس کو کوئی نقص اور خلل کیسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے:

(وَاِلَیْکَ) ''اور تیری ہی طرف'' یعنی تیرے ہی حکم اور ارادے کی طرف ان کی انتہا ہونے والی ہے۔ کیونکہ تمام امور کا تو ہی مبدا و مصدر ہے۔ اور تیری ہی طرف ان کا منتھیٰ ومرجع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ)

''اور اسی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں۔ لہذا آپ اسی کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ رکھئے''۔

ایک عارف کے اشعار ہیں:

اَقْبِلْ عَلَیْنَا لَا تَخَفْ فَلَنَا الْھُدٰی وَلَنَا الْجَلَالُ مَعَ الْجَمَالِ خُذِ الصَّفَا

''ہمارے سامنے آؤ۔ خوف نہ کرو۔ کیونکہ ہمارے ہی پاس ہدایت ہے۔ اور جمال اور جلال ہمارے ہی لئے ہے۔ تم صفائی یعنی خلوص اختیار کرو''۔

وَاقْصِدْ حِمَانَا مَا اَتَانَا مُذْنِبٌ اِلَّا نَجَا لَوْ کَانَ مِنَ الذُّنُوْبِ عَلَی الشِّفَا

''اور ہماری حمایت اور پناہ میں آنے کا ارادہ کرو۔ ہمارے پاس جو گناہگار آتا ہے وہ نجات پا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ گناہ کی آخری حد پر پہنچ چکا ہو''۔

اے میرے اللہ! ہم نے خضوع کرتے ہوئے، اور تیری بارگاہ سے نسبت قائم رکھتے ہوئے، اور تیری ہمسائیگی کی رسی کو مضبوط پکڑتے ہوئے، اور تیرے مرتبے کے غلبے سے غلبہ طلب کرتے ہوئے، اور تیری فوری مدد سے مدد حاصل کرتے ہوئے تیری حمایت اور پناہ میں آنے کا ارادہ کیا ہے۔ لہٰذا تو ہماری مدد فرما۔ اور ہمارے مقابلے میں ہمارے دشمنوں کی مدد نہ کر۔ یا خیر الناصرین

تیرا پورا ہونے والا عہد، اور تیری کافی مدد اس سے پاک ہے، کہ تو اس کو رسوا کرے جو تیرے ہمسایہ میں داخل ہو جائے۔ یا اس کو بھگا دے جو تیرے دروازے پر کھڑا ہو جائے۔ اے بہترین مسئول!

اور اے تمام داتاؤں سے بڑا داتا! تو ایک ایسے بندے پر رحم فرما۔ جو اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا ہے۔

بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

مناجات کی مسلسل عبارت

اِلٰھِیْ کَیْفَ تَکِلُنِیْ وَقَدْ تَکَفَّلْتَ لِیْ؟ وَکَیْفَ اُضَامُ وَ اَنْتَ النَّاصِرُ لِیْ؟ اَمْ کَیْفَ اَخِیْبُ وَاَنْتَ الْحَفِیُّ بِیْ؟ ھَا اَنَا اَتَوَسَّلُ بِفَقْرِیْ اِلَیْكَ، کَیْفَ اَتَوَسَّلُ اِلَیْكَ بِمَا ھُوَ مَحَالٌ اَنْ یَّصِلَ اِلَیْكَ؟، اَمْ کَیْفَ اَشْکُوْا اِلَیْكَ حَالِیْ وَھُوَ لَا یَخْفٰی عَلَیْكَ؟، اَمْ کَیْفَ اَتَرَجَّمُ اِلَیْكَ بِمَقَالِیْ، وَھُوَ مِنْكَ بَرَزَ؟ اَمْ کَیْفَ تَخِیْبُ اٰمَالِیْ وَھِیَ وَفَدَتْ عَلَیْكَ؟ اَمْ کَیْفَ لَا تَحْسُنُ اَحْوَالِیْ وَبِكَ قَامَتْ''

''اے میرے اللہ! تو مجھ کو کیسے سپرد کرے گا جب کہ تو میرا ضامن ہو چکا ہے؟ اور میں ظلم کیسے
...وں گا جب کہ میرا مددگار تو ہے؟ یا میں ناکام کیسے ہو سکتا ہوں جب کہ میرے اوپر تو مہربان
...ں اپنی محتاجی کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتا ہوں۔ تیری بارگاہ کے لئے میں اس شی کو وسیلہ کیسے
...جس کا تیری بارگاہ میں پہنچنا محال ہے؟ یا میں تیرے سامنے اپنا حال کیسے ظاہر کروں جب کہ وہ
...اوپر پوشیدہ نہیں ہے؟ یا میں تیرے سامنے اپنے دل کی ترجمانی اپنے قول سے کیسے کروں
...ہ وہ تیری ہی طرف سے ظاہر ہوئی ہے؟ یا میری امیدیں ناکام کیسے ہوں گی جب کہ وہ تیری
...میں حاضر ہو چکی ہیں۔ یا میرے احوال کیسے بہتر نہ ہوں گے جب کہ وہ تیرے ہی ساتھ قائم
...اور تیری ہی طرف ان کی انتہا ہو گی۔

آٹھویں مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ مَا اَلْطَفُكَ بِیْ مَعَ عَظِیْمِ جَهْلِیْ ، وَمَا اَرْحَمُكَ بِیْ مَعَ قَبِیْحِ فِعْلِیْ؟

''اے میرے اللہ! میری بڑی جہالت اور نادانی کے باوجود میرے ساتھ تیرا لطف وکرم کتنا زیادہ ہے۔اور میرے برے فعل کے باوجود میرے ساتھ تیرا رحم کتنا زیادہ ہے''۔

میں کہتا ہوں:۔ یہ آٹھویں مناجات ساتویں مناجات کی تکمیل ہے۔اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہارا وکیل اور مددگار ہے اور تمہارے اوپر مہربان ہے تو وہ تمہارے اوپر اس طرح لطف وکرم کرتا ہے کہ تم کو خبر نہیں ہوتی ہے۔

اور لطف:۔ نقصانات کی حالتوں میں خوشیاں،اور مصیبتوں کی صورتوں میں فوائد حاصل کرنا ہے۔

حاصل یہ ہے:۔لطف:۔لطیف طریقے پر بھلائی حاصل کرنا ہے اور اس کو اہل بصیرت کے سوا دوسرے لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔

لہذا لطف جمیل:۔وہ ہے،جس کا باطن نعمت ہوتی ہے۔اور اس کا ظاہر عذاب ہوتا ہے۔اس کا باطن جمال اور اس کا ظاہر جلال ہوتا ہے۔لہذا عارف باللہ ہر حال میں اپنی ذات کو لطف میں ڈوبا ہوا دیکھتا ہے۔

اسی لئے مصنف رضی اللہ عنہ کا یہ بیان پہلے گزر چکا ہے: جو شخص اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر سے اس کے لطف کے جدا ہونے کا گمان کرتا ہے۔تو یہ اس کی نظر اور فکر کا قصور ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ سے جاہل،لطف کو اسی وقت سمجھتا ہے جب کہ وہ محسوس ظاہر اور کھلا ہوا ہو۔اسی لئے مصنفؒ نے اس مناجات میں تواضع اور تنزل کے طریقے پر فرمایا: اے میرے اللہ! میری بڑی جہالت اور نادانی کے باوجود تیرا لطف وکرم میرے ساتھ کتنا زیادہ ہے؟ اس طرح کہ میں تیرے پوشیدہ لطف سے

جہالت کرتا ہوں۔اور تیرے ظاہری لطف کو طلب کرتا ہوں۔

عافیت کی عجیب وغریب تشریح

اور اگر اللہ تعالیٰ ہماری جہالت کے مطابق ہمارے ساتھ معاملہ کرتا۔تو اپنا پوشیدہ لطف ہم سے چھین لیتا اور ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیتا۔لیکن اللہ سبحانہ تعالیٰ حلیم ہے۔اس لئے اس نے ہمارے ساتھ ہماری جہالت کے مطابق معاملہ نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ہماری بڑی جہالت کے باوجود ہمارے اوپر اپنا لطف جاری رکھا۔ اسی لئے مصنفؒ نے اپنی بڑی جہالت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لطف کی کثرت پر تعجب کیا۔اور مصنفؒ کا یہ قول ویسا ہی ہے جیسا کہ حضرت شیخ ابوالعباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو۔تو تم اس کو اس حیثیت سے طلب کرو کہ تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے لئے عافیت ہے۔

نیز انہوں نے اپنی بیماری کے حال میں فرمایا۔جب کہ ایک شخص نے ان سے کہا۔اپ اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کیجئے۔تو انہوں نے اس سے فرمایا۔میں جس حال میں ہوں، یہی میرے لئے عافیت ہے۔

اور سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کی تھی تو ان کی وفات زہر سے ہوئی۔اور سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کی تو وہ تلوار سے زخمی ہو کر شہید ہوئے اور سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عافیت طلب کی تو وہ ذبح ہو کر شہید ہوئے۔اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عافیت طلب کی تو وہ قتل ہو کر شہید ہوئے۔

لہذا عافیت اور لطف: رضا وتسلیم ہے۔اور قضا وقدر کا حکم جاری ہونے کے وقت سکون قلب ہے۔اور رحمت:۔ لطف ومحبت اور قریب کرنا ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اپنے بندے کو اس کے اوپر مخلوق کی ایذا رسانی اور محتاجی اور بیماریاں اور ان کے علاوہ وہ چیزیں جو نفس کو تکلیف دیتی ہیں، مسلط کر کے اپنی طرف قریب کرے۔ اور اپنے اور اس کے درمیان دوری کے فاصلہ کو لپیٹ دے۔ لیکن بندہ اپنی جہالت اور بدافعالی کی وجہ سے ان سے بھاگتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس کو ان مصیبتوں سے محفوظ رکھے۔

بعض اخبار میں وارد ہوا ہے:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! جن چیزوں کے ذریعے میں نے تیرے اوپر رحم کیا ہے۔انہیں چیزوں کے دور کر کے میں تیرے اوپر کیسے رحم کروں۔ یا اللہ تعالیٰ نے جیسا فرمایا ہو۔اور مصنف ؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے: اے میرے اللہ! میرے برے فعل کے باوجود میرے اوپر تیرا رحم کتنا زیادہ ہے۔

اور یہ جہالت:۔ میرا ان چیزوں سے بھاگنا ہے،جن کے ذریعے تو نے مجھ پر رحم فرمایا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ برے فعل سے گناہوں اور نافرمانیوں کو مراد لیا ہو۔کیونکہ وہ ناراضی اور دوری کا سبب ہیں۔ لہذا اگر اللہ تعالیٰ ہمارے برے افعال کے مطابق ہمارے ساتھ معاملہ کرتا۔تو وہ ہم کو اپنے دردناک عذاب کا مزہ چکھاتا۔لیکن رحمان و رحیم کی رحمت اس کے دردناک عذاب پر غالب آ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی: اے موسیٰ! آپ گناہگاروں سے مہربانی اور نرمی کے ساتھ خطاب کریں۔اور ان کو میری طرف اچھی بات کے ساتھ بلائیں۔اور ان کو قائم رہنے والی نعمت یعنی جنت کی طرف رغبت دلائیں۔اور ان کے اوپر سختی نہ کریں۔کیونکہ اگر میں ان کو جلد سزا دینا چاہتا تو میں ان کو پلک جھپکانے کی مہلت نہ دیتا۔اور آپ ان کو یہ بتا دیں کہ جو شخص میرے سامنے توبہ کرے گا میں اس کی توبہ قبول کروں گا۔اور جو شخص سستی کرے گا میں اس کو مہلت دوں گا۔اور جو شخص میری نافرمانی کرے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔

اے موسیٰ! کون ہے،جس نے صدق دل سے میرا ارادہ کیا ہو،لیکن میں نے اس کو ناکام کر دیا ہو۔یا اس نے میری طرف پناہ لی ہو،لیکن میں نے اس کو چھوڑ دیا ہو یا اس نے مجھ سے مانگا ہو، لیکن میں نے اس کو محروم کر دیا ہو۔یا اس نے میری طرف رجوع کیا ہو،لیکن میں نے اس کو بھگا دیا ہو،یا اس نے میرے سامنے توبہ کی ہو،لیکن میں نے اس کی توبہ نہ قبول کی ہو۔یا اس نے میرے سامنے عاجزی کی ہو لیکن میں نے اس پر رحم نہ کیا ہو؟

جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ

''جو مصیبت تم لوگوں کو پہنچتی ہے۔ وہ تمہارے ہی برے اعمال کے صلہ میں پہنچتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہاری بہت سی بداعمالیوں کو معاف فرما دیتا ہے''۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا ہے: اس آیہ کریم کے نازل ہونے پر حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

يَا عَلِيُّ مَنْ اٰخَذَهُ اللّٰهُ بِذَنْبِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يُّعَذِّبَهٗ عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرَةِ، وَمَنْ عَفَا عَنْهُ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ اَعَزُّ مِنْ اَنْ يُّعَاقِبَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَهٗ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ اَجَلُّ مِنْ اَنْ يَّفْضَحُهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

''اے علی جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کے سبب دنیا میں پکڑ لیا تو وہ اس کے لئے اس سے زیادہ کریم ہے، کہ وہ اس کو اس گناہ پر آخرت میں عذاب دے۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں معاف کر دیا۔ تو وہ اس سے اعلیٰ ہے، کہ وہ اس کو آخرت میں سزا دے۔ اور جس شخص کی دنیا میں پردہ پوشی فرمائی۔ تو وہ اس سے بلند ہے، کہ وہ اس کو آخرت میں رسوا کرے''۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا ہے: یہ قول میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے افضل ہے۔

ایک عارف کے اشعار ہیں:

سُبْحَانَ مَنْ اَبْدَعَ الْاَشْيَاءَ وَقَدَّرَهَا وَمَنْ يَّجُوْدَ عَلَى الْعَاصِيْ وَيَسْتُرُهٗ

''وہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، جس نے اشیاء کو پیدا فرمایا۔ اور ان کے لئے اندازہ (تقدیر) مقرر کیا۔ اور جو گناہگار پر بخشش کرتا، اور اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے''۔

يُخْفِي الْقَبِيْحَ وَ يُبْدِيْ كُلَّ صَالِحَةٍ وَ يَغْمُرُ الْعَبْدَ اِحْسَاناً وَ يَشْكُرُهٗ

''وہ برائی کو چھپاتا ہے۔ اور ہر بھلائی کو ظاہر کرتا ہے اور بندے کو احسان میں ڈھانپ لیتا ہے۔ اور اس کے شکر کو قبول فرماتا ہے''۔

اور چونکہ لطف درستی کا تقاضا کرتا ہے اور رحمت قریب کرنا چاہتی ہے لہذا مصنفؒ نے اللہ تعالیٰ سے بندے کے زیادہ دور ہونے کے باوجود، بندے سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہونے پر تعجب کیا۔

جیسا کہ مصنفؒ نے نویں مناجات میں فرمایا:

نویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِيْ مَا اَقْرَبُكَ مِنِّيْ وَمَا اَبْعَدُنِيْ مِنْكَ، وَمَا اَرْاَفُكَ بِيْ، فَمَا الَّذِيْ يَحْجُبُنِيْ عَنْكَ؟

''اے میرے اللہ! مجھ سے زیادہ تجھ سے قریب کون شی ہے۔ اور مجھ سے زیادہ تجھ سے دور کون سی شی ہے۔ اور تیری رافت (مہربانی) میرے ساتھ کتنی زیادہ ہے پھر وہ کون سی شی ہے جو مجھ کو تجھ سے محجوب کرتی ہے''۔

میں کہتا ہوں:۔ بندے سے اللہ تعالیٰ کا قرب:۔ رحمت اور انتخاب، اور تقریب اور مقبولیت کا قرب ہے۔ اور یہ خواص الخواص کے لئے ہے۔ اور عوام کے لئے قرب:۔ احاطہ اور قدرت، اور علم و مشیت، اور تصریف و قہریت کا قرب ہے۔

اور یہاں مراد پہلا یعنی خواص الخواص کا قرب ہے۔

پس بے شک بندے کی اس کے رب سے دوری، صرف اس کی بے ادبی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر شی سے قریب ہے۔ اور ہر شی کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی شی اس سے کسی شی سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ اور کوئی شی اس سے کسی شی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور بندے سے اس کے رب کی دوری صرف اس کا وہم اور اس کا برا فعل ہے۔ اسی لئے مصنف ؒ نے تواضع اور ادب کے ساتھ کہا:

اے میرے اللہ! تیرے لطف اور تیری رافت اور تیرے علم اور تیرے احاطہ کی بناء پر مجھ سے زیادہ تجھ سے قریب کون سی شی ہے۔ اور میرے وہم اور میری بے ادبی کی بناء پر مجھ سے زیادہ تجھ سے دور کون سی شی ہے۔

یا اوصاف ربوبیت کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ تجھ سے قریب کون سی شی ہے اور اوصاف

عبودیت کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ تجھ سے دور کون سی شی ہے۔ کیونکہ ربوبیت کے اوصاف بلند مرتبہ اور بڑی شان والے ہیں۔ اور عبودیت کے اوصاف کم تر درجے اور ادنیٰ مرتبے والے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے ایک مقام میں باہم لازم ہونے کے باوجود، مرتبہ میں دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دونوں میں وحدت کی تحقیق کے اعتبار سے، دونوں قیام میں باہم لازم ہیں۔ اور احکام میں متضاد ہیں۔

اور رافت: رحمت اور مہربانی کا زیادہ شدید ہونا ہے اور رافت، قرب و وصال کی زیادتی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور غیریت اور جدائی کی نفی کرتی ہے۔ اور غیریت اور جدائی ہی حجاب ہے۔

اسی لئے مصنف ؒ نے اپنے لئے اپنے مولائے حقیقی کی رافت اور قرب کی زیادتی کے باوجود، اپنے اور اس کے درمیان حجاب کے وجود پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ جس اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر مہربانی کی۔ اور تم کو پناہ دی۔ یہ ناممکن ہے کہ تم اس کو چھوڑ کر اس کے غیر کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

حکمت میں مرقوم ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! میں نے کل کائنات کو جس میں ملک اور اس کی کل اشیاء اور ملکوت اور اس کی کل اشیاء ہیں، تیرے سامنے سرنگوں کر دیا ہے۔ لہٰذا تو میری تائید کی بناء پر میں ہو گیا ہے۔ اور میں اپنی سپرد کی ہوئی شی کی بنا پر تو ہو گیا ہوں۔ لہٰذا تو ابد تک زندہ رہ۔ کیونکہ تجھ کو ایسا مقام حاصل ہو گیا ہے جس میں کوئی شی تجھ سے مزاحمت نہیں کر سکتی ہے۔

اے میرے بندے! میں نے تیرا حجاب چاک کر دیا ہے اور تیرے لئے دروازہ کھول دیا۔ اور تیرے سامنے تعجب خیز امر ظاہر کر دیا۔ لہٰذا تو اپنی عقلمند قوم تک اس کو پہنچا دے۔ اگرچہ وہ لوگ تجھ کو جادوگر یا جھوٹا کہیں اور چونکہ میں نے تجھ کو بہترین اخلاق عطا فرمایا ہے۔ اس لئے تو ان کو اس حال میں چھوڑ دے۔ کہ وہ یہ کہتے رہیں: (اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ) ''یہ تو صرف افترا (بہتان) ہے''۔

اے میرے بندے! میں نے تجھ کو ایسا بنا دیا ہے کہ جب تو کسی شی کے لئے کہے: ''کن'' تو ہو جا۔ تو وہ ہو جائے۔ اور اگر لوگ تجھ کو جادوگر یا دیوانہ کہتے ہیں تو اس کی کوئی ذمہ داری تیرے اوپر

نہیں ہے۔ تو حوض کوثر کا خالص شراب پیتا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں:

اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ

''یہ صرف دوسروں سے نقل کیا ہوا جادو ہے''۔

تو اپنے سر کے ساتھ آسمان کی طرف چڑھا۔ اور میں نے تجھ کو اسموں کی خصوصیتوں کی تعلیم دی۔ لہذا تو حقیقت کے خزانوں کا امین، اور صراط مستقیم کی طرف کل مخلوقات کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

اے میرے بندے! جس شخص نے وزیر کے اوپر نکتہ چینی کی۔ اور اس کے حکم کو حقیر سمجھا۔ تو بے شک اس نے امیر یا بادشاہ کے حکم کو ٹھکرا دیا۔ اور اس کی ناقدری کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

''جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی''۔

لہذا جب اللہ تعالیٰ اپنے احسان و فضل سے اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو مقبول کر لیتا ہے۔ تو وہ اس کو اپنے فضل سے اپنے قریب کر لیتا ہے۔ اور اس کو اپنی بارگاہ قدس کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ اور اس کو اس کی طبیعت کی کثافتوں سے پاک کر دیتا ہے اور اس کی ذات کو اس کے نفس کی سرکشی سے محفوظ کر دیتا ہے۔ لہذا وہ اللہ تعالیٰ کے اہل قرب میں سے ہو جاتا ہے اور اس کے قلب کی آنکھ سے حجاب اٹھ جاتا ہے۔ پھر اس کی روح احدیت کے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سر الوہیت کے جلال میں گم ہو جاتا ہے۔

پس اگر وہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی ذات سے مخلوق کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے تو اس کو اپنے وجود کے سر کے شہود کی طرف واپس کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے قلب کی آنکھ میں سر حقیقت کا سرمہ لگا ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات ایسا وجود حاصل کر لیتی ہے، جو اس پر نمایاں ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ جو تمام مخلوق کو فیض پہنچاتا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات کو صرف وہمی خیال کرتا ہے۔

كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ

''جیسے ریگستان کا بالو۔ پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔ لیکن جب اس کے پاس پہنچا۔ تو اس کو کچھ نہیں ملا۔ اور وہاں صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت نظر آئی''۔

اس مقام میں بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے۔ اس کا حکم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس طریقے پر کہ اس میں ماسوی اللہ کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا ہے۔ اور کوئی شی اس کو اللہ تعالیٰ سے محجوب نہیں کرتی ہے۔

لہٰذا یہی وہ شخص ہے جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس کو اپنی بارگاہ قدس کے لئے قبول کرتا ہے۔ اور اس کو اپنی مناجات وانسیت کے لئے منتخب کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کا کان اور اس کی آنکھ اور اس کا مددگار بن جاتا ہے۔ اور اس کی گزرگاہ اور ٹھکانوں میں اس کا محافظ ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہر حال میں خاص کر اختلاف احوال کے وقت عارف باللہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے دسویں مناجات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا:

دسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِىْ قَدْ عَلِمْتُ بِاخْتِلَافِ الْاٰثَارِ وَ تَنَقُّلَاتِ الْاَطْوَارِ اَنَّ مُرَادَكَ مِنِّىْ اَنْ تَتَعَرَّفَ اِلَيَّ فِىْ كُلِّ شَىْءٍ حَتّٰى لَا اَجْهَلَكَ فِىْ شَىْءٍ

''اے میرے اللہ! میں نے آثار کے اختلاف اور حالات کی تبدیلیوں سے یہ جان لیا ہے کہ میری ذات سے تیری مراد (مقصود) یہ ہے کہ تو مجھ کو ہر شی میں اپنی پہچان کرائے (یعنی میں ہر شی میں تیری معرفت حاصل کروں) یہاں تک کہ میں کسی شی میں تجھ سے ناواقف نہ رہوں''۔

میں کہتا ہوں:۔ قدرت کے آثار صرف اس لئے مختلف ہوئے ہیں تاکہ تم قادر مطلق اللہ تعالیٰ کی عظمت کو پہچانو۔

آثار کا اختلاف:۔ اجسام میں مثلاً علوی وسفلی، جمادات و مائعات (رقیق چیزیں)، نورانی وظلماتی، آبی وناری۔ اور حیوانات میں مثلاً آدمیوں، اور چوپایہ جانوروں، اور چڑیوں، اور درندوں، اور وحشیوں، اور حشرات (زمین میں سوراخ کر کے رہنے والے جانور)۔

اور اعراض میں (عرض:۔ دوسری شی کی ذات سے قائم ہونے والی شی) مثلاً سفیدی، اور سیاہی اور سرخی، اور زردی، اور نیلا پن، اور اشہبی (سیاہی مائل سفیدی) اور ان کے علاوہ دوسرے رنگ۔

ان سب کے اندر اختلاف اس لئے ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کی وسعت اور اس کی ذات اقدس کی عظمت کو پہچانو۔

حالات کی تبدیلیاں: مثلاً جوانی اور ادھیڑ پن اور بڑھاپا، اور مرض وصحت اور محتاجی و دولتمندی، اور عزت وذلت، اور چھین لینا اور واپس کر دینا اور محروم کرنا اور عطا فرمانا، اور تنگی وکشادگی، اور جلال وجمال، اور حیات وموت وغیرہ اس لئے ہیں۔ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کو ان حالات میں سے ہر حال

اور ان آثار کے جنسوں کے اختلاف میں پہچانو۔ یہاں تک کہ تم ان میں سے کسی شی میں اللہ تعالیٰ سے جاہل و ناواقف نہ رہو۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مصنوعات کی جنسوں میں، اور اپنی قدرت کے احوال کے اختلاف میں اپنے بندوں کو اپنی پہچان کرائی ہے جس نے اس کو نہیں پہچانا۔ وہ جاہل رہا۔ اور جس نے اس کو پہچان لیا۔ وہ عارف ہو گیا۔

لہذا انسان اس وقت عارف کہلاتا ہے۔ جب کہ وہ کل اشیاء میں اس کے آثار کے اختلاف اور اس کے احوال کی تبدیلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔

لہذا وہ ذلت میں بھی اسی طرح اس کی معرفت حاصل کرے، جس طرح عزت میں اس کی معرفت حاصل کرے۔ اور سلب میں بھی اسی طرح اس کی معرفت حاصل کرے۔ جس طرح عطا میں اس کی معرفت حاصل کرے اور مرض میں بھی اسی طرح اس کی معرفت حاصل کرے، جس طرح صحت میں اس کی معرفت حاصل کرے۔ اور جلال میں بھی اسی طرح اس کی معرفت حاصل کرے، جس طرح جمال میں اس کی معرفت حاصل کرے۔ اسی طرح ان تمام اشیاء میں اس کی معرفت حاصل کرے جن کا بیان گزر چکا ہے۔ اور وہ ہر رنگ کے ساتھ رنگ بدلتا رہے۔ اور ہر حال کے ساتھ حال اختیار کرتا رہے۔ لہذا عارف وہی ہے جو تمام احوال کے ساتھ حال اختیار کرتا رہے۔ تا کہ وہ کل احوال کو حاصل کر لے۔ اور اشیاء کے ساتھ بدلتے رہنا، یہی ان کے ساتھ ادب ہے۔ اور یہی اشیاء میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خضوع (عاجزی کرنا) ہے۔

لیکن جو شخص صرف جمال میں معرفت حاصل کرتا ہے، اور جلال میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا عطا میں معرفت حاصل کرتا ہے، اور محرومیت میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا عزت میں معرفت حاصل کرتا ہے، اور ذلت میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا صحت میں معرفت حاصل کرتا ہے، اور مرض میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا عافیت میں معرفت حاصل کرتا ہے، اور محنت میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا دولتمندی میں معرفت حاصل کرتا ہے اور فاقہ میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ یا آسانی میں معرفت حاصل کرتا ہے اور سختی میں نہیں حاصل کرتا ہے۔ تو یقیناً وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ تم ایک عارف کے اس قول میں غور

کرو:۔

حَبِيْبِىْ وَ مَحْبُوْبِىْ عَلٰى كُلِّ حَالَةٍ

''وہ ہر حال میں میرا حبیب اور میرا محبوب ہے''

اور وہ شخص کتنا بدترین انسان ہے، جو خصوصیت اور معرفت اور غیر اللہ کی نفی کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے اسم پاک ''جلیل'' کے ساتھ اس کو اپنا تعارف کراتا ہے۔ تو وہ اس سے انکار کرتا ہے۔ اور بھاگ جاتا ہے۔ اور اپنے بندوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی یہی عادت ہے کہ جو شخص خصوصیت یا طاقت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ فوراً اس کی آزمائش کرتا ہے:۔

لِيَسْأَلَ الصَّادِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَاَعَدَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَاباً اَلِيْمًا

''تاکہ اللہ تعالیٰ صادقین سے ان کے صدق کے متعلق سوال کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

لہذا دعویٰ کرنے والے ذلیل و رسوا ہو جاتے ہیں۔ اور صادقین ثابت قدم ہو جاتے ہیں۔ اور مصنف رضی اللہ عنہ نے اس حال کے بعد کہ وہ بعض حالت میں معرفت حاصل کرتے تھے، اور بعض حال میں نہیں حاصل کرتے تھے۔ اس حقیقت کا مزہ چکھا۔ پھر وہ اس حقیقت میں ثابت و قائم ہو گئے۔ تو انہوں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ آثار کے اختلاف اور احوال کی تبدیلی میں یہی راز ہے۔ کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔ لہذا فرمایا:

اے میرے اللہ! بے شک میں نے جان لیا۔ یعنی قدرت کے آثار کے اختلاف اور اعراض و احوال کی تبدیلیوں سے میں نے یہ یقین کر لیا۔ کہ میری ذات سے تیرا مقصد یہ ہے کہ قدرت کے جنسوں کے اختلافات، اور ان کے احوال کی تبدیلیوں سے ہر شی میں تو مجھ کو اپنا تعارف کرائے۔ تاکہ میں ان میں سے کسی شی میں تجھ سے جاہل اور ناواقف نہ رہوں۔

حضرت مصنفؒ نے تنویر میں فرمایا ہے:۔ ہر حالت لامحالہ زائل ہونے والی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو مختلف احوال میں منتقل کرے۔ اور آثار کو اس کے اوپر مختلف کرتا رہے۔ تاکہ وہ ہر خاص حالت میں خاص تعارف کے ساتھ اس کو اپنا تعارف کراتا رہے۔ اور جو

شخص ایک ہی حال چاہتا ہے وہ کمال حاصل کرنا نہیں چاہتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے صرف اپنی معرفت چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

''اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ وہ میری عبادت کریں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:۔

''لِيَعْبُدُوْنَ'' کے معنی ''لِيَعْرِفُوْنَ'' کے ہیں'' تا کہ وہ مجھ کو پہچانیں'' یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

اور اللہ تعالیٰ کی معرفت صرف آثار کے اختلافات اور احوال کی تبدیلیوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ دوسرے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں فرمایا ہے:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ

''اور اس شخص کے لئے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا' دو جنتیں ہیں''۔

دو جنتوں میں ایک جنت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ اور وہ معارف کی جنت ہے۔ اور دوسری جنت ظاہری آرائش کی جنت ہے۔ اور جو شخص معارف کی جنت میں داخل ہو گیا۔ وہ پھر اس کے سوا کسی شے کا مشتاق نہیں رہ گیا۔

حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ لوگ دنیا سے چلے گئے لیکن انہوں نے دنیا کی سب سے بہترین اور پاکیزہ [illegible] کا مزہ نہیں چکھا۔ ان سے دریافت کیا گیا:۔ حضرت، وہ کون سی شے ہے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔

روایت ہے: ایک پتھر پایا گیا۔ جس پر قدرت کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔ جس شخص نے ہر شے کو پالیا لیکن اللہ تعالیٰ کو نہیں پایا تو اس نے کچھ نہیں پایا۔ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانے پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا۔ تو اس نے ہر شے کو پالیا۔ اور کوئی شے اس سے غائب نہیں ہوئی۔ اور جو شخص

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اس کو روزی کی تلاش، اور حرص کی تکلیف، اور اس کی وجہ سے دل کی پریشانی، اور اس کے متعلق فکر سے آرام وسکون حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر مخلوق روزی ہی کی فکر میں پریشان رہتی ہے۔

اور اگر بندہ قناعت کرے، تو وہ ایسی غنا سے سرفراز ہو جاتا ہے جس کے بعد کوئی محتاجی نہیں ہے۔ اور اس اللہ حیی وقیوم پر توکل کرنا جس کے لئے موت نہیں ہے۔ یہی وہ غنائے اکبر ہے، جس کو کوئی محتاجی کبھی لاحق نہیں ہوتی ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: بندے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ عافیت اور غنا پر بھروسہ کرے۔ نہ یہ مناسب ہے کہ وہ کسی ایسی حالت پر بھروسہ کرے، جس سے غیر اللہ خوش ہو۔ اور اسی درمیان کہ بندہ آرام میں ہوتا ہے، تم اچانک اس کو مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہو۔ اور اسی درمیان کہ وہ دولتمند ہوتا ہے، تم ناگہاں اس کو فقیر دیکھتے ہو۔ اور اسی درمیان کہ بندہ ہنستا ہوا ہوتا ہے، تم اس کو روتا ہوا دیکھتے ہو اور اسی درمیان کہ وہ خوشی نظر آتا ہے تم اس کو رنجیدہ دیکھتے ہو۔ اور اسی درمیان کہ وہ زندہ ہوتا ہے، تم اس کو مردہ دیکھتے ہو۔ جس شخص نے غیر اللہ پر بھروسہ کیا، یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شی کا سہارا لیا۔ وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

حکایت:۔ ایک شخص روزی کی تنگی کی وجہ سے بہت پریشان حال ہو گیا۔ روزی کی تلاش میں اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ وہ پریشان اور بدحواس ہو کر گھر سے نکلا۔ اور سیدھا اپنے منہ کے سامنے روانہ ہو کر میدان اور جنگل میں پہنچا۔ اس کو ایک ویران گرتا ہوا مکان ملا۔ ہوا نے اس کا بالو ادھر ادھر اڑا دیا تھا۔ اس مکان کی چہار دیواری کے اندر اس نے سنگ مرمر کا ایک مکان دیکھا۔ اس میں یہ حکمت کے اشعار لکھے ہوئے تھے:۔

لَمَّا رَاَیْتُکَ جَالِساً مُسْتَقْبِلاً اَیْقَنْتُ اَنَّکَ لِلْهُمُوْمِ قَرِیْنُ

''جب میں نے تم کو سامنے بیٹھا ہوا دیکھا۔ تو میں نے یہ یقین کر لیا کہ تم فکر میں مبتلا ہو''۔

مَالَا یُقَدَّرُ لَا یَکُوْنُ بِحِیْلَۃٍ اَبَدًا، وَمَا هُوَ کَائِنٌ سَیَکُوْنُ

''جو کچھ مقدر نہیں ہے۔ وہ کسی تدبیر سے کبھی حاصل نہ ہو گا اور جو ہونے والا ہے۔ وہ عنقریب

ہو کر رہے گا۔"

سَيَكُوْنَ مَا هُوَ كَائِنٌ فِيْ وَقْتِهٖ وَاَخُو الْجَهَالَةِ مُتَعَبٌ مَحْزُوْنٌ

"جو ہونے والا ہے وہ اپنے وقت پر ضرور ہوگا۔لیکن جاہل پریشان اور رنجیدہ ہوتا ہے"۔

يَجْرِى الْحَرِيْصُ وَلَا يَنَالُ بِحِرْصِهٖ شَيْئًا وَيَحْظٰى عَاجِزٌ وَ مَهِيْنٌ

"حریص دوڑ دھوپ کرتا ہے۔لیکن اپنے حرص سے کچھ نہیں پاتا ہے۔اور عاجز اور کمزور بغیر محنت کے پالیتا ہے"۔

فَدَعِ الْهُمُوْمَ تَعَرَّ مِنْ اَثْوَابِهَا اِنْ كَانَ عِنْدَكَ بِالْقَضَاءِ يَقِيْنٌ

"لہذا تم فکر کرنا ترک کر دو۔اور اس کے کپڑے اتار دو۔اگر تم کو قضاوقدر پر یقین ہے"۔

هَوِّنْ عَلَيْكَ وَكُنْ بِرَبِّكَ وَاثِقًا فَاَخُو الْحَقِيْقَةِ شَانُهُ التَّهْوِيْنُ

"آہستگی اختیار کرو۔اور اپنے رب پر بھروسہ کرو۔کیونکہ اہل حقیقت کی شان آہستگی اختیار کرنا ہے"۔

طَرَحَ الْاَذٰى عَنْ نَّفْسِهٖ فِيْ رِزْقِهٖ لِمَا تَيَقَّنَ اَنَّهٗ مَضْمُوْنٌ

"اہل حقیقت نے اپنی روزی کے بارے میں اپنے اوپر سے محنت و مشقت کو دور کر دیا۔کیونکہ انہوں نے یہ یقین کرلیا۔کہ روزی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔"

اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کے احسان کی وسعت کی طرف دیکھا۔پھر اپنی عاجزی اور محتاجی کی طرف دیکھا۔اس نے اپنی پیٹھ سے غم اور فکر کا بوجھ گرا دیا۔اور اپنے مولائے حقیقی کے علم اور نظر کو کافی سمجھ لیا۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کی طرف گیارھویں مناجات میں اشارہ فرمایا ہے:۔

گیارھویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِيْ كُلَّمَا اَخْرَسَنِيْ لُؤْمِيْ اَنْطَقَنِيْ كَرَمُكَ ، وَكُلَّمَا اَيْاَسَتْنِيْ اَوْصَافِيْ اَطْمَعَتْنِيْ مِنَنُكَ

''اے میرے اللہ! جب میری پستی وحقارت نے مجھ کو گونگا کر دیا تو تیرے کرم نے مجھ کو گویائی عطا فرمائی۔ اور جب میرے اوصاف نے مجھ کو مایوس کر دیا تو تیرے احسانات نے مجھ کو امید دلائی''۔

میں کہتا ہوں:۔ بندہ جب اپنے پست اور ذلیل اوصاف اور برے افعال کو دیکھتا ہے تو وہ اس بات سے شرمندہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے۔ لہذا اپنی حاجت بیان کرنے سے اس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے نفس کی اس ذلت وحقارت کو دیکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سزا پانے اور بھگا دیئے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم، اور احسان وبخشش کی وسعت کی طرف نظر کرتا ہے۔ تو سوال کرنے کے لئے اس کی زبان گویا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس عطا اور بخشش کا امیدوار ہو جاتا ہے جو اس کے لئے ہے۔

اور مصنفؒ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے:۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے لئے رجا یعنی امید کا دروازہ کھل جائے۔ تو تم اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ان احسانات کی طرف نظر کرو۔ جو اس نے تمہارے اوپر کئے ہیں۔ اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے لئے غم کا دروازہ کھلے تو تم اپنے اس گناہ اور بداعمالی کی طرف دیکھو جو تم نے کر کے اس کی بارگاہ میں بھیجا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جو شخص انصاف کی نظر سے اپنے نفس کی طرف دیکھے گا۔ تو وہ اس کو سزا اور عذاب ہی کے لائق پائے گا۔ یا تو غفلت اور کوتاہی کی بنا پر، یا حمد وشکر کی کمی کی بناء پر۔

اسی لئے بعض دعاؤں میں وارد ہوا ہے:

اَللّٰھُمَّ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ لَہٗ اَھْلٌ وَلَا تَفْعَلْ بِنَا مَا نَحْنُ اَھْلُہٗ

''اے میرے اللہ! تو ہمارے ساتھ وہ سلوک کر جس کا تو اہل ہے۔ اور ہمارے ساتھ وہ سلوک نہ کر جس کے ہم اہل ہیں''۔

عابدین میں سے بعض سختی اختیار کرنے والوں نے فرمایا ہے:۔ بندے کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنی ذات کو نجس کے مثل دیکھے۔ یعنی سراپا نجس سمجھے۔ اگر وہ دعا کرنے والوں کے ساتھ بیٹھے تو یہ خیال کرے کہ وہ لوگ اس کی وجہ سے قبولیت سے روک دیئے گئے ہیں۔ اور اگر وہ آگ کے انگارے پر سجدہ کرے۔ تو بھی وہ اپنے عمل کو قبولیت کے لائق نہ سمجھے اور اگر اس کا نفس انتہائی پاکیزہ ہو جائے تو بھی اس کو مدح و ثنا کے لائق نہ سمجھے اور اگر لوگ اس کے کپڑے کو تبرک کے طریقے پر چھوئیں یا چومیں تو وہ اپنے نفس کو اس کنواری لڑکی کی طرح تصور کرے جو شب زفاف میں اپنے شوہر کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بدکاری سے ذلیل ہو چکی ہے۔ جتنا لوگ اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور اس کی شان بڑھاتے ہیں اتنا ہی رسوائی کے خوف سے اس کا رنج بڑھتا ہے۔

میں کہتا ہوں: جس شخص کی اس کے نفس سے فنا، اور اس کے رب کے ساتھ بقا ثابت ہو گئی ہے۔ اس کی مدح و ثنا میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اب وہ ممدوح نہیں ہے۔ بلکہ اب ممدوح وہ ذات اقدس ہے جس کا فضل و کرم اس کے اوپر غالب ہے۔ اور جس شخص نے اپنا ہاتھ چومنے کے لئے بڑھایا لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کا ہاتھ نہیں تصور کیا۔ وہ اس کے حق میں منقطع ہونا ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ

''بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں''۔

اور بندے کا ہاتھ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا ہاتھ نہیں ہوتا ہے جب تک کہ زمین میں اس کی خلافت نہ ثابت ہو جائے۔ اور اس کی خلافت اس وقت تک ثابت نہیں ہوتی ہے جب تک کہ وہ عرش سے فرش تک کل موجودات پر غالب نہ ہو جائے۔ اور اس کے قلب میں کل موجودات زمین میں ایک حلقہ کی طرح نہ ہو جائے۔ لہذا جب وہ اس طرح ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کا خلیفہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ تو اب جو شخص اس کے ہاتھ پر بیعت

کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ○

''ان لوگوں کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے''۔ اور اسی کے بارے میں عارفین کے اشعار ہیں:

قَدِ اسْتَقَامَ عَلَى الْمِنْهَاجِ يَسْلُكُهُ وَلَمْ يَزِغْ حَائِدًا مِنْهُ وَلَا عَدَلَا

''وہ اس راستے پر مضبوطی سے قائم ہوا۔ جس راستے پر وہ چلتا ہے۔ اور اس سے ہٹ کر اور ادھر ادھر مائل ہو کر نہیں بہکا۔

مَنْ حَالُهُ يُعْمِرُ الدُّنْيَا بِظَاهِرِهِ وَقَلْبُهُ فِيْ اَعَالِيْ الْخُلْدِ قَدْ نَزَلَا

''اس شخص کا کیا حال ہوگا جو اپنے ظاہر یعنی جسم سے دنیا کو آباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا قلب خلد کے اعلیٰ مقامات میں اترا ہوا ہے''۔

وَاَبْصَرَ الْاَمْرَ يَجْرِيْ فِيْ مَسَالِكِهِ مِنْ اَوَّلِ النَّشْأُ حَتّٰى شَبَّ وَ اكْتَهَلَا

''اور اس نے پیدائش کی ابتداء سے جوانی اور بڑھاپے تک یہی دیکھا کہ حکم اپنے ہی راستوں پر جاری رہتا ہے''۔

وَنَاطَقَتْهُ الْبَرَايَا وَهِيَ صَامِتَةٌ وَمَيَّزَ الضِّدَّ وَالْاَرْوَاحَ وَالْعِلَلَا

''اور مخلوق نے اس سے کلام کیا۔ لیکن وہ خاموش ہے۔ اور اس نے ضد اور ارواح اور علتوں کو جدا جدا کر دیا''۔

وَاَظْهَرَ الصُّوْرَةَ الْعُلْيَا بِصُوْرَتِهَا الْحُسْنٰى وَمِنْ قَبْلُ كَانَتْ اُلْبِسَتْ ظُلَلَا

''اور اس نے اعلیٰ صورت کو اس کی بہتر صورت کے ساتھ ظاہر کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ پوشیدہ تھی''۔

ایک بزرگ نے فرمایا ہے:۔ میں نے ایک کالی لونڈی خریدی۔ جب رات ہوئی اور میں نے سونے کا ارادہ کیا۔ تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ کو شرم نہیں آتی ہے۔ آپ کا مولائے حقیقی نہیں سوتا ہے۔ اور آپ سو رہے ہیں؟ پھر وہ کھڑی ہوئی اور نماز پڑھنے لگی۔ جب میں

بیدار ہوا تو میں نے اس کو سجدہ کی حالت میں دیکھا۔ میں نے سنا کہ وہ اپنے سجدے کی حالت میں یہ کہہ رہی ہے: اے میرے رب! مجھ سے اپنی محبت کے طفیل تو مجھ کو عذاب نہ دے۔ میں نے اس سے کہا: تو نے غلط کہا ہے تم اس طرح کہو: اپنی ذات سے میری محبت کے طفیل تو مجھ کو عذاب نہ دے۔ جب اس نے سلام پھیرا تو کہا: اے میرے آقا! میں نے غلط نہیں کہا ہے۔ بلکہ صحیح کہا ہے اگر اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو وہ آپ کو نہ سلاتا اور مجھ کو کھڑا نہ کرتا۔ میں نے اس سے کہا: تم جاؤ۔ تم اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہو۔ اس نے کہا: یہ چھوٹی آزادی ہے اور بڑی آزادی ابھی باقی ہے۔

اور بعض عاشقین اپنی بعض مناجات میں کہتے تھے:۔ اے میرے اللہ! اگر تو مجھ کو ذلیل کرنا چاہتا، تو مجھ کو اپنی عبادت کی توفیق نہ عطا فرماتا۔ اور اگر تو مجھ کو رسوا کرنا چاہتا، تو اس وقت تو میری پردہ پوشی نہ فرماتا، جب میں نے تیری نافرمانی کی۔ اے میرے اللہ! اگر میرا گناہ نہ ہوتا، تو میں تیرے عذاب سے نہ ڈرتا۔ اور اگر تیرا کرم نہ ہوتا تو میں ثواب کی امید نہ کرتا۔

پھر مصنفؒ نے بارھویں مناجات میں ان اوصاف کو بیان فرمایا، کہ جب بندہ ان کی طرف نظر کرتا ہے تو وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کی رحمت سے مایوس کر دیتے ہیں۔

بارھویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ مَنْ کَانَتْ مَحَاسِنُهٗ مَسَاوِیَ فَکَیْفَ لَا تَکُوْنُ مَسَاوِیْهٖ مَسَاوِیَ؟ وَمَنْ کَانَ حَقَائِقُهٗ دَعَاوِیْ فَکَیْفَ لَا تَکُوْنُ دَعَاوِیْهٖ دَعَاوِیَ؟

''اے میرے اللہ! جس شخص کی نیکیاں بھی برائیاں ہوں، تو اس کی برائیاں کیوں برائیاں نہ ہوں گی؟ اور جس شخص کی حقیقتیں بھی دعوے ہوں، اس کے دعوے کیوں دعوے نہ ہوں گے؟

میں کہتا ہوں: انسان کی نیکیاں خلل اور نقصان سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی خلل اور نقص نہ ہو۔ تو ان کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرنی، اور ان کو اپنا فعل سمجھنا، اور ان کو اپنی قوت اور اختیار سے خیال کرنا ہی ان میں خلل اور نقص ہونے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ وہ بہ ظاہر نیکیوں کی شکل میں ہونے کے باوجود برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ لہذا جب اس کی نیکیاں بھی برائیاں ہیں۔ تو اس کی برائیاں کیوں برائیاں نہ ہوں گی؟

اور اسی طرح بندے کی حقیقتوں کا حال ہے۔ اور حقیقت: وہ مقامات اور منزلیں ہیں جن میں وہ ثابت ہوتا ہے۔ اور عارفین کے ذوق، اور عاشقین کے وجد و حال ہیں۔ جو دعوؤں کی آمیزشوں، اور خواہش کی چوریوں سے پاک نہیں ہوتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی چشم پوشی ان کے شامل حال نہ ہو۔

تو جب اس کی وہ حقیقتیں جن میں وہ ثابت و قائم ہوا ہے۔ اور اس کا ذوق اس کو حاصل ہوا ہے، دعویٰ کی آمیزشوں سے پاک نہیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ جب وہ ان کی نسبت اپنے نفس سے کر دیتا ہے، تو وہ سب کے سب دعوے بن جاتے ہیں۔ تو پھر اس کے خالی دعوے کیوں دعوے نہ ہوں گے؟

لہذا جب بندہ اس کو سمجھ لیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس بات پر شرم کرتا ہے کہ وہ کسی نیکی کو اپنی ذات سے منسوب کرے۔ یا اپنے لئے کوئی حقیقت ثابت کرے۔ اور اکثر اوقات وہ مخلوق کے سامنے ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ اور شک کرنے والے کے لئے سلامت رہ جانا ہی کافی ہے۔

حضرت ذوالنون رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ سے حیا، عبارت (بیان) کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اشارے کو باریک کر دیتی ہے۔

اور حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ سے حیا، قلب کو کھٹکھٹاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس میں دنیا کی کچھ محبت پاتی ہے، تو وہ واپس چلی جاتی ہے۔ اور حضرت ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! جب تو مجھ سے شرم کرتا ہے۔ تو میں لوگوں سے تیرے عیوب کو بھلا دیتا ہوں۔ اور زمین کے خطوں سے تیرے گناہوں کو بھلا دیتا ہوں۔ اور ام الکتاب سے تیری خطاؤں اور لغزشوں کو مٹا دیتا ہوں۔ اور میں قیامت کے دن حساب میں تجھ سے جرح نہ کروں گا۔

اور حضرت نبی کریم ﷺ نے حیاء کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے:

اَلْحَیَاءُ مِنَ اللّٰهِ :۔ اَنْ تَحْفَظَ الرَّاْسَ وَمَا وَعیٰ وَالْبَطْنَ وَمَا حَوٰی، وَ تَذْكُرُ الْقَبْرَ وَالْبِلیٰ، وَ تَتْرُكَ اَفْضَلَ زِيْنَةِ الدُّنْيَا، فَمَنْ فَعَلَ ذَالِكَ فَقَدِ اسْتَحٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ

''اللہ تعالیٰ سے حیا یہ ہے کہ تم اپنے سر کی اور اس کی متعلق اعضاء کی (آنکھ، کان، زبان کی) اور شکم کی اور اس سے متعلق اعضاء کی (قلب و معدہ و شرم گاہ کی) حفاظت کرو۔ اور قبر اور اس میں بوسیدہ ہو جانے کو یاد کرو۔ اور دنیا کی بہترین زینتوں کو ترک کر دو۔ لہٰذا جس نے ایسا کیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کی جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے''۔

روایت ہے: ایک شخص ایسے خطرناک مقام میں جہاں درندوں اور دوسری آفتوں کی کثرت تھی، سویا ہوا تھا۔ اور اس کی سواری کا جانور اس کے کنارے چر رہا تھا۔ اس سے کہا گیا: تم ایک خطرناک مقام پر سو رہے ہو۔ اس نے جواب دیا: ہم کو اس سے شرم آتی ہے کہ ہم غیر اللہ سے ڈریں۔ یہ کہہ کر وہ پھر سو گیا۔

حکمت میں مرقوم ہے: جو شخص اپنی اطاعت کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے شرم کرتا ہے۔ تو اس کی گناہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ اس سے شرم کرتا ہے۔ حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: حیا کیا شی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حیاء ایسی حالت ہے جو نعمت دیکھنے اور خطا و کوتاہی دیکھنے کے

درمیان پیدا ہوتی ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: بدبختی کی پانچ علامتیں ہیں:

اول:۔ حیا کی کمی۔ دوم: دل کی سختی سوم: آنکھ کی بے حسی

چہارم: دنیا کی رغبت پنجم: لمبی امید

پھر اگر نیکیاں برائیوں میں تبدیلی سے محفوظ، اور حقیقتیں دعووں سے پاک بھی ہوں۔ پھر بھی مشیت الٰہی کا معاملہ مبہم، اور سابقہ اور خاتمہ دونوں نامعلوم ہیں۔ لہذا کوئی شخص نہیں جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا کرے گا۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو تیرھویں مناجات میں بیان فرمایا۔

تیرھویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ حُكْمُكَ النَّافِذُ وَمَشِیْئَتُكَ الْقَاهِرَةُ ، لَمْ یَتْرُكَا لِذِیْ حَالٍ حَالاً وَلِذِیْ مَقَالٍ مقالاً

''اے میرے اللہ! تیرے نافذ حکم اور تیری غالب مشیت نے کسی حال والے کے لئے کوئی حال، اور کسی قال والے کے لئے کوئی قال باقی نہیں رکھا''۔

میں کہتا ہوں:۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس کی مخلوق میں نافذ ہے۔اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اور اس کی قضا کو کوئی رد نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔اور جو ارادہ کرتا ہے، وہ حکم دیتا ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ

''اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا ہے جو وہ کرتا ہے۔اور ان لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا''

اور یہی وہ شی ہے جس نے عارفین کے قلوب کو متحرک کیا۔تو وہ، نہ کسی حال سے مطمئن ہوئے، اور نہ انہوں نے کسی عمل اور قول پر اعتماد کیا۔ بلکہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے سامنے محتاج رہے۔اس لئے کہ انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم چشم زدن (آنکھ جھپکنے) یا اس سے بھی کم وقت میں نافذ ہو جاتا ہے اور اس کی مشیت ایسی غالب ہے کہ اس کو اس کے ارادہ کے مطابق نافذ ہونے سے نہ کوئی پھیرنے والا پھیر سکتا ہے، نہ کوئی روکنے والا روک سکتا ہے اور نہ کسی ولی اور عارف کی ہمت اس کو رد کر سکتی ہے۔لہذا وہ ایک لحظہ میں دور کو قریب، اور قریب کو دور کر دیتا ہے۔اور پست کو بلند اور بلند کو پست کر دیتا ہے۔اور ذلیل کو عزیز اور عزیز کو ذلیل کر دیتا ہے۔اور غنی کو فقیر اور فقیر کو غنی کر دیتا ہے۔اور تنگ دست کو فراخدست اور فراخدست کو تنگدست کر دیتا ہے۔اور بیمار کو تندرست

اور تندرست و بیمار کر دیتا ہے۔ لہٰذا کسی عقلمند کیلئے یہ کسی طرح درست ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حال یا مقام کی طرف مائل ہو۔ یا کسی علم اور عمل پر بھروسہ کرے۔ یا اپنی زبان اور قول کی روانی سے دھوکہ کھائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ)

''اور تم لوگ یہ جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہے۔ اور یہ کہ تم سب اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے''۔

ایک عارف نے فرمایا ہے: بندے کے لئے حال یا قال کس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ حال میں بھی عین قال ہے؟ وہ ایک حقیر ذرہ ہے۔ جو اپنے باطن کی طرف دوڑا۔ لیکن اس کے آخری حد تک نہیں پہنچا۔ لہذا اللہ کی قسم، بندہ اپنے باطن کے جفت تک نہیں پہنچا۔ تو وہ اپنے باطن کے طاق تک کیسے پہنچے گا۔ اس کے باطن کا طاق ایک جوہر ہے۔ جس نے ارادہ کیا تو وہ ظاہر ہوا۔ اور چمکا، تو وہ چھپ گیا۔ اور ٹھہرا، تو وہ متمکن ہوا۔ پھر وہ غیب کے سمندر کی گہرائی سے ظاہر ہوا۔ پھر اس سے قدرت نے غیرت کیا۔ پھر اس کو اس کی ذات کی سیاہی میں پالئے جانے، یا ظاہر ہو جانے، یا پہچان لئے جانے کے خوف سے چھپا دیا۔ لہذا اس کے لئے نہ کیفیت ہے، نہ مکان، نہ رحم، نہ عین، نہ وصل، نہ قطع۔

تشریح: عارف کے قول ''وہ حال میں عین قال ہے'' کا مفہوم یہ ہے:۔

ذرہ:۔ کے معنی، چھوٹی چیونٹی۔ اور جلہ:۔ کے معنی، عظیم (بڑا)۔

یعنی بندہ ظاہر میں چھوٹی چیونٹی، اور باطن میں عظیم یعنی بڑا ہے۔ وہ اپنی فکر کے ساتھ اپنے باطن کے معلوم کرنے کے لئے دوڑا۔ لیکن اس کی انتہا تک نہیں پہنچا۔

انتہا:۔ بہت چھوٹی سی شی میں اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائبات سے کنایہ ہے۔ تو جب وہ ایک بہت ہی چھوٹی شی کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔ تو انسان کی حقیقت تک کیسے پہنچ سکے گا؟

اسی لئے عارف نے فرمایا:۔ بندہ اپنے باطن کے جفت تک نہیں پہنچا۔

بندے کے باطن کا جفت:۔ اس کی ظاہری بشریت ہے۔ کیونکہ وہ عبودیت کا مقام ہے۔ جو ربوبیت کے اعتبار سے جفت ہے۔

اور اس کے باطن کا طاق: اس کی روحانیت ہے۔ کیونکہ وہ واحد ہے۔ اور عارف کے قول ''وہ جوہر ہے جس نے ارادہ کیا'' کا مفہوم یہ ہے۔

جوہر:۔ سے مراد، روح ہے۔ یعنی روح نے ظاہر ہونے کا ارادہ کیا۔ تو وہ ظاہر ہوئی۔ یعنی اس بشری جسم میں ظاہر ہوئی۔ اور اس کے انوار اس جسم پر چمکے۔ پھر چھپ گئے۔ لہذا اس کو اس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نے نہیں جانا۔ جس نے اس کو پیدا کیا۔ اور اس کو جسم میں پھونکا۔ پھر وہ اپنے پنجرے میں ٹھہری۔ تو اس میں متمکن یعنی مضبوطی سے قائم ہوئی۔

اور عارف کے قول ''پھر وہ غیب کے سمندر کی گہرائی سے ظاہر ہوا'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے ظاہر ہونے کی اصل جبروت کے سمندر سے ظاہر ہوئی۔ لہذا جب وہ عالم خلق میں غیب کے اسرار کے عالم ہونے کی حالت میں ظاہر ہوئی۔ اور غیب کے اسرار: بادشاہ کے اسرار ہیں۔ تو اس سے قدر کو غیرت لاحق ہوئی۔ اور اس کو یہ خوف ہوا کہ بادشاہ کے اسرار کو فاش نہ کر دے۔ تو اس کو پوشیدہ کر دیا۔ یعنی اس کو اس کی ذات کی سیاہی میں پوشیدہ کر دیا۔ پس اس کو ان اسرار سے، اس خوف سے کہ وہ پالئے جائیں یا ظاہر ہو جائیں یا پہچان لئے جائیں، محجوب کر دیا۔ لہذا روح کے لئے نہ کیفیت ہے نہ مکان نہ رحم، بلکہ وہ در یتیم (بڑا اور قیمتی موتی جو سیپ میں اکیلا ہوتا ہے)۔ نہ اس کے لئے ذات ہے، جس سے وہ پہچانی جائے۔ نہ اس کے لئے کسی شی سے وصل ہے نہ جدائی۔ ہمارا رب اس سے بلند ہے کہ کوئی شی اس سے متصل ہو۔ یا وہ کسی شی سے متصل ہو۔

اور عارف کے قول ''وہ حال میں بھی عین قال ہے'' کا مفہوم یہ ہے کہ بندے کا معاملہ کاف اور نون کے درمیان ہے۔ لہذا وہ عین قول ''کن'' ہے۔ پس قال سے مراد قول ''کن'' ہے لہذا حال میں اسی حکم کا تصرف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ایک عارف کے اشعار ہیں۔

فَالْكُلُّ يَطْلُبُ نُعْمٰى حَيْثُ ضَلَّ وَمَا يَحْظٰى بِنُعْمٰى سِوَى فَرْدٍ بِاَفْرَادِ

''پس ہر شخص نعمٰی کو اس طرح تلاش کرتا ہے گویا کہ وہ گم ہو گیا ہے۔ اور نعمٰی تک سب لوگوں میں سے

صرف ایک شخص پہنچے گا۔"

مَهْلاً عَلَيْكَ وَعُدْمِنْ حَيْثُ جِئْتَ وَسَلْ

فِي الدَّارِ يَيْنَ غَداً عَنْ سَاكِنِ الْوَادِيْ

"تم ٹھہرو اور اس جگہ واپس جاؤ جہاں سے آئے ہو۔ اور آیندہ کل روانہ ہونے والوں کے بارے میں اس وادی کے رہنے والوں سے دریافت کرو"۔

عَسَاكَ تَلْقِیْ خَبِيْرًا عَالِمًا بِهِمْ

يُنْبِيْكَ عَنْهُمْ وَلَمْ يُلْمِمْ بِمِيْعَادِ

"ممکن ہے کہ تمہاری ملاقات کسی ایسے واقف کار شخص سے ہو جائے جو ان کو جانتا ہو۔ اور وہ تم کو ان کی خبر دے۔ اگرچہ وہ مقررہ وقت کو نہ جانتا ہو"۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے: اللہ کی قسم، سعدیٰ کے پانے میں وہی شخص کامیاب ہوا جو تقدیس کی سرزمین میں سرگرداں رہا۔ اور خسیس و نفیس سے پاک ہو گیا۔ تو اس کا جسم اور اس کی روح نافرمان ہو گئی۔ اور اس کا نفس فرعون بن گیا۔ لہذا اس کا کلام خاموشی ہے۔ اور اس کی خاموشی کلام ہے۔ اور اس کے حال کی زبان کل مخلوقات سے خطاب کرتی ہے۔ لہذا اگر اس کے سامنے اس کے حجرے کے دروازے پر شہادت پیش کی جائے اور موت اسی حجرے کے اندر بخوبی مہر بند ہو تو وہ شہادت کو چھوڑ دے گا، اور موت کو مکمل طریقے پر اختیار کر لے گا۔ کیونکہ اس کا عمل یقین پر ہے۔ شک پر نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

اس شخص کی زندگی کتنی بہتر اور پاکیزہ ہے، جس کو دعوت دی گئی تو اس نے قبول کیا۔ اور لبیک کہا۔ اور اس شخص کا مرتبہ کتنا بلند ہے، جس نے دروازے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اس کا مرتبہ کتنا پست اور حقیر ہے جو بارگاہ سے دور کر دیا گیا۔ اس شخص کی قیمت کتنی کم ہے، جو غفلتوں میں سر کے بل پڑا ہوا ہے۔ جب طبیعت غالب ہو جاتی ہے تو تدبیر کام نہیں کرتی ہے اور جس کے لئے قضا پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے اس کو وسیلہ فائدہ نہیں پہنچاتا ہے۔ لہذا وہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، جو عطا فرماتا اور محروم کرتا ہے۔ اور نقصان اور نفع پہنچاتا ہے۔

عنایت الٰہی نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو فارس سے کھینچ لیا۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ ملک حبشہ سے بلا لئے گئے۔ اور ابو طالب حقیقت کے دروازے پر رہتے ہوئے توفیق ربانی سے محروم رہ گئے۔ حکم واقع ہو چکا۔ اور امر نافذ ہو گیا۔ اور مشیت سبقت کر چکی۔ اور قلم خشک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَو اَنفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعاً مَا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنِ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ

''اگر آپ زمین کی تمام چیزوں کو خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت نہ پیدا کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان محبت پیدا کر دی۔

اور جس طرح اس کا نافذ حکم احوال پر اعتماد کو منہدم کر دیتا ہے۔ اسی طرح اس کا غالب انصاف اعمال پر اعتماد کو منہدم کر دیتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو چودھویں مناجات میں بیان فرمایا:۔

چودھویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِىْ كَمْ مِّنْ طَاعَةٍ بَنَيْتُهَا وَ حَالَةٍ شَيَّدْتُّهَا، هَدَمَ اِعْتِمَادِىْ عَلَيْهَا عَدْلُكَ بَلْ اَقَالَنِىْ مِنْهَا فَضْلُكَ

''اے میرے اللہ! بہت سی عبادتوں کی میں نے بنیاد رکھی۔ اور بہت سی حالتوں کو میں نے مضبوط کیا۔ مگر تیرے عدل نے ان پر میرے اعتماد کو منہدم کر دیا۔ بلکہ تیرے فضل نے مجھ کو ان سے بے زار کر دیا''۔

میں کہتا ہوں: بندے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی طاعت کی طرف نظر کرے اگر چہ وہ بہت بڑی ہو۔ اور نہ یہ مناسب ہے، کہ وہ اپنے کسی حال کو بہتر سمجھے اگر چہ وہ بہت بہتر ہو۔ کیونکہ پرکھنے والا بصیر ہے، اور محافظ پوشیدگیوں سے خبیر (باخبر) ہے۔

پس بہت سی عبادتیں ایسی ہیں جو اپنے کرنے والے کی نظر میں پہاڑوں کی طرح بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوتی ہیں اور بہت سے احوال ایسے ہیں جو صاحب احوال کے نزدیک خالص اور صاف ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدخول ہوتے ہیں۔ اور مصنفؒ کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے: کوئی کبیرہ، کبیرہ نہیں ہے، اگر اس کا فضل تمہارے سامنے آئے۔ اور کوئی صغیرہ صغیرہ نہیں ہے اگر اس کا عدل تمہارے سامنے آئے۔

لہذا جس شخص کے سامنے اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ آئے اس کے سب کبیرہ صغیرہ ہو جاتے ہیں۔ اور جس شخص کے سامنے وہ اپنے انصاف کے ساتھ آئے اس کے سب صغیرہ کبیرہ ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے مصنفؒ نے اس مقام پر فرمایا: بہت سی عبادتوں کی میں نے بنیاد رکھی۔ یعنی میں نے بہت سی عبادتیں کیں۔ لیکن تیرے انصاف کی طرف میری نظر نے ان پر میرے اعتماد کو منہدم کر دیا۔

لہذا جب میں نے تیرے انصاف کی طرف دیکھا تو میرے اعمال ختم ہو گئے۔ اور میرے احوال نیست و نابود ہو گئے۔ اور بہت سی حالتوں کو میں نے مضبوط اور بلند کیا۔ لیکن جب میں نے تیرے انصاف اور تیری سخت جرح پر غور کیا۔ تو وہ حالتیں منہدم اور فنا ہو گئیں۔ بلکہ تیرے فضل اور تیری ہدایت اور تیری توفیق نے مجھ کو ان سے اس طرح بے زار کر دیا کہ ان کی نسبت مجھ سے ختم ہو گئی۔ لہذا میرے پاس نہ کوئی عبادت باقی رہی نہ کوئی حال باقی رہا۔ بلکہ وہ اللہ فاعل ومختار بزرگ و برتر کی طرف لوٹ گیا۔

لہذا بندے پر واجب ہے کہ وہ اپنے علم اور عمل اور حال اور نفس اور روح اور اختیار اور قوت سے نکل جائے۔ اور اپنے آقائے حقیقی کے سامنے محتاج ہو کر باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ

''خریدا ہوا غلام جو کسی شی پر اختیار نہیں رکھتا ہے''۔

ایک عارف نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی قسم، فنا کے سمندر میں اس شخص نے غوطہ لگایا، جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے''

وہ شخص حقائق کے سمندر میں کیسے غوطہ لگا سکتا ہے، جس کا علم اور عمل آمیزش اور کھوٹ سے پاک اور خالص نہ ہو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے صراف محمدی ﷺ کسوٹی لئے ہوئے ساحل پر موجود ہیں۔ وہ اس شخص کو واپس کر دیتے ہیں جو مخلص نہیں ہوتا ہے؟ اور اخلاص، ہے کہاں؟

یہ اس شخص کے لئے ہے جو سمندر کے ساحل تک پہنچ گیا۔ پھر اس شخص کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ جو اس کا انکار کرتا ہے۔ اور تصدیق نہیں کرتا ہے۔ یا اس کی طرف بغیر استقامت کے احکام سے منحرف ہو کر سفر کرتا ہے؟

جیسا کہ ایک عارف نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے:

لَيْسَ مَنْ بَاتَ قَرِيراً عَيْنُهُ مِثْلَ مَنْ اَصْبَحَ فَقْرًا دَارِسًا

''جس شخص نے رات اس حال میں گزاری کہ اس کی آنکھ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ٹھنڈی تھی۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے۔ جس نے ختم ہونے والی محتاجی کی حالت میں صبح کی''۔

لَيْسَ مَنْ اُكْرِمَ بِالْوَصْلِ كَمَنْ ظَلَّ يَهْدِىْ بِلَعَلَّ وَعَسٰى

''جس شخص کو وصل کی عزت عطا فرمائی گئی۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو شاید اور ممکن کے ساتھ ہدایت پاتا ہو''۔

لَيْسَ مَنْ اُلْبِسَ اَثْوَابُ التُّقٰى مِثْلَ الَّذِىْ اُلْبِسَ ثَوْباً دَنِسًا

''جس شخص کو تقویٰ کے لباس پہنائے گئے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے۔ جس کو نجس کپڑا پہنایا گیا''۔

لَيْسَ مَنْ سِيْرَبِهٖ مِثْلَ الَّذِىْ بَاتَ يَرْعَى الْحِمٰى مُبْتَئِسًا

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سیر کرائی گئی۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے۔ جس نے رنجیدہ ہو کر چراگاہ کی حفاظت کرتے ہوئے رات گزاری''۔

لَيْسَ مَنْ شَاهَدَ صُبْحاً وَاضِحاً مِثْلَ الَّذِىْ شَاهَدَ لَيْلاً غَلِسًا

''جس شخص نے روشن صبح کا مشاہدہ کیا۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے۔ جس نے اندھیری رات کا مشاہدہ کیا''۔

لَيْسَ مَنْ بُوِّئَ رَوْضَاتِ الْحِمٰى مِثْلَ الَّذِىْ اَسْكَنْ قَفْراً يَا بِسًا

''جو شخص سبزہ زار باغوں میں ٹھہرایا گیا۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو خشک روٹی کھا کر رہا۔

لَيْسَ مَنْ اَشْبَهَ غُصْناً يَا نِعًا مِثْلَ مَنْ اَشْبَهَ عُوْداً يَا بِسًا

''جو شخص پختہ پھل لگے ہوئے شاخ کے مشابہ ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو خشک لکڑی کے مشابہ ہے''۔

اور عمل پر عدم اعتماد سے عمل کا ترک لازم نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ بندے پر یہ واجب ہے کہ وہ عمل پر مداومت کرے۔ لیکن اس پر اعتماد نہ کرے۔ اور اگر وہ بالفعل عمل پر مداومت نہ کر سکے تو محبت اور ارادے کے ساتھ عمل پر مداومت کرے۔ جیسا کہ مصنف نے اس کو پندرہویں مناجات میں بیان فرمایا:

پندرھویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰھِیْ اِنَّکَ تَعْلَمُ وَاِنْ لَّمْ تَدُمِ الطَّاعَةُ مِنِّیْ فِعْلاً جَزْماً فَقَدْ دَامَتْ مَحَبَّةً وَعَزْماً

''اے میرے اللہ! بے شک تو جانتا ہے کہ اگر چہ مجھ سے عملی طور پر دائمی عبادت نہیں ہو سکی۔ لیکن عبادت کی محبت اور ارادہ ہمیشہ قائم رہا''۔

میں کہتا ہوں: بندے پر اپنے رب کی عبادت میں یہ واجب ہے کہ فعل اور محبت اور ارادہ کے ساتھ ہر لحظہ اور ہر وقت عبادت ہو۔ لیکن اگر وہ اس پر قادر نہ ہو۔ (اگر وہ ایسا نہ کر سکے) تو اس کو چاہیے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کا ارادہ کرے۔ اور نیک اعمال کی نیت کرے۔ کیونکہ مومن کی نیت اس کے عمل سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْراً یُّؤْتِکُمْ خَیْراً مِّمَّا اُخِذَ مِنْکُمْ

''اگر اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں نیکی معلوم کرے گا تو وہ تم کو اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے''

بعض عارفین نے فرمایا ہے: فعل جزم: عمل اور محبت کا واقع ہونا ہے۔ اور عزم:۔ عمل کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور بہت سے متوجہ ہونے والوں نے عمل نہیں کیا۔ اور بہت سے کوشش کرنے والے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن عزم میں حقیقتیں ظاہر ہوئیں۔ اور عزم ہی کے ساتھ شریعتیں ائیں۔ اور بندے پر صرف قصد اور کوشش اور عزم واجب ہے۔ لیکن اس کا اثر کرنا یا آگے بڑھنا، تو کبھی مقدر ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ہوتا ہے:

(وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهٖ) ''اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم پر غالب ہے''۔

اور عزم سے مراد: قصد اور نیت ہے۔ اور وہ مطلوبہ کام کے لئے قلب کا متوجہ ہونا ہے۔

اور تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ علم کی پیروی اختیاری ہے اور حال کی پیروی اضطراری (بے

اختیاری) ہے۔ لہذا جب تک بندے کے پاس کچھ اختیار باقی رہتا ہے اس وقت تک علم کی اتباع اس کے اوپر واجب ہوتی ہے اور یہی سلوک کا مقام ہے۔ لیکن اگر حال غائب ہو جائے تو اس کی اتباع واجب ہو جاتی ہے اور یہ جذب کا مقام ہے۔

اور اس کی مثال سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا واقعہ ہے۔ جب وہ اپنا کل مال لے کر حاضر ہوئے۔ تو حضرت رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:

"مَا تَرَكْتَ لِاَهْلِكَ" تم نے اپنے اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے جواب دیا:

تَرَكْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ "میں نے ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑا ہے"۔

اور حضرت رسول کریم ﷺ کے اس قول کی طرف توجہ نہیں کی جو آنحضرت ﷺ نے تشریع کے حال میں فرمایا ہے:

لَاَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ

"یہ کہ تم اپنے وارثوں کو دولتمند چھوڑو، اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑو۔ کہ وہ ضروری خرچ کے لئے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں۔"

لہذا جب حال علم پر غالب ہو جاتا ہے تو حکم حال کا ہوتا ہے۔

لہذا غور کرو کہ عارفین محققین کے نزدیک اس مقام کی شان کتنی عزیز اور اس کا مرتبہ کتنا اعلیٰ ہے۔

اسی کے بارے میں ایک عارف کے اشعار ہیں:

وَحَاشَا هُمْ مِنْ قَادِحٍ فِيْ طَرِيْقِهِمْ وَ مَطْلُوْبُهُمْ اَسْنَى الْمَطَالِبِ كُلِّهَا

"اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے طریقے میں نکتہ چینی کرنے والے سے دور رکھا ہے۔ اور ان کا مقصد کل مقصدوں سے اعلیٰ ہے"۔

حَبَاهُمْ بِتَائِيْدٍ وَ عِزٍّ وَ عِصْمَةٍ فَاَكْرِمْ بِاَوْصَافٍ لَهُمْ مَا اَجَلَّهَا

''اللہ تعالیٰ نے ان کو تائید اور عزت اور عصمت سے قریب کیا۔ لہذا تم ان کے اعلیٰ اور پاکیزہ اوصاف کی بناء پر ان کی تعظیم وتکریم کرو''۔

اور تم یہ جان لو کہ نیکی کی نیت کرنے والا نیکی کرنے والا ہے۔ اور وصول کی نیت کرنے والا واصل (پہنچنے والا) ہے۔ اور بندے کے اوپر صرف کوشش کرنی واجب ہے۔ لہذا جب اس نے اپنی کوشش صرف کی۔ اور اپنا مقصد حاصل کر لیا تو وہ اور واصل دونوں برابر ہیں۔

اور ہمارے شیخ الشیوخ فرماتے تھے: جس شخص نے اس حال میں انتقال کیا کہ وہ راستے میں تھا۔ تو تحقیقی طور پر موت کے بعد اس کو ولایت حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے۔ اور انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ تو وہ لوگ تم میں سے ہیں''۔

اور حدیث شریف میں ہے:

مَنْ مَّاتَ فِی طَرِیْقِ الْحَجِّ فَھُوَ حَاجٌّ، وَمَنْ مَاتَ فِیْ طَرِیْقِ الْجِھَادِ فَھُوَ مُجَاھِدٌ

''جو شخص حج کے راستے میں مر گیا وہ حاجی ہے۔ اور جو شخص جہاد کے راستے میں مر گیا وہ مجاہد ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِراً اِلَی اللہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللہِ

''اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف مہاجر ہو کر نکلے پھر اس کو موت آ جائے۔ تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر لازم ہو گیا''۔

اور حدیث شریف میں ہے:

مَنْ مَاتَ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ ، اَیِ النَّافِعَ، لَیْسَ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا دَرَجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ

''جو شخص علم نافع طلب کرنے کی حالت میں مر گیا۔ اس کے درمیان اور نبوت کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہے''۔

وَمَنْ تَوَجَّهَ لِاَمْرٍ وَلَمْ يُدْرِكْهُ فَكَاَنَّمَا اَدْرَكَهٗ

''اور جس شخص نے کسی کام کی طرف توجہ کی۔ لیکن اس کو حاصل نہیں کر سکا۔ تو گویا اس نے اس کو حاصل کر لیا''۔ دونوں ایک ہی حدیث کے ٹکڑے ہیں۔

اور ان امور کی ابتداء میں مشقتوں پر صبر و برداشت کرنا، اور خواہش اور آرام سے نفس کو روکنا ضروری ہے۔ اسی لئے جہاد کا نام جہاد رکھا گیا ہے۔ اور ارادہ کرنے والا صراط مستقیم تلاش کر لینے کے بعد دروازہ تلاش کرتا ہے۔ پھر جب وہ دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اندر داخل ہونے کی خواہش کرتا ہے اور جب وہ اندر داخل ہو گیا۔ تو پہنچ گیا۔ اور جب پہنچ گیا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ

''تو کوئی شخص نہیں جانتا ہے کہ ان کے لئے کیا آنکھ کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے'' (جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے وہ کوئی شخص نہیں جانتا ہے)

اسی سے متعلق ایک عارف کے اشعار ہیں:

مَنْ فَاتَهٗ طَلَبُ الْوُصُوْلِ وَنَيْلُهٗ ۔۔۔ مِنْهُ فَقُلْ لَّهٗ مَا الَّذِيْ هُوَ يَطْلُبُ

''جس شخص سے وصول کی طلب اور وصول کا پانا فوت ہو گیا۔ تم اس سے دریافت کرو:۔ اب وہ کیا چاہتا ہے''۔

حَسْبُ الْمُحِبِّ فَنَاءُهٗ عَمَّا سِوٰى ۔۔۔ مَحْبُوْبِهٖ اِنْ حَاضِرٌ اَوْ غَائِبٌ

''محبت کرنے والے کے لئے اپنے محبوب کے ماسویٰ سے فنا ہو جانا کافی ہے۔ خواہ وہ حاضر ہو یا غائب ہو''۔

اور حقیقت کی حیثیت سے عبادت کے لئے بندے کی نیت اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن شریعت کی حیثیت سے وہ اس کیلئے حکم دیا گیا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے سولھویں مناجات میں اس سے آگاہ فرمایا:

سولہویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ كَیْفَ اَعْزِمُ وَاَنْتَ الْقَاهِرُ؟ اَمْ كَیْفَ لَا اَعْزِمُ وَاَنْتَ الْاٰمِرُ؟

''اے میرے اللہ! میں عبادت کے لئے کیسے ارادہ کروں۔ جب کہ تو غالب ہے؟ یا میں کیسے ارادہ نہ کروں۔ جب کہ تو نے حکم دیا ہے''؟

میں کہتا ہوں: عبادت کی محبت، اور اس کی نیت، اور اس پر عمل، حقیقتاً بندے کی قدرت اور اس کا فعل نہیں ہے۔ لیکن وہ شرعاً اس کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ تا کہ حجت قائم ہو جائے۔ اور اعتدال کا راستہ ظاہر ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ اَجْمَعِیْنَ

''آپ کہہ دیجئے: کامل حجت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا فرماتا''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

''بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے برابر ظلم نہیں کرتا ہے''۔

پس جس نے باطن کی طرف دیکھا۔ اس نے بندے کو مجبور پایا۔ اور جس نے ظاہر کی طرف دیکھا۔ اس نے اس کو غیر معذور پایا۔ لہذا انسان پر اور خصوصاً عارف پر یہ واجب ہے کہ وہ حقیقت کی آنکھ سے ان امور کے باطن کی طرف دیکھے۔ اور مخلوق کو معذور سمجھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ صاحب اختیار جسموں کے اندر مجبور ہیں۔ اور شریعت کی آنکھ سے ان امور کے ظاہر کی طرف دیکھے۔ لہذا وہ ربوبیت کا راز چھپانے، اور عبودیت کے وظائف ظاہر کرنے کے لئے حقوق کو نافذ اور حدود کو قائم کرے۔ لیکن ایسا وہ مہربانی اور نرمی کے ساتھ کرے۔ اس کا قلب اس کے اوپر مہربان ہو۔ اور اس

کا ظاہر اس کے اوپر سخت ہو۔ جس طرح غلام اپنے آقا کے بیٹے کو ادب کی تعلیم دیتا ہے۔

اور اس مناجات کا یہی مفہوم ہے: یعنی میں عبادات کے لئے کیسے ارادہ کروں۔ اور اس کے لئے کیسے عہد کروں۔ جب کہ میرے اوپر تو غالب ہے؟ لہذا اس کے کرنے کی طاقت اس حال میں مجھ کو نہیں ہے۔ کہ تو مجھ کو اس کے کرنے سے مغلوب کر دے یعنی روک دے۔ اور یہی حقیقت ہے۔

اور میں عبادت کے لئے کیسے ارادہ نہ کروں جب کہ تو نے مجھ کو اس کا حکم دیا ہے۔ تو اگر میں اس کے کرنے کا ارادہ نہ کروں تو تو مجھ پر عذاب کرے گا۔ اور یہی شریعت ہے۔

لہذا واجب یہ ہے کہ میں ارادہ کروں، اور یہ دیکھوں کہ تو کیا کرتا ہے۔ پھر اگر تو مجھ کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، تو تو اہل تقویٰ اور اہل مغفرت (تقویٰ اور مغفرت کا مالک) ہے۔

اور اگر تو مجھ کو عمل کرنے کی توفیق نہ عطا فرمائے تو تو معاف کرنے اور معذرت قبول کرنے کا مالک ہے۔ اور تو ہی فاعل حقیقی اور مختار مطلق ہے۔ لہذا حکم بھی تیرا ہی حکم ہے۔ اور بندہ بھی تیرا ہی بندہ ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا

''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے''۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَهَدَى النَّاسَ

''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو لوگوں کو ہدایت عطا فرماتا''

حضرت شطیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مصنف نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ حقیقت اور شریعت کے درمیان جمع کے مقام کی طرف مریدین کی رہنمائی کریں۔ اس لئے کہ شرعاً بندے کی نیت اس سے مطلوب ہے۔ اور وہ نتیجہ جو اس سے سلب کر لیا گیا ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اور دونوں یعنی شریعت اور حقیقت کے درمیان وہی شخص ثابت قدمی سے قائم ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ قائم کرے۔

اسی لئے مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو متضاد اشیاء کے طالبین پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ یہ بشر کی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ انسان وجود کا نسخہ ہے اور کل موجود سے افضل واشرف

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اپنی حکمت کے اسرار میں سے ایسی حکمت ودیعت فرمائی ہے۔ جو دو متضاد اشیاء میں محبت پیدا کرتی ہے۔ اور دو ہم جنس اشیاء کو جمع کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ

''اللہ تعالیٰ نے دو ایسے دریاؤں کو جاری کیا جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ان کے درمیان ایک برزخ (حائل) ہے۔ دونوں اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے ہیں۔''

لہذا جس شخص کے جسمانی اعضاء پر برزخیت کا اثر ظاہر ہوا، اس نے دنیا اور آخرت کے اعمال پر عمل کیا۔ اور جس شخص کے قلب پر برزخیت کا اثر ظاہر ہوا، اس نے آخرت کے اعمال اور بارگاہ قدس کے مشاہدے کے درمیان جمع کیا۔ اور اس کا نور اس پر روشن ہوا۔ اور جس شخص کی روح پر برزخیت کا اثر ظاہر ہوا، اس نے مشاہدہ اور محبت کے درمیان جمع کیا۔

پھر مصنفؒ نے فرمایا: تم یہ جان لو، کہ اجسام مر جاتے ہیں اور وہ پھر اٹھائے جائیں گے، اور زندہ کئے جائیں گے۔ اور یہی حال نفوس اور ارواح کا ہے۔

پس اجسام کی موت:۔ دنیا سے نکلنے اور محلوں کی قبروں سے تبدیلی کے وقت واقع ہوتی ہے۔

اور نفوس کی موت:۔ فوائد سے نکلنے اور فوائد کی حقوق میں تبدیلی کے وقت ہوتی ہے۔

اور ارواح کی موت:۔ نفسانی خیالات سے نکل کر اپنے نورانی عالم میں پہنچنے کے لئے ملاء اعلیٰ کی طرف ان کا رجوع کرنا ہے۔

لہذا جب نفس کی نظر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے اور روح کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور مخلوق فنا ہو جاتی ہے۔ اور صرف اللہ حی و قیوم باقی رہ جاتا ہے۔ تو ظاہر باطن کے ساتھ اور باطن ظاہر کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرف سے مشاہدہ متعین ہو جاتا ہے۔ اور ماسوی اللہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔

''كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ'' اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے سوا ہر شی ہلاک ہونے والی ہے''۔

اور اس وقت تجرید کا ہاتف تفرید کے مقام سے آواز دیتا ہے:۔

(لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ) ''آج کس کی بادشاہت ہے''۔

تو بشریت کے عالموں اور مخلوقیت کی صورتوں میں سے کوئی جواب دینے والا اس کو جواب نہیں دیتا ہے۔ (کیونکہ کوئی شی باقی ہی نہیں رہتی ہے) تو وہ اپنی ذات کو خود ہی جواب دیتا ہے۔

(لِلّٰهِ الْوَاحِدُ الْقَهَّارِ) ''آج صرف اللہ واحد قہار کی بادشاہت ہے''۔

اس مناجات کا مختصر مفہوم یہ ہے:۔ اللہ تعالیٰ نے عبادت اور اس کی نیت کا حکم اس لئے دیا ہے کہ وہ اس کی طرف اس کی مقرر کردہ حکمت اور شریعت کے مطابق وصول کا سبب ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو سترھویں مناجات میں بیان فرمایا:

سترہویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ تَرَدُّدِیْ فِی الْاٰثَارِ یُوْجِبُ بُعْدَ الْمَزَارِ ، فَاجْمَعْنِیْ عَلَیْكَ بِخِدْمَةٍ تُوْصِلُنِیْ اِلَیْكَ

''اے میرے اللہ! مخلوقات میں میرا تردد، تیری زیارت گاہ سے دور ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ لہذا تو مجھ کو ایسی خدمت کے ساتھ اپنی طرف جمع کر (یعنی ایسی خدمت کی توفیق عطا فرما) جو مجھ کو تیرے پاس پہنچا دے''۔

میں کہتا ہوں: مخلوقات میں تردد: اس کے ثابت اور نفی کرنے میں شک اور فکر ہے۔ اور یہ مستشرفین یعنی سائرین کا حال ہے۔ پس جب وہ اس کو مستقل طور پر ثابت کرتا ہے تو وہ فرق یعنی بعد (دور ہونا) کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس کی نفی کرتا ہے۔ تو وہ جمع کی حالت میں ہوتا ہے۔ لہذا وہ ہمیشہ اس طریقے پر جمع کی طلب کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کی اثبات اور نفی میں اس کو کوئی تردد نہ رہے۔ اور یہی بقاء کا مقام ہے۔

لہذا مخلوق کو ہمیشہ نفس کے ساتھ ثابت کرنا، یہ ہمیشہ بعد ہے۔ اور یہ عوام میں سے اہل حجاب کا مقام ہے۔

اور مخلوق کی ہمیشہ نفی کرنا، یہ اہل فنا و جذب میں سے اہل جمع کا مقام ہے۔

اور مخلوق کی نفی کرنا، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ثابت کرنا، یہ حکمت اور قدرت کے وظائف کے ساتھ قائم رہنے، اور حقیقت و شریعت کے درمیان جمع ہونے کے اعتبار سے اہل بقاء کا مقام ہے۔

اور یہ مناجات صرف اہل استشراف یعنی سائرین ہی کے لائق ہے۔ اور اگر مصنفؒ سائرین اور واصلین اور متمکنین کی مناجاتیں بیان کرنے کا ارادہ کرتے۔ تو وہ اس مناجات کے بعد جو

سائرین کے لئے ہے یہ فرماتے:

اے میرے اللہ! انوار میں میری سیر، مسار (جس کی طرف سیر کی جائے) کے قرب کا سبب ہوتی ہے۔ لہذا تو مجھ کو ایسی فکر کے ساتھ اپنی طرف جمع کر جو مجھ کو تیرے پاس پہنچا دے۔ اور یہ رسوخ وتمکین سے پہلے واصلین کی مناجات ہے۔

پھر یہ فرماتے:۔ اے میرے اللہ! اسرار میں میری سیر، مسار کے وصل کا سبب ہوتی ہے۔ لہذا تو مجھ کو ایسی نظر کے ساتھ اپنی طرف جمع کر جو مجھ کو تیرے سامنے قائم کر دے۔ اور یہی جمع کی انتہا، اور نظر کا تمکن، اور بارگاہ قدس کا دائمی شہود ہے۔ اور اس کا مزہ صرف وہی شخص چکھتا ہے جس کی خدمت سبقت کر گئی۔ اور جذب کی عنایت اس کے شامل ہو گئی۔ لہذا وہ کامیاب ہونے والوں، اور اپنے محبوب کے واصلین میں سے ہو گیا۔

منقول ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے اور میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تو اس کو اپنے دروازے سے بھگا دیتا ہے۔ پھر اس کو حجاب دور کرنے کی مشقت میں مشغول کر کے اپنے سے غافل کر دیتا ہے حالانکہ اس کو حجاب دور کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہ کرے اور ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کے یہی معنی ہیں لیکن نامرد مباشرت کی لذت نہیں پا سکتا ہے اور اندھا میدانوں اور زمینوں کی وسعت کو محسوس نہیں کر سکتا ہے۔

منقول ہے:۔ اللہ تعالیٰ پر جمع شدہ لوگوں میں سے بعض حضرات نے اپنے مقام سے پوشیدہ رہنے کا ارادہ کیا۔ تو جب کسی شی کے متعلق ان سے دریافت کیا جاتا۔ تو وہ فرماتے: ''ھو'' وہ۔ تو ان سے دریافت کیا گیا: ''ھو'' سے شاید آپ کی مراد، اللہ تعالیٰ ہے۔ پس وہ مردہ ہو کر گر گئے۔

اور اس مقام کو حضرات صوفیائے کرام کی اصطلاح میں جمع الجمع کہتے ہیں۔

اور یہ مقام خواص الخواص کے لئے مخصوص ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے:۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے:۔ مرسلین علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے:۔ ہمارے نبی کریم حضرت محمد ﷺ کیلئے مخصوص ہے۔

اور کونین سے ہمت اٹھا لینے، اور دارین سے قدم نکال لینے کے بغیر اس مقام تک رسائی ناممکن ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:۔ میرے سامنے دنیا اس کی آرائش اور زینت کے ساتھ پیش کی گئی۔ لیکن میں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ پھر میرے سامنے جنت اس کے حور وقصور اور لباسوں کے ساتھ پیش کی گئی۔ لیکن میں نے اس سے بھی منہ پھیر لیا۔ تو مجھ سے کہا گیا:۔ اگر تم دنیا کے ساتھ مشغول ہو جاتے تو ہم تم کو آخرت سے محروم کر دیتے۔ اور اگر تم آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتے تو ہم تم کو اپنی ذات سے محجوب کر دیتے۔ لہذا تم ہمارے ماسوئی کو چھوڑ کر ہمارے ہی ساتھ راضی رہو۔ اور دنیا و آخرت میں سے تمہارا حصہ تمہارے پاس پہنچے گا۔

ایک دوسرے عارف نے فرمایا ہے: میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ پانی پر مصلیٰ بچھا کر اس پر سفر کر رہا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ شخص کامیاب ہو گیا۔ اور میں نہ دنیا کے لائق ہوا نہ آخرت کے۔ تو میں نے ہاتف کو یہ کہتے سنا۔ جو شخص دنیا اور آخرت کے لائق نہیں ہوا۔ وہی میرے لائق ہے۔

حضرت شطیبی ؒ نے فرمایا ہے: مخلوقات میں تردد اور ان کی طرف نظر کرنا، ان اہل دلیل لوگوں کے لئے ہے جو ان کی طرف نظر کرنے کے لئے فرق کرتے ہیں۔ تا کہ وہ ان کے ذریعے ان کے صانع پر استدلال کریں۔ لیکن اہل شہود مخلوق سے بے نیاز ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا ظہور غیر اللہ کے ظہور سے زیادہ واضح ہے۔ بلکہ غیر اللہ کا مطلق وجود ہی نہیں ہے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کی طرف اٹھارہویں مناجات میں اشارہ فرمایا:

اٹھارہویں مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ کَیْفَ یُسْتَدَلُّ عَلَیْكَ بِمَا هُوَ فِی وُجُوْدِهٖ مُفْتَقِرٌ اِلَیْكَ؟ اَیَکُوْنُ لِغَیْرِكَ مِنَ الظُّهُوْرِ مَا لَیْسَ لَكَ حَتّٰی یَکُوْنَ هُوَ الْمُظْهِرُ لَكَ؟ مَتٰی غِبْتَ حَتّٰی تَحْتَاجَ اِلٰی دَلِیْلٍ یَدُلُّ عَلَیْكَ؟ وَمَتٰی بَعُدْتَ حَتّٰی تَکُوْنَ الْاٰثَارُ هِیَ الَّتِیْ تُوْصِلُ اِلَیْكَ؟

’’اے میرے اللہ! تیری ذات پر اس شی سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ جو اپنے وجود کے لئے تیری محتاج ہے؟ کیا تیرے غیر کے لئے ایسا ظہور ہے جیسا تیرے لئے نہیں ہے۔ تا کہ وہ تیری ظاہر کرنے والی ہو؟ تو غائب کہاں ہے کہ تو کسی ایسی دلیل کا محتاج ہو جو تیری طرف رہنمائی کرے؟ اور تو دور کہاں ہے کہ مخلوقات تیرے پاس پہنچانے والے وسیلہ بنیں‘‘۔

میں کہتا ہوں: مصنف رضی اللہ عنہ نے اس شخص پر تعجب کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر اس کے نور کے کامل ظہور کے بعد استدلال کرتا ہے۔ کیونکہ نور اپنے بخوبی ظاہر ہونے کے بعد کسی ایسی دلیل کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے، جو اس کے وجود کی طرف رہنمائی کرے؟ اور اس ذات اقدس کا وجود کسی دلیل کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے، جو خود ہر دلیل سے زیادہ ظاہر ہے؟ یا وہ وجود کسی دلیل کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے، جس نے دلیل کو قائم کیا ہے۔

ایک عارف شاعر نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

عَجِبْتُ لِمَنْ یَبْغِیْ عَلَیْكَ شَهَادَةً وَاَنْتَ الَّذِیْ اَشْهَدْتَهٗ کُلَّ شَاهِدٍ

’’میں نے اس شخص پر تعجب کیا جو تیرے وجود کی شہادت طلب کرتا ہے حالانکہ تو وہ ہے کہ تو نے اپنی ذات اقدس کو ہر گواہ کا گواہ بنایا‘‘۔

حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ وہ ذات اقدس، کس طرح معارف سے پہچانی جا سکتی ہے۔ جس کی ذات سے معارف پہچانے گئے؟ یا کسی شی سے وہ کیسے پہچانا جا سکتا ہے

جس کا وجود ہر شی سے مقدم ہے۔

میں کہتا ہوں: سخت تعجب ہے کہ فروع، اصول سے زیادہ ظاہر کیسے ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ اگر اصول نہ ہوتے، تو فروع حاصل ہی نہ ہوتے؟

یا سمندروں سے جاری ہونے والے نالے اور نہریں، سمندروں سے زیادہ ظاہر کیسے ہو سکتی ہیں؟ اور ملکوت کے انوار جبروت کے سمندروں ہی سے جاری ہوئے ہیں۔ لیکن اندھی بصیرت آسمان کے افق میں سورج کو نہیں دیکھتی ہے تو اندھی آنکھ سورج کو کیسے دیکھ سکے گی؟

ایک مرید نے اپنے شیخ سے دریافت کیا: یا حضرت اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ شیخ نے اس کو جواب دیا: اللہ تعالیٰ تجھ کو دور کرے۔ کیا تو حقیقت کے لئے جگہ تلاش کرتا ہے؟

ایک شخص نے حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: اے ابوالقاسم! کیا آپ نے اپنے رب کو اس وقت دیکھا، جب آپ نے اس کی عبادت کی۔ یا آپ نے اپنے دل سے اس کے پاس پہنچنے کا اعتقاد کر لیا؟

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اے سائل ہم ایسے نہیں ہیں کہ ایسے رب کی عبادت کریں جس کو ہم نہ دیکھیں۔ اور ہم اس بات کے ساتھ نہیں ہیں، کہ جس کو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں ۔ ہم اس کی تشبیہ بیان کریں۔ اور ہم اس کے ساتھ نہیں ہیں کہ جس سے ہم ناواقف ہیں اس کی پاکیزگی کا یقین کریں۔

اس شخص نے ان سے پھر دریافت کیا: آپ نے اللہ تعالیٰ کو کس طرح دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا: کیفیت بشر کے حق میں معلوم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں مجہول ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں عیاں مشاہدے کے ساتھ آنکھیں ہرگز نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ لیکن قلوب اس کو ایمان کے حقائق کے ساتھ پہچانتے ہیں۔ پھر احسان کے نور کے مشاہدے کے ساتھ معرفت سے رویت کی طرف ترقی کرتے ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ حقائق قدسیہ کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ وہ حادث صفات سے پاک ہے۔ وہ اپنے جمال کے ساتھ مقدس، اور اپنے کمال کے ساتھ موصوف ہے۔ قلب پر اپنی بخشش و کرم سے فضل کرنے والا ہے۔ اپنے عدل کے ساتھ اور اپنے فضل کے ساتھ موصوف ہے۔

جب اس شخص نے حضرت جنیدؒ کا یہ کلام سنا تو وہ کھڑا ہوا۔ اور ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور توبہ کی۔ اور ان کی صحبت اختیار کی۔ یہاں تک کہ اس پر بھلائی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ پھر وہ موت کے وقت تک ان کی صحبت میں رہا۔ رحمۃ اللہ علیہما۔

اور تم یہ جان لو، کہ اہل دلیل صنعت سے صانع پر اور حاضر سے غائب پر استدلال کرتے ہیں۔ اور اہل عیاں کے نزدیک غیب شہادت ہو جاتی ہے اور مدلول، دلیل بن جاتا ہے۔

لہٰذا پہلی قسم:۔ اہل علم الیقین ہیں۔ اور دوسری قسم:۔ اہل عین الیقین یا حق الیقین ہیں۔ پہلی قسم: عوام ہیں۔ اور دوسری قسم:۔ خواص۔ یا خواص الخواص ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسنؒ نے فرمایا ہے:۔ اہل شہود و عیاں کے نزدیک، اہل دلیل و برہان عوام ہیں۔ اہل شہود نے اللہ سبحانہ تعالیٰ کو اس سے پاک سمجھا کہ وہ کسی دلیل کا محتاج ہو جو اس کی طرف رہنمائی کرے۔

لہٰذا مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے:۔ اے میرے اللہ! تیری ذات پر اس شی سے یعنی اس مخلوق سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جو اپنے وجود میں تیری محتاج ہے؟ کیا تیرے غیر کے وجود کے لئے اگر اس کا وجود فرض کر لیا جائے، ایسا ظہور ہے جیسا تیرے لئے نہیں ہے؟ تو بصیرتوں اور آنکھوں سے غائب کہاں ہے کہ تو کسی ایسی دلیل کا محتاج ہو جو تیری طرف رہنمائی کرے۔ جب کہ وہ دلیل بھی تیری ہی ذات سے قائم ہے۔ یہ محال ہے کہ وجود میں تیرے نور کے سوا کوئی شی ظاہر ہو؟ اور تو ان اشیاء سے دور کہاں ہے جو تیرے ساتھ یعنی تیری قدرت کے ساتھ قائم ہیں۔ کہ مخلوقات تیرے پاس پہنچنے کا وسیلہ بنیں؟

تیرے اور تیری مخلوق کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اور وہم کے وجود اور قاہریت کے حجاب کے سوا کوئی جدا کرنے والی شی نہیں ہے جو ان کو تجھ سے جدا کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و کرم سے اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔

اور اللہ تعالیٰ کے لئے غائب ہونا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ رقیب (نگہبان) اور قریب ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو انیسویں مناجات میں بیان فرمایا:۔

انیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا:۔

اِلٰهِیْ عَمِیَتْ عَیْنٌ لَا تَرَاكَ عَلَیْهَا رَقِیْباً، وَ خَسِرَتْ صَفْقَةُ عَبْدٍ لَّمْ تَجْعَلْ مِنْ حُبِّكَ نَصِیْباً

''اے میرے اللہ! وہ آنکھ اندھی ہے جو تجھ کو اپنا نگران و محافظ نہیں دیکھتی ہے۔ اور اس بندے کا معاملہ نقصان میں ہے جس کے لئے تو نے اپنی محبت میں سے حصہ نہیں مقرر کیا''۔

میں کہتا ہوں: ظاہر ہے کہ یہ اس بات کی خبر دیتی ہے کہ وہ ہر آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے مراقبے سے خالی ہے، وہ اندھی ہے۔ اور ہر وہ معاملہ جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے خالی ہے، وہ نقصان میں ہے۔ اور اندھا پن اس کے حق میں باطنی ہے۔ پس گویا کہ وہ اس حیثیت سے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا مراقبہ نہیں کیا اور اس سے شرم نہیں کیا، اندھی ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْباً ''بے شک اللہ تعالیٰ تم لوگوں پر نگران و محافظ ہے''۔ اور دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَمَا تَكُوْنُ فِی شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْداً

''اور تم کسی حال میں ہوتے ہو۔ یا قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو۔ یا کوئی عمل کرتے ہو۔ تو ہم تمہارے سامنے حاضر ہوتے ہیں''۔

لہذا جس نے ایسا اعتقاد نہیں رکھا، وہ کافر ہے۔ اور جس نے ایسا اعتقاد رکھا لیکن اللہ تعالیٰ سے شرم نہیں کیا، وہ جاہل اور بصیرت کا اندھا ہے۔

بزرگوں نے بیان فرمایا ہے: حیا کا اکثر حصہ آنکھ سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اندھا کم حیادار ہوتا ہے۔ لہذا یہ عبارت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آنکھ جس نے اللہ تعالیٰ کا مراقبہ

نہیں کیا۔ اور اس سے شرم نہیں کیا۔ وہ آنکھ نہیں ہے بلکہ وہ اندھا پن ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے، کہ مصنفؒ نے آنکھ سے بصیرت کی آنکھ مراد لی ہو۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے: جب تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرو تو ایسی جگہ کرو جہاں وہ تم کو نہ دیکھے۔

لہذا جس شخص نے نافرمانیاں کرنے میں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے شرم نہیں کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ظاہر ہے تو بے شک اس کی بصیرت کی آنکھ اندھی ہوگئی۔

ایک عارف سے دریافت کیا گیا: بندہ اپنی آنکھ کی حفاظت کے لئے کس شی سے مدد طلب کرے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ اپنی آنکھ کی حفاظت کے لئے اپنے اس علم سے مدد طلب کرے کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھنا اس کی آنکھ سے آگے بڑھی ہوئی ہے

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضرت رسول کریم ﷺ سے روایت فرمائی ہے۔
حضرت ﷺ نے فرمایا۔

اَفْضَلُ اِیْمَانِ الْمَرْءِ اَنْ یَّعْلَمَ اَنَّ اللّٰہَ مَعَہٗ حَیْثُ کَانَ

"آدمی کا افضل ترین ایمان یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے وہ جہاں بھی ہو"۔

صفقہ:۔ ان سب اشیاء کو کہتے ہیں جن کو خریدا جاتا ہے۔ یعنی خریداری کا معاملہ۔ اور مصنفؒ نے اس لفظ کے ساتھ بندے کے حصے اور اس کی ازلی قسمت سے کنایہ کیا ہے۔ لہذا وہ شخص جس کا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضی اور دوری ہو۔ تو اس کا معاملہ نقصان میں ہے۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی عافیت چاہتے ہیں۔

بعض سادات رو رہے تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا: آپ کا رونا کس وجہ سے ہے؟ انہوں نے جواب دیا: میرا رونا میری نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ میرے نفس کی صفت ہے۔ بلکہ میرا رونا اس وجہ سے ہے کہ ازل میں جو حصے تقسیم کئے گئے، اور جو فوائد جاری کئے گئے، ان میں سے میرے حصے میں دوری آئی۔ بعض آسمانی کتابوں میں جو بعض انبیاء علیہم

السلام پر نازل کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اے میرے بندے! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں لہذا میرا جو حق تیرے اوپر ہے۔ اس حق کے واسطے تو مجھ سے محبت کرنے والا ہو جا۔

تو اپنے بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت:۔ بندے کو قریب کرنا، اور اس کو اپنی بارگاہ کے لئے منتخب کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت:۔ اس کے حکم کی تعمیل، اور اس کی منع سے پرہیز کے ساتھ اس کی اطاعت، اور اس کے غلبے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اور یہ محبت کی ابتداء ہے۔ اور یہ کسبی ہے۔

اور محبت کی انتہا:۔ حجاب دور ہونا، اور دروازہ کھلنا، اور احباب کے ساتھ داخل ہونا ہے۔ اور یہ وہبی ہے۔ اور یہ کسبی محبت کا نتیجہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت رابعہ عدویہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ان اشعار میں اشارہ فرمایا ہے:

اَحِبُّكَ حُبَّيْنِ حُبَّ الْهَوٰی وَحُبًّا لِاَنَّكَ اَهْلٌ لِذَاكَ

''میں تجھ سے دو قسم کی محبت کرتی ہوں۔ ایک محبت خواہش یعنی مائل ہونے کی محبت ہے۔ اور دوسری محبت اس لئے کہ تو محبت کے لائق ہے''۔

فَاَمَّا الَّذِیْ هُوَ حُبُّ الْهَوٰی فَشُغْلِیْ بِذِكْرِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

''پس وہ محبت جو خواہش اور مائل ہونے کی محبت ہے، وہ تیرے ماسوا کو چھوڑ کر تیرے ذکر میں میرا مشغول ہونا ہے''۔

وَاَمَّا الَّذِیْ اَنْتَ اَهْلٌ لَهٗ فَكَشْفُكَ الْحُجُبَ حَتّٰی اَرَاكَ

''لیکن وہ محبت جس کا تو اہل ہے۔ تو وہ تیرا حجابات کا اٹھا دینا ہے۔ تاکہ میں تجھ کو دیکھوں۔

فَلَا الْحَمْدُ فِیْ ذَا وَلَا ذَاكَ لِیْ وَلٰكِنْ لَكَ الْحَمْدُ فِیْ ذَا وَذَاكَ

''پس دونوں محبتوں میں میرے لئے کوئی تعریف نہیں ہے۔ بلکہ دونوں میں تیرے ہی لئے سب تعریفیں ہیں''۔

حضرت رابعہ عدویہ رضی اللہ عنہا نے ان اشعار میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم: احسان کے شہود سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسری قسم: جمال کے شہود سے پیدا ہوتی ہے۔

پہلی قسم کی محبت، جو احسان کے شہود سے پیدا ہوتی ہے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بندہ جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے ظاہری اور باطنی احسانات و انعامات کی طرف نظر کرتا ہے۔ تو وہ اس سے لامحالہ محبت کرتا ہے۔ اس لئے کہ قلوب فطری (پیدائشی) طور پر اس سے محبت کرتے ہیں جو ان کے اوپر احسان کرتا ہے۔ اور اسی محبت کا نام خواہش اور میلان کی محبت ہے۔ اور یہ کسبی ہے۔ کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے احسانات سے ڈھانپا ہوا ہے۔ اور وہ ان میں غور و فکر سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ اور چونکہ وہ ہمیشہ ایک نعمت کے بعد دوسری نعمت اور ایک احسان کے بعد دوسرا احسان دیکھتا رہتا ہے۔ اور ہر نعمت اپنے سے پہلے کی نعمت سے زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ لہذا اپنے مولائے حقیقی سے اس کی محبت بڑھ جاتی ہے۔ اور اسی سے وہ اپنے ارادہ اور تمنا تک پہنچ جاتا ہے۔

اور محبت کی دوسری قسم، جو جمال کے شہود سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بندے کے قلب سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور اس سے مانعات اور قاطعات دور ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے جمال اور اس کے کمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور بارگاہ قدس کے انوار اس کے قلب پر روشن ہوتے ہیں۔ اور چونکہ جمال فطری طور پر محبوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے درمیان اور اس کے مولائے حقیقی کے درمیان محبت منعقد ہو جاتی ہے۔

اور حضرت رابعہ ؒ نے دوسری محبت کو جو جمال کے شہود سے پیدا ہوتی ہے، اہلیت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ پہلی محبت کو نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی محبت کا اہل ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ دوسری قسم کی محبت اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ بندے کے کسب کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اور پہلی قسم کی محبت اس کے لئے سبب ہے اور بندے کا عمل معلول ہے۔

اور حضرت رابعہؒ کا یہ قول:۔ تیرے ماسویٰ کو چھوڑ کر تیرے ذکر میں میرا مشغول ہونا ہے''۔ سبب سے مسبب کی تعبیر ہے۔ یعنی اس محبت کا نتیجہ:۔

تیرے ماسوا کو چھوڑ کر میرا تیرے ذکر میں مشغول ہونا ہے۔

اور حضرت رابعہؒ کا یہ قول: ''تیرا حجابات کو اٹھا دینا ہے۔ تاکہ میں تجھ کو دیکھو'' مسبب سے سبب کی تعبیر ہے۔ اور یہ پہلی محبت کے برعکس ہے۔ اور اس محبت کا سبب اور اس کے پیدا ہونے کی

وجہ حجاب کا اٹھنا ہے تا کہ میں تجھ کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھوں۔

اور حضرت رابعہ ؒ کا یہ قول: دونوں محبتوں میں میرے لئے کوئی تعریف نہیں ہے۔ بلکہ دونوں میں سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں''۔ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ دونوں قسم کی محبتیں درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہیں۔ ان میں بندے کے کسب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور احسان کے شہود سے پیدا ہونے والی محبت کی تاثیر، اور جمال کے شہود سے پیدا ہونے والی محبت کی تاثیر کے درمیان فرق محسوس کرنا، نیز یہ معلوم کرنا کہ دوسری محبت کا اثر پہلی محبت سے زیادہ قوی ہے۔ بلکہ دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہے۔ ان دونوں محبتوں کا ذائقہ چکھنے والے کے لئے لازی وضروری ہے۔ یہ حضرت فاسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح رائیہ میں بیان فرمایا ہے۔

لہذا مصنف رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''تو نے اپنی محبت سے اس کے لئے حصہ نہیں عطا کیا''۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ مصدر کی اضافت فاعل اور مفعول کی طرف ہو۔ اور فاعل کی طرف اضافت زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت زیادہ بڑی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت کی اصل یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

(يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ) ''اللہ تعالی ان سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں''۔

لہذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مذکورہ محبت سے حصہ عطا فرمایا۔ اس نے دنیا و آخرت کے فوائد حاصل کر لئے۔ اور وہ آنکھ کی ٹھنڈک حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس محبت سے محروم کر دیا۔ اس کا معاملہ خسارے میں پڑ گیا۔ اور اس کا نقصان اور اس کی ناکامی ظاہر ہو گئی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے احسان اور رحمت کی التجا کرتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی محبت کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ بندے سے فرماتا ہے: تو جو چاہے کر۔ میں نے تجھ کو بخش دیا۔ اور چونکہ محبت کی انتہا محبوب میں فنا ہو جانا ہے۔ اور فنا کی انتہا، بقا ہے۔ اور بقاء مخلوق کی طرف واپس ہونا ہے۔

لہذا مصنف نے اس کی طرف بیسویں مناجات میں اشارہ فرمایا ہے۔

بیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ اَمَرْتَ بِالرُّجُوْعِ اِلَی الْاٰثَارِ فَارْجِعْنِیْ اِلَیْهَا بِكِسْوَةِ الْاَنْوَارِ وَهِدَايَةِ الْاِسْتِبْصَارِ، حَتّٰی اَرْجِعَ اِلَيْكَ مِنْهَا، كَمَا دَخَلْتُ عَلَيْكَ مِنْهَا مَصُوْنَ السِّرِّ عَنِ النَّظَرِ اِلَيْهَا، مَرْفُوْعَ الْهِمَّةِ عَنِ الْاِعْتِمَادِ عَلَيْهَا، اَنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۔

''اے میرے اللہ! تو نے مجھ کو آثار (مخلوقات) کی طرف واپس ہونے کا حکم دیا ہے۔ لہذا تو مجھ کو ان کی طرف انوار کے لباس، اور بصیرت کی ہدایت کے ساتھ واپس کر۔ تاکہ میں ان سے تیری طرف رجوع کروں۔ جیسا کہ میں پہلے ان سے جدا ہو کر اس حال میں تیری بارگاہ قدس میں داخل ہوا۔ کہ میرا سر مخلوقات کی طرف نظر کرنے سے محفوظ، اور میری ہمت ان کے اوپر اعتماد کرنے سے بلند تھی۔ بے شک تو ہی ہر شی پر قادر ہے''۔

میں کہتا ہوں: مخلوقات کی طرف لوٹنا: بارگاہ قدس سے حقوق کے آسمان اور فوائد کی زمین کی طرف نزول ہے۔ اور بارگاہ قدس:۔ ماسوی اللہ سے بالکل غائب ہو کر وحدت کے سمندر میں ڈوب جانا ہے۔

پس وہ حقوق کے آسمان کی طرف ربوبیت کے ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے، اور عبودیت کے حقوق کے ساتھ قائم رہتے ہوئے نزول کرتے ہیں۔ اور فوائد کی زمین کی طرف حکمت کے ادب کا خیال رکھتے ہوئے، اور عبودیت کے وظائف کو ظاہر کرتے ہوئے نزول کرتے ہیں۔

اور حقوق کے آسمان کی طرف نزول کی مثال: وہ بدنی یا مالی عبادتیں ہیں۔ جن کو بندہ اپنے اوپر لازم کرتا ہے۔ خواہ وہ مقررہ وقت کی پابندی کے ساتھ ہوں، یا وقت کی پابندی سے آزاد ہوں۔ اور فوائد کی زمین کی طرف نزول کی مثال: کھانا اور پینا اور لباس اور نکاح وغیرہ ضروری حاجتیں ہیں۔ جن کی بشریت محتاج ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا حکم اس لئے دیا ہے تاکہ ربوبیت کا راز

عبودیت کے راز سے علیحدہ رہے۔ یا عبودیت کی محتاجی کے ساتھ ربوبیت کی بے نیازی ظاہر ہو۔

پس مصنف رضی اللہ عنہ نے یہ طلب کی ہے۔ کہ اس کے بعد کہ وہ حقوق وفوائد یعنی مخلوقات سے اپنی ہمت اٹھا کر کوچ کر گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو پھر مخلوقات کی طرف شہود کے انوار کا لباس پہنا کر واپس کرے۔ تاکہ مخلوق کی طرف ان کی واپسی اس حال میں ہو کہ وہ اپنے فائدے اور اپنی خواہش سے غائب رہ کر صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوں۔ حالانکہ وہ مخلوقات سے کوچ کرنے سے پہلے ان سے فوائد حاصل کرتے ہوئے اپنے نفس کے ساتھ انہیں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا تو وہ اپنے نفس سے غائب ہو گئے لہذا جب پھر وہ اپنی بشریت کے وظائف کی طرف واپس ہوں۔ تو وہ اس کی طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس حال میں واپس ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ماسوا کی طرف توجہ سے ہٹا کر شہود کے انوار کا لباس پہنا دے۔

اور مصنفؒ نے یہ طلب کی ہے، کہ مخلوق کی طرف ان کی واپسی اس حال میں ہو کہ وہ بصیرت کی ہدایت کا لباس پہنے ہوں۔

اور بصیرت کی ہدایت: ان اشیاء میں معرفت ثابت ہونی ہے جن سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ خواہ وہ عبادات ہوں یا عادات، اس طریقہ پر کہ ان کو ان میں نہ طبیعت چرا سکے نہ حس، بلکہ وہ ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رہتے ہوئے داخل ہوں۔ اور اسی طرح ان سے نکلیں۔

اور حضرت مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے: ''تاکہ میں ان سے تیری طرف رجوع کروں''۔

یہاں تک کہ یہ اشیاء ایسی ہو جائیں کہ وہ مجھ کو اس وقت تیری طرف لوٹا دیں جب میں ان میں تیری معرفت حاصل کروں۔ اور ان میں تیری عظمت اور تیرے جبروت کے نور کا مشاہدہ کروں۔ کیونکہ کل وجود تیرے جبروت کے سمندر ہی سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

لہذا عارف ہر شی سے پیتا ہے۔ اور ہر شی سے غذا حاصل کرتا ہے۔ اور ہر شی سے اپنا حصہ لیتا ہے۔ اور اس کے نور سے کچھ کم نہیں ہوتا ہے۔

لہذا حاصل یہ ہوا: انوار کا لباس: عبادتوں اور عادتوں میں اس کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اپنے نفس کے ساتھ نہیں ہے۔

اور بصیرت کی ہدایت:۔ ان مخلوقات میں جن کی طرف اس نے نزول کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنی ہے۔

اور حضرت مصنفؒ کے اس قول ''جیسا کہ میں ان کے پاس سے تیری بارگاہ قدس میں داخل ہوا'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ پہلے مخلوقات کے ساتھ تھے۔ اور وہ ان کو خالق کے شہود سے روکتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے ان میں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی۔ تو وہ ان سے علیحدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس میں داخل ہو گئے۔

اور یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مجذوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔

اَلْخَلْقُ نَوَّارٌ وَاَنَا رَعَيْتُ فِيهِمْ هُمُ الْحُجُبُ الْاَكْبَرُ وَالْمَدْخَلُ فِيهِمْ

''مخلوق قابل نفرت ہے۔ حالانکہ میں نے انہیں میں زندگی گزاری ہے۔ وہ بڑے حجابات ہیں۔ حالانکہ انہیں میں رہنے کی جگہ ہے''۔

''اور جب بندہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور ان میں قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے انوار کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا سر اشیاء کی طرف نظر کرنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر کہ وہ مخلوق ہیں۔ اور اس کی ہمت ان کے اوپر اعتماد کرنے سے اٹھ جاتی ہے۔ خواہ وہ عبادات ہوں یا اسباب یا عادات۔ کیونکہ عارف بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شی کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ اور اپنے مولائے حقیقی کے سوا کسی شی پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔ پس بے شک وہ غنی (بے نیاز) اور حمید (صاحب حمد) سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اور ہر شی پر قادر ہے۔

پھر جب بندہ مخلوقات کی طرف واپس ہوتا ہے۔ تو یہ ضروری ہے کہ اس کے ظاہر پر عاجزی اور محتاجی کا اثر، عبودیت کے وظائف کے ساتھ ثابت ہونے اور ربوبیت کے آداب کے ساتھ قائم ہونے کی وجہ سے ظاہر ہو۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اکیسویں مناجات میں بیان فرمایا:

اکیسویں مناجات

حضرت مصنفؒ نے بیان فرمایا:

اِلٰهِیْ هٰذَا ذُلِّیْ ظَاهِرٌ بَیْنَ یَدَیْكَ، وَهٰذَا حَالِیْ لَا یَخْفٰی عَلَیْكَ، مِنْكَ اَطْلُبُ الْوُصُوْلَ اِلَیْكَ، وَ بِكَ اَسْتَدِلُّ عَلَیْكَ لَا بِغَیْرِكَ ، فَاهْدِنِیْ بِنُوْرِكَ اِلَیْكَ، وَاَقِمْنِیْ بِصِدْقِ الْعُبُوْدِیَّةِ بَیْنَ یَدَیْكَ۔

''اے میرے اللہ! میری یہ ذلت تیرے سامنے ظاہر ہے۔ اور میری یہ خستہ حالی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تیری طرف پہنچنے کی طلب میں تجھی سے کرتا ہوں۔ اور میں تجھی سے تیرے اوپر استدلال کرتا ہوں۔ تیرے غیر سے تیری ذات پر استدلال نہیں کرتا ہوں۔ لہذا تو اپنے نور کے ذریعے اپنی طرف مجھ کو ہدایت عطا فرما۔ اور اپنے سامنے عبودیت کی سچائی کے ساتھ مجھ کو قائم رکھ۔

میں کہتا ہوں:۔ یہ حضرت مصنف رضی اللہ عنہ کی طرف سے انتہائی عاجزی وانکساری، اور سخت محتاجی اور مجبوری کا اعتراف ہے۔ اور اپنی عاجزی ظاہر کرنے اور اپنی شکایت پیش کرنے کے لئے اپنے مولائے حقیقی کے چوکھٹ پر پڑا رہنا ہے۔ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ رب العزت نے ان کو عزت اور بزرگی کا لباس پہنایا۔ اور اپنی مخلوق کے درمیان ان کو ظاہر اور مشہور کر کے ان کی قیمت بڑھا دی۔ یہاں تک کہ ان کا کلام ایسا ہو گیا کہ قلوب اور کان اس سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے بڑے اثرات اور فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ اللہ عزیز وحکیم وغنی وکریم کے سامنے ان کی ذلت وعاجزی کا نتیجہ ہے جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:

تَذَلَّلْ لِمَنْ تَهْوٰی لِتَكْسِبَ عِزَّةً ۔۔۔ فَكُمْ عِزَّةٍ قَدْ نَالَهَا الْمَرْءُ بِالذُّلِّ

''تم اپنے محبوب کے سامنے ذلت اور عاجزی اختیار کرو۔ تا کہ تم عزت حاصل کرو۔ کیونکہ بہت سی عزت ایسی ہے جس کو انسان نے ذلت اور عاجزی سے حاصل کیا''۔

اور ایک دوسرے عارف نے فرمایا ہے:

تَذَلَّلْ لِمَنْ تَهْوٰى فَلَيْسَ الْهَوٰى سَهْلٌ اِذَا رَضِيَ الْمَحْبُوْبُ صَحَّ لَكَ الْوَصْلُ

''تم اس کے سامنے ذلت اور عاجزی اختیار کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ کیونکہ محبت آسان نہیں ہے جب محبوب راضی ہو جائے گا تو تمہارے لئے وصل درست ہو جائے گا۔''

تَذَلَّلْ لَهٗ تَحْظٰى بِرُؤْيَا جَمَالِهٖ فَفِيْ وَجْهِ مَنْ تَهْوٰى الْفَرَائِضُ وَالنَّفْلُ

''تم اس کے سامنے ذلت اور عاجزی اختیار کرو۔ تو تم اس کے جمال کے دیدار کا لطف حاصل کرو گے۔ کیونکہ جس سے تم محبت کرتے ہو، اسی کے سامنے فرائض اور نوافل ہیں''۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس بندے کو اس عزت سے جو اس کے نزدیک زیادہ عزیز ہے کتنی عزت عطا فرمائی۔ جس کو اس کے نفس کی ذلت پر ذلیل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بندے کو اس ذلت سے جو اس کے نزدیک زیادہ ذلیل ہے، کتنا ذلیل کیا۔ جس کو اس کے نفس کی ذلت سے روک دیتا ہے۔

اور وہ حال جو اسکے مولائے حقیقی سے پوشیدہ نہیں ہے وہ کمزوری اور مجبوری اور ذلت اور عاجزی کا حال ہے۔ اور یہ حال معرفت اور وصال کے ثابت ہونے ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے مصنفؒ نے اس کو اپنے اس قول سے ملا دیا ہے:

''تیری طرف پہنچنا'' میں تجھی سے طلب کرتا ہوں،، تیرے غیر سے نہیں کرتا ہوں نہ تیرے غیر کے ذریعے کرتا ہوں۔ نہ تیرے غیر کی طرف کرتا ہوں۔ بلکہ ہماری روحوں کو اپنے ہاتھ سے قبض کر کے اپنی بارگاہ میں پہنچانے کا متولی تو ہے۔ اور ہمارے اور اپنے غیر کے درمیان تو ہی حائل ہے۔

اور مصنفؒ کے اس قول کا یہی مفہوم ہے: ''اور میں تجھی سے تیری ذات پر استدلال کرتا ہوں۔ تیرے غیر سے تیری ذات پر استدلال نہیں کرتا ہوں، کیونکہ درحقیقت تیرے ساتھ تیرے غیر کا وجود نہیں ہے۔

اور اس سے پہلے ایک عارف کا یہ قول گزر چکا ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے اپنے رب کو کس کے ذریعے پہچانا؟ انہوں نے جواب دیا۔ میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعے پہچانا۔ اور اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہ پہچانتا۔

حضرت احمد ابن ابوالحواری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ پر اس کے سوا کوئی شی دلیل نہیں ہے۔ اور علم صرف خدمت کی ادب کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح اس کے اوپر اس کے سوا کوئی شی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی طرف اس کے سوا کوئی شی ہدایت کرنے والی نہیں ہے۔ جیسا کہ مصنف نے فرمایا: ''لہذا تو اپنے نور کے ذریعے اپنی طرف مجھ کو ہدایت عطا فرما''۔

یعنی میری سیر کی حالت میں اپنی توجہ کے نور کے ذریعے اپنی طرف میری رہنمائی فرما۔ اور اپنے پاس پہنچنے کے بعد اپنی مواجہت کے نور کے ذریعے اپنی طرف میری رہنمائی فرما۔ اور اپنے سامنے عبودیت کی سچائی کے ساتھ مجھ کو قائم رکھ۔ تا کہ ہم تیری طرف وصول پر ثابت قدمی سے قائم رہیں۔ پھر ہم عبودیت کے وظیفے کی طرف ربوبیت کے انوار کے عین شہود میں رجوع کریں۔

(وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ) ''اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے''۔

اس وقت علم لدنی اور اسرار ربانی کا فیضان ہوتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو بائیسویں مناجات میں بیان فرمایا۔

بائیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ عَلِّمْنِیْ بِعِلْمِكَ الْمَخْزُوْنِ، وَصُنِّیْ بِاِسْمِكَ الْمَصُوْنِ

''اے میرے اللہ! اپنے پوشیدہ غیبی علم میں سے مجھ کو علم عطا فرما۔ اور اپنے اسم پاک مصون کے طفیل میری حفاظت فرما''۔

میں کہتا ہوں:۔ علم مخزون: وہ وہبی علم ہے جس کا فیضان علام الغیوب کی بارگاہ سے قلوب پر ہوتا ہے۔ وہ کسی تدبیر اور محنت سے نہیں پایا جا سکتا ہے۔ اور کسی دفتر اور کتاب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کمال سے اہل اللہ کی صحبت کی حکمت کے ذریعے یا صرف فضل وکرم سے عطا فرمایا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں حضرت رسول اللہ ﷺ سے روایت کی گئی ہے۔ حضرت ﷺ نے فرمایا ہے:۔

اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ كَهَيْئَةِ الْمَكْنُوْنِ لَا يَعْلَمُهٗ اِلَّا الْعُلَمَاءُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى ، فَاِذَا نَطَقُوْا بِهٖ لَا يُنْكِرُهٗ اِلَّا اَهْلُ الْغِرَّةِ بِاللّٰهِ

''بے شک بعض علوم پوشیدہ موتی کی طرح ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کا علم رکھنے والے (عارف) کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ پس جب وہ اس علم کے ساتھ بات کرتے ہیں، تو اس کا انکار اللہ تعالیٰ سے جاہل ہی کرتا ہے''۔

اور وہ علوم ربوبیت کے وہ اسرار ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے اور ان سے صرف اپنے خواص اولیائے کرام ہی کو آگاہ فرمایا ہے۔

لہذا جب کبھی انہوں نے اس کے نااہل کے سامنے اس علم کی بات کی، تو نااہلوں نے ان کی تردید کی۔ بلکہ اکثر اوقات ان کا خون مباح کر دیا ہے۔

اور انہیں علوم میں سے، قضاوقدر کے اسرار اور غیبی عجائب سے آگاہی ہے۔ اور انہیں علوم میں سے علوم کی کنجیوں اور سمجھ کے خزانوں سے آگاہی ہے۔

لہذا وہ لوگ اپنی فکروں کے نتیجوں میں حکمتوں کی وہ موتیاں اور علوم کے وہ یاقوت نکالتے ہیں۔ جن کے بیان سے زبانیں گونگی اور ان کی برداشت سے عقلیں عاجز ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابوبکر واسطی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں فرمایا ہے:

(وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ) ''اور وہ لوگ جو علم میں مضبوط ہیں کہتے ہیں''

''رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' علم میں مضبوط، وہ لوگ ہیں جن کی روحیں غیب الغیب اور سر السر میں مضبوطی سے قائم ہو گئیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جو معرفت عطا کرنی تھی وہ معرفت عطا کی۔ اور وہ علم و معرفت کی ترقی کی طلب میں سمجھ کے ساتھ علوم کے سمندروں میں گھس گئے۔ لہذا ان کے سامنے غیب کے خزانوں کے ذخیروں میں سے کتاب اللہ کے ہر حرف اور کلام اللہ کی ہر آیۃ میں وہبی معلومات کے عجائب منکشف ہو گئے تو وہ کامل حکمت اور اعلیٰ فصاحت کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔

یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے گروہ ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے گروہ ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے گروہ ہیں۔

بعض تابعین نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ اپنے اسرار صرف اپنے امانت دار اولیائے کرام پر بغیر سننے اور پڑھنے کے ظاہر فرماتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: فقہا یعنی علماء جن علوم میں مشغول ہیں۔ ان میں ہم ان کے ساتھ شریک ہیں۔ لیکن جن علوم میں ہم مشغول ہیں۔ ان میں وہ لوگ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

اور حضرت شیخ ابوالعباسؒ کا اکثر کلام، عقل اکبر، اور اسم اعظم اور اس کی چاروں شاخوں اور اولیائے کرام کے دائروں اور مومنین کے مقامات، اور مقربین کے املاک (ملک کی جمع)، اور اسرار کے علوم، اور اذکار کی امداد، اور مقادیر (قضاوقدر) کا دن، اور تدبیر کی شان، اور پیدائش کا علم، اور مشیت کا علم، اور قبضے کی شان، اور رجال الغیب، اور افراد کے علوم، اور قیامت کی خبروں کے بارے

میں ہے۔اور یہ سب کے سب علم مخزون میں سے ہیں۔ اور مصنفؒ نے جو حفاظت طلب کی ہے۔ وہ اغیار کے دیکھنے، یا اللہ واحد قہار تک نہ پہنچ کر انوار کے ساتھ مشغول ہو جانے سے حفاظت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اسم پاک "مصون" اس کا وہ اسم اعظم ہے کہ جب اس کے وسیلے سے دعا کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔اور جب اس کے واسطے سے مانگا گیا تو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔اور اس کا راز: ان اشیاء میں جو اللہ کے وسیلے سے مانگی گئی ہیں۔اس کے تصرف کا ظاہر ہونا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر جب اغیار سے حفاظت ثابت ہو جاتی ہے تو قلب اسرار کی بارگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور وہ سالکین و مجذوبین میں سے مقربین کی بارگاہ ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو تیئسویں مناجات میں بیان فرمایا ہے:

تیئسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ حَقِّقْنِیْ بِحَقَائِقِ اَهْلِ الْقُرْبِ ، وَاسْلُكْ بِیْ مَسَالِكَ اَهْلِ الْجَذْبِ

''اے میرے اللہ! تو مجھ کو اہل قرب کے حقائق میں ثابت قدمی سے قائم کر، اور مجھ کو اہل جذب کے راستوں پر چلا''

میں کہتا ہوں:۔ حقائق: حقیقت کی جمع ہے۔ اور حقیقت:۔ اشیاء اپنی اصلیت کے اعتبار سے جس حالت پر ہیں۔ ان کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

اور اہل قرب کے حقائق:۔ ان کے علوم اور معارف اور اذواق (ذوق کی جمع) اور کشوفات (کشف کی جمع) ہیں۔

اور اہل قرب:۔ مقربین ہیں۔ خواہ وہ اہل مراقبہ کاملہ میں سے ہوں۔ یا اہل مشاہدہ میں سے، یا اہل مکالمہ میں سے۔

اور قرب: سیر اور صفائی کے فرق کے ساتھ متفرق یعنی جدا جدا ہوتا ہے۔ لہذا پہلے مراقبہ، پھر شہود اور وصول، پھر محو اور فنا، پھر بقاء اور نزول ہوتا ہے۔ اور یہ مجاہدہ اور مکابدہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور یہ محبین میں سے اہل سلوک کا مقام ہے۔ اور جذب وعنایت سے ہوتا ہے۔ اور یہ محبوبین میں سے اہل جذب کا مقام ہے۔ اور کبھی پہلے مجاہدہ ہوتا ہے اور بعد میں جذب وعنایت۔ اور یہ مرتبہ کے لحاظ سے بہت بڑا، اور فائدہ کے لحاظ سے زیادہ عام، اور تربیت کے لحاظ سے زیادہ نفع بخش ہے۔

اور یہی ہے جس کا ارادہ مصنف رضی اللہ عنہ نے کیا ہے اس لئے کہ انہوں نے پہلے اہل قرب کے حقائق میں ثابت ہونے کو طلب کیا ہے۔

اور اہل قرب:۔ وہ اہل تقرب ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے محبوب بنا لیا ہے۔ پھر دوبارہ مصنفؒ نے اہل جذب کا سلوک طلب کیا ہے۔

اور اہل جذب: وہ محبوبین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ کے لئے منتخب کیا ہے۔ اور ان کی

ارواح کواغیار کے شہود سے انوار کے شہود کی طرف کھینچ لیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

(اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ) ''اللہ تعالیٰ اپنے لئے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے''۔

اور یہی لوگ محبوبین ہیں۔اور دوسری جگہ فرمایا۔

(وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ) ''اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف اس کو ہدایت کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے''۔

اور یہ لوگ محبین ہیں۔

لہذا مصنفؒ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ سلوک اور جذب کے درمیان جامع ہوں۔اور یہ دوسرے درجوں سے زیادہ اعلیٰ اور بزرگ ہے۔

اور بعض عارفین نے فرمایا ہے: اہل قرب: وہ اہل بارگاہ ہیں جو شہود میں مستغرق ہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ قرب ہے نہ بعد۔یہ درحقیقت صرف بندے کے لئے ہے۔

لہذا جس شخص کے قلب کی آنکھ سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے انوار کا فیضان اس پر ہوتا ہے تو اس کو مراقبہ مشاہدے کے لئے، اور مشاہدہ مکاشفے کے لئے، اور مکاشفہ معائنہ کے لئے۔اور معائنہ مسامرہ اور توجہ طلب اور مکالمہ کے لئے آگے بڑھاتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے اس کا ہم نشین اور غمخوار اور مانوس ہو جاتا ہے۔اور یہی دوری اور حجابات کے چاک ہونے کے بعد بندے کو قریب کرنا ہے۔

اور یہی وہ مقام ہے جس کو حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول میں طلب کیا ہے: اے میرے اللہ! تو اپنی قدرت کے ساتھ مجھ سے ایسا قریب ہو کہ اس قرب کے ذریعے تو مجھ سے کل حجابات کو اس طرح دور کر دے جس طرح تو نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دور فرمایا۔

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اہل محبت وشوق کی دو قسمیں ہیں:۔

ایک قسم: وہ لوگ ہیں، جن کے قلوب غائب ہونے کے مشتاق ہوئے لہذا ان کو ملاقات کے سوا کسی حال میں سکون نہیں ہوتا ہے۔

دوسری قسم:۔ وہ لوگ ہیں جن کی ارواح حضور و معائنہ د شہود کی مشتاق ہوئیں۔لہذا ان

اسرار کے سمندر میں غوطہ لگانے، اوران کے قلوب پر حقائق کے نازل ہونے کے سوا کسی حال میں سکون نہیں ہوتا ہے۔

حضرت ابو یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے خاص بندے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اپنے دیدار سے محجوب کردے تو وہ جنت سے اسی طرح فریاد کریں گے کہ جس طرح اہل دوزخ دوزخ سے فریاد کریں گے۔ لیکن وہ لوگ تخت پر بیٹھے ہوئے جمال الٰہی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔

حضرت سمنونؒ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے محبت کرنے والوں نے دنیا وآخرت کی بزرگی کو ترک کردیا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اسی کے ساتھ ہیں اور حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔

"اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" (انسان اسی کے ساتھ ہے اور رہے گا جس سے اسنے محبت کی)

مشائخ کی ایک جماعت نے حضرت جنید رضی اللہ عنہ سے محبت کے بارے میں دریافت کیا؟ حضرت جنید نے رو کر جواب دیا میں ایسے بندے کی تعریف کس طرح بیان کروں جو اپنے نفس سے گم ہو گیا ہو اور اپنے رب کے ذکر سے متصل اور اس کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ قائم ہو۔ اس کی طرف اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ اس کے قلب کو اللہ تعالیٰ کی ہیبت کی آگ نے جلا دیا ہو۔ اور اس کا پینا اس کے ورد کے پیالے سے صاف ہو چکا ہو۔ اور اللہ جبار اپنے غیب کے پردوں سے اس کے سامنے ظاہر ہو گیا ہو؟ پھر اگر وہ بات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اگر بولتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اگر وہ حرکت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اگر وہ سکون میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ پھر ان لوگوں نے کہا: اے تاج العارفین! اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ وصف اہل سلوک وجذ کیلئے صادق ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو شخص اس مقام میں پہنچ جاتا ہے اور محبت اور معرفت اس کے قلب میں مکمل طریقے پر مضبوط ہو جاتی ہے اس کے لئے اپنے محبوب کے ساتھ کوئی تدبیر و اختیار، اور شوق وانتظار باقی نہیں رہتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو چوبیسویں مناجات میں بیان فرمایا:

چوبیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا:

اِلٰهِیْ اَغْنِنِیْ بِتَدْبِیْرِكَ عَنْ تَدْبِیْرِیْ، وَ بِاِخْتِیَارِكَ عَنْ اِخْتِیَارِیْ، وَ اَوْقِفْنِیْ عَلٰی مَرَاكِزِ اِضْطِرَارِیْ

''اے میرے اللہ ! مجھ کو اپنی تدبیر کے ساتھ میری تدبیر سے، اور اپنے اختیار کے ساتھ میرے اختیار سے بے نیاز کر دے۔ اور مجھ کو میری بے قراری کے مرکزوں پر قائم کر دے''۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے ساتھ نفس کی تدبیر سے، اور اللہ تعالیٰ کے اختیار کے ساتھ بندے کے اختیار سے بے نیازی، تمام امور کی تدبیر کرنے والے اور ان میں تصرف کرنے والے کے شہود میں نفس سے گم ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اللہ فاعل، مختار، واحد قہار ہے۔ کیونکہ وہی تنہا تدبیر و اختیار، اور مشیت و اقتدار کا مالک ہے۔ لیکن اس کے شہود میں نفس سے گم ہونے کے پہلے اپنی سیر کی معرفت کے حال میں یہ ناممکن ہے کہ بندہ تدبیر کی کدورت اور اختیار کی ظلمت سے نجات حاصل کر لے۔

اسی لئے حضرت مصنفؒ نے یہ طلب کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معرفت میں گم کر دے۔ تا کہ ان کی فکریں اور ارادے اور اختیارات صرف ایک فکر میں جمع ہو جائیں اور وہ ان کے محبوب حقیقی کا شہود ہے۔

جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:

كَانَتْ لِقَلْبِیْ اَهْوَاءٌ مُفَرَّقَةٌ   فَاسْتَجْمَعَتْ مُذْ رَاَتْكَ الْعَیْنُ اَهْوَائِیْ

''میرے قلب میں بہت سی متفرق خواہشیں تھیں لیکن جب میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا تو سب خواہشیں صرف ایک خواہش میں جمع ہو گئیں''

فَصَارَ يَحْسُدُنِي مَنْ كُنْتُ أَحْسُدُهُ ۞ وَصِرْتُ مَوْلَى الْوَرٰى مُذْ صِرْتَ مَوْلَائِي

''تو وہ لوگ مجھ سے حسد کرنے لگے جن سے میں حسد کرتا تھا۔ اور جب سے تو میرا مولا ہو گیا میں مخلوق کا مولا ہو گیا ہوں''۔

تَرَكْتُ لِلنَّاسِ دُنْيَاهُمْ وَ دِيْنَهُمْ ۞ شُغْلاً بِذِكْرِكَ يَا دِيْنِي وَدُنْيَائِي

''اے میرے دین اور دنیا میں تیرے ذکر میں مشغول ہو کر لوگوں کے دین اور دنیا کو ان کے لئے چھوڑ دیا ہے''۔

پس مصنف ؒ کا یہ قول ''مجھ کو اپنی تدبیر کے ساتھ بے نیاز کر دے'' یعنی اپنی تدبیر کے شہود کے ساتھ، اور اس کی تدبیر کا شہود اس کی معرفت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

نیز مصنف ؒ نے اللہ تعالیٰ سے بے قراری اور محتاجی کے مرکزوں پر قائم ہونے کی طلب کی ہے۔

اور بے قراری ومحتاجی کا مرکز: ظاہر میں ہمیشہ عبودیت کے مقام میں سختی سے قائم ہونا ہے۔ اس لئے کہ عارف کی بے قراری کبھی زائل نہیں ہوتی ہے۔ اور اپنے باطن میں غیر اللہ کے ساتھ اس کو قرار نہیں ہوتا ہے۔ اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

اور شی کا مرکز: اس کے قائم ہونے کی جگہ، جس میں وہ ٹھہرتی ہے۔ اور یہ لفظ یہاں عبودیت کے ثابت ہونے کے لئے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ عبودیت کے مرتبے کو پہچانے۔ اور اس کے طریقوں اور حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ لہٰذا جو شخص تدبیر اور اختیار کی ظلمت سے رہائی پا گیا اور بے قراری ومحتاجی کے مرکزوں پر مضبوطی سے قائم ہو گیا وہ اپنے نفس کی ذلت سے نجات پا گیا۔ اور اپنے اندازہ اور عقلمندی کے شرک سے پاک ہو گیا۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کو چھبیسویں مناجات میں بیان فرمایا ہے

پچیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِىْ اَخْرِجْنِىْ مِنْ ذُلِّ نَفْسِىْ

''اے میرے اللہ! مجھ کو میرے نفس کی ذلت سے نکال''

اور نفس کی ذلت: طمع اور حرص کے ساتھ غیر اللہ کے سامنے اس کا ذلیل ہونا ہے۔ کیونکہ حرص ہی ذلت کے درخت کا بیج ہے:

وَطَهِّرْنِىْ مِنْ شَكِّىْ وَشِرْكِىْ ، قَبْلَ حُلُوْلِ رَمْسِىْ

''اور مجھ کو میرے شک اور شرک سے میرے قبر میں داخل ہونے سے پہلے پاک کر''

میں کہتا ہوں: شاید اس مقام پر شک سے مراد: ظلمانی دشمن کا زیادہ ہونا ہے۔ یا رزق کے وسوسے مراد ہیں۔ جو قائم نہیں رہتے ہیں۔

حضرت شیخ ابن عباد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: شک نفس کے کسی ناگوار معاملے کے محسوس کرنے پر جو اس کو لاحق ہوئی سینے کا تنگ ہونا ہے۔ تو جب اس کا سینہ تنگ ہوتا ہے تو اس کے سبب سے اس کا قلب تاریک ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کو فکر اور غم لاحق ہوتا ہے۔ اور اس تاریکی سے قلب کی پاکیزگی اس کی ضد کے وجود سے ہوتی ہے۔ اور شک کی ضد: یقین ہے۔ لہٰذا یقین ہی سے سینہ کشادہ ہوتا ہے اور اسی سے اس کی تنگی دور ہوتی ہے۔ اور یقین کے نور سے جتنا حصہ قلب کو ملتا ہے اتنا ہی سینہ کشادہ ہوتا ہے۔ اور سینہ کشادہ ہونے پر اللہ تعالیٰ سے اور اس کے فضل سے قلب کو راحت اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں حضرت رسول اکرم ﷺ سے روایت کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِقِسْطِهٖ وَعَدْلِهٖ جَعَلَ الرَّوْحَ وَالْفَرَحَ بِالرِّضٰى وَالْيَقِيْنِ ، وَجَعَلَ الْهَمَّ

وَالْحُزْنَ فِي السَّخْطِ وَالشَّكِّ

''اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل و انصاف سے رضا اور یقین میں راحت اور فرحت رکھی۔ اور ناراضی اور شک میں فکر اور غم رکھا''

اور شرک: قلب کا مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر اسباب میں اس طرح متعلق ہونا اور پھنس جانا ہے۔ جس طرح شکار جال میں پھنس جاتا ہے۔

اور شرک کا پیدا کرنے والا: قلب پر شک کی ظلمت غالب ہونے کے وقت شہوت کا ہیجان ہے۔ پھر خواہش اس کے لئے مزیدار اور شیریں ہو جاتی ہیں پھر وہ ان اسباب کی پناہ لیتا ہے جن کی وجہ سے وہ اپنی اس سرکشی اور نافرمانی تک پہنچتا ہے۔ کہ وہ ان کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا ہے لہذا وہ اس کی وجہ سے شرک کی جال میں پھنس جاتا ہے۔

اور شرک سے بندے کی پاکیزگی اس کی ضد سے ہوتی ہے۔

اور شرک کی ضد: توحید کا وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈالتا ہے۔ لہذا اس کا نفس اس سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس حرص اور خفت اور بے عقلی سے جو اس کو لاحق ہوئی تھی سکون حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کے قلب میں جیسے جیسے توحید مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ ویسے ویسے شرک سے اس کی رہائی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے قلب سے اسباب مٹ جاتے ہیں۔ اور اس میں خالص توحید قائم ہو جاتی ہے۔ لہذا جب بندہ شرک اور شک سے پاک ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ہدایت اور اصلاح اور معاونت اور تائید کے ساتھ اس کا سرپرست ہو جاتا ہے۔

سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی: اے داؤد! کیا تم جانتے ہو کہ میں کب لوگوں کا سرپرست ہوتا ہوں، جب وہ اپنے قلوب کو شرک سے پاک کر لیتے ہیں۔ اور اپنے قلوب سے شک دور کر دیتے ہیں۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ مصنفؒ نے حوادث اور مصائب کے نازل ہونے پر شک اور شرک سے اپنی پاکیزگی طلب کی ہو۔ کیونکہ حوادث و مصائب شک اور وہم کا مقام ہیں۔

لہذا بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے قدر کے نازل ہونے پر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم میں شک

نہ کرے۔ نہ کسی سبب سے نہ غیر اللہ سے تعلق پیدا کرے۔ بلکہ وہ خالص ابراہیمی ہو جائے۔ جب وہ جلال کی آگ میں ڈال دیا جائے اور مخلوق اس سے کہے: کیا تمہاری کچھ حاجت ہے؟ تو وہ اپنی زبان حال یا زبان قال سے جواب دے لیکن تم سے تو میری کچھ حاجت نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے تو ہاں، میری حاجت ہے۔ پھر جب مخلوق کہے: اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرو۔ تو وہ اس کو جواب دے۔ اللہ تعالیٰ کو میرے حال کا علم ہونا، میرے سوال سے مجھ کو بے نیاز کرتا ہے (یعنی اس کو میرے حال کا علم ہونا ہی میرے لئے کافی ہے)

تو یہ ضروری اور یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ جلال کی آگ سے کہے گا: میرے ولی پر ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا۔ لہذا وہ جلال خالص جمال ہو جائے گا۔

پس جب بندہ ایسے وقت شک اور شرک سے پاک ہو جاتا ہے تو وہ حقیقی موحد اور خالص ابراہیمی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔ اور اس کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتا ہے۔ جیسا کہ مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بِکَ اَسْتَنْصِرُ" "میں تجھی سے مدد چاہتا ہوں" تیرے غیر سے نہیں۔

"فَانْصُرْنِیْ، وَعَلَیْکَ اَتَوَکَّلُ" لہذا تو میری مدد کر۔ اور میں تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتا ہوں"۔ یعنی اپنے کل معاملات تیرے حوالے کرتا ہوں۔

"فَلَا تَکِلْنِیْ" لہذا تم مجھ کو سپرد نہ کر

یعنی مجھ کو اپنے سوا دوسرے کا محتاج نہ کر۔

"وَاِیَّاکَ اَسْاَلُ" اور میں تجھی سے مانگتا ہوں

یعنی اپنی کل حاجتیں تجھی سے مانگتا ہوں۔ تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتا ہوں۔

فَلَا تُخَیِّبْنِیْ "پس تو مجھ کو ناکام و مایوس نہ کر" اس سے جو میں نے تجھ سے امید کی ہے۔ کیونکہ تو کریم ہے۔ تو اس بات سے شرم کرتا ہے کہ تو اس شخص کو خالی ہاتھ اور مایوس واپس کرے، جس نے اپنے دونوں ہاتھ تیرے سامنے پھیلائے۔

وَفِیْ فَضْلِكَ اَرْغَبُ فَلَا تَحْرِمْنِیْ

''اور میں تیرے فضل کی خواہش رکھتا ہوں۔ لہذا تو مجھ کو محروم نہ کر''۔

یعنی اپنے فضل عظیم سے محروم نہ کرے۔

وَلِجَنَابِكَ ''اور تیری بارگاہ سے'' یعنی تیری حمایت اور حرمت کی جگہ سے۔

اَنْتَسِبُ فَلَا تُبْعِدْنِىْ ''میں اپنی نسبت کرتا ہوں۔ لہذا تو مجھ کو دور نہ کر'' یعنی اپنی حمایت کی جگہ اور اپنی ہمسائیگی سے، اپنے ساتھ میری بے ادبی کی وجہ سے مجھ کو دور نہ کر۔ کیونکہ تو غفور وحلیم ہے۔

''وَبِبَابِكَ اَقِفُ ''اور میں تیرے دروازے پر کھڑا ہوں اور گریہ وزاری کر رہا ہوں۔ اور اسی دروازے کو ثابت قدمی سے پکڑے ہوئے، اس کو کھٹکھٹا رہا ہوں۔

''فَلَا تَطْرُدْنِىْ، لہٰذا تو مجھ کو نہ بھگا'' اس لئے کہ کریم کی شان یہ نہیں ہے کہ اپنے عظیم الشان دروازے سے بھگائے یا اپنے فضل عام کے سمندر کے صدر مقام سے لوٹا دے۔

''وَنَحْنُ كِلَابُ الدَّارِ طَبْعًا وَلَمْ نَزَلْ نُحِبُّ مَوَالِيْهَا وَنَحْرُسُ بَابَهَا

اور ہم طبعا (پیدائشی طور پر) اس گھر کے کتے ہیں اور ہم برابر اس گھر کے آقاؤں سے محبت کرتے اور اس گھر کے دروازے کی پاسبانی کرتے ہیں۔

اِذَا طُرِدَتْ يَوْمًا كِلَابُ قَبِيْلَةٍ فَقَوْمِىْ كِرَامٌ لَا تُهِيْنُ كِلَابَهَا

جب کسی دن کسی قبیلے کے کتے بھگا دئے جائیں تو میری قوم شریف و بزرگ ہے وہ اپنے کتوں کو ذلیل نہیں کرتی ہے۔

حضرت علی بن ہند فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:۔ تم اس کی کوشش کرو کہ کسی حال میں اپنے آقا کے دروازے سے جدا نہ ہو۔ کیونکہ وہ کل مخلوق کی پناہ گاہ ہے لہٰذا جس شخص نے اس دروازے کو چھوڑ دیا پھر وہ کسی دروازے پر قرار اور مقام نہ پائے گا۔

اور جب تم ہمیشہ دروازے پر پڑے رہو گے تو وہ تم کو مانگنے سے پہلے عطا فرمائے گا اور بغیر کسی سبب کے تمہارے اوپر بخشش کرے گا۔

مصنفؒ نے چھبیسویں مناجات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا:

مناجات کی مسلسل عبارت

اِلٰهِیْ اَخْرِجْنِیْ مِنْ ذُلِّ نَفْسِیْ وَطَهِّرْنِیْ مِنْ شَكِّیْ وَشِرْكِیْ ، قَبْلَ حُلُوْلِ رَمْسِیْ بِكَ اَسْتَنْصِرُ فَانْصُرْنِیْ وَعَلَیْكَ اَتَوَكَّلُ فَلَا تَكِلْنِیْ وَاِیَّاكَ اَسْاَلُ فَلَا تُخَیِّبْنِیْ وَفِیْ فَضْلِكَ اَرْغَبُ فَلَا تَحْرِمْنِیْ وَلِجَنَابِكَ اَنْتَسِبُ فَلَا تُبْعِدْنِیْ وَبِبَابِكَ اَقِفُ فَلَا تَطْرُدْنِیْ۔

اے میرے اللہ! مجھ کو میرے نفس کی ذلت سے نکال اور مجھ کو میرے شک اور شرک سے میرے قبر میں داخل ہونے سے پہلے پاک کر میں تجھی سے مدد چاہتا ہوں لہٰذا تو میری مدد کر اور میں تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتا ہوں۔ لہٰذا تو مجھ کو سپرد نہ کر۔ اور میں تجھی سے مانگتا ہوں۔ پس تو مجھ کو ناکام نہ کر اور میں تیرے فضل کی خواہش رکھتا ہوں لہٰذا تو مجھ کو محروم نہ کر اور تیری بارگاہ سے میں اپنی نسبت کرتا ہوں لہٰذا تو مجھ کو دور نہ کر اور میں تیرے دروازے پر کھڑا ہوں لہٰذا تو مجھ کو نہ بھگا۔

چھبیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِيْ تَقَدَّسَ رِضَاكَ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ عِلَّةٌ مِّنْكَ فَكَيْفَ تَكُوْنُ لَهٗ عِلَّةٌ مِّنِّيْ؟

''اے میرے اللہ! تیری رضا اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے تیری جانب سے کوئی سبب ہو۔ تو اس کے لئے میری جانب سے کوئی سبب کیسے ہوسکتا ہے''۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہ کسی سبب سے حاصل ہوتی ہے نہ کسی عمل اور طلب سے۔ بلکہ وہ صرف عطائے الٰہی اور خصوصی بخشش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

''اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ عظیم فضل کا مالک ہے''۔

لہذا اللہ تعالیٰ کی رضامندی اس سے پاک ہے کہ اس کے لئے اس کی طرف سے کوئی سبب ہو۔ کیونکہ وہ قدیم ہے تو اس کی رضامندی کے لئے اس کے غیر کی طرف سے کوئی سبب کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ غنی و کریم ہے۔

اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا:

اَنْتَ الْغَنِيُّ بِذَاتِكَ عَنْ اَنْ يَّصِلَ اِلَيْكَ النَّفْعُ مِنْكَ، فَكَيْفَ لَا تَكُوْنُ غَنِيًّا عَنِّيْ؟

''تو اپنی ذات میں اس سے بے نیاز ہے کہ تیری طرف سے کوئی نفع تجھ کو پہنچے۔ تو میری طرف سے تو کیوں بے نیاز نہ ہوگا؟

لہذا جس طرح اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کی ناراضی اس سے بے نیاز ہے کہ ان دونوں کے لئے کوئی سبب ہو۔ اسی طرح اس کی ذات اقدس اس کی طرف سے یا اس کے غیر کی طرف سے

فوائد کے پہنچنے سے پاک ہے کیونکہ جس طرح اس کی ذات اقدس قدیم ہے۔ اسی طرح اس کے اوصاف اطہر ازلی قدیم ہیں۔

حضرت ابوبکر واسطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: رضا اور ناراضی اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں سے دو وصف ہیں۔ وہ ابد تک اس کے ساتھ جاری رہیں گے، جس کے ساتھ ازل میں جاری ہوئے۔ یہ دونوں وصف مقبولوں اور مردودوں پر علامت کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لہذا مقبولوں کے گواہان (علامات) اپنے نور کے ساتھ ان کے اوپر ظاہر ہوئے۔ جس طرح مردودوں کے گواہان اپنی ظلمت کے ساتھ ان کے اوپر ظاہر ہوئے لہذا اس سے زرد رنگیں، اور چھوٹی آستینیں، اور اٹھے ہوئے قدم میں کس طرح فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت اور اس کی سنت اس طریقے پر جاری ہے کہ جس شخص پر عبادت اور نیکی ظاہر ہوئی تو یہ رضامندی اور خوشی کی علامت ہے۔ اور جس شخص پر مخالفت اور نافرمانی ظاہر ہوئی، تو یہ ناراضی اور نقصان کی علامت ہے۔ اور اسی کو لے کر شریعتیں نازل ہوئی ہیں اور آدمی اسی طریقے پر مرتا ہے جس طریقے پر اس نے زندگی گزاری ہے اور شاذ و نادر حالات کے لئے کوئی حکم نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت نبی کریم ﷺ کے اس قول کے بارے میں بعض علمائے کرام نے فرمایا ہے:

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ حَتّٰی مَا یَبْقٰی بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیَدْخُلُھَا، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی مَا یَکُوْنَ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ فَیَدْخُلُ النَّارَ

''انسان اہل دوزخ کا عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر کتاب (ازلی مقدر) سبقت کرتی ہے۔ (قضا و قدر کا لکھا ہوا اس کے سامنے آتا ہے) پس وہ اہل جنت کا عمل کرتا ہے۔ لہذا وہ جنت میں داخل ہو

جاتا ہے۔

اور انسان اہل جنت کا عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر کتاب سبقت کرتی ہے پس وہ اہل دوزخ کا عمل کرتا ہے۔ لہذا وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔''

بے شک پہلی قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زیادہ ہیں۔ اور دوسری قسم کے لوگ شاذ و نادر یعنی اتنے کم ہیں کہ ان کے لئے کوئی حکم نہیں ہے۔ یعنی وہ کسی شمار میں نہیں ہیں۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ

''اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے۔ اور وہی راستے کی ہدایت کرتا ہے''۔

لیکن اس کے باوجود اکابرین بزرگان دین، سابقہ (نوشتہ تقدیر) اور خاتمہ (موت کا وقت) سے ہمیشہ ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ نہیں معلوم ہے کہ قضاو قدر کا فیصلہ کیا ہے۔

جیسا کہ مصنف ؒ نے اس کی طرف ستائیسویں مناجات میں اشارہ فرمایا

ستائیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ اِنَّ الْقَضَاءَ وَالْقَدَرَ قَدْ غَلَبَنِیْ

''اے میرے اللہ! بے شک قضاوقدر میرے اوپر غالب ہے''۔

لہذا میں اطاعت کے لئے کتنا ارادہ کرتا ہوں۔ لیکن قضا مجھ پر غالب ہو جاتی ہے؟ اور میں نافرمانیوں سے کتنا دور بھاگتا ہوں۔ لیکن قدر مجھ کو کمزور اور مجبور کر دیتا ہے؟ لہذا تیرے اختیار اور قوت سے امید کے سوا میرے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے:

وَاِنَّ الْهَوٰی بِوَثَائِقِ الشَّهْوَةِ اَسَرَنِیْ

''اور بے شک خواہش نے شہوت کی رسیوں سے مجھ کو قید کر دیا ہے''۔

یعنی خواہش نے شہوت کی رسیوں سے مجھ کو باندھ دیا ہے۔ اور تیری بارگاہ کی طرف روانہ ہونے سے اور تیری جنت میں داخل ہونے کی کامیابی سے مجھ کو روک دیا ہے۔

فَكُنْ اَنْتَ النَّاصِرَ لِیْ ''لہذا تو ہی میرا مددگار بن''

یعنی اپنے غیر سے کسی واسطے کے بغیر تو ہی میرا مددگار بن۔

حَتّٰی تَنْصُرَنِیْ ''یہاں تک کہ تو میری مدد کرے''

یعنی ان اشیاء کا مقابلہ کرے جو مجھ کو تیری طرف چلنے سے روکتی ہیں:

(وَتَنْصُرَ بِیْ) ''اور میرے ذریعے مدد کرے''

یعنی میرے وسیلے سے۔ ان لوگوں کی مدد کرے جنہوں نے مجھ سے تعلق قائم کیا۔ یا میرے وسیلے سے پناہ لی۔

اور یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اے اللہ تو ہم کو بغیر کسی سبب کے غنی کر دے۔ اور ہم کو اپنے اولیائے کرام کے لئے غنا کا وسیلہ،

اوران کے اور اپنے دشمنوں کے درمیان برزخ یعنی حائل بنادے۔

پھر مصنفؒ نے غنائے اکبر کی درخواست کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ حَتّٰی اَسْتَغْنِیْ بِكَ عَنْ طَلَبِیْ

''اور تو مجھ کو اپنے فضل سے غنی کر دے تاکہ میں تیرے ساتھ اپنی طلب سے بے نیاز ہو جاؤں''۔

کیونکہ جب بندے کا قلب اللہ تعالیٰ سے آباد ہو جاتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی طلب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اوقات ادب طلب کے ترک کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور یہی سعادت عظمیٰ اور ولایت کبریٰ ہے۔

جیسا کہ حضرت شیخ ابوالحسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: حقیقی سعید (نیک بخت) وہ ہے جس کو تو نے اپنے سے بھی سوال کرنے سے بے نیاز بنا دیا ہے۔

اور یہ ولایت کے ان انوار کا نتیجہ ہے جو عارفین کے قلوب میں روشن کئے گئے ہیں۔

اور مصنف کے اس قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔

اَنْتَ الَّذِیْ اَشْرَقْتَ الْاَنْوَارَ فِیْ قُلُوْبِ اَوْلِيَآئِكَ

''اپنے اولیائے کرام کے قلوب میں انوار کو تو نے ہی روشن فرمایا ہے''۔

یہاں تک کہ حق ظاہر ہوا۔ اور باطل ان کے اندر فنا ہو گیا۔ لہذا انہوں نے تجھ کو پہچان لیا۔ اور تیری توحید کا یقین کر لیا۔

وَاَنْتَ الَّذِیْ اَزَلْتَ الْاَغْيَارَ عَنْ قُلُوْبِ اَحِبَّآءِ كَ

''اور اپنے دوستوں کے قلوب سے اغیار کو تو نے ہی زائل فرمایا''

پھر تو نے ان کے قلوب کو اپنے شہود کے انوار سے بھر دیا۔ لہذا انہوں نے صرف تجھ سے ہی محبت کی۔ اور تیرے سوا کسی شی سے محبت نہیں کی۔ اس لئے کہ انہوں نے کسی شی کو دیکھا ہی نہیں۔

وَاَنْتَ الْمُؤْنِسُ لَهُمْ ''اور تو ہی ان لوگوں کا مونس و غمخوار ہے''

اپنے ذکر کی حلاوت اور اپنے نور کے ذریعے:

"حَيْثُ اَوْ حَشْتَهُمُ الْعَوَالِمَ" اس طریقے پر کہ تو نے ان کو کائنات سے متنفر کر دیا لہذا وہ کسی شی سے مانوس نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ ان سے ان کے مخلوق ہونے کی حیثیت سے متنفر ہو گئے۔ اور ان کے خالق اور ان کے اندر جلوہ گر سے مانوس ہوئے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے خلوتوں میں اپنے ساتھ ان کی انسیت، اور چٹیل میدانوں میں اپنے ساتھ ان کی ہمنشینی کو مشاہدہ اور مکالمہ اور مساورہ اور مناجات سے تبدیل فرمادیا۔ اور یہی ہمیشہ قائم رہنے والی نعمت اور بڑی کامیابی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: میں میدان میں جا رہا تھا۔ اسی درمیان اتفاقاً میری ملاقات ایک عورت سے ہوئی۔ اس عورت نے مجھ سے دریافت کیا: آپ کون ہیں؟ میں نے جواب دیا: میں ایک غریب الوطن مسافر ہوں۔ اس نے کہا: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کی حالت میں بھی غریب الوطنی محسوس کرتے ہیں؟

حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس یہ مکتوب لکھا: تمہاری انسیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور تمہارا جدا ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اس سے مانوس ہیں۔ لہذا لوگ اپنی کثرت یعنی محفل سے جتنا مانوس ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ اپنی تنہائی سے مانوس ہیں۔ اور جن اشیاء سے لوگ زیادہ مانوس ہوتے ہیں ان سے وہ بہت متنفر ہیں اور جن اشیاء سے لوگ زیادہ متنفر ہوتے ہیں، ان سے وہ بہت مانوس ہیں۔

اَنْتَ الَّذِیْ هَدَيْتَهُمْ حَتّٰى اسْتَبَانَتْ لَهُمُ الْمَعَالِمُ

"تو نے ہی ان کو ہدایت فرمائی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے علامات ظاہر ہو گئیں"۔

یعنی تو نے ہی اپنی بارگاہ تک پہنچنے کے راستے کی ان کو ہدایت کی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے حقیقت کی علامات ظاہر ہو گئیں۔

اور یہ مصنف رضی اللہ عنہ کی طرف سے سوال کے لئے کنایہ ہے۔ اور یہ واضح طریقے پر کہنے سے بہتر اور فصیح ہے۔ گویا کہ مصنف ؒ عرض کرتے ہیں۔

اے میرے اللہ! جس طرح تو نے اپنے اولیائے کرام کے قلوب میں انوار کو روشن فرمایا۔

یہاں تک کہ انہوں نے تجھ کو پہچان لیا۔ اور جس طرح تو نے اپنے دوستوں کے قلوب سے اغیار کو زائل فرمایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے صرف تجھ سے محبت کی۔ اور جس طرح تو نے ان کو اپنے سے مانوس کیا۔ اس طریقے پر کہ ان کو کائنات سے متنفر کر دیا۔ اور جس طرح تو نے ان کو ہدایت فرمائی، یہاں تک کہ ان کے سامنے علامات ظاہر ہو گئیں۔

اسی طرح تو اپنے معارف کے انوار میرے قلب میں روشن فرما دے۔ تا کہ میں تجھ کو پہچان لوں۔ اور تو میرے قلب سے اغیار کو دور فرما دے تا کہ میں صرف تجھ سے محبت کروں۔ اور تو مجھ کو اپنے سے اس طریقے پر مانوس فرما لے، کہ مجھ کو کائنات سے متنفر کر دے۔ اور تو مجھ کو حقیقت کے راستے کی ہدایت فرما۔ تا کہ میرے سامنے علامات ظاہر ہو جائیں۔ لہذا میں تیرے سوا ہر شی سے بے نیاز ہو جاؤں۔ اور ہر شی میں تجھی کو پاؤں۔ جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:

مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَكَ؟

''اس شخص نے کیا پایا جس نے تجھ کو کھو دیا؟''

اگر چہ وہ پوری دنیا کا مالک ہو جائے۔ پھر بھی وہ سب محتاجوں سے زیادہ محتاج ہے۔ جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ إِذَا فَارَقْتَهُ عِوَضٌ   وَلَيْسَ لِلّٰهِ إِنْ فَارَقْتَهُ عِوَضٌ

''اگر تم نے ہر شی کو چھوڑ دیا ہے تو اس کا بدل ہے۔ لیکن اگر تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیا ہے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہے''۔

حضرت شبلی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: سب سے بڑا نقصان کون سا ہے؟ انہوں نے جواب دیا جس شخص سے جنت فوت ہو گئی۔ اور وہ دوزخ میں داخل ہوا۔ یہی سب سے بڑا نقصان ہے۔

پھر جب انہوں نے انتقال فرمایا۔ تو ایک شخص نے ان کو خواب میں دیکھا۔ اس نے ان سے دریافت کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے مجھ سے صرف ایک شی کے لئے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ وہ یہ کہ میں نے ایک دن یہ کہا تھا

جنت کے کھو جانے اور دوزخ میں داخل ہونے سے بڑا کوئی نقصان نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: میری ملاقات یعنی میرے شہود اور میری معرفت کے کھو جانے سے بڑا کون سا نقصان ہے؟

وَمَا الَّذِیْ فَقَدَ مَنْ وَجَدَكَ؟

''اور اس شخص نے کیا گم کر دیا جس نے تجھ کو پالیا؟''

یقیناً وہ کل وجود کا مالک ہوا اور وہ ایسی غنا سے غنی ہوا جس کے بعد آخری زمانے تک کوئی محتاج نہیں ہے۔

لَقَدْ خَابَ مَنْ رَضِیَ دُوْنَكَ بَدَلاً

''البتہ وہ شخص محروم اور بدنصیب ہے جو تیرے عوض دوسری شی سے راضی ہوا''

یعنی جس نے تیرے سوا کسی دوسری شی سے محبت کی اور تیرے عوض اس کو پسند کیا۔ وہ بدنصیب اور محروم ہو گیا۔

کسی عارف کے اشعار ہیں۔

سَهَرُ الْعُيُوْنِ لِغَيْرِ وَجْهِكَ بَاطِلٌ وَبُكَاءُهُنَّ لِغَيْرِ فَقْدِكَ ضَائِعُ

تیرے غیر کے دیدار کیلئے آنکھوں کا جاگنا بے سود ہے اور تیرے سوا کسی دوسری شی کے کھو جانے پر ان کا رونا بے کار ہے۔

اَيُظَنُّ اَنِّیْ فِيْكَ مُشْتَرِكُ الْهَوٰى هَيْهَاتَ قَدْ جَمَعَ الْهَوٰى بِكَ جَامِعُ

کیا یہ گمان کیا جاتا ہے کہ میں تیری محبت اور تیرے سوا دوسری شی کی محبت میں مشترک ہوں۔ ایسے گمان پر افسوس ہے کیونکہ جمع کرنے والے نے محبت کو تیرے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

بَصْرِیْ وَسَمْعِیْ طَائِعَيْنِ وَاِنَّمَا اَنَا مُبْصِرُبِكَ فِی الْحَيَاةِ وَسَامِعُ

میری آنکھ اور میرا کان دونوں فرمان بردار ہیں اور میں اپنی زندگی میں صرف تجھی کو دیکھتا ہوں اور صرف تیری باتیں سنتا ہوں۔

وَلَقَدْ خَسِرَ مَنْ بَغٰی عَنْكَ مُتَحَوَّلًا ۔ اور البتہ وہ شخص خسارے میں ہے جس نے تجھ سے

روگردانی کر کے سرکشی کی۔

یعنی وہ شخص یقیناً ناکام ہوا جس کو تو نے اپنے دروازے پر کھڑا کیا پھر اس نے تیرے غیر کا دروازہ تلاش کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا اور تیرے غیر کی بارگاہ میں پناہ لی لہٰذا اس سے زیادہ نقصان اٹھانے والا، اور اپنی تجارت کے معاملے میں اس سے زیادہ خسارے میں پڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے سخی و کریم اللہ تعالیٰ کا دروازہ ترک کیا اور بخیل ترین بندے کے پاس پناہ حاصل کی۔

لہٰذا تیری عظیم بارگاہ اور کریم دروازے سے پھر کر جس نے تیرے غیر سے کچھ چاہا وہ سخت خسارہ میں پڑا۔

كَيْفَ يُرْجٰى سِوَاكَ وَاَنْتَ مَا قَطَعْتَ الْاِحْسَانَ

تیرے غیر سے کیسے امید کی جائے جبکہ تو نے احسان کو ختم نہیں کیا ہے۔ اور نہ تو اپنا احسان انسان سے کبھی منقطع کرے گا۔

اَمْ كَيْفَ يُطْلَبُ مِنْ غَيْرِكَ وَاَنْتَ مَا بَدَّلْتَ عَادَةَ الْاِمْتِنَانِ

یا تیرے غیر سے کیسے مانگا جائے جبکہ تو نے اپنی احسان کرنے کی عادت تبدیل نہیں کی ہے۔ بلکہ تیرا احسان و کرم مخلوق پر جاری ہے اور وہ ان کو ہمیشہ پہنچ رہا ہے۔ عارفین نے اس کو پہچانا اور جاہلوں نے اس کا انکار کیا۔

يَامَنْ اَذَاقَ اَحِبَّائَهُ حَلَاوَةَ مُوَانَسَتِهٖ ۔ اے وہ ذات پاک جس نے اپنے دوستوں کو اپنی انسیت کی شیرینی چکھائی۔

اور یہ اس وقت چکھائی جب وہ اس کے غیر کی انسیت سے متنفر ہو گئے۔

فَقَامُوْا بَيْنَ يَدَيْهِ مُتَمَلِّقِيْنَ ۔ لہٰذا وہ اس کے سامنے محبت اور چاپلوسی کرتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

میں کہتا ہوں:۔ حدیث شریف میں ہے۔

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِذَا دَعَا اَخِّرُوْا حَاجَةَ عَبْدِىْ ، فَاِنِّىْ اُحِبُّ اَنْ

اَسْمَعَ صَوْتَهٗ

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ فرشتوں سے اس وقت فرماتا ہے جب وہ بندہ دعا کرتا ہے اس کی حاجت کو مؤخر کرو۔ (یعنی اس کی حاجت پوری کرنے میں دیر کرو) کیونکہ اس کی آواز سننا پسند کرتا ہوں۔

لہٰذا دوست کے سامنے خوشامد اور قریب سے سرگوشی کل مرغوب اشیاء سے بڑی اور سب مقصدوں سے افضل ہے اور اس کو صرف اہل شوق واشتیاق ہی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:۔

سَفِيْنَةُ الْحُبِّ فِي بَحْرِ الْهَوٰى وَقَفَتْ　　فَامْنُنْ عَلَيَّ بِرِيْحٍ مِنْكَ يُجْرِيْهَا

محبت کی کشتی خواہش کے سمندر میں ٹھیر گئی ہے۔ لہٰذا تو میرے اوپر احسان کر کہ اپنی طرف سے ایسی ہوا چلا دے جو اس کو جاری کر دے۔

لَا يَعْرِفُ الشَّوْقَ اِلَّا مَنْ يُكَابِدُهٗ　　وَلَا الصَّبَابَةَ اِلَّا مَنْ يُعَانِيْهَا

شوق کو وہی شخص پہچانتا ہے، جو اس کی تکلیفوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور محبت کو وہی جانتا ہے۔ جو اس کی سختیاں جھیلتا ہے۔

لَا اَوْحَشَ اللّٰهُ مِنْكُمْ مَنْ يُّحِبُّكُمْ　　وَاٰنَسَ اللّٰهُ دَارًا اَنْتُمْ فِيْهَا

اللہ تعالیٰ تم سے اس شخص کو متنفر نہ کرے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ اور تم کو اس گھر سے مانوس کر دے جس میں تم رہتے ہو۔

يَـا مَنْ اَلْبَـسَ اَوْلِيَـاءَهٗ مَلَابِـسَ هَيْبَتِـهٖ ۔اے وہ ذات پاک! جس نے اپنے اولیائے عارفین کو اپنی ہیبت کا لباس پہنایا۔

یہاں تک کہ ہر شی ان سے خوفزدہ و مرعوب ہو گئی۔ اور وہ کسی شی سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔

حدیث شریف میں ہے

مَنْ خَافَ اللّٰهَ خَافَ مِنْهُ كُلُّ شَيْءٍ، وَمَنْ لَّمْ يَخِفِ اللّٰهَ اَخَافَهُ كُلُّ شَيْءٍ

''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے ہر شی اس سے ڈرتی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا ہے ہر

شی اس کو ڈراتی ہے''

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی ہیبت کا لباس پہنایا۔

'فَقَامُوْا بِعِزَّتِہٖ مُسْتَعِزِّیْنَ' لٰہذا وہ اس کی عزت سے عزت حاصل کر کے عزت کے مقام میں قائم ہوئے۔

جب ان لوگوں نے مخلوق سے اپنی ہمت اٹھالی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت عطا فرمائی۔ اور جب ان لوگوں نے دنیا سے اپنی ہمت اٹھالی تو مخلوق نے ان کی عزت کی۔

اور جب اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اپنے ولی کو اپنی مخلوق کی طرف واپس کرے تا کہ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو فائدہ پہنچائے۔ تو اس کو دو لباس پہنا تا ہے۔

ایک لباس: زیبائش اور جمال کا لباس ہے۔ تا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت اور وصال حاصل کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے ان لوگوں کو فیضیاب فرمائے۔

دوسرا لباس: ہیبت اور جلال کا لباس ہے تا کہ جب وہ لوگوں کو حکم دے تو وہ اس کے حکم کی تعمیل کریں۔ اور جب وہ منع کرے تو وہ اس کے منع سے پرہیز کریں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو یہ دونوں لباس رسوخ و تمکین میں قائم ہونے کے وقت پہنا تا ہے۔

اسی کی طرف بعض عارفین نے اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّ عِرْفَانَ ذِی الْجَلَالِ لِعِزٌّ وَضِیَاءٌ وَبُھْجَۃٌ وَ سُرُوْرُ

''بے شک اللہ ذوالجلال کا عرفان عزت اور روشنی اور خوشی اور سرور ہے''۔

وَعَلَی الْعَارِفِیْنَ اَیْضًا بَھَاءٌ وَعَلَیْھِمْ مِنَ الْمَحَبَّۃِ نُوْرُ

''اور عارفین کے چہرے پر بھی رونق اور محبت کا نور ہے''

فَھَنِیْئًا لِمَنْ عَرَفَکَ اِلٰھِیْ ھُوَ وَاللّٰہِ دَھْرُہٗ مَسْرُوْرُ

''لٰہذا اے میرے اللہ! جس شخص نے تیری معرفت حاصل کی اس کے لئے مبارک بادی ہے۔ اور اللہ کی قسم اس کی ساری زندگی خوش رہے گی'' واللہ تعالیٰ اعلم

لہذا جب وہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت عطا فرمائی۔ اور ان لوگوں کو بھی عزت عطا فرمائی جنہوں نے ان کی عزت کی۔

اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے:

(تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ) تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے''

مفسرین عارفین نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ اس طریقے پر عزت عطا فرماتا ہے کہ وہ تمہارے لئے، تم سے، تمہارے ساتھ، تمہارے سامنے ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سے عزت کا سبب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا:

اَنْتَ الذَّاكِرُ مِنْ قَبْلِ الذَّاكِرِيْنَ

''تو ذکر کرنے والوں سے پہلے ذاکر ہے''

یعنی تو ان کا ذکر اس سے پہلے کرتا ہے کہ وہ تیرا ذکر کریں۔ کیونکہ اگر تو ان کا ذکر نہ کرتا، تو وہ تیرا ذکر نہ کرتے۔

حضرت ابو یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: میں نے اپنی ابتدائی حالت میں چار اشیاء میں غلطی کی:

میں نے خیال کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں اور اس کو پہچانتا ہوں۔ اور اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس کو طلب کرتا ہوں۔ پھر جب میں ہوشیار ہوا۔ تو میں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر میرے ذکر سے پہلے، اور اس کی معرفت میری معرفت سے پہلے، اور اس کی محبت میری محبت سے پہلے، اور میرے لئے اس کی طلب میری طلب سے پہلے ہے۔ پھر میں نے بعد میں اس کو طلب کیا۔

وَاَنْتَ الْبَادِىُٔ بِالْاِحْسَانِ مِنْ قَبْلِ تَوَجُّهِ الْعَابِدِيْنَ

''اور عابدین کی توجہ سے پہلے تو احسان کرنے والا ہے''

لہذا جب تو نے ان کے اوپر پہلے احسان فرمایا۔ تو وہ اطاعت اور یقین کے ساتھ تیری طرف متوجہ ہوئے۔

وَاَنْتَ الْجَوَّادُ بِالْعَطَاءِ مِنْ قَبْلِ طَلَبِ الطَّالِبِيْنَ

''اور تو طالبین کی طلب سے پہلے عطا کے ساتھ فیاض ہے''۔

کیونکہ ازل کا حکم اس سے بلند ہے کہ وہ اسباب اور علتوں سے متعلق ہو

وَاَنْتَ الْوَهَّابُ ، ثُمَّ اَنْتَ لِمَا وَهَبْتَنَا مِنَ الْمُسْتَقْرِضِيْنَ

''اور تو ہی عطا فرمانے والا ہے پھر تو نے جو کچھ ہم کو عطا فرمایا۔ اسی کو ہم سے قرض مانگنے والا ہے''

پس اللہ تعالیٰ ہی نے ہم کو نعمتیں عطا فرمائیں۔ اور اسی نے ہم کو سخاوت اور بخشش کا حکم دیا۔ اور اسی نے ہم کو عطا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اور اسی نے اس پر ہم کو بڑی بڑی نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا۔ لہذا بندے نے جو کچھ دیا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور جو کچھ لیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

لہذا جب بندے نے یہ پہچان لیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے سوا کوئی وسیلہ باقی نہیں رہا۔ جس سے وہ وسیلہ پکڑے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ کی مناجات میں ہے: اے ذاکرین کے اس شی کے ساتھ ذکر کرنے والے جس کے ساتھ انہوں نے ذکر کیا۔

اے عارفین کی اس شی کے ساتھ ابتدا کرنے والے ! جس شی میں انہوں نے تیری معرفت حاصل کی۔

اے عابدین کو نیک عمل کی توفیق دینے والے!

کون ہے جو تیری اجازت کے بغیر تیرے پاس شفاعت کرے؟

کون ہے جو تیرے فضل کے بغیر تیرا ذکر کرے۔

اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے اسی شی کا قرض مانگنا جو اسی نے اس کو عطا فرمایا ہے اس کے مرتبے کو انتہائی بلندی پر پہنچانا، اور اس کی شرف اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے اور پھر اس پر بہترین ثواب کا وعدہ کرنا، بندے پر اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ نے تم کو مالک بنایا۔ پھر اس نے جس شی کا تم کو مالک بنایا۔ اسی کو تم سے خریدا۔ تا کہ وہ اپنے ساتھ تمہاری نسبت ثابت کرے۔ پھر جو شی اس نے تم سے خرید لی اسی کو تم سے قرض کے طور پر مانگا۔ پھر اس پر اس نے کئی گنا ثواب کا وعدہ فرمایا۔

عارف نے اسی بیان میں فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور بخششیں اس سے بلند ہیں کہ اسباب کے بدلے میں دی جائیں۔

حضرت ابن عباد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: چونکہ مصنفؒ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا چاہنا بندے کے چاہنے پر مقدم ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مصنفؒ نے یہ استدعا کی ہے کہ وہ ان کو چاہے۔ تا کہ مصنفؒ کی طرف سے چاہنا ثابت ہو جائے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اٹھائیسویں مناجات میں بیان فرمایا:

مناجات کی مسلسل عبارت

اِلٰهِىْ اِنَّ الْقَضَاءَ وَالْقَدَرَ قَدْ غَلَبَنِىْ ، وَاِنَّ الْهَوٰى بِوَثَائِقِ الشَّهْوَةِ اَسَرَنِىْ ، فَكُنْ اَنْتَ النَّاصِرَ لِىْ حَتّٰى تَنْصُرَنِىْ وَ تَنْصُرَبِىْ ، وَ اَغْنِنِىْ بِفَضْلِكَ حَتّٰى اَسْتَغْنِىْ بِكَ عَنْ طَلَبِىْ ، اَنْتَ الَّذِىْ اَشْرَقْتَ الْاَنْوَارَ فِىْ قُلُوْبِ اَوْلِيَائِكَ ، وَاَنْتَ الَّذِىْ اَزَلْتَ الْاَغْيَارَ عَنْ قُلُوْبِ اَحِبَّاءِ كَ ، وَاَنْتَ لَهُمْ حَيْثُ اَوْ حَشَتْهُمُ الْعَوَالِمَ ، اَنْتَ الَّذِىْ هَدَيْتَهُمْ حَتّٰى اسْتَبَانَتْ لَهُمُ الْمَعَالِمُ ، مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَكَ ؟ وَمَا الَّذِىْ فَقَدَ مَنْ وَجَدَكَ ؟ لَقَدْ خَابَ مَنْ رَضِىَ دُوْنَكَ بَدَلاً ، وَلَقَدْ خَسِرَ مَنْ بَغٰى عَنْكَ مُتَحَوِّلًا ، كَيْفَ يُرْجٰى سِوَاكَ وَاَنْتَ مَا قَطَعْتَ الْاِحْسَانَ؟ اَمْ كَيْفَ يُطْلَبُ مِنْ غَيْرِكَ وَاَنْتَ مَا بَدَّلْتَ عَادَةَ الْاِمْتِنَانِ ؟ ، يَا مَنْ اَذَاقَ اَحْبَابَهٗ حَلَاوَةَ مُؤَانَسَتِهٖ فَقَامُوْا بَيْنَ يَدَيْهِ مُتَمَلِّقِيْنَ ، يَامَنْ اَلْبَسَ اَوْلِيَاءَهٗ مَلَابِسَ هَيْبَتِهٖ فَقَامُوْا بِعِزَّتِهٖ مُسْتَعِزِّيْنَ ، اَنْتَ الذَّاكِرُ مِنْ قَبْلِ الذَّاكِرِيْنَ ، وَاَنْتَ الْبَادِىْ بِالْاِحْسَانِ مِنْ قَبْلِ تَوَجُّهِ الْعَابِدِيْنَ ، وَاَنْتَ الْجَوَّادُ بِالْعَطَاءِ مِنْ قَبْلِ طَلَبِ الطَّالِبِيْنَ ، وَاَنْتَ الْوَهَّابُ ثُمَّ اَنْتَ لِمَا وَهَبْتَنَا مِنَ الْمُسْتَقْرِضِيْنَ

''اے میرے اللہ! بے شک قضا وقدر میرے اوپر غالب ہے اور بے شک خواہش نے شہوت کی رسیوں سے مجھ کو باندھ دیا ہے۔ لہٰذا تو ہی میرا مددگار بن۔ یہاں تک کہ تو میری مدد کرے۔ اور میرے ذریعے مدد کرے۔ اور مجھ کو اپنے فضل سے غنی کردے۔ تاکہ میں تیرے ساتھ اپنی طلب سے بے نیاز ہو جاؤں۔ اپنے اولیائے کرام کے قلوب میں انوار کو تو نے ہی روشن فرمایا ہے۔ اور اپنے دوستوں کے قلوب سے اغیار کو تو نے ہی زائل فرمایا۔ اور تو ہی ان لوگوں کا مونس اور غمخوار ہے۔ اس طریقے پر کہ تو نے ان کو کائنات سے متنفر کر دیا۔ تو نے ہی ان کو ہدایت فرمائی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے علامات ظاہر ہو گئیں۔ اس شخص نے کیا پایا جس نے تجھ کو کھو دیا؟ اور اس شخص نے کیا گم کیا جس نے تجھ کو پالیا؟ البتہ وہ شخص محروم و بدنصیب ہے جو تیرے عوض دوسری شئی سے راضی ہوا اور البتہ وہ شخص خسارے میں ہے جس نے تجھ سے روگردانی کر کے سرکشی کی۔ تیرے غیر سے کیسے امید کی جائے جب کہ تو نے احسان کو ختم نہیں کیا ہے؟ یا تیرے غیر سے کیسے مانگا جائے جب کہ تو نے احسان کرنے کی عادت تبدیل نہیں کی ہے؟ اے وہ ذات پاک جس نے اپنے دوستوں کو اپنی انسیت کی شیرینی چکھائی۔ لہٰذا وہ اس کے سامنے محبت اور چاپلوسی کرتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ اے وہ ذات پاک! جس نے اپنے اولیائے عارفین کو ہیبت کا لباس پہنایا۔ لہٰذا وہ اس کی عزت سے عزت حاصل کر کے عزت کے مقام میں قائم ہوئے تو ذکر کرنے والوں سے پہلے ذاکر ہے۔ اور عابدین کی توجہ سے پہلے تو احسان کرنے والا ہے۔ اور تو طالبین کی طلب سے پہلے عطا کے ساتھ فیاض ہے۔ اور تو ہی عطا فرمانے والا ہے۔ پھر تو نے جو کچھ ہم کو عطا فرمایا۔ اس کو ہم سے قرض مانگنے والا ہے''۔

اٹھائیسویں مناجات

حضرت مصنفؒ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ اُطْلُبْنِیْ بِرَحْمَتِكَ حَتّٰی اَصِلَ اِلَیْكَ

''اے اللہ! تو مجھ کو اپنی رحمت سے طلب کر۔ یہاں تک کہ میں تیرے پاس پہنچوں''۔

یعنی تو مجھ کو اپنی ازلی رحمت سے طلب کر۔ تا کہ میں تیری طلب کروں اور تیرے پاس پہنچوں۔ کیونکہ وصول سے پہلے طلب یعنی چاہنا ہے۔ اور یہی سلوک کا طریقہ ہے۔

پھر مصنفؒ نے جذب وعنایت کے طریقے کی طرف اشارہ فرمایا:

وَاجْذُبْنِیْ بِمِنَّتِكَ حَتّٰی اُقْبِلَ عَلَیْكَ

''اور اپنے احسان سے مجھ کو جذب کر۔ تا کہ میں تیری طرف بڑھوں''۔

میں کہتا ہوں: اگر اس کے برعکس ہوتا تو بہتر ہوتا۔

پس مصنفؒ اس طرح فرماتے: تو مجھ کو اپنی رحمت سے طلب کر۔ تا کہ میں تیری طرف بڑھوں۔ اور تو مجھ کو اپنے احسان سے جذب کر تا کہ میں تیرے پاس پہنچوں۔

اس لئے کہ جذب: مخلوق کے شہود سے خالق کے شہود کی طرف اچانک کھینچ لینا ہے۔ اور یہ اکثر توجہ اور طلب اور مجاہدہ اور محنت کے بعد ہوتا ہے۔

اور ایسا کبھی اتفاقیہ ہوتا ہے کہ پہلے جذب کر لیا جائے پھر سلوک کی طرف واپس کیا جائے اور پہلا طریقہ زیادہ کامل ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی طلب بندے کو حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے خوف ورجا بندے سے منقطع نہیں ہوتی ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے انتیسویں مناجات میں اس کو بیان فرمایا:

انتیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ اِنَّ رِجَائِیْ لَا یَنْقَطِعُ عَنْكَ وَاِنْ عَصَیْتُكَ، وَاَنَّ خَوْفِیْ لَا یُزَایِلُنِیْ وَاِنْ اَطَعْتُكَ

''اے میرے اللہ! میری رجا (امید) تجھ سے منقطع نہیں ہوتی ہے۔ اگر چہ میں تیری نافرمانی کروں۔ اور میرا خوف مجھ سے زائل نہیں ہوتا ہے۔ اگر چہ میں تیری اطاعت کروں''۔

میں کہتا ہوں: چونکہ سابقہ یعنی نوشتہ ازلی، پوشیدہ۔ اور خاتمہ یعنی موت کا حال نامعلوم ہے۔ اس لئے بندہ خوف ورجا کے درمیان ہے۔ اگر چہ جو پہنچنا ہے۔ وہ پہنچے گا۔ اور قلوب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے۔ ان کو پھیرتا ہے اور بدلتا ہے۔ اور پیشانیاں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہ جہاں چاہتا ہے۔ ان کو لے جاتا ہے۔

ایک عارف نے فرمایا ہے:

حَسْبِیَ اللّٰهُ تَوَكَّلْتُ عَلَیْهِ مَنْ نَّوَاصِی الْخَلْقِ طُرًّا فِیْ یَدَیْهِ

''میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ میں نے اس پر بھروسہ کیا۔ وہ ذات اقدس جس کے ہاتھ میں کل مخلوق کی پیشانیاں ہیں''۔

لَیْسَ لِلْهَا رِبِ فِیْ مَهْرَبِهٖ اَبَداً مَلْجَأٌ اِلَّا اِلَیْهِ

''بھاگنے والے کے لئے اس کے بھاگنے میں۔ اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے''

لہذا بندے کے لئے یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اطاعت کرے تو اس کا خوف ختم ہو جائے۔ اور اگر وہ نافرمانی کرے تو اس کی امید ختم ہو جائے۔

اور کتاب کی ابتداء میں یہ بیان گزر چکا ہے۔ عارفین کا خوف اور ان کی امید جلال اور جمال کے شہود سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جلال اور جمال تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ لہذا جو شی ان سے پیدا ہوتی

ہے اس میں بھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے مصنفؒ نے اپنی ذات کو اسی بزرگ حالت سے موصوف کیا ہے۔ اور یہ ہمیشہ اعتدال کی حالت ہے۔ خواہ بندے سے اطاعت ظاہر ہو یا معصیت۔

تم اس بیان کو پھر مطالعہ کرو جو پہلے گزر چکا ہے۔ اور مصنفؒ کے اس قول میں غور وفکر کرو۔ ''اگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تمہارے سامنے آئے تو کوئی کبیرہ کبیرہ نہیں ہے''۔

لہذا جب یہ ثابت ہو گیا کہ بندے کے لئے نافرمانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے دروازے کے سوا بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اطاعت کی حالت میں اس کے فضل وکرم اور احسان کے سوا کسی شی میں سکون نہیں ہے۔ تو اس نے یہ جان لیا کہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہر شی سے دور کیا ہوا ہے۔

مصنفؒ کے اس قول کا یہی معنی ہے:

قَدْ دَفَعَتْنِیْ الْعَوَالِمُ اِلَیْكَ

''کائنات نے مجھ کو تیری ہی طرف دور کر دیا (لوٹا دیا)''۔

پس جب میں کائنات میں سے کسی شی کی طرف مائل ہوا تو اس نے مجھ کو اپنے سے دور کر دیا۔ یا جب میں نے کسی شی پر بھروسہ کیا۔ تو اس نے اپنے کو میرے اوپر منتشر (ناگوار) کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھ کو اپنے سے دور کر کے تیری طرف لوٹا دیا۔

لہذا میری عظیم جہالت کے باوجود تو میرے ساتھ کتنا بڑا رحیم ہے۔ اور یہ اپنے بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی کی علامت ہے۔ کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ بندہ کسی شی کے ساتھ ٹھہر گیا۔ یا کسی شی کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ اس شی کو اس پر پریشان کر دیتا ہے۔ اور اس کو اس شی سے منتقل کر دیتا ہے۔

اور یہ بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ان تمام سزاؤں میں سے جن سے مرید کو سزا دی جاتی ہے، مرید کو اس کے ارادے اور خواہش کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ حضرت مولائے عربی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

جب تم کسی فقیر کو اس حال میں دیکھو کہ اس پر ہر طرف سے مصیبت اور پریشانی برپا ہے۔ تو تم یہ جان لو کہ اس کو اللہ تعالیٰ اپنے قریب سکون کی جگہ عطا فرمانا چاہتا ہے۔ یا انہوں نے ایسا کلام فرمایا جس کا یہی مفہوم ہے۔

حاصل یہ ہے: اللہ تعالیٰ غیور ہے وہ یہ نہیں پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے کا قلب اس کے سوا کسی دوسری شی کی طرف متوجہ ہو۔ اور یہ اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور احسان ہے۔

اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا:

قَدْ اَوْ قَفَنِیْ عِلْمِیْ بِکَرَمِکَ عَلَیْکَ

''اور تیرے فضل و کرم سے میرے علم نے مجھ کو تیرے حضور میں ٹھیرایا''۔

میں کہتا ہوں: جب کائنات نے بندے کو اپنے سے دور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا۔ تو اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کریم نہیں پایا۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے علم نے اس کو اس کے دروازے پر ٹھیرا دیا۔ اور اس نے اس کی بارگاہ میں پناہ لی۔ اور وہ ایسا کریم ہے کہ امیدیں اس سے نہ تجاویز کرتی ہیں نہ سبقت کرتی ہیں۔

بیان کیا گیا ہے: اس کے کرم کے یہ معنی ہیں

معنی: اس کا اپنے بندوں پر احسان کرنا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے: اسی کے کرم سے۔ کہ وہ مانگنے سے پہلے ہی عطا فرماتا ہے۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے جو سوال کا محتاج نہیں بلکہ بغیر مانگے عطا فرماتا ہے۔

حضرت محاسبی نے فرمایا ہے: وہ ایسا کریم ہے کہ اس کو یہ پرواہ نہیں ہے کہ کس کو دیا۔ نہ پرواہ ہے کہ کتنا دیا۔

اور بیان کیا گیا ہے: جو شخص اللہ تعالیٰ کے کرم کی سمجھ رکھتا ہے۔ وہ قضا و قدر (تقدیر) کی خرابی سے غم نہیں کرتا اور بے صبر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مصیبت کو ایسی نعمت سمجھتا ہے جو مخلوق کی سمجھ سے پوشیدہ ہے۔

جیسا کہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے جن مصیبتوں میں مجھ کو مبتلا فرمایا۔ میں نے اس میں اللہ تعالیٰ کی تین نعمتیں دیکھیں۔

پہلی نعمت: یہ کہ وہ میرے دین نہیں واقع ہوئی۔

دوسری نعمت: یہ کہ وہ جتنی واقع ہوئی۔ اس سے زیادہ بڑھی۔

تیسری نعمت: یہ کہ وہ خطاؤں کا کفارہ بن گئی۔

لہذا میں اس مصیبت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

اسی لئے عارفین نے فرمایا ہے: اس شخص پر تعجب نہیں ہے کہ جو نعمتوں میں لذت محسوس کرتا ہے بلکہ تعجب اس پر ہے جو دردناک عذاب میں لذت محسوس کرتا ہے۔

اور یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب کہ نفس کی عادت ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس شی سے لذت حاصل کرتا ہے جس سے لوگ درد و تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

جیسا کہ ایک عارف نے فرمایا ہے:

اُرِیْدُكَ لَا اُرِیْدُكَ لِلثَّوَابِ　　وَلٰکِنَّنِیْ اُرِیْدُكَ لِلْعِقَابِ

"میں تجھ کو چاہتا ہوں۔ لیکن میں تجھ کو ثواب کے لئے نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میں تجھ کو سزا کے لئے چاہتا ہوں"۔

وَكُلُّ مَاٰرِبِیْ قَدْ نِلْتُ مِنْهَا　　سِوٰی مَلْذُوْذِ وَجْدِیْ بِالْعَذَابِ

"اور اپنی کل حاجتیں میں نے حاصل کر لی۔ عذاب سے میرے حال کے لذیذ ہونے کے سوا۔

اور ایک دوسرے عارف نے فرمایا ہے:

اِذَا كَانَتِ الْاَقْدَارُ مِنْ مَالِكِ الْمُلْكِ　　فَسِیَّانِ عِنْدِیْ مَا یَسُرُّ وَمَا یُبْكِیْ

"جب کہ قضا و قدر مالک الملک کی طرف سے ہے۔ تو جو شی خوش کرتی ہے اور جو شی رلاتی ہے دونوں میرے نزدیک برابر ہیں"۔

حاصل یہ ہے کہ محبت جب کامل اور غالب ہو جاتی ہے تو وہ محبت کرنے والے کو تکلیفوں اور

مصیبتوں سے غائب کر دیتی ہے۔ ورنہ وہ محبت ناقص اور کمزور ہے۔

اور محبت کے پیدا ہونے کا سبب: کرم کا شہود ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اور جو شخص اپنے مولائے حقیقی کے کرم کے دروازے پر ٹھیر جاتا ہے تو وہ اس کی امید اور تمنا کو ناکام نہیں کرتا ہے۔

جیسا کہ مصنفؒ نے اس کو تیسویں مناجات میں بیان فرمایا:

مناجات کی مسلسل عبارات

اِلٰهِىْ اِنَّ رِجَائِىْ لَا يَنْقَطِعُ عَنْكَ وَاِنْ عَصَيْتُكَ، وَاَنَّ خَوْفِىْ لَا يُزَايِلُنِىْ وَاِنْ اَطَعْتُكَ ، قَدْ دَفَعَتْنِى الْعَوَالِمُ اِلَيْكَ، وَقَدْ اَوْقَفَنِىْ عِلْمِىْ بِكَرَمِكَ عَلَيْكَ

''اے میرے اللہ! میری رجا (امید) تجھ سے منقطع نہیں ہوتی ہے اگر چہ میں تیری نافرمانی کروں۔ اور میرا خوف مجھ سے زائل نہیں ہوتا ہے۔ اگر چہ میں تیری اطاعت کروں۔ کائنات نے مجھ کو تیری ہی طرف دور کر دیا (لوٹا دیا) اور تیرے فضل وکرم سے میرے علم نے مجھ کو تیرے حضور میں ٹھیرایا''

تیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ كَیْفَ اُخَیَّبُ وَاَنْتَ اَمَلِیْ

''اے میرے اللہ! میں ناکام کیسے کیا جاؤں گا جب کہ میری امید تو ہے''۔

یعنی میری حرص اور امید کا مقام تو ہے۔ اور کریم، حرص کرنے والوں کی امیدوں کو ناکام نہیں کرتا ہے۔ جب کہ وہ اکرم الاکرمین ہے:

اَمْ كَیْفَ اُهَانُ وَعَلَیْكَ مُتَّكَلِیْ

''یا میں ذلیل ورسوا کیسے کیا جاؤں گا جب کہ میرا بھروسہ تیرے اوپر ہے''۔

اور تو نے اپنی بزرگ کتاب قرآن کریم میں فرمایا ہے:

وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہے''

اور جس کے لئے تو کافی اور مددگار رہو۔ وہ کبھی ذلیل ورسوا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حکایت: ایک ولی کے گھر میں ان کی آخری عمر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اور اس لڑکی کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور ان ولی کی وفات کا وقت آ گیا۔ تو ایک شخص نے ان سے کہا: یا حضرت! آپ اس لڑکی کے بارے میں مجھ کو وصیت کر دیجئے تاکہ میں اس کی پرورش کا ذمہ دار ہو جاؤں۔ ولی نے جواب دیا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن جب میرا انتقال ہو جائے تو آپ اس لڑکی کو اللہ تعالیٰ کے حرم شریف میں لے جائیے۔ اور حجر اسود کے پاس چھوڑ کر چلے آئیے۔ اور اس لڑکی کو اللہ تعالیٰ کی کفالت (ضمانت) میں چھوڑ دیجئے۔ لہذا جب ان ولی کا انتقال ہو گیا تو اس شخص نے ویسا ہی کیا، جیسا انہوں نے فرمایا تھا لیکن دور کھڑا ہو کر لڑکی کی نگرانی کرتا رہا۔ خلیفہ وقت کی ماں طواف کر رہی

تھی۔اس نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس نے اپنے لئے اس لڑکی کو اٹھا کر لے چلنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے اس کو اپنی متبنیٰ بیٹی بنائی۔اور اس کی پرورش کی۔ یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئی۔تو اس نے وزیر کے لڑکے سے اس کا نکاح کیا۔اور اس کا مہر بیس ہزار دینار مقرر کیا۔لہذا تم اس شخص کے حال پر غور کرو۔ جس نے اپنے مولائے حقیقی کی کفالت پر بھروسہ کیا۔اور اس کی حفاظت اور حمایت کے قلعے میں پناہ لی۔

ایک عارف کے اشعار ہیں:

اَیَحْسُنُ بِیْ فِیْ دَارِکُمْ وَنُزُوْلِکُمْ اُوَجِّهُ یَوْماً لِلْعِبَادِ رِجَائِیَا

”تمہارے گھر میں ہونے اور تمہارے یہاں اترنے کی حالت میں کیا میرے لئے یہ بہتر ہو سکتا ہے کہ میں اپنی امیدیں کسی دن بندوں کے سامنے پیش کروں“۔

یَحِقُّ لِمِثْلِیْ اَنْ یَّعُوْدَ لِمِثْلِکُمْ وَاَتْرُکُنَ جَمْعَ الْعِبَادِ وَرَائِیَا

”مجھ جیسے محتاج کے لئے یہی بہتر ہے کہ تم جیسے کریم کی طرف لوٹے۔اور سب بندوں کو پیچھے چھوڑ دوں“۔

حکایت: ایک شخص نے سفر کا ارادہ کیا۔اس کی بیوی حاملہ تھی۔ جب وہ سفر کے لئے روانہ ہوا۔تو اس نے کہا: اے اللہ! میں اس بچے کو جو اس عورت کے شکم میں ہے تیرے سپرد کرتا ہوں یہ کہہ کر وہ چلا گیا جب وہ سفر سے واپس آیا۔تو اس نے اپنی بیوی کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا۔تو اس کو بتایا گیا وہ حاملہ ہونے کی حالت میں انتقال کرگئی۔ جب رات ہوئی تو وہ قبرستان کی طرف گیا۔ اس نے ایک روشنی دیکھی وہ اسی روشنی کے پیچھے پیچھے چلا۔اور اچانک وہ اپنی بیوی کی قبر میں پہنچ گیا۔ اس نے اس کے اوپر سے کفن ہٹایا۔تو دیکھا کہ بچہ اس کے پستان سے دودھ پی رہا ہے۔پس ہاتف غیب نے اس کو آواز دے کر کہا: اے شخص! تو نے لڑکے کو ہمارے سپرد کیا تھا۔لہذا تو نے اس کو پا لیا۔اگر تو اس کی ماں کو بھی ہمارے سپرد کرتا تو دونوں کو تو ایک ساتھ پاتا۔یہ حکایت تنویر سے نقل کی گئی ہے۔

لہذا اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس شخص پر کتنی مہربانی فرمائی جس نے اس کی حفاظت چاہی۔اور اس

شخص کی کتنی حفاظت فرمائی جو اس کی حمایت میں داخل ہو گیا۔

اے اللہ! تو ہم کو ان لوگوں میں شامل کر جنہوں نے تیرے قلعے میں پناہ لی۔ پس تو ان کے لئے کافی ہو گیا۔ اور ان لوگوں میں شامل کر جنہوں نے اپنے ترکے میں تیری حفاظت چاہی۔ لہذا تو نے ان کی حفاظت فرمائی۔ یا ارحم الراحمین

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو شخص اللہ عزیز کی حفاظت میں داخل ہو جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عزیز، اور اس کے سامنے ذلیل ہوتا ہے۔

مصنف ؒ نے اکتیسویں مناجات میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا۔

اکتیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا

اِلٰهِیْ كَیْفَ اَسْتَعِزُّ وَفِی الذِّلَّةِ اَرْكَزْتَنِیْ

''اے میرے اللہ! میں عزت کیسے طلب کروں۔ جب کہ تو نے مجھ کو ذلت میں قائم کیا ہے؟''

یعنی میں تیرے سامنے عزت کیسے طلب کروں جب کہ تو نے مجھ کو عبودیت کی ذلت میں قائم کیا ہے؟

اَمْ كَیْفَ لَا اَسْتَعِزُّ وَاِلَیْكَ نَسَبْتَنِیْ؟

''یا میں عزت کیسے نہ چاہوں۔ جب کہ تو نے مجھ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے؟''

یعنی میں اپنے قلب اور روح اور سر میں عزت کیسے نہ چاہوں۔ جب کہ تو نے مجھ کو اس طریقے سے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ کہ تو نے میرے قلب میں خصوصیت کا راز، اور معرفت کا نور، اور آزادی کی قوت سپرد فرمائی۔

پھر تو نے فرمایا: اے میرے بندے! اور اے میرے دوست۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نسبت وجود پر فکر، اور کل موجود پر بڑائی کا سبب ہے۔ لہذا عارف کی ذلت عبودیت کے سبب اس کے ظاہر میں ہے۔ اور اس کی عزت انوار ربوبیت کے مشاہدے کی بناء پر آزادی کے سبب اس کے باطن میں ہے۔

اسی کی طرف ایک عارف نے اپنے ان اشعار میں اشارہ فرمایا ہے:

نَحْنُ اِنْ كُنَّا بِهٖ تُهْنَا دَلَالًا   عَلٰى سَائِرِ الْحَرَائِرِ وَالْعَبِیْدِ

''ہم اگر اس کے ساتھ ہوتے ہیں تو تمام آزادوں اور غلاموں پر عزت اور وقار سے فخر کرتے

ہیں''۔

وَاِنَّ نَحْنُ رَجَعْنَا اِلَيْنَا عَطَّلَ ذُلُّنَا ذُلَّ الْيَهُوْدُ

''اور جب ہم اپنی طرف لوٹ آتے ہیں تو ہماری ذلت یہود کی ذلت کو بھی شکست دے دیتی ہے''۔

ایک عارف نے فرمایا ہے: میں نے ہر ذلت والے کی زلت کو دیکھا۔ تو مجھ کو اپنی ذلت ان کی ذلت سے بڑھی ہوئی نظر آئی۔ اور میں نے ہر عزت والے کی عزت کو دیکھا۔ تو مجھ کو اپنی عزت ان کی عزت سے زیادہ نظر آئی۔

حضرت شبلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: میں ایسا ذلیل ہوں کہ میری ذلت کے مقابلے میں ہر ذلیل عزیز ہے۔ اور میں ایسا عزیز ہوں کہ ہر شخص میری نسبت کی وجہ سے عزیز ہے۔ اور اس ذات کی نسبت کی وجہ سے عزیز ہے۔ جس کی نسبت کی وجہ سے میں عزیز ہوں۔

پھر چونکہ محتاجی ذلت کا بھائی ہے۔ اس وجہ سے مصنفؒ نے ذلت کے بیان کے ساتھ ساتھ محتاجی کا بیان بتیسویں مناجات میں فرمایا:

بتیسویں مناجات

حضرت مصنف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِلٰهِیْ كَیْفَ لَا اَفْتَقِرُ اِلَیْكَ وَاَنْتَ الَّذِیْ فِی الْفَقْرِ اَقَمْتَنِیْ؟

''اے میرے اللہ! میں تیرا محتاج کیسے نہ رہوں۔ جب کہ تو نے ہی مجھ کو محتاجی میں قائم کیا ہے؟''

اس لئے کہ میرا ہر سانس تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا میں اپنی پیدائش اور امداد میں ہر وقت تیرا محتاج ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یَآاَیُّهَاالنَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ

''اے انسانو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو''۔

اور یہ پیدائش کی نعمت کی محتاجی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ

''اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سب کو ختم کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے''۔

اور یہ امداد کی نعمت کی محتاجی ہے۔

اَمْ كَیْفَ اَفْتَقِرُ اِلٰی غَیْرِكَ وَاَنْتَ الَّذِیْ بِجُوْدِكَ اَغْنَیْتَنِیْ؟

''یا میں تیرے غیر کا محتاج کیسے ہو جاؤں۔ جب کہ تو نے ہی اپنے فضل و کرم سے مجھ کو بے نیاز کر دیا ہے''۔

اس طریقے پر کہ جن اشیاء نے مجھ کو فکر و غم میں مبتلا کیا۔ ان میں تو میرے لئے کافی ہو گیا۔ اور تو نے میری روزی اور ان تمام اشیاء کی ضمانت لی، جن سے میرا وجود قائم ہے۔ اور تو نے مجھ کو اپنی

معرفت سے غنی کردیا۔ تاکہ میں تیرے غیر کا محتاج نہ رہوں۔ حدیث شریف میں ہے۔

لَيْسَ الْغِنٰى بِكَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَاِنَّمَا الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ

''سامان کی زیادتی سے غنا نہیں ہوتی ہے بلکہ غنا نفس کی غنا ہے''۔

یعنی روح کی غنا ہے۔ اور روح کی غنا صرف اپنے رب کے ساتھ ہوتی ہے۔

اَنْتَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ تَعَرَّفْتَ لِكُلِّ شَيْءٍ

''تو ہی وہ ذات پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو نے ہر شی کو اپنی پہچان کرائی''۔

اس طریقے پر کہ تو نے ان کے سامنے اپنے جلال اور جمال کا نور ظاہر فرمایا۔ لہذا ہر شی تیری حمد کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہوگئی۔ اور تیرے سامنے سجدے میں گر گئی۔

فَمَا جَهِلَكَ شَيْءٌ ''لہذا کوئی شی تجھ سے ناواقف نہیں رہی''

یعنی ہر شی تیری عارف ہے۔ اور تیری ربوبیت کا اقرار کر رہی ہے۔ خواہ ظاہری و باطنی طور پر خوشی و رضامندی سے ہو۔ یا صرف باطنی طور پر رضامندی سے ہو۔

وَاَنْتَ الَّذِیْ تَعَرَّفَ اِلَيَّ فِیْ كُلِّ شَيْءٍ

''اور تو وہ ذات پاک ہے کہ تو نے ہر شی میں مجھ کو اپنی پہچان کرائی''۔

یعنی آثار کے اختلافات اور حالات کی تبدیلیوں سے تو نے مجھ کو ہر شی میں اپنی پہچان کرائی۔

فَرَاَيْتُكَ ظَاهِرًا فِیْ كُلِّ شَيْءٍ

''لہذا میں نے تجھ کو ہر شی میں ظاہر دیکھا'' یعنی تیرے اس ازلی نور کے ساتھ دیکھا۔ جس نے ہر شی کے وجود کو فنا کر دیا ہے''۔

فَاَنْتَ الظَّاهِرُ لِكُلِّ شَيْءٍ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ لِكُلِّ شَيْءٍ

''پس تو ہی ہر شی کا ظاہر ہے اور تو ہی ہر شی کا باطن ہے''۔

حدیث شریف میں ہے

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَاَنْتَ

الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ

''اے میرے اللہ! تو ہی اول ہے۔ لہذا تجھ سے قبل کوئی شی نہیں ہے۔ اور تو ہی آخر ہے۔ لہذا تیرے بعد کوئی شی نہیں ہے۔ اور تو ہی ظاہر ہے لہذا تیرے اوپر کوئی شی نہیں ہے۔ اور تو ہی باطن ہے۔ لہذا تیرے سوا کوئی سی نہیں ہے۔''

اور ظہور کی قسمیں اس کتاب کی ابتداء میں مکمل طریقے پر بیان ہو چکی ہیں۔ اور مصنفؒ نے یہاں ان کو ایسی عبارت سے بیان فرمایا ہے کہ ایسی عبارت اس سے پہلے نہیں بیان ہوئی۔ چنانچہ فرمایا۔

يَا مَنِ اسْتَوٰى بِرَحْمَانِيَّتِهٖ عَلٰى عَرْشِهٖ فَصَارَ الْعَرْشُ غَيْباً فِيْ رَحْمَانِيَّتِهٖ ، كَمَا صَارَتِ الْعَوَالِمُ غَيْبًا فِيْ عَرْشِهٖ

''اے وہ ذات پاک! جو اپنی رحمانیت کے ساتھ اپنے عرش پر قائم (غالب) ہوئی پس عرش اس کی رحمانیت میں گم ہے۔ جیسا کہ کائنات اس کے عرش میں گم ہے''

میں کہتا ہوں: مصنفؒ نے اس عبارت میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

(اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى) ''رحمان عرش پر قائم ہوا'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمٰنِ

''پھر رحمان عرش پر قائم ہوا''

پس مصنفؒ نے یہ بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پر قائم ہونا صرف اپنی رحمانیت کے ساتھ ہے۔ لہذا عرش اللہ تعالیٰ کی رحمانیت سے ڈھانپا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی رحمانیت میں گم ہے۔ کیونکہ اس کی رحمانیت کے ساتھ عرش کی کوئی نسبت نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی رحمانیت: ایسا وصف ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اور صفت موصوف کے ساتھ لازم ہوتی ہے۔

لہذا جب عرش غائب ہو گیا۔ اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی رحمانیت میں پوشیدہ ہو گیا تو کائنات بھی اس کی رحمانیت میں غائب ہو گئی۔ کیونکہ وہ عرش کے وجود میں غائب ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی رحمانیت میں عرش کا وجود غائب ہو گیا تو کل کائنات کا وجود بھی غائب ہو گیا کیونکہ کل کائنات عرش کے پیٹ میں اس طرح ہے جیسے زمین میں ایک حلقہ۔ اور عرش کائنات کو اسی طرح گھیرے ہوئے ہے جس طرح رحمانیت عرش کو گھیرے ہوئے ہے۔ لہذا رحمانیت کے ساتھ عرش کی کوئی نسبت نہیں ہے۔

پھر مصنفؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

مَحَقْتَ الْاٰثَارِ بِالْاٰثَارِ

''تو نے آثار کو آثار سے باطل کر دیا''

پہلا آثار کائنات ہے اور دوسرا آثار عرش ہے۔ پس کل کائنات عرش کی عظمت میں باطل ہو گئیں یہاں تک کہ وہ کالعدم ہو گئیں:

وَمَحَوْتَ الْاَغْیَارَ بِمُحِیْطَاتِ اَفْلَاكِ الْاَنْوَارِ

''اور تو نے اغیار کو انوار کے گھیرنے والے افلاک سے مٹا دیا''۔

میں کہتا ہوں: اغیار سے مراد عرش ہے۔ اور وہ کل کائنات ہے۔ جس کو عرش گھیرے ہوئے ہے۔

یا تم اس طرح کہو: عرش سے فرش تک ہر وہ شی جو عالم خلق میں داخل ہے۔ یا وہ اشیاء جن کا وجود عرش سے علیحدہ فرض کیا گیا ہے وہ اغیار ہیں۔

اور انوار کے افلاک: ذات اور صفات کے انوار ہیں۔

لہذا جب ذات اقدس کی عظمت کے انوار سے اغیار یعنی آثار باطل یعنی فنا ہو گئے تو صرف انوار باقی رہ گئے۔ اور وجود میں اللہ تعالیٰ واحد قہار منفرد (تنہا) رہ گیا۔

پس صفات کے انوار ہی ذات کے انوار ہیں۔ اور ذات کے انوار ہی صفات کے انوار ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

يَا مَنْ اِحْتَجَبَ فِيْ سُرَادِقَاتِ عِزِّهٖ عَنْ اَنْ تُدْرِكَهُ الْاَبْصَارُ

''اے وہ ذات اقدس جو اپنی عزت کے پردوں میں آنکھوں کے دیکھنے سے پوشیدہ ہو گئی''۔

میں کہتا ہوں: سرادقات کے معنی چہار دیواری۔ اور یہاں حجابات قہر یہ سے کنایہ ہے۔ اور وہ عزت کے وہ حجابات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ اپنی شدت ظہور کے باوجود اپنے بندوں سے پوشیدہ ہو گیا ہے۔

اور عزت کے حجابات: حس اور وہم اور غفلت کے دائرے اور وہ پردے ہیں جو قلوب پر پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ پانچ امور میں منحصر ہیں۔

پہلا امر: دنیا کی محبت ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قہر سے انسان کے قلوب میں بو دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمتیں اس کی طرف پھر گئیں۔ اور عقلیں اس میں کھو گئیں۔ اور قلوب اس کی خیالی صورتوں سے تاریک ہو گئے۔ اور فکریں اس میں پھنس گئیں۔ لہذا اب وہ دنیا کے علاوہ کسی دوسری شی کی طرف نہیں لوٹ سکتی ہیں اور اسی دنیا کی محبت کے سبب اکثر بندے اللہ تعالیٰ سے مجوب ہو گئے ہیں مگر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی محبت سے محفوظ رکھا۔

دوسرا امر: اسباب کو اس کے مسبب کے ساتھ متعلق کرنا ہے اور عادتوں کو ان اشیاء سے متعلق کرنا ہے جن کے وہ عادی ہیں جیسے کہ روزہ کا معاملہ سبب کی حرکت پر، اور درختوں اور سبزیوں کا پیدا ہونا بارشوں پر، اور ان کے علاوہ دوسرے اسباب کو متعلق کرنا ہے۔

پس جاہلوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اسباب مسببوں سے جدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ مسبب الاسباب سے مجوب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اللہ حکیم و علیم بغیر اسباب کے روزی دیتا ہے۔ اور بے حساب عطا فرماتا ہے اور اسی وجہ سے بہت سے لوگ مجوب ہوئے کیونکہ وہ اسباب کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ اور رب الارباب کے شہود سے رک گئے۔ مگر اہل عقل میں سے وہ لوگ جن کی بصیرت اسباب سے آگے بڑھ گئی۔

تیسرا امر: ظاہری شریعت کی ترغیب و ترہیب اور علم و عمل کے ساتھ ٹھہر جانا ہے۔ پس کچھ لوگ ایسے ہیں جو ترغیب کے ساتھ ٹھہر گئے۔ لہذا وہ ثواب حاصل کرنے کے لئے عمل میں مشغول

ہوئے۔ اور وہ عابدین ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو ترہیب کے ساتھ ٹھیر گئے لہذا ان کے اوپر خوف غالب ہو گیا اور وہ زاہدین ہیں۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم کی ترغیب کے ساتھ ٹھیر گئے۔ لہذا وہ عبارت اور حروف کے علم میں مشغول ہو گئے۔ اور یقین اور خوف اور معرفت کے علم کو ترک کر دیا۔ اور وہ علمائے ظاہر ہیں۔

پس وہ علم کے ساتھ معلوم سے محجوب ہو گئے۔ اور معلوم، اللہ حی وقیوم کی معرفت ہے۔

چوتھا امر: عبادت کی حلاوت اور مناجات کی لذت کے ساتھ ٹھیر جانا ہے اور وہ اس شخص کے لئے زہر قاتل ہیں جو ان کے ساتھ ٹھیر گیا اور وہ اہل مراقبہ ہیں۔ اور بہت سے عابدین وزاہدین اسی وجہ سے محجوب ہوئے ہیں اور کبھی ان سے ظاہری کرامات ظاہر ہوتے ہیں تو وہ ان کو اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ حجاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

پانچواں امر: قدرت کا اثر ان تجلیوں پر ظاہر ہوا۔ اور اس کا عبودیت کے اوصاف سے موصوف ہونا ہے۔ مثلاً فقر اور ذلت اور جہل، اور مرض اور موت اور ان کے علاوہ دوسرے بشری اوصاف جو خصوصیت کا راز پوشیدہ کئے ہوئے ہیں۔ اور بعض فنا فی الذات کی طرف نظر رکھنے والے اس کے ساتھ محجوب ہو گئے۔ لہذا وہ وہیں واپس ہو گئے۔ جہاں سے وہ آئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

(وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ) ''اور وہ حکمت والا خبر رکھنے والا ہے''

پس یہی عزت کے وہ حجابات ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ پوشیدہ ہو گیا ہے اور بے شک اس اللہ عزیز تک کوئی وہم اس کی تقدیر میں طمع کر کے ترقی نہیں کر سکتا ہے اور نہ کوئی سمجھ اس کی تصویر کا ارادہ کر کے اس کی صمدانیت تک بلند ہو سکتی ہے۔

اور بیان کیا گیا ہے: اللہ عزیز وہ ہے جس کی عظمت کے سمندر میں عقلیں گم ہو گئیں اور اور اسکی کی نعمت کے سمجھنے میں ذہن ودماغ حیران ہو گئے اور اس کے جلال اور جمال کے اوصاف پوری طرح بیان کرنے سے زبانیں گونگی ہو گئیں۔

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ ، اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ

''میں تیری تعریف نہیں بیان کرسکتا ہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنی تعریف کی ہے''۔

''یَا مَنْ تَجَلّٰی بِكَمَالِ بَهَائِهٖ'' اے وہ ذات اقدس جو اپنے حسن وجمال کے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔

فَتَحَقَّقَتْ عَظْمَتُهُ الْاَسْرَارَ ''پس اس کی عظمت اسرار میں مضبوطی سے قائم ہوگئی''۔

یعنی عارفین کے اسرار میں قائم ہوگئی۔ لہذا ان کا سرور اور ان کی خوشی قیامت تک ہمیشہ قائم رہے گی۔ پھر ان کی بشاشت رب العالمین کی طرف ان کے دیکھنے سے متصل ہو جائے گی۔

ایک عارف نے یہ حقیقت اشعار میں بیان فرمائی ہے

سُرُوْرِیْ بِكُمْ اَضْحٰی یَجِلُّ عَنِ الْوَصْفِ
وَقُرْبِیْ مِنْكُمْ بِالْمُوَدَّةِ وَالْعَطْفِ

''تمہارے ساتھ میرا سرور، بیان سے باہر ہے۔ اور تم سے میرا قرب، دوستی اور مہربانی کے ساتھ ہے''۔

وَاَنْتُمْ مَعِیْ حَیْثُ اسْتَقَلَّ بِیْ الْهَوٰی فَلِیْ بِكُمْ شُغْلٌ عَنِ الدَّانِیْ وَالْاِنْفِ

اور تم میرے ساتھ اسی حیثیت سے ہو، جس حیثیت سے میرے ساتھ محبت مضبوط و مستقل ہے۔ لہذا اقارب اور احباب سے منہ پھیر کر میری مشغولیت تمہارے ساتھ ہے۔

سُوَیْدَاءُ قَلْبِیْ اَصْبَحَتْ حَرَمًا لَكُمْ تَطُوْفُ بِهَا الْاَسْرَارُ مِنْ عَالَمِ اللُّطْفِ

میرا قلب تمہارا حرم ہوگیا ہے۔ عالم لطف کے اسرار اس کا طواف کرتے ہیں۔

رَسَائِلُ مَا بَیْنَ الْمُحِبِّیْنِ اَصْبَحَتْ تَجِلُّ عَنِ التَّعْرِیْفِ وَالرَّسْمِ وَالْعُرْفِ

دو دوستوں کے درمیان ایسے خطوط ہیں جو تعریف اور تحریر اور بیان سے باہر ہیں۔

رَسَائِلُ جَاءَتْنَا بِرِیًّا جَنَابِكُمْ عَوَارِفُ عَرْفٍ فَاقَ كُلَّ شَذَا عَرْفٍ

وہ خطوط جو تمہاری بارگاہ کی سیرابی و تازگی کے ساتھ ہمارے پاس آئے ہیں وہ عرفان کی خوشبوئیں ہیں جو ہر تیز خوشبو پر فوقیت رکھتی ہیں۔

كَيْفَ تَخْفٰى ۔تو کیسے چھپ سکتا ہے۔یعنی عارفین کی بصیرتوں سے تو کیسے چھپ سکتا۔

وَاَنْتَ الظَّاهِرُ۔ جبکہ تو ہی ظاہر ہے۔

یعنی تو ہی تنہا ظاہر ہے۔تیرے ساتھ کوئی ظاہر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۔ وہی اول اور آخر اور ظاہر اور باطن ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ ظاہر ہے لیکن مخلوقین کی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہیں۔اور حادث

کو نہیں دیکھ سکتا ہے۔اور حق سبحانہ تعالیٰ کو حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے۔لہٰذا

حادث مخلوق فنا ہو جاتی ہے۔اور صرف قدیم باقی رہ جاتا ہے تو قدیم قدیم کو دیکھتا ہے اور حق تعا

تعالیٰ کو پہچانتا ہے۔لہٰذا جب تک اللہ تعالیٰ تمہارے وصف کو اپنے وصف سے نہ ڈھانپ ـ

وقت تک اس کے نور کے ظہور کی شدت کے باوجود تم اس کے شہود اور معرفت کی حرص نہ کرو۔

اَمْ كَيْفَ تَغِيْبُ وَاَنْتَ الرَّقِيْبُ الْحَاضِرُ۔ یا تو کیسے غائب ہو سکتا ہے جب کہ تو نگ

حاضر ہے''

یعنی ایسا حاضر ہے جس سے کوئی شی نہ پوشیدہ ہے نہ غائب ہے۔اور وہ ہر شی کو محیط (گھیـ

ہوئے) ہے۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ

''اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے''۔

یعنی صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دینے والا ،اور عین حقیقت تک پہنچانے والا اللہ تعالیٰ ہی

وَبِهٖ اَسْتَعِيْنُ ''اور میں اسی سے مدد مانگتا ہوں''

کیونکہ بے شک وہ طاقتور مددگار ہے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

''اللہ علی وعظیم کے سوا کسی کے پاس نہ کچھ اختیار ہے نہ قوت''

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفَى الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى

مناجات کی مسلسل عبارت

اِلٰهِیْ كَيْفَ لَا اَفْتَقِرُ اِلَيْكَ وَاَنْتَ الَّذِیْ فِی الْفَقْرِ اَقَمْتَنِیْ؟ اَمْ كَيْفَ اَفْتَقِرُ اِلٰى غَيْرِكَ وَاَنْتَ الَّذِیْ بِجُوْدِكَ اَغْنَيْتَنِیْ؟ ،اَنْتَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ تَعَرَّفْتَ لِكُلِّ شَیْءٍ فَمَا جَهِلَكَ شَیْءٌ ، وَاَنْتَ الَّذِیْ تَعَرَّفَ اِلَیَّ فِیْ كُلِّ شَیْءٍ فَرَاَيْتُكَ ظَاهِرًا فِیْ كُلِّ شَیْءٍ، فَاَنْتَ الظَّاهِرُ لِكُلِّ شَیْءٍ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ لِكُلِّ شَیْءٍ، يَا مَنِ اسْتَوٰى بِرَحْمَانِيَّتِهٖ عَلٰى عَرْشِهٖ فَصَارَ الْعَرْشُ غَيْباً فِیْ رَحْمَانِيَّتِهٖ ، كَمَا صَارَتِ الْعَوَالِمُ غَيْبًا فِیْ عَرْشِهٖ ،مَحَقْتَ الْاٰثَارَ بِالْاٰثَارِ وَمَحَوْتَ الْاَغْيَارَ بِمُحِيْطَاتِ اَفْلَاكِ الْاَنْوَارِ ،يَا مَنْ اِحْتَجَبَ فِیْ سُرَادِقَاتِ عِزِّهٖ عَنْ اَنْ تُدْرِكَهُ الْاَبْصَارُ، يَا مَنْ تَجَلّٰى بِكَمَالِ بَهَائِهٖ فَتَحَقَّقَتْ عَظْمَتُهُ الْاَسْرَارَ ، كَيْفَ تَخْفٰى وَاَنْتَ الظَّاهِرُ ، اَمْ كَيْفَ تَغِيْبُ وَاَنْتَ الرَّقِيْبُ الْحَاضِرُ، وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَبِهٖ اَسْتَعِيْنُ

''اے میرے اللہ! میں تیرا محتاج کیسے نہ رہوں جب کہ تو نے ہی مجھ کو محتاجی میں قائم کیا ہے''
یا میں تیرے غیر کا محتاج کیسے ہو جاؤں جب کہ تو نے ہی اپنے فضل وکرم سے مجھ کو بے نیاز کر دیا ہے؟ تو ہی وہ ذات پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔تو نے ہر شی کو اپنی پہچان کرائی۔لہٰذا کوئی شی تجھ سے ناواقف نہیں رہی۔اور تو ہی وہ ذات پاک ہے کہ تو نے ہر شی میں مجھ کو اپنی پہچان کرائی۔پس میں نے ہر شی میں تجھ کو ظاہر دیکھا۔پس تو ہی ہر شی کا ظاہر ہے۔اور تو ہی ہر شی کا باطن ہے۔اے وہ ذات پاک ! جو اپنی رحمانیت کے ساتھ اپنے عرش پر قائم (غالب) ہوئی۔پس عرش اس کی رحمانیت میں گم ہو گیا۔جیسا کہ کائنات اس کے عرش میں گم ہے۔تو نے اثار کو آثار سے باطل کر دیا اور تو نے اغیار کو انوار کے گھیرنے والے افلاک سے مٹا دیا۔اے وہ ذات اقدس جو اپنی عزت کے پردوں میں آنکھوں کے دیکھنے سے پوشیدہ ہو گئی۔اے وہ ذات اقدس جو اپنے حسن و جمال کے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔پس اس کی عظمت اسرار میں مضبوطی سے قائم ہو گئی۔تو کیسے چھپ سکتا

ہے جب کہ تو ہی ظاہر ہے۔ یا تو کیسے غائب ہو سکتا ہے جب کہ تو نگہبان حاضر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔ اور میں اسی سے مدد مانگتا ہوں''

میں نے جس کے جمع کرنے کا (یعنی کتاب الحکم کی تشریح) ارادہ کیا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قوت سے مکمل ہو گیا۔

پس اگر یہ حق اور درست ہے تو اللہ بزرگ و برتر کا احسان و کرم ہے ورنہ بندہ تو خطا و تقصیر سے مرکب ہے۔ اور خاص کر اپنی بے سروسامانی اور علم کی کمی کی بناء پر خطا و نسیان کا امکان زیادہ ہے۔

اور میں اسی طرح کہتا ہوں جس طرح حضرت شیخ خلیل نے فرمایا

اور میں اہل علم و عقل کے سامنے اس خطا و نسیان کے لئے جو اس کتاب میں واقع ہوئی ہو معذرت پیش کرتا ہوں اور میں نہایت عاجزی و انکساری کے ساتھ ان سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ وہ رضامندی اور درستی کی نظر سے دیکھیں۔ لہٰذا اگر ان کو اس کتاب میں کوئی نقص نظر آئے تو اس کو مکمل کریں۔ اور اگر کوئی غلطی پائیں تو اس کی اصلاح کریں کیونکہ ایسا کم ہوتا ہے کہ مصنف خطاؤں سے خالی اور لغزشوں سے پاک ہو۔

اور جیسا کہ ابن مالک نے تسہیل میں فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ ایسے حسد کرنے والے سے ہم کو محفوظ رکھے جو انصاف کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اور بہترین اوصاف سے منہ پھیر لیتا ہے اور ہم کو ایسے شکر کی توفیق عطا فرمائے جو متواتر نعمتوں کا باعث ہو۔ اور سختیوں کے ختم ہونے کا سبب ہو۔

اور جیسا کہ حرز امانی میں فرمایا ہے:

فَيَا عَاطِرَ الْاَنْفَاسِ اَحْسَنُ تَاَوُّلاً

''اے سانسوں کو معطر کرنے والے، بہتر تاویل کر''

اور میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچائے، جو اس کو تحریر کریں یا اس کا مطالعہ کریں یا اس میں سے کچھ حاصل کریں۔ یا اس کو سنیں۔ یا ان پر عمل کریں جو اس کتاب میں درج ہے۔ یا اس کو قبول کریں اور اس کے حاصل کرنے والے کو حضرت خیر الانام

سیدنا و مولانا محمد شفیع و مقبول صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وعترتہ واحزابہ وسلم اہل محبت و وصول کے طفیل اس کے تمام امید و مقاصد تک کامیابی سے پہنچا دے۔

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

''اور مرسلین پر سلام ہو۔ اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ جو کل عالموں کا رب ہے''

یہ کتاب بروز چہار شنبہ آٹھویں جمادالاولیٰ ۱۲۱۱ کو مکمل ہوئی اور اسی سال کے محرم الحرام میں اس کو لکھنا شروع کیا۔

اور ہماری آخری دعا یہ ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَ اِمَامِ الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ

ایقاظ الہِمَم
فی
شرح الحِکَم

(جلد دوم)

مصنف

احمد بن محمد عجیبۃ الحسنی رحمہ اللہ

مترجم

حضرت مولانا محی الدین نظامی رحمہ اللہ

باہتمام

حضرت مولانا صاحبزادہ عزیز احمد صاحب مدظلہم

خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ

کندیاں ضلع میانوالی

فون: 0300-6092045